خطباتِ حکیم الاسلام

جلد
۱

افادات

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی
نور اللہ مرقدہٗ

مرتبہ
قاری محمد ادریس ہوشیارپوری

اضافہ وترتیب جدید:۔ مولانا محمد شفیق فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

دار الاشاعت
اردو بازار۔ کراچی۔ فون ۲۶۳۱۸۶۱

حقوق طباعت بحق ناشر محفوظ ہیں۔

مرتب مدظلہ کے اصل مکتوب گرامی کا عکس

حامداً ومصلیاً:

بندہ محمد ادریس ہوشیارپوری نے اپنی مرتب کردہ
تعلیمات تفہیم الاسلام کی دس جلدوں کے حقوق طباعت و
اشاعت مستقل طور پر دارالاشاعت کراچی کو دیئے
ہیں۔ اس سے قبل کچھ ادارے اس کتاب کو
ملتان سے شائع کر رہے ہیں۔ ان دو اداروں کے
علاوہ بندہ کی طرف سے مزید کسی کو اجازت نہیں ہے۔

والسلام

محمد ادریس

خادم دارالعلوم رحیمیہ ملتان

۱۵/۷/۱۴۰۶ھ

طبع اوّل کمپیوٹر : ۱۹۹۷ء

طبع دوم کمپیوٹر جدید ایڈیشن ۔ نومبر ۲۰۰۰ء

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی

مرتب : قاری محمد ادریس ہوشیارپوری ❖ اضافہ وترتیب جدید: مولانا محمد شفیق صاحب

مصححین : مولانا محمد عمیر صاحب ۔ مولانا عبدالبصیر صاحب ۔ مولانا محمد ہارون صاحب

طباعت : حسان پرنٹنگ پریس

فون 6642832

ملنے کے پتے :

بیت القرآن اردو بازار، کراچی نمبر ۱

ادارۃ المعارف دارالعلوم، کراچی نمبر ۱۴

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور

ادارۃ القرآن ڈی۔۴۳۷۔ ویپ روڈ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

حق تعالیٰ کا انعام ہے ہمارے ادارے سے "خطبات حکیم الاسلام کامل[1]" شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس سے پہلے بھی علمائے حق کی تصانیف وتراجم شائع ہو چکی ہیں جنہیں علمی حلقوں میں بحمد اللہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، دراصل یہ ان حضرات کی ساری زندگی کا نچوڑ ہے جن کا اوڑھنا بچھونا درس و تدریس اور علم و عمل کی طلب رکھنے والے حضرات کی دینی رہنمائی رہی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن حضرات کو دین کی تبلیغ کے لئے منتخب فرمایا ان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام نامی نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کی بے شمار تصانیف شائع ہو کر قارئین کے لئے علم و عمل میں اضافہ کا سبب ہیں، آپ کی تصانیف سے علمی حلقوں نے بہت استفادہ کیا اور کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب کو کہ حضرت قاری صاحبؒ کے خطبات جو آپ تک کیسٹوں کی شکل میں منتشر تھے یا منتشر تحریرات جو دستیاب ہو سکی ہیں ان کو نہایت جانفشانی اور احتیاط کے ساتھ جمع کر کے عمدہ ترتیب دے دی۔ اور اس کا نام "خطبات حکیم الاسلام" تجویز کیا۔ (جو پہلے پاکستان کے ایک اور ادارے سے بھی شائع ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے)۔ اس کتاب کے طبع ہو جانے سے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے علوم و فیوض سے استفادہ صرف علمی حلقے کے لئے ہی نہیں بلکہ عوام کے لئے بھی آسان ہو گیا، اور یہ کتاب بہت پسند کی گئی، نامور علماء نے اس کی پسندیدگی اور افادیت پر اپنی رائے دی ہے جو شامل کتاب ہے۔

ضرورت تھی کہ اس کتاب کو اس کے شایان شان طریقہ سے شائع کیا جائے چنانچہ اس کے مرتب نے ہمارے ادارے دارالاشاعت کو ایک خصوصی معاملہ کے بعد طباعت واشاعت کے جملہ حقوق تحریری طور پر ہمیں دے دیئے ہیں۔ جس پر ادارہ ان کا شکر گزار ہے، ہم نے کوشش کی ہے جیسا کہ یہ کتاب معنوی حسن سے مالا مال ہے اس کو ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہونا چاہئے اس لئے ہمارے طبع کردہ اس ایڈیشن کی خصوصیات یہ ہیں۔

---

[1] یہ عرض ناشر پرانے ایڈیشن پر لکھا گیا تھا، اس نئے ایڈیشن کی جو اضافی خصوصیات ہیں وہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)...... پوری کتاب کمپیوٹر کتابت سے آراستہ ہے جس سے پوری کتاب میں کتابت و طباعت اور قلم یکساں ہے اس وجہ سے کتاب کے وقار اور حسن میں اضافہ ہو گیا۔

(۲)...... پہلے یہ کتاب جس سائز پر شائع ہوتی رہی ہے وہ علمی طور پر خوبصورت نہیں سمجھا جاتا، اب یہ اس سے ذرا بڑے اور علمی سائز پر طبع کی گئی ہے۔

(۳)...... کاغذ اور طباعت اعلیٰ رکھا گیا ہے۔

(۴)...... جلد بندی پائیدار اور خوبصورت ہے اور جلدوں کا سائز یکساں ہونے کی وجہ سے یہ کتاب بہت خوبصورت ہو گئی ہے۔

(۵)...... قیمت کوشش کی گئی ہے کہ ان اضافی خصوصیات کے باوجود بڑھنے نہ پائے۔

(۶)...... حتی الامکان اس کی تصحیح میں بھی کوشش کی گئی ہے کہ اغلاط باقی نہ رہیں اگر پھر بھی اغلاط سامنے آئیں تو ازراہ کرم ناشر کو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ وہ غلطی باقی نہ رہے۔

کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں اس لئے اس کے مطالعے میں آپ کو انداز تحریری نہیں بلکہ خطابی محسوس ہوگا اور ان خطبات کا مقصد خطاب برائے خطاب نہیں ہے۔ اس لئے ازراہ کرم مطالعہ کر کے اس پر خود بھی عمل کی کوشش فرمائیں اور اپنے گھر والوں اور متعلقین کو بھی اس جانب متوجہ کریں۔ میرے اور میرے والدین کے لئے بھی دعا فرمائیں۔ احسان ہوگا

اس نئے ایڈیشن کی خصوصیات

اس نئے ایڈیشن میں حضرتؒ کے متعدد نئے ملنے والے خطبات و مضامین شامل کئے گئے ہیں اور قارئین کی سہولت کے لئے ترتیب جدید موضوع کے اعتبار سے کی گئی ہے، اس میں تقریباً 250 سے زائد صفحات کا اضافہ ہوا ہے، اس طرح بحمد للہ ہمارا یہ ایڈیشن اب تک کے مطبوعہ تمام نسخوں سے ہر لحاظ سے ممتاز ہے۔ الحمد للہ۔

والسلام
ناشر
خلیل اشرف عثمانی

اجمالی فہرست

نام خطبات **صفحہ**

◆ عرض ناشر ۔۔۔۔۔۔ ۳
◆ عکس تحریر ۔۔۔۔۔۔ ۶
◆ تقریظ ۔۔۔۔۔۔ ۷
◆ الاھداء ۔۔۔۔۔۔ ۸
◆ پیش لفظ ۔۔۔۔۔۔ ۹
◆ حرف سپاس ۔۔۔۔۔۔ ۱۲
◆ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کا مختصر سوانحی خاکہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۳
◆ کتاب خداوندی اور شخصیت مقدسہ ہدایت کیلئے دونوں ۔۔۔۔۔۔ ۴۳
◆ انسانی فضیلت کا راز ۔۔۔۔۔۔ ۶۹
◆ معجزۂ علمی ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۳
◆ راہنمائے انقلاب ۔۔۔۔۔۔ ۱۴۹
◆ علمی معجزہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۷
◆ معارف القرآن ۔۔۔۔۔۔ ۱۹۱
◆ عظمت حفظ ۔۔۔۔۔۔ ۲۰۹
◆ قرآن معدن حیات ہے ۔۔۔۔۔۔ ۲۱۷
◆ خلافت تجوید ۔۔۔۔۔۔ ۲۳۳
◆ جنت کی رسی کو مضبوط پکڑو ۔۔۔۔۔۔ ۲۴۷
◆ تفسیر سورۂ ملک ۔۔۔۔۔۔ ۲۶۱
◆ حدیث رسول کا قرآنی معیار ۔۔۔۔۔۔ ۳۶۵
◆ آغاز بخاری ۔۔۔۔۔۔ ۴۲۳
◆ افادات بخاری نمبر ۱ ۔۔۔۔۔۔ ۴۳۹
◆ افادات بخاری نمبر ۲ ۔۔۔۔۔۔ ۴۵۷
◆ درس ختم بخاری ۔۔۔۔۔۔ ۴۷۱

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

کی

تحریر کا عکس

گر گزندت رسد ز خلق مرنج

کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست

کہ دل ہر دو در تصرف اوست

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

١٦ ۲/٨ ھ

تقریظ

عارفِ کبیر، حجۃ القراء شارح شاطبی
حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحب
(ادام اللہ بقاءہٗ بالعزۃ والجمال)

حامداً ومصلّیاً

امّا بعد!

ماشاء اللہ قاری ادریس صاحب بڑا تعمیری کام کر رہے ہیں اور مولانا قاری محمد طیّب صاحب کی تقریریں طبع کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب تک چار تقریریں تو مکمل کر چکے ہیں۔ اسی طرح اور تقریروں کی بھی تلاش میں ہیں۔ خدا کرے بہت سی تقریریں حضرت موصوف کی مل جائیں اور یہ اصلاحی ذخیرہ کافی ووافی جمع ہو جائے۔

اللہ پاک مولوی ادریس صاحب کے لئے بھی اس کو آخرت کی کامیابی کا بہترین ذریعہ بنائے اور اہلِ علم وعامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کے ارشادات سے مستفیض فرمائے اور ان کے ارشادات کو دنیاو آخرت کے لئے مشعلِ راہ بنائے۔ آمین ثم آمین

بِجَاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیْمُ

(حضرت مولانا قاری) فتح محمد (صاحب مدظلہٗ)
مہاجر مدنی مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاوکرامۃً)
حال وارد ملتان۔ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

اَلإِهداء

"خطباتِ حکیم الاسلام"

کی ترتیب وتدوین کے اس ذرۂ محنت کو اپنے عظیم المرتبت استاذ گرامی ___ مجدّد القرأت استاذ الاساتذہ عارف باللہ حضرت الحاج سیّدی ومولائی المقری القاری رحیم بخش صاحب ادام اللہ تعالیٰ فیوض برکاتہم (خلیفۂ مجاز بیعت حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم) ___ کی خدمت عالیہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جن کی بے پایاں عنایات اور خصوصی ادعیہ سے بندہ ناچیز یہ کام کرپایا ___ اور حضرت موصوف مدظلہٗ العالی سے دعواتِ صالحہ کی بھرپور امید رکھتا ہوں ع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

محمد ادریس ہوشیارپوری (غفرلہٗ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

امّا بعد

الحمد للہ "خطباتِ حکیم الاسلام" ایک عرصہ کی محنت و مشقت اور جدوجہد کے بعد مرتب ہوئی اور بسیار سعی و کاوش سے کتابت و طباعت کے مراحل سے بخیر و خوبی گذر کر منظرِ عام پر آئی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا جناب قاری محمد طیب قاسمی صاحب دامت برکاتہم جس خانوادۂ علمی سے تعلق رکھتے ہیں اس کی شہرت ایسی ہمہ گیر ہے کہ حضرت موصوف کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ امّت مسلمہ بالعموم اور اہل سنّت و الجماعت کا عظیم طبقہ بالخصوص جس عظمت و تقدّس اور احترام کی نگاہ سے اسے دیکھتا ہے وہ کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ میری مراد حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ صحیح معنوں میں "ماہتابِ قاسمی" ہیں۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے دنیائے اسلام کے لئے بالعموم اور برّصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص جو قابل قدر اور گرانمایہ خدمات سرانجام دی ہیں اور اُفق ہند پر چھائے ہوئے کفر و ضلالت کے بادل جس طرح ان کی آہِ سحرگاہی اور اخلاص و للّہیت کی بدولت چھٹے ہیں اس سے تاریخ کا ایک بہت بڑا اور زریں باب مرقوم ہے اربابِ بصیرت اور تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ان نامساعد حالات سے بخوبی واقف ہے جن میں "اسلام کے چراغ" کو گل ہونے سے بچانے کے لئے وہ غیر مسلم طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے اور ایسی مجاہدانہ قربانیاں پیش کیں جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائیں گی۔ اور پھر اپنے بعد تربیت یافتہ اپنا ایک مستقل طبقہ چھوڑا جو آج تک ان کے اس مقدّس مشن کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور ہر طرف سے اسے خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہو رہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند جو بظاہر ایک ادارہ ہے۔ جہاں علوم دینیہ کی درس و تدریس کا سلسلہ صبح و شام جاری ہے۔ طالبانِ علم کی تشنگی کا سامان ہوتا رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نوّر اللہ مرقدہٗ کے دل میں جو مسلمانانِ ہند کے اجتماعی مفاد اور اسلام کے لئے تڑپ تھی۔ اس اجتماعی مفاد کے حصول کی خاطر آپ نے اپنی تحریک اور مشن کو علم کی چادر اوڑھا دی تھی..... الحمد للہ وہ آج تک اسی راہ پر سرگرم عمل ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ اس ادارہ نے علم و فضل سے کیا عروج پایا؟ اور دنیائے اسلام میں کیا مقام پایا اور کیا کیا خدمات سرانجام دیں؟ اس کے پیش نظریہ کہنا بے جا یا مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیائے اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کوئی صاحب علم، دین کے کسی شعبہ میں کسی خدمتِ دینی میں لگا ہوا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ دارالعلوم دیوبند کا ہی فیض یافتہ نہ ہو۔ دارالعلوم کا فیض پُر تاثیر ایسا ہمہ گیر ہے کہ صدیوں اس کے اثرات انشاء اللہ باقی رہیں گے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات نوّر اللہ مرقدہٗ نے گو اپنے کو مٹائے رکھا لیکن جس کو اللہ پاک عزت و

شرف سے نمایاں کرنا چاہیں تو وہ مشیت ایزدی کے تحت ہو کر ہی رہتا ہے۔ الحمد للہ وہ اپنے علمی کارہائے نمایاں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں اور جس عشق و محبت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اتباعِ دین کے ساتھ انہوں نے زندگی گذاری۔ کہا جاسکتا ہے کہ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کا وہ حقیقی مصداق ہیں۔

آج اس دار العلوم کو قائم ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ وہ اسی آب و تاب سے اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ کفر کی حرکات گو اس پہ خندہ زن ہوں مگر نورِ نبوّت کا چراغ جل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرات اکابرِ دیوبند سے جو کام لیا ہے اس کے ظاہری وسائل کم اور حقیقی و روحانی وسائل اس میں بطور اصل عنصر کے شامل رہے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ اس دور میں علومِ قاسمی کے سچے وارث اور امین ہیں۔ ان کے اندازِ بیان سے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کی تقاریر جو میرے پاس پہنچیں تو اس جذبے کے ساتھ کہ یہ علوم چند اشخاص کی حد تک نہیں رہنے چاہئیں بلکہ ان کو عام ہونا چاہئے۔ ان تقاریر کو ایک کتابی شکل دینے پر آمادگی ہوئی اور ان تقاریر کو پڑھنے والے مجھے امید ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ الکریم ابن الکریم ابن الکریم کی شان کے حامل ہیں۔

اور اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا قائم کردہ "دار العلوم" نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا ان کے زیرِ اہتمام جس حُسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ روحِ قاسمی قالبِ طیّب میں جلوہ گر و جلوہ آراء ہے۔

حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کی تقاریر بالمشافہ سننے کا اتفاق کم ہی ہوا اور پاکستان میں حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری بھی ہوتی ہے تو پروگرام کچھ اس نہج سے بنتے ہیں کہ عامۃ النّاس کو حضرت قاری صاحب کے علوم و معارف سے استفادہ کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ جہاں اس میں حکومت کے مروّجہ اصول و ضوابط آڑے آتے ہیں اور حضرت قاری صاحب چند مخصوص مقامات (مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، دار العلوم کراچی، خیر المدارس ملتان، دار العلوم اکوڑہ خٹک) کے علاوہ آزادانہ طور پر ہر جگہ نہیں پہنچ سکتے، وہاں خود عامۃ النّاس میں معتقدین، متوسّلین اور اکابرِ دیوبند سے متعلقہ ایک مستقل طبقہ اپنی گراں بار مصروفیات اور دینی مشاغل کے پیشِ نظر نیز ہوش ربا گرانی کے باعث اپنے اندر ہمت و سکت نہیں پاتا کہ وہ اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر برابر مسافرت میں شریک رہ سکے اور حضرت قاری صاحب کے نکتہ رس اور حکیمانہ اندازِ تکلم سے فیض یاب ہو سکے۔ نیز آج کے دور میں اصلاحی جلسوں کی تقاریر کا "رخ" بھی کچھ اس ڈھب کا ہو گیا ہے کہ تقریر کے اختتام پذیر ہونے کے بعد حاضرین میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں اصلاح کے علاوہ باقی سب کچھ مل جاتا ہے۔ "سیرتِ طیّبہ" کے نام پر منعقد ہونے والی بڑی بڑی مجالس میں بھی سیرت کے علاوہ باقی بہت کچھ مل جائے گا مگر سیرت ہی مفقود ہو گی۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے خطبات میں جہاں عوام کے لئے اصلاحی افادیت ہے وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اسلام کو ایک اجتماعی نظامِ حیات ماننے کی بجائے "اسلام ہر ایک کا ذاتی و شخصی مذہب ہے" کے فلسفہ کا قائل ہے۔ اسے بھی دعوت فکر ہے، اندازِ بیان نہایت شستہ، سنجیدگی اور متانت سے بھرپور، روانی اور تسلسل کا شاہکار جو دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

بیان میں قصص وواقعات، قرآن حکیم کی آیات کی بے نظیر تفسیر احادیث کی بہترین تشریح، حکایات و تمثیلات اور حکیمانہ نکات کی خوب سے خوب آمد ہوتی ہے، سامعین اکثر دم بخود محوِ وعظ ہوتے ہیں۔ اہلِ علم بات بات پہ سر دھنتے ہیں۔ اور مجمع پر ایک سنّاٹے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ كَأَنَّ عَلٰى رُؤُسِهِمُ الطَّيْرَ

حضرت قاری صاحب مدّ ظلہٗ اپنی انہی خصوصیات کے باعث مجلسِ وعظ سے جب مخاطب ہوں تو ان کی تقریر حشو وزوائد اور مکرّرات سے مبرّاء ہوتی ہے۔ تحریر نما تقریر ہوتی ہے۔ تاہم سلسلۂ کلام بہرحال تحریر سے کچھ مختلف ہو جانا ایک فطری امر ہے۔

بندہ نے پورے خطبات کو لفظ بہ لفظ قلمبند کرنے کی حتیّ الامکان کوشش کی ہے۔ تاہم تحریر میں لاتے وقت کچھ جملوں کی نوک پلک ضرور سنواری ہے، اور اس میں بھی مقدور بھر یہی کوشش رہی کہ حضرت قاری صاحب کے الفاظ میں ہی جملوں کی نشست وبرخاست کو درست کر دیا جائے۔ حضرت قاری صاحب کے مواعظ سے مستفیض ہونے والے اصحاب اس بات کا فیصلہ کر پائیں گے کہ کس حد تک مجھے کامیابی ہو سکی؟

حضرت قاری صاحب مدّ ظلہٗ العالی کی شخصیت یا ان کے خطبات ومواعظ کے بارے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب میں اگر کوئی حسن وخوبی نظر آئے تو اسے حضرت قاری صاحب کی خطابت کا ایک حصّہ سمجھا جائے اور جو اس میں نقص وکمی محسوس ہو تو اسے راقم آثم کی طرف سے منسوب فرماویں۔ جس پر راقم بصد ندامت معذرت خواہ ہے۔

محمد ادریس ہوشیار پوری

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حرفِ سپاس

ناسپاسی ہوگی اگر اس مجموعۂ صد رنگ کا سر نقطۂ آغاز اس بزرگ اور مہربان شخصیت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں مجھے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کردیا۔ تشکّر وامتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک شخصیت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والدِ گرامی کی نسبت وعظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکتِ اسلوب کا تقاضا کرتا ہے، اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلۂ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کی علمی راہ نمائی اور عملی شفقت وعنایت ہی سے میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستۂ پند وحکمت کو مرتب کرسکوں۔

دست بدعاء ہوں کہ حق تعالیٰ بتصدق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظلِّ عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے اور اپنی جنابِ خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایانِ شان اجر وثواب سے خوش وقت وشاد کام فرمائے اور اس کوشش ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ آمین

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی نور اللہ مرقدہ کا مختصر سوانحی خاکہ

ترتیب

حافظ تنویر احمد شریفی ناظم اعلیٰ تنظیم القراء والحفاظ (ٹرسٹ پاکستان کراچی)

علم و عمل کی دنیا میں خانوادۂ قاسمی کسی تعارف کا محتاج نہیں، مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک اس علمی خاندان کی جدوجہد، خدمات، آفتاب و مہتاب کی طرح روشن ہیں، جس خاندان کی جدوجہد کے نتیجہ میں دیوبند سے علمی چشمے پھوٹے اور دنیا میں پھیلے اور برابر پھیلتے ہی چلے جارہے ہیں، ہندوپاک، برما، بنگلہ دیش، سمرقند، بخارا، ملیشیا، افغانستان، افریقہ، نیپال، ممالک عربیہ، غرض جہاں بھی جائیں کوئی نہ کوئی دارالعلوم دیوبند کا فاضل اور اس کے فیوض و برکات سے متمتع انسان ضرور ملے گا۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی مسلم حکومت کے زوال کے بعد سارے ہندوستان میں تاریکی ہی تاریکی تھی، دین و دیانت امن و سکون اور اخلاق و مروت کا نام مٹنا شروع ہوچکا تھا، بالخصوص مسلمان بڑی بے بسی اور کشمکش میں مبتلا تھے، اور اس کے اثرات پوری اسلامی دنیا پر پڑرہے تھے، ان مصائب و آلام کے عالم میں قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کمر ہمت کس کر اٹھے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک متحدہ ہندوستان سے عیسائی مشنریوں اور پادریوں کو نکلنے پر مجبور نہیں کردیا، اور اس زمانہ میں دیوبند جیسے گمنام قصبہ میں ازہرِ ہند دارالعلوم کی بنیاد رکھی، جو اشاعت اسلام کی ایک عالمگیر اور بین الاقوامی یونیورسٹی ہے، یہ تذکرہ اسی یونیورسٹی کے ساتویں مہتمم اور پرنسپل کا ہے۔

پیدائش

حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ اس یونیورسٹی کے ساتوں مہتمم تھے، آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ ہیں، آپ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز اتوار دیوبند میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ''مظفر الدین'' تجویز ہوا۔

رسم بسم اللہ

آپ کی تربیت دینی و علمی ماحول میں ہوئی، ۱۳۲۲ھ میں تعلیم کا آغاز ہوا، رسم بسم اللہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اس مجلس بسم اللہ میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ)، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ شریک ہوئے، بسم اللہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی، جو اس وقت موجود علماء میں عمر اور علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھے، اور ملک کے مشہور نامور عالم اور ادیب شمار ہوتے تھے، اس موقع پر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے برجستہ ایک قصیدہ پڑھا، جس کے دو شعر یہ ہیں:

ے (مجالس حکیم الاسلام صفحہ ۲۹، ذکر طیب صفحہ ۶۸ (مولفہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری صاحب) میں جمادی الثانی کے بجائے محرم کا مہینہ درج ہے۔ شریفی)

مکتب طیب کی مبارک تقریب
کچھ عجب طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر

رب یسر جو کہا اس نے تو بوی وریا
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

حفظ و تجوید قرآن

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پاک مولانا قاری عبدالوحید خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حفظ کیا' اسی زمانہ میں دارالعلوم میں تجوید کا شعبہ قائم کیا گیا جو اس سے پہلے نہ تھا' حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"دارالعلوم دیوبند میں شعبہ تجوید قائم ہونے کا سبب میں ہوں' اور میں ہی اس شعبہ کا سب سے پہلا شاگرد ہوں"۔

اعلیٰ تعلیم

۱۳۲۶ھ میں جب کہ آپ کی عمر ۱۱ سال تھی اس وقت آپ نے قرآن پاک تجوید کے ساتھ حفظ کرلیا تھا' حفظ قرآن کے بعد آپ درجہ فارسی میں داخل ہوئے' اور ۲۷ ۱۳ھ سے ۱۳۲۹ھ تک مسلسل تین سال آپ نے فارسی کی کتابیں پڑھیں' ۱۳۳۰ھ میں درجہ عربی میں داخل ہوئے' اور اس طرح شعبان المعظم ۱۳۳۷ھ میں آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

اساتذۂ کرام

آپ کے اساتذۂ کرام میں مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) منشی منظور احمد صاحب' شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ' جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد رسول خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا نبیہ الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ' شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ' والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا میاں صاحب سید اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ' مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ' محدث العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ اسرارہم شامل ہیں۔

فن سپہ گری میں حضرت امیر شاہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے' اور فن خوشنویسی میں منشی محبوب علی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے' جلد بندی میں محمد علی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے'

اجازت حدیث

آپ کو جن علماء اور محدثین سے اجازت حدیث حاصل تھی ان میں شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا عبداللہ صاحب انبہٹوی رحمۃ اللہ علیہ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔

اصلاحی تعلق

۱۹۲۰ء میں آپ دورۂ حدیث میں شریک تھے' حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا سے اسی سال رہا ہو کر دیوبند تشریف لائے' دیوبند تشریف آوری کے ایک روز بعد آپ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی درخواست کی' اس پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

''اس وقت اپنی جماعت میں دو ہی صاحبزادے ہیں جن کا پوری جماعت احترام کرتی ہے' ایک مولانا حافظ محمد احمد صاحب ؒ (ابن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) اور ایک مولانا حافظ مسعود احمد صاحب ؒ (ابن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ)..........''۔

پھر فرمایا کہ :

''بھائی مالٹا سے کوئی بدل کر تھوڑا ہی آیا ہوں' میں تو وہی کا وہی ہوں' جو مالٹا جانے سے پہلے تھا' آپ نے عرض کیا کہ حضرت ہم وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے' پہلے ہمیں آپ کے بارے میں کوئی شعور نہ تھا' اب ہو گیا ہے''۔

اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمالیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا سے واپسی کے بعد ۶ ماہ حیات رہے' ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء کو آپ نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی' آپ کی وفات کے بعد حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے امام العصر حضرت مولانا کشمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع فرمایا' حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت تو نہیں فرمایا' لیکن تعلیم دیتے رہے' حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب دیوبند سے ڈابھیل تشریف لے گئے تو حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کا ارادہ فرمایا' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا' جس کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ :

''وہ میری اولاد کی طرح ہے' جب چاہے آجائے' لیکن اصول کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود لکھے''۔

یہاں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی اصول پسندی ظاہر ہوتی ہے' اگر آپ کے ایسے سخت اصول نہ ہوتے تو کبھی ایک ہزار کے قریب کتابیں تصنیف نہ فرما سکتے تھے' حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ نے حضرت تھانوی ؒ کو خط لکھا' حضرت تھانوی ؒ نے اس کا جواب دیا کہ : ''تو میری اولاد ہے کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں' جب بھی فرصت ہو فوراً آجاؤ''۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ :

''اتنے میں رمضان کا مہینہ آگیا' میں نے دارالعلوم کی مسجد میں ڈیڑھ پارہ روزانہ سنا کر بیس دنوں میں قرآن پاک ختم کرلیا' اور بیس رمضان کو تھانہ بھون حاضر ہوگیا' اور آخری عشرہ گزارنے کا پروگرام تھا' اطلاع پہلے دے چکا تھا' جس دن پہنچا وہ جمعہ کا دن تھا' مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی' خانقاہ کے دروازہ پر مولوی شبیر علی ؒ صاحب میرے منتظر تھے' ان سے مصافحہ ہوا' میرے ہمراہ مفتی محمد شفیع صاحب ؒ بھی تھے' ہم لوگوں کے پہنچتے ہی بھائی شبیر علی ؒ نے فرمایا کہ حضرت تھانوی ؒ نے سلام فرمایا ہے' اور تین باتیں کہی ہیں''۔

''پہلی بات یہ ہے کہ خانقاہ کے حجرہ نمبر (۴) میں آپ کا قیام ہوگا' وہاں سامان پہنچا دیا گیا ہے''۔

دوسری بات یہ کہ اگر کوئی تکلیف یا تکلف نہ ہو تو ان دس دنوں میں ایک کلام پاک تراویح میں تین تین پارے یومیہ ہمیں سنادو۔

''تیسری بات یہ کہ آپ تین دن تک میرے مہمان رہیں گے' اس کے بعد آپ اپنے کھانے پینے وغیرہ کا بندوبست خود کریں ہے''۔

''اس تیسری بات سے قدرے گرانی کا میرے دل پر اثر ہوا کہ اتنی قرابت داری اور مجھ پر اولاد جیسی شفقت کے ہوتے ہوئے حضرت نے یہ غیریت کی بات کیوں اختیار فرمائی؟ مگر چونکہ حاضری اصلاح کے لئے ہوئی تھی اس لئے سب باتیں بخوشی منظور کرلیں' اور حکم کے مطابق نامزد کمرہ میں

قیام کیا' اور تراویح میں تین پارے پڑھے' تین دن کے بعد حضرت نے یاد فرمایا' اور بلا کر فرمایا کہ میں نے میزبانی میں تین دن کی شرط لگائی تھی وہ ایک ضابطہ اور اصول کی بات تھی' تو میری اولاد ہے یہ ممکن ہے کہ تھانہ بھون آ کر اپنے کھانے کا بندوبست کرے تیرا کھانا وغیرہ میرے ساتھ ہی ہوگا"۔

بعد میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا شمار حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خاص لوگوں میں ہونے لگا' ایک روز حضرتؒ نے خط میں فرمایا کہ:

"بے ساختہ میرے دل پر یہ وارد ہوا ہے کہ میں تجھے خلافت دے دوں' اس لئے میں تم کو خلافت دیتا ہوں' جو کوئی بہ نیت اصلاح و تربیت آئے اس توبہ کرا دیا کرو' اور مشائخ کے معمولات تلقین کر دیا کرو"۔

اہتمام دار العلوم

۴۳ھ میں حضرت قاری صاحبؒ کو دار العلوم کا مہتمم بنایا گیا___ مگر آپ کو اہتمام کے کاموں سے طبعی مناسبت نہ تھی' ایک مرتبہ مہتمم) چھوڑ کر تھانہ بھون چلے گئے' وہاں جا کر لکھ دیا کہ آپ کا یہ کام ہم سے نہیں ہو سکے گا' کسی اور کے سپرد کر دیں' اس پر اکابرین کو بڑی دشواری پیش آئی' اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی سربراہی میں ایک وفد جس میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ' شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور حضرت مولانا عبد السمیع صاحب شامل تھے تھانہ بھون پہنچ گیا' اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ "حضرت آپ کے یہاں ہمارا ایک چور آیا ہے' اور آپ نے اسے پناہ دے رکھی ہے" حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو اس واقعہ کی کوئی خبر نہیں تھی' فرمایا "کیسا چور؟" "کیا مطلب؟" ان حضرات نے عرض کیا کہ "مولوی محمد طیب صاحبؒ تھانہ بھون آ گئے ہیں کہ وہاں یہ تحریر لکھ کر دے آئے ہیں کہ مجھ سے یہ جھگڑے برداشت نہ ہوں گے' کسی دوسرے کے سپرد یہ کام کر دیا جائے' فرمایا جائے' ہم لوگ مدرسہ کس کے سپرد کریں؟

حضرت تھانویؒ نے فرمایا "کہ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں" حضرت تھانویؒ نے حضرت قاری صاحبؒ کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ "تم نے یہ کیا حرکت کی؟ کہ سارا کام چھوڑ کر یہاں آ گئے؟" حضرت قاری صاحبؒ نے فرمایا کہ "یہ کام ہمارے بس کا نہیں' یہ گاڑی مجھ سے نہیں چلے گی"۔

حضرت مدنیؒ اور وفد کے دوسرے علماء نے فرمایا کہ "ضرور چلے گی' کیسے نہیں چلے گی؟" قاری صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں انکار کرتا رہا' بالآخر ان حضرات نے فرمایا کہ "تم کو ہم زبردستی لے کر جائیں گے"۔

قاری صاحب رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ "میرا عجیب حال تھا' اور سخت ذہنی کشمکش تھی' میں اہتمام چاہتا نہیں تھا اور یہ حضرات مانتے نہیں تھے' بالآخر حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کو دار العلوم کے اہتمام کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ (مجالس حکیم الاسلام صفحہ ۶۰)

وفات سے چند ماہ پہلے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے' آپ کے زمانہ اہتمام میں دار العلوم نے خوب سے خوب تر ترقی کی۔

تقریر کا خاص ملکہ' فاتح بمبئی کا خطاب

حضرت قاری صاحبؒ کو اللہ رب العزت نے تقریر کا ایک خاص ملکہ عطاء فرمایا تھا' جب آپ پہلی بار بمبئی تشریف لے گئے تو بمبئی میں معتقدین نے قد آدم پوسٹر لگا دیئے اور عوام کو بتایا گیا کہ نعوذ باللہ "کفار دیوبند" میں یہ شخص___ "اکفر الکفار" ہے' کیونکہ دیوبند کے بڑے کفار سے اسے نسبت حاصل ہے' حضرت شیخ الہندؒ کا مرید ہے حضرت تھانویؒ کا مجاز ہے' حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا مخصوص شاگرد ہے' اور حضرت قاسم العلوم کا پوتا ہے' اس لئے اس میں ساری کفریہ نسبتیں جمع ہیں' سنی بھائیوں کو چاہئے کہ اس کی صورت بھی نہ دیکھیں' ورنہ ایمان کے سلب ہونے کا خطرہ ہے۔ (مجالس حکیم الاسلام صفحہ ۶۱)

عجیب اتفاق کہ یہ پوسٹر ہی اس جلسہ میں جس میں آپ کی تقریر تھی لوگوں کی غیر معمولی حاضری کا سبب بن گیا' زیر

لساں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، کہ آخر دیکھنا تو چاہئے کہ اتنے بڑے ''کافر'' کی شکل و صورت کیسی ہے، اور وہ کیا کفریہ باتیں لوگوں کو تلقین کرتا ہے؟

پوسٹر میں دوسرے جید علماء دیوبند کو بھی جی بھر کر سب و شتم سے نوازا گیا تھا، لیکن خلاف توقع اس دن وعظ میں بہت بڑا مجمع ہوا، کہتے ہیں بمبئی کی تاریخ میں اتنا بڑا جلسہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا، تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق چالیس ہزار آدمی اس جلسہ میں موجود تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے تین گھنٹے وعظ فرمایا، مجمع پر سکوت طاری ہو گیا، آپ اپنی عادت کے مطابق مثبت انداز میں تقریر فرمارہے تھے، آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کے حوالے، اکابر و اولیاء اللہ کے واقعات اور اپنے اسلاف و اکابرؒ کی خدمات بڑے موثر انداز میں بیان فرمارہے تھے، اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے سامعین پر غیر معمولی اثر ہوا، اور پورے بمبئی میں مشہور ہو گیا کہ اگر علماء دیوبند ایسے ہوتے ہیں تو پھر ان سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ان محلوں سے تقریر کی دعوتیں آنی شروع ہو گئیں جو مخالفین علماء دیوبند کے خاص محلے کہلاتے تھے، اور پھر انتیس دن مسلسل یومیہ آپ کی تقریریں بمبئی میں ہوتی رہیں، جن میں عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے، آپ کی غیر معمولی کامیابی سے متاثر ہو کر حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ نے آپ کو ''فاتح بمبئی'' کا خطاب عطاء فرمایا تھا۔

لاہور کی تقریر کا واقعہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر دل پذیر کا دوسرا واقعہ پاکستان کا ہے، شیخ طریقت حضرت اقدس مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کردہ جامعہ مدنیہ پہلے مسلم مسجد میں تھا، مسلم مسجد مسلک کے اعتبار سے بریلوی حضرات کی ہے، لیکن جامعہ بھی اس میں کئی سال رہا، مولانا موصوفؒ درس حدیث دیا کرتے تھے، جس میں دور دور سے لوگ ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے، مولانا مرحوم نے مسلم مسجد میں قاری صاحبؒ کی تقریر کا اعلان کر دیا، بریلوی حضرات کو یہ بات ناگوار گذری مسجد ان کے زیر اہتمام تھی انہوں نے فیصلہ کیا کہ قاری صاحبؒ کی تقریر نہیں ہونے دیں گے، جلسہ درہم برہم کر دیں گے۔

بہر کیف! قاری صاحب رحمہ اللہ نے تقریر شروع فرمائی، جو جلسہ درہم برہم کرنے آئے تھے وہ ایمان افروز بیان سن کر ششدر رہ گئے، کہ یہ دھان پان سا آدمی اور بولے جارہا ہے، نہ تھکتا ہے نہ کسی کے خلاف بولتا ہے، بس قرآن و حدیث اور اکابرین کے واقعات سناتا ہے، خواہ مخواہ ہمارے لوگ (بریلوی علماء) کہتے ہیں یہ کافر ہے، ہمارے علماء سب کو برا بھلا کہتے ہیں، اور اس نے کسی کو بھی فرمایا تھا، جب آپ پہلی بار بمبئی تشریف لے گئے تو بمبئی میں مبتدعین نے قد آدم پوسٹر لگا دیئے اور عوام کو بتایا کہ نعوذ باللہ ''کفار دیوبند'' میں یہ شخص ''اکفرا لکفار'' ہے، کیونکہ دیوبند کے بڑے کفار سے اس نسبت حاصل ہے، حضرت شیخ الہندؒ کا مرید ہی حضرت تھانویؒ کا مجاز ہی حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا مخصوص شاگرد ہے، اور حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ کا پوتا ہے، اس لئے اس میں ساری کفریہ نسبتیں جمع ہیں، سنی بھائیوں کو چاہئے کہ اس کی صورت بھی نہ دیکھیں، ورنہ ایمان سلب ہونے کا خطرہ ہے۔ (مجالس حکیم الاسلامؒ صفحہ ۴۶)

عجیب اتفاق کہ یہ پوسٹر ہی اس جلسہ میں، جس میں آپ کی تقریر تھی لوگوں کی غیر معمولی حاضری کا سبب بن گیا، زیر

لساں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، کہ آخر دیکھنا تو چاہئے کہ اتنے بڑے ''کافر'' کی شکل و صورت کیسی ہے، اور وہ کیا کفریہ باتیں لوگوں کو تلقین کرتا ہے؟

پوسٹر میں دوسرے جید علماء دیوبند کو بھی جی بھر کر سب و شتم سے نوازا گیا تھا، لیکن خلاف توقع اس دن وعظ میں بہت بڑا مجمع ہوا، کہتے ہیں بمبئی کی تاریخ میں اتنا بڑا جلسہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا، تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق چالیس ہزار آدمی اس جلسہ میں موجود تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے تین گھنٹے وعظ فرمایا، مجمع پر سکوت طاری ہو گیا، آپ اپنی عادت کے مطابق مثبت انداز میں تقریر فرمارہے تھے، آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کے حوالے، اکابر اولیاء اللہ کے واقعات اور اپنے اسلاف و اکابر کی خدمات بڑے موثر انداز میں بیان فرمارہے تھے، اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے سامعین پر غیر معمولی اثر ہوا، اور پورے بمبئی میں مشہور ہو گیا کہ اگر علماء دیوبند ایسے ہوتے ہیں تو پھر ان سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ان محلوں سے تقریر کی دعوتیں آنی شروع ہو گئیں جو مخالفین علماء

دیوبند کے خاص محلے کہلاتے تھے' اور پھر انتیس دن مسلسل یومیہ آپ کی تقریر بمبئی میں ہوتی رہیں' جن میں عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے' آپ کی غیر معمولی کامیابی سے متاثر ہو کر حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ نے آپ کو ''فاتح بمبئی'' کا خطاب عطاء فرمایا تھا۔

لاہور کی تقریر کا واقعہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر دلپذیر کا دوسرا واقعہ پاکستان کا ہے' شیخ طریقت حضرت اقدس مولانا سید حامد میاں کا قائم کردہ جامعہ مدنیہ پہلے مسلم مسجد میں تھا' مسلم مسجد مسلک کے اعتبار سے بریلوی حضرات کی ہے' لیکن جامعہ بھی اس میں کئی سال رہا' مولانا موصوفؒ درس حدیث دیا کرتے تھے' جس میں دور دور سے لوگ ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے' مولانا مرحوم نے مسلم مسجد میں قاری صاحبؒ کی تقریر کا اعلان کردیا' بریلوی حضرات کو یہ بات ناگوار گذری' مسجد ان کے زیر انتظام تھی' انھوں نے فیصلہ کیا کہ قاری صاحبؒ کی تقریر نہیں ہونے دیں گے' جلسہ درہم برہم کردیں گے۔

بہرکیف! قاری صاحبؒ نے تقریر شروع فرمائی' جو جلسہ درہم برہم کرنے آئے تھے وہ ایمان افروز بیان سن کر ششدر رہ گئے' کہ دھان پان سا آدمی اور بولے جارہا ہے' نہ تھکتا ہے نہ کسی کے خلاف بولتا ہے' بس قرآن و حدیث اور اکابرین کے واقعات سناتا ہے' خواہ مخواہ ہمارے لوگ (بریلوی علماء) کہتے ہیں یہ کافر ہے' ہمارے علماء سب کو برا بھلا کہتے ہیں' اور اس نے کسی کو بھی برا نہیں کہا' اس تقریر سے بہت سے لوگوں کے عقائد درست ہوگئے تھے' جن میں ایک حاجی گام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے' جو حضرت مولانا سید حامد میں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جان کے دشمن تھے اور کہتے تھے کہ میں اس وہابی کو قتل کردوں گا' اللہ رب العزت نے ان کے دل کو صحیح سمت پھیردیا' انھوں نے بدعات سے توبہ کی' اور پھر اتنے معتقد ہوگئے کہ جامعہ مدنیہ کی موجودہ عمارت اپنی نگرانی میں تعمیر کروائی۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انداز خطابت اور اثر آفرینی کے بارے میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم فرماتے ہیں:

> ''جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطاء فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی' بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آجکل ہوا کرتے ہیں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے' نہ جوش و خروش' نہ فقرے چست کرنے کا انداز' نہ پُر تکلف لسان' نہ لہجہ اور ترنم' نہ خطیبانہ ادائیں' لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر' دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے' مضامین اونچے درجہ کے عالمانہ اور عارفانہ' لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے''۔

اس سلسلہ میں موصوف مزید فرماتے ہیں کہ:

> ''حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا' لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی' اور کتنے غلط عقائد و نظریات سے تائب ہوئے''۔ (نقوش رفتگاں' صفحہ ۱۹۳)

پاکستانی شہرت

ہمارے مؤرخین نے تاریخ کو مرتب کرتے ہوئے حقائق میں چشم پوشی سے کام لیا اسی لئے ہمارے اکثر بزرگوں کے حالات زندگی مؤرخین کے اعراض کی نذر ہوگئے ہیں' ان بزرگوں میں حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کی بابرکت شخصیت بھی ہے'

اس عنوان کے ذیل میں تاریخ کا وہ حصہ نقل کیا جارہا ہے جو اکابرین کے سینوں میں محفوظ تھا' تاریخ کے اوراق سے گم تھا' لیکن جب خطبات حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی نویں جلد شائع ہوئی تو اس میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تقریر

بھی شامل تھی جس میں موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستانی شہریت ترک کرنے اور ہندوستان کو دوبارہ اپنا وطن بنانے کے واقعے اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی تھی' اس مجلس میں دار العلوم دیوبند میں حضرات اکابرین میں سے حضرت شیخ الاسلام الامام سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ قدس اللہ اسرار ہم موجود تھے' ضروری ہے کہ اس واقعہ کو تاریخ میں اس کی قرار واقعی جگہ دی جائے۔

حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہم العالی کی زبانی واقعہ اس طرح ہے' حضرت سے میں نے بارہا سنا ہے کہ حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ سن ۱۹۵۰ میں پاکستان میں تشریف لائے تو میمن برادری کے کچھ لوگوں نے (جو اکثر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و معتقد تھے) حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو پاکستان میں روکنے کی کوششیں کیں' جس کے لئے انہوں نے سرتوڑ جدوجہد کی' حتی کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ کی ایک تقریر کے دوران انھوں نے ایک تحریری اپیل حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے نام شائع کی' اور شرکاء جلسہ اور اہلیان کراچی کے نامور لوگوں سے دستخط لینے شروع کردیئے۔

حضرت قاری صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ وہ دستخط کرانے ہمارے پاس بھی آئے' تو ہم نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ کی یہاں سے زیادہ دیوبند میں ضرورت ہے۔ ہم ان کے پاکستان میں رہنے کے مخالف ہیں' دار العلوم کی جو خدمت حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کر رہے ہیں اور جو ترقی دار العلوم کی ہو رہی ہے وہ اس سے متاثر ہوگی' اس لئے حضرت رحمہ اللہ علیہ کا پاکستان میں رہنا دار العلوم دیوبند کے لئے نقصان کا باعث ہے۔

قارئین کرام یہاں اس بات کو ذہن نشیں کرلیں کہ میمن برادری کا روکنا معتقدانہ تھا' اور قاری صاحب مدظلہ کی حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے پاکستان میں قیام کی مخالفت دار العلوم کے مفاد کی خاطر تھی' حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ میمن برادری کی اپیل پر پاکستان میں قیام پذیر ہوگئے۔

حضرت قاری صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ میں اس دوران حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گیا تو فرمانے لگے کہ ساری ساری رات سو نہیں سکتا' لیٹتا ہوں تو بدن میں سوئیاں چبھتی ہیں' چہل قدمی کرتا ہوا ساری رات گذار دیتا ہوں' اور ہر صبح ایک خط حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (مدظلہ) کو لکھتا ہوں کہ مجھے بلالیں' جب تک حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا جواب نہیں آیا یہی کیفیت رہی' جواب آنے پر سکون و اطمینان ہوا' اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنوں نے بڑی تکلیف پہنچائی۔

حضرت مدنی کی جدوجہد کا ثمرہ

حضرت الامام مدنی رحمہ اللہ' امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد قدس سرہ سے ملے اور فرمایا کہ آپ حکومت ہند سے کہیں کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستانی شہریت دیدی جائے' حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد اور مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے اثر و رسوخ سے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو دوبارہ ہندوستانی شہریت ملی۔

دیوبند واپسی پر

آپ کی دیوبند واپسی پر اکابرین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شاندار جلسہ کا اہتمام کیا' یہ جلسہ علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں ہوا' حضرت الامام مدنی رحمہ اللہ نے خطبہ استقبالیہ پیش فرمایا اور خطبہ مسنونہ کے بعد اس شعر سے خطبہ کا آغاز فرمایا ۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشاہی روی

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر شروع فرمائی تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا

"حضرت شیخ مدظلہ العالی کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں' وہ تو ہم سب کے لئے انشاء اللہ وسیلہ نجات ہیں"۔ (خطبات حکیم الاسلام' صفحہ ۲۹' جلد ۹)

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سو ۱۰۰ کتابوں کے مصنف ہیں' چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) التشبہ فی الاسلام (۲) مشاہیرات امت (۳) کلمات طیبات' (۴) اطیب الثمر فی مسئلۃ القضاء والقدر (۵) سائنس اور اسلام (۶) تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام (۷) مسئلہ زبان اردو (۸) ہندوستان میں دین وسیاست (۹) اسباب عروج و زوال اقوام (۱۰) اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام (۱۱) الاجتہاد والتقلید (۱۲) اصول دعوت اسلام (۱۳) اسلامی مساوات (۱۴) تفسیر سورۂ فیل (۱۵) فطری حکومت (۱۶) ڈاڑھی کی اسلامی حیثیت (۱۷) خاتم النبیینؐ (۱۸) شرعی پردہ (۱۹) انسانیت کا امتیاز (۲۰) شان رسالتؐ (۲۱) آفتاب نبوتؐ (۲۲) علماء دیوبند کا دینی رخ اور مزاج (۲۳) حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآنی معیار (۲۴) فلسفہ نماز (۲۵) مقامات مقدسہ (۲۶) عالم برزخ (۲۷) مقالات طیبہ (۲۸) کلمہ طیبہ (۲۹) اسلام کا نظام اخلاق وغیرہ۔

صد سالہ اجلاس

دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس بھی آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا' جو مارچ سن ۱۹۸۰ میں فضلاءِ دار العلوم کی دستار بندی کے لئے منعقد ہوا تھا' جس میں دنیا کے ہر خطہ سے علماء کرام نے شرکت کی۔

علالت و رحلت

اجلاس صد سالہ کے بعد حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی صحت دن بہ دن گرتی چلی گئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا بھی صدمہ تھا کہ ان کے اپنوں نے دار العلوم کا شیرازہ بکھیرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی' جس کے باعث حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا استعفیٰ شوریٰ دار العلوم کو سن ۱۹۸۳ میں پیش فرمادیا (جس کے بعد سے دار العلوم اسی سابقہ نہج پر چل رہا ہے) اسی صدمہ اور روحانی پریشانی کی حالت میں ۶ شوال المکرم سن ۱۴۰۳ ہجری مطابق ۱۷ جولائی سن ۱۹۸۳ بروز اتوار ۸۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا' **اناللہ واناالیہ راجعون**

وصیت کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ دار العلوم کے احاطہ میں ہوئی' اور قبرستان قاسمی میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ' شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الاسلام الامام سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ اسرارہم کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں
کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہوگئیں

خلفاء کرام

آپ کے خلفاء کی تعداد معلوم نہ ہو سکی' جن کا علم ہوا وہ یہ ہیں:

۱ حضرت قاری سراج احمد صاحب عرف بابا رحمہ اللہ' (بانی دار العلوم الاسلامیہ' لاہور)
۲ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب اشرفی مدظلہ' (مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور)
۳ مولانا اخلاق احمد صاحب عثمانی' (کراچی)

درخواست

اگر کسی کو حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کے اسمائے گرامی معلوم ہوں تو مؤدبانہ التماس ہے کہ ناشر کو مطلع فرمائیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

کتابِ خداوندی اور شخصیتِ مقدسہ ہدایت کیلئے دونوں......

قرآن پاک علوم کا جامع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ با برکات اعمال کی جامع ہے۔ جو قرآن کہتا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور آپ جو کر کے دکھلاتے ہیں وہ قرآن کہتا ہے۔۔۔ اگر ہم یوں کہہ دیں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن اُتارے۔ ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن جو ذاتِ بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ قرآن علم کا مجموعہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات عمل کا 'اخلاق کا اور کمالات کا مجموعہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

فہرست مضامین

- احوالِ واقعی ۴۳
- دین کی تاریخ کا اصول مسلم ۴۴
- تلامذۂ خدا اور اساتذۂ انسانیت ۴۴
- قانونِ ہدایت ۴۶
- کتابِ قانون کے الفاظ ومعانی کی حفاظت ۴۶
- مرادِ باری تعالیٰ صحابیٔ رسولؐ بھی نہ سمجھ پائے ۴۸
- قرآن کا اپنا عرف ۴۸
- ضرورتِ معلم ۴۹
- عنوان اور الفاظ کی حفاظت کی ضرورت ۴۹
- اُسلوبِ بیان ۵۰
- معانیٔ قرآن ۵۱
- قرآن کے معانی میں خود رائی ۵۲
- تعلیم حکمت ۵۳
- تزکیۂ قلوب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ تربیت ۵۴
- ہر عمل میں اعتدال ۵۵
- دردِ دل کا علاج ۵۶
- حضرات انبیاء علیہم السلام کا موضوع ۵۶
- اُمت کے فرائض ۵۷
- کتاب اور شخصیت دونوں ضروری ۵۸
- کیا صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہؒ معیارِ حق ہیں؟ ۵۹
- صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا کمالِ تقویٰ ۶۱
- تعلیم وتربیت کے درجات ۶۲
- نئی نسل کی تربیت کا راز ۶۳

انسانی فضیلت کا راز

"ذی شعور مخلوق، ملائکہ، جنات، حیوانات، انسان میں سے علم صرف انسان کو بخشا، باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطے سے ہوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے۔ شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیت نہیں۔ یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں، کیونکہ یہ تمام علوم اپنے اندر اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں، اور قویٰ جانداروں میں کم و بیش رکھے گئے ہیں۔ عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبیعت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا اس سے خود اس کے نفس کی مرضی و نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آسکتی ہے اور وہ ہی وحی کا علم ہے جو نبوت و رسالت کے ذریعہ آتا ہے، اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کو خصوصیت علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہیہ ہیں، علوم نبوت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں۔ اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ علوم شرعیہ ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ دار العلوم کا موضوع اور مقصد	۶۹
◆ مقدمہ و تمہید	۷۰
◆ مقصودِ تخلیق کائنات	۷۰
◆ ذی شعور اور حساس مخلوق کی چار اقسام	۷۱
◆ ہر نوع کے مستقل حقوق اور اسلام میں ان کی حفاظت	۷۱
◆ دربارِ رسالت میں اس کی چند مثالیں	۷۱
◆ حیوانات کے حقوق	۷۲
◆ جنات کے حقوق	۷۳
◆ جنات میں مختلف صفات و مذاہب	۷۳
◆ جنات کے ساتھ رشتۂ زوجیت	۷۴
◆ جنات کو وعظ و تبلیغ	۷۵
◆ حقوقِ ملائکہ	۷۵
◆ ملائکہ کی بدبو اور جھوٹ سے نفرت	۷۵
◆ انسان کے حقوق	۷۶
◆ حیوانات کی پیدائش سے متعلقہ مقاصد	۷۶
◆ حیوانات کو عقل و فہم سے محروم رکھنے کی حکمت	۷۷
◆ بے عقلی نعمت ہے	۷۷
◆ ملائکہ کو خطابِ خدا کی نوعیت	۷۸
◆ جنات کو تکلیفی خطاب کیا گیا مگر مستقل نہیں	۷۸

فہرست مضامین

- جنات میں نبوت نہ رکھنے کی وجہ ۷۹
- انسان کو مستقلاً تشریعی خطاب کیا گیا ۷۹
- علم الٰہی کے لئے انسان کا انتخاب ۷۹
- انسانیت کا جوہر علم وحی ہے ۸۰
- علم مطلق انسانیت کی خصوصیت نہیں ۸۰
- فن انجینئرئی انسان کیساتھ مخصوص نہیں ۸۱
- انسان اور علم طب ۸۱
- فن سیاست بھی حیوانات میں ہے ۸۳
- شہد کی مکھیوں میں قانون قصاص اور مکافات جرم ۸۳
- بطخوں میں سیاست اور تنظیم ۸۴
- مکڑی کی صنعت کاری ۸۵
- ضروریاتِ زندگی کا ہر فن حیوانات میں موجود ہے ۸۵
- انسانیت کا مدار ہی علوم الٰہیہ ہیں ۸۶
- طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے ۸۷
- حضرت نانوتوی کا بصیرت افروز واقعہ ۸۸
- اہل اللہ کا ذریعۂ حیات ۸۹
- علم نبوی محنت اور مجاہدات ہی سے حاصل ہوتا ہے ۹۰
- انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے بدرجہا افضل ہے ۹۱
- انسان کی عبادت پوری مزاحمت نفس ہے ۹۱
- انسان اور ملائکہ کے علم کا فرق ۹۱
- انسانی علم کی فضیلت ۹۲
- استنباط اور ارتقائے علم صرف انسانی علوم کا خاصہ ہے ۹۲
- استعداد علم کی ترقی ۹۳
- تکمیل علم و خلافت ۹۳
- اختصاص خلافت ۹۳
- مادی ترقی عناصر اربعہ کے تصادم و ٹکراؤ کا نتیجہ ہے ۹۴
- علم و جہل، حق و باطل کے تقابل کی حکمت ۹۵
- قوموں کے باہمی تقابل میں درس عبرت ۹۵
- تقابل صفات سے ترقی ۹۶
- کمال کا ظہور اور مادی و روحانی ترقی ۹۶
- قویٰ شر کا عقل پر غالب ہونے کا نتیجہ ۹۷
- شریعت کی حکمرانی ۹۷
- اسلام کے دین فطرت ہونے کے معنی ۹۸
- شریعت نے جبلی و طبعی قویٰ شر کو خیر کی طرف موڑا ۹۸
- عبادت کی حقیقت تسلیم و رضا ہے ۹۹
- بر و تقویٰ ۱۰۰
- بنیاد خلافت ۱۰۱
- خلافت انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال ۱۰۲
- بارگاہ الٰہی سے قولی و عملی جواب ۱۰۲
- انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت ۱۰۲
- احوال و کیفیات میں انسان کا تفوق ۱۰۳
- تکمیل خلافت آخرت میں ہوگی ۱۰۴
- خلافت نبوت ۱۰۵
- وراثت نبوت ۱۰۶
- انسانی ترقی ۱۰۶
- نور قلب ۱۰۷
- برکت عمل ۱۰۸
- انسانیت کی فیکٹریاں ۱۰۸
- صورت اور سیرت میں فرق ۱۰۸
- معیار کمال و قبول سیرت ہے نہ صورت ۱۰۹
- مدارس دینیہ سیرت سنوارنے کیلئے ہیں ۱۱۰
- زہد و قناعت ۱۱۰
- احسان عظیم ۱۱۱
- خاتمہ ۱۱۱

معجزۂ علمی

ہر فن کے اندر اہلِ علم اور اہلِ کمال پیدا ہوئے اور ان کے ذریعہ سے علماء کے کمالات ظاہر ہوئے 'وہ علوم لا کے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آ گئیں' یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ مسلمانوں میں اس نے اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہوں گے۔ اُمت کی طاقت ختم ہو جائے گی 'اس کی طرف لوٹیں گے' تبھی جا کر امت کی شوکت بازیاب ہو گی 'ان کی قوت بازیاب ہو گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- تمہید ۱۱۳
- کلام کی عظمت کا معیار ۱۱۴
- عورتوں کا کلام بے وقعت ہونے کی وجہ ۱۱۵
- کلام کے اندر حقیقتِ متکلم جلوہ گر ہوتی ہے ۱۱۶
- سیرت سازی کی ضرورت ۱۱۶
- صورت قابلِ التفات کیوں نہیں؟ ۱۱۷
- سیرت باقی اور صورت فانی ہے ۱۱۸
- کلام اللہ کی عظمتِ شان ۱۱۸
- معجزہ کی حقیقت ۱۱۹
- کلامِ خداوندی صرف قرآن پاک ہے دوسری کوئی کتاب نہیں ۱۲۲
- قرآن کریم کتابِ خداوندی بھی ہے ۱۲۲
- ایک عجیب نمونۂ قرآن ۱۲۳
- کلماتِ قرآن کی طرح مرادِ ربانی بھی من جانب اللہ متعین ہے ۱۲۳
- لغتِ عرب سے درجۂ کمال واقفیت کے باوجود مرادِ ربانی از خود متعین ۱۲۴
- محض لغت جاننے سے کسی زبان پر عبور حاصل نہیں ہو سکتا ۱۲۵
- واقعہ نمبر ۲ ۱۲۶
- مرادِ ربانی کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے ۱۲۷
- جناب نبی کریم ﷺ سے متعلقہ فرائض ۱۲۷
- حدیث قرآن ہی کا بیان ہے ۱۲۸
- قرآن کا قرآن ہونا حدیث کے اوپر موقوف ہے ۱۲۸
- حجیتِ فقہ ۱۳۰
- کلامِ خداوندی انمٹ یوں ہے؟ ۱۳۱
- سابقہ کتب کیوں مٹ گئیں اور قرآن کیوں مٹنے والا نہیں ۱۳۲
- سندِ قرآن کی صحت ۱۳۳
- سندِ قرآن پر اعتراضات کے جوابات ۱۳۴
- پیغام رسانی میں جھوٹ اہلِ کفر بھی عیب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ اہلِ ایمان؟ ۱۳۵
- کلام اللہ کو تین امانتوں نے گھیرا ہوا ہے ۱۳۶
- سندِ کلام اللہ میں ذاتِ نبوت کا مقام ۱۳۶
- سندِ قرآن پر قانوناً بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ۱۳۸
- حدیث از روئے قرآن محفوظ ہے ۱۳۸
- قرآن دلیلِ ختمِ نبوت بھی ہے ۱۴۰
- حجت و برہان سے مسلمانوں میں اختلاف ڈالنا ممکن نہیں ۱۴۱
- حضرت نانوتویؒ کے حفظِ قرآن کا واقعہ ۱۴۱
- حضرت مدنیؒ کے حفظِ قرآن کا واقعہ ۱۴۲
- قرآن بے اعتنائی سے جاتا رہتا ہے ۱۴۲
- کثرتِ تصنیف امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے ۱۴۲
- قرآن کو چھوڑنے کا نتیجہ اعجازی قوت سے محرومی ۱۴۳
- قرآن کریم کی حفاظت کی صورتیں ۱۴۳
- قرآن سے غیر مسلم بھی متاثر ہوئے ہیں ۱۴۴
- محافظینِ قرآن خلفائے خداوندی ہیں ۱۴۵
- محافظینِ قرآن کے سرکاری القاب اور انکی عظمت ۱۴۵
- دین و دنیا کی ترقی کا داعی "قرآن کریم" ۱۴۷
- اختتام ۱۴۸

راہنمائے اِنقلاب

صحابہ کرامؓ نے حضور اقدس ﷺ سے بلاواسطہ قرآن اَخذ کیا' دل بدل گئے' روح بدل گئی' جذبات بدل گئے۔ پھر جہاں بھی یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا۔ قیصرو کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے۔ خیر تخت اُلٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کر لیا۔ قیصر کا ملک فتح ہو گیا' رومی ماتحت بن گئے' کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا' ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی گئے' ملک بدل دیا' تہذیب بدل دی' مذہب بدل دیا' زبان بدل دی۔ ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ آج آپ ''ممالک عربیہ'' کہتے ہیں مصر کو' شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور بولی بولی جاتی تھی عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ مصر قبطیوں کا ملک تھا اسمیں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہؓ کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے' مذہب بھی بدل دیا' زبان بھی بدل دی' مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہو گئی' تمدن تک بدل دیا' تہذیب تک بدل دی تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہؓ میں کہاں سے آئی؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی۔ صحابہؓ اسی کو لیکر کھڑے ہوئے' اسی کو دستورُ العمل بنایا تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ احوالِ واقعی	۱۵۰	◆ قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب	۱۵۸
◆ کلامِ آثارِ متکلم کو نمایاں کرنیکا ذریعہ ہے	۱۵۰	◆ انقلاب عظیم	۱۵۹
◆ مقصودِ عبادات	۱۵۰	◆ صحابہ کرام کے انقلاب کا نقشہ	۱۶۰
◆ تلاوت' اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ	۱۵۱	◆ انقلاب شر	۱۶۰
◆ دستورِ حیات	۱۵۱	◆ جنات میں انقلاب	۱۶۱
◆ الفاظِ قرآن' کمالات خداوندی کے مظہر	۱۵۱	◆ صحابہ میں قرآن کریم کے انقلاب کی ایک جھلک	۱۶۲
◆ اللہ کی رسی اور اس کو تھامنے کا طریق کار	۱۵۲	◆ انقلاب عظیم کا سرچشمہ	۱۶۲
◆ عظمت و محبت کا تقاضا	۱۵۳	◆ صحیح انقلاب کی تمنا میں اُلٹی زقند	۱۶۳
◆ قیامت میں اوصاف کے لحاظ سے جماعت بندی	۱۵۴	◆ کتاب انقلاب کا طرزِ تعلیم	۱۶۳
◆ اہل علم کا اُخروی مقام	۱۵۵	◆ کتاب انقلاب کا طرزِ تربیت	۱۶۴
◆ تجلیات قرآن کریم کے ظہور کی ترتیب	۱۵۵	◆ حضور اکرم کا طرزِ تعلیم اور حکمتِ عملی	۱۶۴
◆ قرآن کریم' کتابِ انقلاب	۱۵۵	◆ تبریک و دعا	۱۶۵
◆ عورتوں میں انقلاب	۱۵۷		

علمی معجزہ

انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دیئے گئے تھے — اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ علمی معجزہ بھی دیا گیا۔ عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے مگر اس کا علم باقی رہتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات آپ کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے لیکن "علمی معجزہ" قرآن کریم موجود ہے جو آج تک باقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- معجزہ دلیل نبوت ہے ۱۶۷
- آپ ﷺ کے عملی معجزات کا تفوق ۱۶۹
- سب سے بڑا معجزہ ۱۷۰
- حقیقت معجزہ ۱۷۱
- کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی ۱۷۱
- انسانی صفات کی حد اعجاز ۱۷۲
- اعجاز کلام ۱۷۳
- معرفت اوصاف متکلم ۱۷۴
- متکلم حقیقی ۱۷۵
- قرآن کریم کی اعجاز نمائی ۱۷۶
- شرائع ظلیہ ۱۷۷
- امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ۱۷۷
- رعایت مقام ۱۷۸
- شان عمل اور شان اجتہاد ۱۷۹
- شرط معرفت ۱۸۰
- سلب توفیق ۱۸۱
- مشتبہ چندے سے احتراز ۱۸۲
- شان اتقیاء ۱۸۳
- کمال دانشمندی ۱۸۳
- عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثلت ۱۸۴
- علمی معجزے کا امتیاز ۱۸۴
- دوام کتاب دوام نبوت کو مستلزم ہے ۱۸۵
- معارضۂ قرآن کا عذاب ۱۸۵
- افتراق امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ ۱۸۶
- علوم القرآن ۱۸۷
- کتاب مبین کا خاصہ ۱۸۷
- اصلاحی نصاب ۱۸۸
- مرکز علوم ۱۸۸
- تبریک ۱۸۹

معارف القرآن

قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں‘ ایک معانی ہیں‘ جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں‘ حقائق کے تحت معارف ہیں‘ اور معارف میں کیفیات ہیں‘ جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں ـــــ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ و معانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں‘ بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت وتزکیہ بھی ہے‘ جو الفاظ و معانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق و معارف کے ادراک کے قابل بھی ہوں‘ اوران معارف کی کیفیات کا محل بھی بن سکیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ‘

فہرست مضامین

◆ خیر کی دو بنیادیں ۔۔۔۔۔ ۱۹۱
◆ بنیادوں سے خیر ۔۔۔۔۔ ۱۹۲
◆ مشیت الٰہی بندہ کے تابع ۔۔۔۔۔ ۱۹۲
◆ خیر عمل ۔۔۔۔۔ ۱۹۳
◆ حفاظت قرآن کریم ۔۔۔۔۔ ۱۹۴
◆ قرآن اور بیان قرآن ۔۔۔۔۔ ۱۹۵
◆ مراد قرآنی اور لغت ۔۔۔۔۔ ۱۹۶
◆ مقاصد بعثت نبی کریم ﷺ ۔۔۔۔۔ ۱۹۶
◆ اُسوۂ حسنہ کی ضرورت ۔۔۔۔۔ ۱۹۷
◆ قرآن کے ساتھ اجتماع خیر ۔۔۔۔۔ ۱۹۹
◆ کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی ۔۔۔۔۔ ۱۹۹
◆ باطن قرآن جنت ہے ۔۔۔۔۔ ۲۰۰
◆ تورات اور میدان حشر ۔۔۔۔۔ ۲۰۱
◆ قرآن کریم اور میدانِ حشر ۔۔۔۔۔ ۲۰۲
◆ اہل قرآن کے احوال ۔۔۔۔۔ ۲۰۳
◆ برکات قرآن حکیم ۔۔۔۔۔ ۲۰۴
◆ مسرت کا موقع ۔۔۔۔۔ ۲۰۶
◆ خوشی کا دوسرا موقع ۔۔۔۔۔ ۲۰۶
◆ علامات ولایت ۔۔۔۔۔ ۲۰۷
◆ تقریب مسرت ۔۔۔۔۔ ۲۰۸

عظمتِ حفظ

میدانِ محشر میں آدم علیہ السلام کی ساری اولاد جمع ہو گی اول سے لے کر آخر تک اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے' جلسہ ہوگا اور صدر حق تعالیٰ شانہ ہوں گے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہو گا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے قرآن حفظ کرایا تھا' اس کی تاج پوشی کی جائے گی۔

تو اولین و آخرین جمع' تاج پہنانے والے حق تعالیٰ اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کونسا موقعہ ہو گا؟

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ ظلمت کدہ میں روشن چراغ ۲۰۹
◆ سرچشمۂ حیات ۲۱۰
◆ سُپر طاقتوں کی شکست کی بنیادی وجہ ۲۱۱
◆ حافظ قرآن کا باطل سے تحفظ ۲۱۱
◆ حافظ قرآن کی حیات دائمی ہے ۲۱۲
◆ حافظ قرآن کے والد کی تاج پوشی ۲۱۳
◆ قرآن حکیم کی ابدی حکومت ۲۱۳
◆ قرآن کریم کے ابدی آثار کی وجہ ۲۱۴
◆ حافظِ قرآن کا حق شفاعت ۲۱۴
◆ ابدی سر بُلندی ۲۱۵
◆ عظمتِ قرآن کریم ۲۱۵
◆ نگاہِ محبت ۲۱۵
◆ برکت سے بڑھ کر برکت ۲۱۶

قرآن معدنِ حیات ہے

فہرست مضامین

- قرآن روح خداوندی ہے ۲۱۷
- قوم مسلم کا حال ۲۱۹
- خیر امت کون ہے ۲۱۹
- قرآن بہترین مصلح ہے ۲۲۰
- خالد بن ولید کی بہادری ۲۲۰
- ہر جگہ قوت ایمانی کارگر ہے ۲۲۱
- عربی زبان ثقیل نہیں ہے ۲۲۲
- دوسری زبانیں ثقیل ہیں ۲۲۲
- قرآن کے الفاظ و معانی منزل من اللہ ہیں ۲۲۳
- حافظ قرآن کو تشبہ حاصل ہے نبی کریمؐ سے ۲۲۴
- دین کے ہر شعبہ کو مستقل ایک طبقے نے سنبھالا ہے ۲۲۴
- حفاظت قرآن پر بیان اسناد ۲۲۵
- اصل میں حافظ حق تعالیٰ کی ذات گرامی ہے ۲۲۶
- حق اور باطل جمع نہیں ہو سکتے ۲۲۸
- حافظ قرآن کبھی نہیں مرتا ۲۲۸
- محشر میں حافظ قرآن کے باپ کی تاج پوشی ہوگی ۲۲۹
- حافظ قرآن اور جنت کے درجات ۲۳۰
- ہمارے کلام کو فضا حاوی اور اللہ کا کلام فضا کو حاوی ۲۳۰
- حافظ قرآن کو شفاعت کا حق دیا جائے گا ۲۳۱
- حافظ قرآن کے والدین ہمیشہ سربلند رہتے ہیں ۲۳۱
- دیگر مختلف ۲۳۱

خلافتِ تجوید

یہ الفاظ اور لب ولہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قراء اور مجودین نے اسی لب ولہجے کی حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق آئے۔ مگر لے وہی اختیار کرتے ہیں جو اوپر سے چلی آرہی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- جوہر دنیا ۲۳۳
- امتیازی عطیہ ۲۳۴
- امتیاز مسلم ۲۳۴
- امتیازی کتاب ۲۳۴
- صوت سرمدی ۲۳۵
- عظمت کلام ۲۳۵
- خلافت تجوید قرأت ۲۳۶
- امتیازی حفاظت ۲۳۷
- حفاظت بطریق حفظ ۲۳۸
- حفاظت بطریق کتابت ۲۳۹
- حفاظت بطریق تواتر ۲۳۹
- محیط بالدیانت کتاب ۲۳۹
- سند پر از روئے قرآن بحث ۲۴۰
- عظیم شہادت ۲۴۲
- عظمت سند ۲۴۳
- تواتر طبقہ ۲۴۳
- ہمہ گیر ابدی حفاظت ۲۴۴
- تغنی بالقرآن ۲۴۵
- تبریک ۲۴۶

جنت کی رسی کو مضبوط پکڑو

فہرست مضامین

- قرآن کریم اللہ کا ترجمان ہے ۲۴۷
- دنیا کی ہر چیز اللہ کے ظاہر سے متعلق ہے ۲۴۷
- رب العالمین سے تعلق کس کا ہوگا ۲۴۸
- علم کا مخزن قلب (دل) ہے ۲۴۸
- اللہ کی صفت الظاہر اور الباطن بھی ہے ۲۴۹
- کلام ہنر اور عیب کو ظاہر کرتا ہے ۲۴۹
- کلام الٰہی کو پڑھیں گے تو صفات الٰہی کا عکس ہم پر پڑے گا۔ ۲۴۹
- آسمان دنیا سے ساتویں زمین تک جہنم کا علاقہ ہے ۲۵۰
- رسی کو پکڑ کر جنت میں چلے جاؤ ۲۵۰
- رسی چھوڑنے یا بے اتفاقی سے جہنم میں رہ جاؤ گے ۲۵۰
- آسمان دنیا کے نیچے سانپ اور عذاب پہنچانے والے حشرات الارض موجود ہیں ۲۵۱
- قرآن کریم ہم کو جہنم سے نکالتا ہے اور اللہ کے باطن سے ملاتا ہے۔ ۲۵۱
- کلام الٰہی خیر ہی خیر ہے۔ ۲۵۱
- قرآن کریم کا شغل رکھنے والا سب سے افضل ہے۔ ۲۵۱
- الفاظ قرآن کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ۲۵۲
- قرآن کلام اللہ کیوں ہے ۲۵۲
- اللہ کے کلام اور بندوں کے کلام میں فرق ۲۵۳
- کلام اللہ پڑھنے والا مامون و محفوظ ہے ۲۵۳
- درس و تدریس امت محمدیہ کا امتیاز ہے ۲۵۴
- حافظ قرآن کے ماں باپ کی تاج پوشی ۲۵۴
- تمام امتوں میں امت محمدیہ کا مقام ۲۵۵
- قرآن کی جتنی آیات ہیں اتنے ہی جنت کے مراتب ہیں ۲۵۵
- مسلمان نے جنت کو اپنے اندر داخل کر لیا ۲۵۵
- دنیا میں جنت کی شکل آیات قرآنیہ ہیں ۲۵۶
- آیات قرآنیہ دل کے اندر علم اور ظاہر میں عمل کی شکل ہیں ۲۵۶
- یہ ساری خوشیاں قرآن پر عمل کرنے میں ہیں ۲۵۷
- قرآن میں جس طرح علم و حقائق ہیں اسی طرح آخرت کی لذتیں بھی ہیں ۲۵۷
- اجتماع خیر ۲۵۷
- مبارک باد اور خوش نصیبی ۲۵۸
- خوشی کے دو مواقع ۲۵۸
- موت پر بھی خوشی ہوتی ہے ۲۵۸
- موت پر جشن نہیں مناسکتے ۲۵۹
- یہ خوشی سب کے لئے ہے ۲۵۹
- ثواب کی حرص ۲۵۹
- دعا ۲۶۰

تفسیر سورۂ ملک

فہرست مضامین

- دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا ظہور ہے ۲۶۱
- دوپہر بارہ بجے سونے سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے ۲۶۲
- دن و رات کی تقسیم ۲۶۳
- آخری تہائی رات میں اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر اترتے ہیں، انکا اترنا کیسا ہوتا ہے؟ ۲۶۳
- اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر اتر کر سوال کرتے ہیں ۲۶۴
- اللہ تعالیٰ حکیم ہیں حکمت کے مطابق عطا فرماتے ہیں ۲۶۴
- دعا میں قیدیں نہیں لگانی چاہئیں ۲۶۷
- دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا ۲۶۸
- روزہ کی ایک عظیم برکت اور فضیلت ۲۶۸
- مظلوم کی بددعا سے بچنا چاہئے ۲۶۹
- اس سورت میں ملوکیت کے تمام لوازمات ظاہر کئے گئے ہیں ۲۶۹
- اسلام میں ملوکیت کے بجائے خلافت رکھی گئی ہے ۲۷۰
- نظامِ بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف ۲۷۰
- دوسری چیز ہے بادشاہت کے لوازمات ۲۷۰
- تیسری چیز ہے ان لوازم کے آثار ۲۷۰
- بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تکمیلی ہے اور دوسرا تکوینی ۲۷۱
- بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز لیاقت اور قابلیت کا ہونا ہے ۲۷۱
- بادشاہ کی قابلیت اور کمال یہ ہے کہ وہ مجسم خیر ہونا چاہئے ۲۷۲
- قیصر جرمنی کی تقریر کے چند جملے ۲۷۲
- سلیمان بن عبدالملک اموی بادشاہ کا شوق ۲۷۲
- خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مشغلہ ۲۷۳
- برکت کسے کہتے ہیں؟ ۲۷۴
- اللہ کی ذات چونکہ برکتوں سے بھرپور ہے اس لئے بادشاہت کے لائق وہی ہے ۲۷۵
- بادشاہ کے لئے دوسری ضروری چیز ملک پر اس کا قبضہ ہونا ہے ۲۷۶
- شاہ جہاں کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ ۲۷۶
- بادشاہ کیلئے تیسری چیز اقتدار حاصل ہونا ۲۷۷
- سورہ ملک کا نام مانعہ اور منجیہ بھی ہے ۲۷۸
- ملک کے اندر پھیلاؤ اور وسعت داخل ہے ۲۷۸
- دنیا کسے کہتے ہیں؟ ۲۷۸
- اللہ کی قدرت کا کمال ۲۷۸
- انسان کی تخلیق مرحلہ وار اور تین اندھیریوں میں ہوئی ہے ۲۷۹
- کائنات میں دنیا سب سے کم تر عالم ہے اس سے اوپر بڑے بڑے عالم ہیں ۲۷۹
- اس سورۃ کا نام ملک کیوں رکھا گیا؟ ۲۸۰
- نظامِ عالم میں بے برکتی کیوں ہوتی ہے؟ ۲۸۱
- حضرت عمرؓ کا تنہائی میں اپنے آپ کو خطاب کرنا ۲۸۲
- حضرت ابوبکرؓ کے تزکیہ قلب کا عالم ۲۸۲
- حضرت علیؓ کا اپنی قمیص کاٹنا ۲۸۳

- حضرت علیؓ نے ایک دفعہ مال و دولت کو دیکھ کر فرمایا ۲۸۳
- بادشاہ کون ہونا چاہئے؟ ۲۸۴
- اولاد کے بارے میں عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۲۸۴
- بادشاہ میں سخاوت وعدل کے ساتھ تدبر اور شجاعت بھی ہونی چاہئے ۲۸۴
- اللہ کی قدرت کا عالم ۲۸۵
- زندگی اور موت کا مطلب؟ ۲۸۵
- موت کسے کہتے ہیں؟ ۲۸۶
- زندگی کسے کہتے ہیں؟ ۲۸۶
- موت وحیات کیوں پیدا کی گئیں؟ ۲۸۷
- تمام انسانوں کو ایک دم ہی زندگی اور موت کیوں نہیں دی جاتی؟ ۲۸۸
- اللہ تعالیٰ موت وحیات پر کیوں قادر ہیں؟ ۲۸۸
- بادشاہ کیلئے محبوب القلوب ہونا ضروری ۲۸۹
- اللہ تعالیٰ جلالی محض نہیں ہیں ۲۸۹
- اللہ کی محبت کی مثال ۲۸۹
- لوازم بادشاہت ۲۹۱
- اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ملک کے اظہار کے لئے تمام لوازم سلطنت قائم کئے ۲۹۲
- سات آسمان بمنزلِ سات پناہوں کے ہیں ۲۹۲
- آسمان کہاں ہے؟ ۲۹۲
- زمین سے آسمان تک کی مسافت پانچ سو برس ہے ۲۹۲
- انسان چاند پر جا سکتا ہے ۲۹۳
- ستارے اپنی کشش سے قائم نہیں بلکہ انہیں ملائکہ نے تھام رکھا ہے ۲۹۳
- ساتوں آسمانوں کے اوپر بطور حفاظتی خندق کے ایک عظیم الشان سمندر ہے ۲۹۳
- عرشِ الٰہی سمندر کے اوپر ہے ۲۹۴
- اللہ کے مہمانوں کے لئے جو گیسٹ ہاؤس ہے اس کا نام جنت ہے ۲۹۴
- کل جنتیں سو ہیں ۲۹۵
- سرکاری مہمان سرکاری مہمان خانے میں کب پہنچیں گے؟ ۲۹۵
- اہلِ جنت کی تین دن خاص مہمانی ہوگی ۲۹۵
- زمین کی روٹی کیسے بنائی جائے گی؟ ۲۹۵
- سالن مچھلی کا کیوں ہوگا؟ ۲۹۶
- زمین کی روٹی کیوں بنائی جائے گی؟ ۲۹۶
- اہلِ جنت کی ابتداءً روٹی سالن سے کیوں خاطر کی جائے گی؟ ۲۹۷
- دنیا میں جو لذتیں چھڑوائی گئی تھیں وہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جانے کے لئے چھڑوائی گئی تھیں ۲۹۷
- ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو جنت ملے گی وہ دس دنیاؤں کے برابر ہوگی ۲۹۷
- جنت میں جنتی ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا ۲۹۸
- جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے ویسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے اور سرکاری جیل خانہ کا نام جہنم ہے ۲۹۸
- جنت میں زیارتِ خداوندی کے درجات ۲۹۸
- حضرت جبرائیل علیہ السلام کی جسامت ۲۹۹
- اللہ کی کرسی کی وسعت ۲۹۹
- جمعہ کا دن دربار خداوندی کا دن ہوگا ۲۹۹
- ہر شخص اپنی جگہ اپنی طبعی کشش سے پہچان لے گا ۳۰۰
- دربار منعقد ہونے کے بعد تجلیات کا ظہور ہوگا ۳۰۰
- تجلیات کے ظہور کے بعد جنتیوں کو

- مشروب پلایا جائے گا ۳۰۰
- اس موقعہ پر داؤد علیہ السلام اہلِ جنت کو مناجات سنائیں گے ۳۰۱
- اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس کا جو جی چاہئے مانگے ۳۰۱
- مولویوں کی محتاجگی جنت میں بھی ہو گی ۳۰۱
- جنتی جنت میں دیدارِ خداوندی مانگیں ۳۰۲
- دیدارِ خداوندی کے سامنے ہر نعمت ہیچ ہو گی ۳۰۲
- جنت میں روشنی عرشِ عظیم کی ہو گی ۳۰۳
- ساتوں آسمانوں کی مضبوطی ۳۰۳
- ساتوں آسمان مختلف دھاتوں کے ہیں ۳۰۳
- اللہ تعالیٰ کی فوج ملائکہ ہیں ۳۰۴
- حضرت جبرائیل علیہ السلام کی دو صفتیں ۳۰۴
- جیسے اللہ تعالیٰ پاک ہیں ویسے ہی انکی فوج پاک ہے ۳۰۵
- کرسی درحقیقت عرشِ الٰہی کا پائیدان ہے ۳۰۵
- عرش سے تدبیراتِ الٰہیہ جاری ہوتی ہیں ۳۰۵
- سورج جب نکلتا ہے تو عرش کے سامنے سجدہ ریز ہو کر چلنے کی اجازت ۳۰۶
- بادشاہ کے لئے تاج ہوتا ہے لیکن وہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب نہیں ۳۰۶
- اللہ تعالیٰ کے تاج کی مثال ۳۰۶
- الرحمٰن علی العرش استویٰ فرمایا، دیگر صفات ذکر نہیں کیں ۳۰۶
- غضبناک بادشاہ ملک کو زیادہ دیر نہیں چلا سکتا ۳۰۷
- آسمانوں کو ستاروں سے مزین کیوں کیا گیا؟ ۳۰۷
- چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے مستفاد ہے ۳۰۸
- جتنی بڑی سلطنت اتنے ہی بڑے اسکے دشمن ۳۰۸
- اللہ تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا فرمائی ۳۰۸
- اپوزیشن پارٹی کا فائدہ ۳۰۸
- مخالف پارٹی کا وجود فطری چیز ہے ۳۰۸
- ستاروں سے دو کام لئے جاتے ہیں ۳۰۹
- اپوزیشن پارٹی دنیا میں ختم نہیں کی جائے گی ۳۰۹
- جہنم جو سرکاری جیل خانہ ہے اس کی کیفیت کیا ہو گی؟ ۳۰۹
- جہنم کے محافظ جہنمیوں سے سوال کریں گے ۳۱۰
- جہنمی جواب دیں گے ۳۱۰
- حق ماننے کی دو صورتیں ہیں ۳۱۰
- جہنمی اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے ۳۱۰
- آخرت میں ہر ایک مومن بن جائیگا ۳۱۱
- یہ تو نہ ماننے والوں کا حشر ہوا ماننے والوں کا کیا بنے گا؟ ۳۱۱
- ایک قاعدہ کلیہ ۳۱۱
- اللہ کی ذات منبع انکشاف ہے ۳۱۲
- ملک اور ملکوت میں فرق ۳۱۲
- ملک کے تین علاقے قرار دیئے گئے ۳۱۳
- دنیا میں کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں ۳۱۳
- دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں ۳۱۳
- اللہ کا خلیفۂ اعظم ۳۱۳
- نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چار وزیر ہیں دو آسمان میں دو زمین میں ۳۱۴
- پہلے رکوع میں عالم سمٰوٰت کا ذکر ہے ۳۱۴
- دوسرے رکوع میں زمین کا ذکر ہے ۳۱۴
- زمین میں ہر چیز کے خزانے رکھ دیئے گئے ہیں ۳۱۵
- زمین کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے ۳۱۵
- انسانی ایجاد کی حقیقت ۳۱۵
- ایجاد کا حاصل ترکیب و تحلیل ہے ۳۱۶

♦ سیر و سفر کا حاصل	۳۱۷
♦ سب کچھ کرو مگر ہمیں مت بھولو	۳۱۷
♦ بد فطرت اور سلیم الفطرت انسان	۳۱۷
♦ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ نعمتیں انسان کو عطا کیں	۳۱۷
♦ ہر جاندار کی غذا متعین ہے اور انسان کے لئے ہر چیز وقف ہے	۳۱۸
♦ سب چیزیں تمہارے لئے ہیں استعمال کرو مگر اصول کے تحت	۳۱۸
♦ اللہ کو یاد کرنے کے دو معنی ہیں	۳۱۹
♦ ہر چیز کو اصول شرعیہ کے مطابق استعمال کرنا بھی ذکر اللہ میں داخل ہے	۳۱۹
♦ مؤذن کی اذان محض اعلان نہیں ہے	۳۲۰
♦ اللہ کے حضور میں ہر شخص تنہا جائے گا	۳۲۱
♦ ایک شبہ کا حل	۳۲۱
♦ نمرود کی سرکشی اور اس کا انجام	۳۲۲
♦ موت کے ہزاروں اسباب ہیں	۳۲۲
♦ موت سے کسی طرح نہیں بچا جا سکتا	۳۲۳
♦ آخرت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے	۳۲۴
♦ بچے کی مثال	۳۲۴
♦ ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کے ماننے کو	۳۲۵
♦ حدیث قدسی	۳۲۵
♦ سات قسم کے لوگ قیامت کے دن عرش الٰہی کے سائے میں ہونگے	۳۲۶
♦ قیامت کے دن ایک ایک ذرے کا حساب دینا پڑے گا	۳۲۶
♦ نعیم کی تفسیر	۳۲۶
♦ سونے سے پہلے مراقبہ	۳۲۷
♦ قبل از موت محاسبہ میں سہولت ہے	۳۲۷
♦ مسلمان کی حقیقت متفکر ہونا ہے	۳۲۸
♦ حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں	۳۲۹
♦ انسان میں یہ روگ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے	۳۳۰
♦ طبیعت کا خالق طبیعت کو اس کے خلاف بھی چلا سکتا ہے	۳۳۰
♦ عقلی شبہہ کے دو جواب دیئے گئے	۳۳۰
♦ اللہ کے فضل اور نبی کریم ﷺ کی رحمت کے طفیل یہ امت عام عذابوں میں مبتلا نہیں کی گئی	۳۳۰
♦ قرآن مجید کی توہین کا عبرت انگیز واقعہ، ایک عورت کی شکل خنزیر کی شکل سے بدل دی گئی	۳۳۲
♦ قرآن کریم میں گزشتہ امتوں کے واقعات محض قصہ و کہانی کے لئے بیان نہیں	۳۳۳
♦ سوال کا جواب	۳۳۳
♦ اعتراض کا جواب	۳۳۳
♦ شبہہ کا دفعیہ	۳۳۴
♦ عقل کے پرستاروں سے سوال	۳۳۵
♦ کفار عبرت حاصل کرنے کے بجائے لڑنے کو مقصد بنائے ہوئے ہیں	۳۳۵
♦ اگر اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی چیزیں چھین لیں تو کیا حشر ہوگا؟	۳۳۶
♦ کفر کی مثال	۳۳۷
♦ انسان خود اپنی ذات میں غور کرے	۳۳۸
♦ بعض عقل کے اندھے قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھ کر مقابلہ کی ٹھانتے ہیں	۳۳۸
♦ انسانی دل ایک عجیب کائنات ہے	۳۳۹
♦ آنکھ، ناک، کان وغیرہ آلات ہیں اور ادراک کرنا دل کا کام ہے	۳۴۰
♦ ایک واقعہ	۳۴۰
♦ دل اشیاء کا صرف ادراک ہی نہیں کرتا انہیں اپنے اندر محفوظ بھی کر لیتا ہے	۳۴۰

- ♦ دل نے پانچ دروازے حواس ظاہرہ کے رکھے اور پانچ دروازے حواس باطنہ کے ۳۴۱
- ♦ حلال وحرام کی تمیز علم غیب (وحی) سے ہوتی ہے ۳۴۲
- ♦ محض صورتوں کو دیکھنا کمال نہیں ان میں امتیاز کرنا کمال ہے ۳۴۲
- ♦ سائنس اور فلسفہ علم نہیں حس ہے ۳۴۲
- ♦ علم کسے کہتے ہیں؟ ۳۴۳
- ♦ سارے بیان کا حاصل ۳۴۴
- ♦ قیامت کے سوال کا منشاء دو چیزیں ہو سکتی ہیں ۳۴۵
- ♦ فلاسفہ یونان بھی دہریوں کی طرح قیامت کے منکر ہیں ۳۴۶
- ♦ فلاسفۂ ہند بھی قیامت کے منکر ہیں ۳۴۶
- ♦ قیامتیں تین ہیں، شخصی، قرنی اور کلی ۳۴۷
- ♦ ہر صدی کے شروع میں مجدد آنے کی حکمت؟ ۳۴۷
- ♦ عالم دنیا اللہ تعالیٰ کی صفات کے ظہور کے لئے بنایا گیا ہے ۳۴۸
- ♦ اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت کے ظہور کے لئے قیامت کا آنا ضروری ہے ۳۴۸
- ♦ عالم دنیا کے ہر ہر جزء پر موت طاری ہوتی ہے ۳۴۸
- ♦ قیامت کا انکار کرنا خود اپنے آپ کو جھٹلانا ہے ۳۴۹
- ♦ قیامت کا مقصد؟ ۳۴۹
- ♦ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قیامت آنی چاہئے ۳۵۰
- ♦ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۳۵۱
- ♦ دنیا میں سب چیزیں خلط ملط ہیں آخرت میں سب کو الگ الگ کردیا جائے گا ۳۵۲
- ♦ قیامت تخریب کا نام نہیں تعمیر کا نام ہے ۳۵۲
- ♦ دین اسلام دین فطرت ہے ۳۵۴
- ♦ قیامت کی تاریخ کا علم نہ ہونا ہی مصلحت ہے ۳۵۴
- ♦ انسان کو اس کے مرنے کی تاریخ کا علم نہ دینے میں بھی بڑی مصلحت ہے ۳۵۴
- ♦ جہاں جتنا رہنا ہے اتنا ہی سامان اس کے لئے کرنا چاہئے ۳۵۵
- ♦ قیامت پل بھر میں قائم ہو جائے گی ۳۵۶
- ♦ صور کی کیفیت ۳۵۶
- ♦ صور بتدریج پھونکا جائے گا ۳۵۷
- ♦ موت سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے ۳۵۷
- ♦ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے بارے میں سوال ۳۵۷
- ♦ مومن وکافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی صورت ۳۵۸
- ♦ موت کے آسان ہونے کی صورت ۳۵۹
- ♦ مصیبت کے سہل اور آسان ہونے کی مثال ۳۵۹
- ♦ مومن کی روح قبض کرتے وقت فرشتے جنت کے تحائف لیکر آتے ہیں ۳۵۹
- ♦ انبیاء کرام اپنی روحانی قوت سے وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے ۳۶۰
- ♦ موسیٰ علیہ السلام سے موت کی کیفیت کے بارے میں سوال ۳۶۰
- ♦ حضرت عمر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ۳۶۱
- ♦ قوت ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کر دیتی ہے ۳۶۱
- ♦ سکون وچین آنے کا ایک ہی راستہ ہے ۳۶۳
- ♦ جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں ۳۶۳

حدیث رسول کا قرآنی معیار

فہرست مضامین

◆ آخری دین ۳۶۵
◆ حفاظت دین کی صورتیں ۳۶۶
◆ ہر صدی کے شروع میں مجدد کی آمد ۳۶۶
◆ دین کی معیاری جماعتیں ۳۶۷
◆ دین کی نافعیت تمام قرون میں ۳۶۸
◆ دین کی دو اصلیں ۳۶۹
◆ رسول نورِ مطلق اور ظلمت محض میں واسطۂ وصول ہے ۳۷۱
◆ فہم حدیث کے بغیر فہم قرآن ممکن نہیں ۳۷۲
◆ قرآن کریم کے نزول اور شرح وبیان کی ذمہ داری ۳۷۵
◆ مطالب قرآنی پر کوئی حاکم نہیں ۳۷۶
◆ حدیث نبوی قرآن کا بیان ہے ۳۷۷
◆ کتاب و سنت کا مابینی ربط اور اس کا فہم ۳۷۸
◆ حدیث بحیثیت حجت مستقل ۳۷۸
◆ قرآن اور فقہ کے ساتھ حدیث کا ربط ۳۸۰
◆ سند میں کلام کی گنجائش اور حجیت حدیث سے انکار ۳۸۱
◆ کلام رسول کے اثبات و تحفظ میں قرآن کا اہتمام ۳۸۲
◆ تعداد رواۃ کے اعتبار سے روایت کی چار قسمیں ۳۸۳
◆ خبر غریب ۳۸۴
◆ خبر عزیز ۳۸۴
◆ خبر مشہور ۳۸۴
◆ خبر متواتر ۳۸۵
◆ تواتر کے اقسام و درجات ۳۸۵
◆ خبر متواتر اور اس کی حجیت ۳۸۶
◆ قرآن سے مطلق روایت و خبر کا ثبوت ۳۸۷
◆ منکرین حدیث کے لئے دو راستے ۳۸۸
◆ ثبوت قرآن سے خبر متواتر کا ثبوت ۳۸۸
◆ خبر متواتر کی قطعیت کا ثبوت ۳۸۹
◆ خبر مشہور، خبر عزیز اور خبر غریب قرآن کی روشنی میں ۳۸۹
◆ روایت اور اسکی حجیت ۳۹۱
◆ ہر امت کے پاس ایک ہی ہادی آیا ۳۹۳
◆ روایت رسول اصول روایت کی روشنی میں ۳۹۴
◆ خبر فرد کا ثبوت غیر انبیاء سے ۳۹۶
◆ فاسق کی خبر کی شرط قبول ۳۹۷
◆ تمام اقسام احادیث کا مآخذ قرآن کریم ہی ہے ۳۹۸
◆ اوصاف رواۃ کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں ۳۹۹
◆ دو اصولی صفات عدالت اور ضبط ۴۰۰
◆ نقصان و فقدان عدالت ۴۰۰
◆ نقصان و فقدان ضبط ۴۰۰
◆ صحیح لذاتہ بلحاظ اوصاف رواۃ ۴۰۱
◆ قرآن نے عدالت و ضبط کے ساتھ ان کے نقصان و فقدان سے پیدا ہونے والی دس کمزوریوں کی وضاحت ۴۰۳

◆ روایت صحیح لذاتہ اور آیاتِ قرآنی ۴۰۶
◆ حدیث میں جرح و تعدیل کا معیار بھی قرآن ہے ۴۰۷
◆ دین کے بے اعتبار بنانے کے لئے قرآن کا غلط استعمال ۴۰۸
◆ قرآن و مراداتِ خداوندی کی رسول اللہ ﷺ تک منتقلی ۴۰۹
◆ قرآن و مراداتِ خداوندی کی ہر دور میں منتقلی ۴۱۰
◆ تا قیامِ قیامت حفاظتِ قرآن ۴۱۳
◆ حدیث کی حفاظت کے مختلف ادوار ۴۱۶
◆ حدیث کی حفاظت فنی طور پر ۴۱۷
◆ قرآن و حدیث کی ہر دور میں حفاظت ۴۱۷
◆ منکرینِ قرآن کی انواع قرآن کریم کی روشنی میں ۴۱۷
◆ وضاعین ۴۱۸
◆ منکرین ۴۱۸
◆ محرفین ۴۱۹
◆ منکرینِ قرآن و حدیث اور حکمتِ خداوندی ۴۲۰
◆ قرآن اور پیغمبرؑ کی باہمی نسبت ۴۲۲

آغاز بخاری

خود مصنفؒ فرماتے ہیں جعلته بيني وبين الله حجة "میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے"۔ حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے ور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ ان شاءاللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں وہ بھی ان شاءاللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کیلئے یہ دستاویز ہے...... یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

◆ کلمات تمہید	۴۲۳
◆ جلالت امام بخاریؒ	۴۲۴
◆ کرامت حفظ	۴۲۴
◆ امتحان حفظ	۴۲۵
◆ جلالت کتب	۴۲۶
◆ اسماء الرجال	۴۲۶
◆ میزان حدیث	۴۲۶
◆ انتخاب حدیث	۴۲۷
◆ شان قبولیت	۴۲۷
◆ موضوع کتاب	۴۲۷
◆ عصمت انبیاء علیہم السلام	۴۲۷
◆ حفاظت اولیاء	۴۲۸
◆ غرض کتاب	۴۲۸
◆ وساطت حدیث	۴۲۹
◆ بیان القرآن	۴۲۹
◆ اہمیت فن حدیث	۴۳۰
◆ حمد و نعت سے ابتداء نہ کرنے کی وجہ	۴۳۰
◆ ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ	۴۳۱
◆ ابتداء کتاب میں اتباع سنت کا اہتمام	۴۳۱
◆ ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت	۴۳۲
◆ امام کا تفقہ	۴۳۳
◆ درجہ اجتہاد	۴۳۳
◆ تشریح حدیث	۴۳۴
◆ اصل کلی	۴۳۴
◆ انتفاع نیت	۴۳۵
◆ ابتداء ظہور عمل	۴۳۵
◆ ثمرات نیت	۴۳۵
◆ واقعۂ جزئی	۴۳۶
◆ جامعیت حدیث	۴۳۶
◆ ضروری تنبیہ	۴۳۷
◆ دعاء	۴۳۷

افاداتِ بخاری نمبر ا

"دنیا میں انسان ایمان کا مکلّف تھا۔ پھر اسلام کا' پھر اعمال کا' پھر معاملات کا' ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی مقبولیت پیدا ہو گی؟ تو اس حدیث پر لا کر ختم کیا کہ تسبیح و تہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ تو دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر ختم کیا...... یہ ایک عجیب و غریب صنعت ہو گئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہا میں قیامت اور یوم حشر اس کے ثمرات' اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ ربط بین الابواب	۴۳۹	◆ وزنِ روحانی	۴۴۴
◆ وحی سے ابتداء کی وجہ	۴۳۹	◆ درود شریف کی برکت	۴۴۵
◆ بنیادِ عمل ایمان ہے	۴۴۰	◆ تیسرا وصف	۴۴۵
◆ ضرورتِ علم	۴۴۰	◆ مقاماتِ الوہیت	۴۴۶
◆ مقصدِ تخلیق	۴۴۰	◆ پہلا مقام	۴۴۶
◆ عبادت کے بعد معاملات	۴۴۰	◆ دوسرا مقام	۴۴۶
◆ ضرورتِ جہاد	۴۴۱	◆ تیسرا مقام	۴۴۷
◆ طریقِ عمل	۴۴۱	◆ چوتھا مقام	۴۴۸
◆ فضیلتِ اُمتِ محمدیہ	۴۴۱	◆ دعوئ توحید کی تکمیل	۴۴۸
◆ ندرتِ سند	۴۴۱	◆ خصوصیتِ الوہیت	۴۴۹
◆ عظمتِ سند	۴۴۱	◆ حدیثِ متعلقہ	۴۴۹
◆ اوصافِ حدیث متعلقہ	۴۴۱	◆ حدیث مذکورہ اوصاف ثلاثہ اور	
◆ حسی وصفِ اوّل	۴۴۲	صفتِ علم کی فوقیت	۴۵۰
◆ فضیلتِ عربی	۴۴۲	◆ صحتِ بخاری	۴۵۱
◆ اہلِ برزخ کی زبان	۴۴۲	◆ سابقہ کتبِ سماوی کی حیثیت	۴۵۱
◆ سابقہ کتب کی زبان	۴۴۳	◆ صرف قرآن ہی کلامِ خداوندی ہے	۴۵۲
◆ وصفِ ثانی وزنِ اعمال اور انکی کیفیت	۴۴۳	◆ قرآن و حدیث میں مابہ الامتیاز	۴۵۳
◆ وزنِ اعمال کی کیفیت	۴۴۳	◆ عظمتِ قرآن اور پیغمبر کی جلالتِ شان	۴۵۳

افاداتِ بخاری نمبر ۲

"امام بخاریؒ کی صنع بھی حد کمال تک ہیں، لیکن یہ اول و آخر کی صنعت اس میں بھی حد کمال ہے کہ ابتداء میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیت کے مقامات کی طرف اشارہ کرایا ہے۔ اور بیچ کے اندر تمام ابواب آ گئے۔ اس میں عبادات بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، معاشرت بھی ہے، سیاسیات بھی ہیں تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آ جاتے ہیں اور اول آخر کو نیت اور میزان عمل سے گھیر دیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادت بھی قبول، معاشرت بھی قبول، سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے"۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

فہرست مضامین

◆ احوالِ واقعی	۴۵۵	◆ حقیقت جنت و عمل	۴۶۵
◆ بجواب سپاسنامہ	۴۵۷	◆ تمثیل اعمال کی مثال	۴۶۶
◆ امام بخاریؒ اور ان کی کتاب	۴۵۹	◆ آیاتِ نعمت کی شکل میں ظاہر ہونے کی مثال	۴۶۶
◆ عملی دنیا کی دو چیزیں	۴۵۹	◆ تمثیل اعمال کی حقیقت	۴۶۶
◆ نیت عمل کی بنیاد ہے	۴۶۰	◆ اعمال متشکل کب ہوں گے؟	۴۶۷
◆ ربط بین الابواب	۴۶۰	◆ سائنسی دنیا سے تمثیلِ اجساد کی تصدیق	۴۶۷
◆ اعمال پر اجر کا ترتب	۴۶۰	◆ صحیح بخاری کے اوّل و آخر کی نسبت	۴۶۹
◆ وزنِ کلمات کی وجہ	۴۶۰	◆ دعاء	۴۷۰
◆ مقامِ تنزیہہ	۴۶۱		
◆ مقام تحمید	۴۶۱		
◆ ایک شبہ اور اس کا جواب	۴۶۲		
◆ حقیقتِ توحید	۴۶۳		
◆ تصحیح نیت اور حقیقت نیت	۴۶۳		
◆ اعمال میں وزن کیسے ہوگا؟	۴۶۴		
◆ اخلاص کی قوت	۴۶۴		

درسِ ختم بخاری

آپ کو بخاری پڑھنے کے بعد دو چیزیں حاصل ہوئیں' ایک متن حدیث اور اس کی مرادات ...... اور دوسرا یہ کہ آپ کو سند ملی۔ آپ نے کہا کہ مجھے یہ حدیث میرے استاذ سے پہنچی اسے اس کے استاذ سے ...... یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ مل گیا' گویا آپ کے قلب کا رشتہ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو گیا اور ایک نورانی سلسلے سے کلام کے لفظ اور معانی آپ کے قلب تک آگئے ...... تو متن حدیث کے ساتھ آپ کو سند بھی حاصل ہو گئی اور آپ مستند عالم ہو گئے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ ثمرات ختم بخاری	۴۷۱	◆ ضرورت سند	۴۸۰
◆ تقدیس بخاری	۴۷۲	◆ مسلسلات	۴۸۱
◆ شرف اولیت	۴۷۲	◆ عالی سند	۴۸۱
◆ نور علم	۴۷۳	◆ محدثین کی احتیاط	۴۸۲
◆ حقیقت محمدی	۴۷۳	◆ غیر مستند عالم	۴۸۳
◆ کمالات نبوت کے منتہی	۴۷۴	◆ مثال غیر مستند عالم	۴۸۴
◆ مراتب اخلاق	۴۷۵	◆ سبب تبریک	۴۸۴
◆ تعریف اخلاق	۴۷۵	◆ وقعت روایت	۴۸۵
◆ اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۴۷۶	◆ ذوق صحیح	۴۸۵
◆ درجات تربیت	۴۷۶	◆ مراد قرآنی اور سنت	۴۸۶
◆ شرف خاتمیت	۴۷۷	◆ کلام میں لب ولہجہ کا دخل	۴۸۶
◆ تکمیل پر مسرت	۴۷۸	◆ ضرورت نبوت	۴۸۷
◆ موت کی خوشی	۴۷۸	◆ امت محمدیہ کی سب سے بڑی عظمت	۴۸۸
◆ شوق ملاقات محبوب	۴۷۹	◆ فن اسماء الرجال	۴۸۹
◆ اصل خوشی	۴۸۰	◆ دین کے ہر ہر جز کی سند	۴۸۹
◆ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ	۴۸۰	◆ مراتب علماء	۴۹۰
		◆ اجازت حدیث	۴۹۰

کتابِ خداوندی اور شخصیتِ مقدسہ ہدایت کے لئے دونوں....

قرآن پاک علوم کا جامع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اعمال کی جامع ہے۔ جو قرآن کہتا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور آپ جو کر کے دکھلاتے ہیں وہ قرآن کہتا ہے ___ اگر ہم یوں کہہ دیں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن اتارے۔ ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن جو ذاتِ بابرکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ قرآن علم کا مجموعہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات عمل کا' اخلاق کا اور کمالات کا مجموعہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللّٰہ من ینصرہٗ ورسلہٗ بالغیب۔ ان اللّٰہ قوی عزیز۔ (الحدید ع ۳ پ ۲۷) صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

احوالِ واقعی

بزرگانِ محترم!

آپ حضرات کی دعوت پر میں دارالعلوم (دیوبند) انڈیا سے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اس ملک میں حاضر ہوا اور آپ حضرات سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا' سعادت بھی میسر آئی اور اس کا موقع ملا کہ ہم اپنی بساط کے مطابق آپ کو فائدہ پہنچائیں اور آپ سے فائدہ حاصل کریں۔ گویا ہماری یہ مجلس ایک دینی مجلس ہے جس کا مقصد افادہ اور استفادہ' فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔ نیز دینی منافع کو ترقی دینا ہے تاکہ ہم لوگ صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور کج راستوں سے بچ کر پھر اسی راستے پر چلیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے پیش فرمایا ہے۔

دین کی تاریخ کا اُصولِ مسلّم

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور دنیا سے زیادہ دین کی تاریخ کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہدایت کے دو طریقے مقرر فرمائے ہیں۔ دونوں جمع ہوتے ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ہوتی ہے دونوں نہ ہوں تو کلیۃً گمراہی رہتی ہے اور دونوں میں سے ایک نہ ہو تو راستہ ٹیڑھا رہتا ہے جب دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ملتی ہے۔ ایک قانونِ خداوندی جو انبیاء علیہم السلام کے قلوبِ مبارکہ پر آسمان سے نازل ہوتا ہے، اپنے اپنے وقتوں میں اللہ نے کتابیں اتاریں۔ تو ایک چیز تو قانونِ الٰہی ہے جو منزّل من اللہ ہے ___ دوسری چیز وہ شخصیتیں ہیں جن کے ذریعہ سے اس قانون کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس قانون کے احکام معلوم ہوتے ہیں احکام کی علتوں اور بنیادوں کا پتہ چلتا ہے۔ مسائل کے دلائل کا علم ہوتا ہے۔ اس کے لئے شخصیتیں اتاری گئیں۔ تو ہدایت کے یہی دو طریقے ابتدا سے لے کر آج تک رہے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ نے تیس صحیفے نازل فرمائے لیکن صحیفوں کے ساتھ آدم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی بھیجا تاکہ ان صحیفوں کے مَطالب کو سمجھائیں۔ ان کے احکام پر لوگوں کو مطلع کریں، اگر صحفِ ابراہیم علیہ السلام آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بھیجے گئے تاکہ ان صحیفوں کا مطلب سمجھائیں ان کے مَطالب اور معانی دنیا کے آگے پیش کریں اور حق تعالیٰ کی جو مرادات ہیں کہ فلاں آیت کا یہ مطلب ہے، فلاں آیت کی یہ مراد ہے۔ اس مراد پر مطلع فرمادیں ___ اگر تورات آئی تو موسیٰ علیہ السلام بھی بھیجے گئے انجیل آئی تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی بھیجے گئے، زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی بھیجے گئے ___ اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس دنیا میں بھیجی گئی۔ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے حقائق سمجھائیں اور مراداتِ ربّانی بتلائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فریضے مقرر فرمائے گئے جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے:

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ ہی وہ ذات بابرکات ہے کہ جس نے اُمّیوں میں رسول بھیجا جو خود بھی امّی، کسی مکتب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھتے۔ اس لئے کہ وہ دنیا کو علم دینے کے لئے آتے ہیں۔ علم لینے کے لئے نہیں آتے، حق تعالیٰ براہ راست ان کو علم دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام براہ راست حق تعالیٰ شانہ کے تلمیذ اور شاگرد ہوتے ہیں، تو جو اللہ سے فیضان حاصل کریں وہ دنیا سے علوم کا فیضان حاصل نہیں کرسکتے۔ تو انبیاء علیہم السلام علم لینے کے لئے نہیں، دینے کے لئے آتے ہیں۔

تلامذۂ خدا اور اساتذۂ انسانیت

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی انبیاء کی تعلیم کا ذکر ہے تو حق تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ کہ ہم نے ان کو تعلیم دی ہے، آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اللہ نے آدم علیہ

السلام کو تمام اسماء کی تعلیم دی۔ تمام چیزوں کے نام سکھلائے۔ اسی طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خصوصیت سے تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ فرمایا وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ــــ "اللہ نے آپ کو تاویلِ احادیث کی تعلیم دی" حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ عَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ۔ "ہم نے ہی تو زرہ سازی کا علم آپ کو دیا۔ ہم نے ہی تو آپ کو یہ سکھلایا" اور حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا "ہم نے خزانۂ غیب سے آپ کو علم عطاء کیا" اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا "وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا" "اللہ نے آپ کو تعلیم دی۔ ان چیزوں کا علم دیا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا بہت بڑا فضل اور انعام ہوا۔ جو اپنے خزانۂ غیب سے علم عطا کیا" دوسری جگہ ارشاد فرمایا وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف اپنی روح کی وحی کی ہے' ــــ علم کو روح خداوندی کہا گیا ہے۔ اسی روح سے اقوام زندہ ہوتی ہیں کوئی قوم جہالت سے زندگی حاصل نہیں کر سکتی' جس قوم نے زندگی پائی ہے' دنیا کی زندگی دنیوی علوم سے اور آخرت کی زندگی اخروی علوم سے ہی پائی۔ زندگی بہرحال علم کے تابع ہے جہالت سے نہ دنیا چل سکتی ہے نہ آخرت چل سکتی ہے ــــ اس لئے حق تعالیٰ نے علم کو روح بتلایا کہ اسی سے اقوام کی زندگی ہے۔

اور فرمایا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو جانتے ہی نہ تھے کہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ایمان کی معنی کیا ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں ایک نور ڈالا' علم کی روشنی ڈالی۔ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب کچھ عیاں ہو گیا ــــ تو ہر جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے اپنے کو استاذ ظاہر کیا' انبیاء علیہم السلام کو شاگرد ظاہر کیا' ــــ تو جو حضرات بلاواسطہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ دنیا کے شاگرد کیسے بن سکیں گے؟ وہ تو دنیا کے استاذ بنیں گے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی عمر پانچ سال کی تھی۔ ان کی والدہ ماجدہ نے پڑھنے کے لئے مکتب میں بھیجا۔ استاذ کے سامنے بیٹھے تو استاذ نے کہا کہ "کہو اَلِفْ" فرمایا الف کے کیا معنی ہیں؟ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ تو پھر مہملات (بے معنی چیزوں) کی تعلیم دینے بیٹھا ہے۔ تو استاذ بنا ہے جو چیز بتلائی ہے اس کے معنی بھی بتلا اور جس چیز کے معنی نہیں اس کی تعلیم کیسی؟ ــــ وہ تو جاہلانہ تعلیم ہوگی۔ اب وہ استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ عجیب قسم کا شاگرد آیا ہے کہ اس نے میرے اوپر سوالات قائم کئے' تو استاذ نے کہا کہ الف کے کچھ معنی ہیں؟ فرمایا کہ ہاں! معنی ہیں' تجھے معلوم ہیں؟ فرمایا کہ ہاں معلوم ہیں (اس نے کہا کہ) کیا معنی ہیں" فرمایا کہ اپنی استاذی کی جگہ چھوڑ یہاں شاگردوں کی لائن میں بیٹھ۔ تب بتلاؤں گا۔ استاذ جگہ چھوڑ کے آیا اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا' پھر آپ نے الف کے معنی بتلائے اور توحید خداوندی' عظمتِ خداوندی اس طرح ثابت کی کہ استاذ حیران تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے استاذ براہ راست حق تعالیٰ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں' اس لئے وہ عالم کے استاذ ہیں' وہ کسی کے شاگرد بننے کے لئے نہیں آتے۔

قانونِ ہدایت

تو ہدایت کے لئے اللہ نے ایک قانون رکھا اور قانون کے ساتھ ایک شخصیت رکھی' تاکہ اس قانون کے مطالب اور مرادات خداوندی سمجھائیں۔ قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اسی اصول پر نازل کی گئیں۔ قرآن قانونِ حق بن کر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات معلم بن کر آئی' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا **انما بعثت معلماً**۔

حدیث میں ہے کہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دو جماعتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک جماعت نوافل میں' تسبیح میں' تہلیل میں' تکبیر میں یعنی عبادت میں مصروف تھی اور ایک جماعت علمی مسائل کا تذکرہ کر رہی تھی کہ یہ چیز جائز ہے یہ ناجائز' یہ حلال یہ حرام' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا **کلا کما علی الخیر** دونوں جماعتیں خیر پر ہیں۔ جو عبادت اور زہد میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے' جو علمی مسائل میں مصروف وہ بھی خیر پر ہے۔ مگر فرمایا کہ **انما بعثت معلماً** میں تو دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جہاں مسئلے مسائل کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری حیثیت معلم کی ہے تاکہ دنیا کو علم سے آشنا کروں اور دنیا میں علم کی روشنی پھیلاؤں تاکہ جہالت ختم ہو___ تو ایک طرف ذاتِ اقدس آئی' ایک طرف قرآن کریم آیا۔

کتابِ قانون کے الفاظ و معانی کی حفاظت

اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے اتارے گئے۔ یعنی اور کتابوں کو ہم مجازاً "کلام اللہ" کہہ سکتے ہیں حقیقی معنوں میں "کلام اللہ" صرف قرآن کریم ہے۔ اس لئے کہ کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے' اس کا تکلم کرے۔ تورات کا تکلم نہیں ہوا بلکہ تورات کو الواح پر لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا گیا' تو اسے "کتابِ خداوندی" تو کہیں گے کلام خداوندی نہیں کہیں گے' مجازاً کلام اللہ کہہ سکتے ہیں' حقیقی معنوں میں نہیں۔ انجیل کو حق تعالیٰ نے لکھ کر بھی نہیں دیا' تکلم بھی نہیں فرمایا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے قلب مبارک پر اتارا۔ اسے مضمونِ خداوندی تو کہیں گے کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے۔ کلام وہی ہے جس سے تکلم ہو۔

قرآن کریم وہ ہے جس کا اول سے لے کر آخر تک حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا ہے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ تو اللہ تعالیٰ سے تکلم واقع ہوا۔ تو کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے' لکھ کر دیدے تو وہ مجازاً کلام ہے۔ اسی طرح دل میں کوئی چیز ڈالدے وہ مجازاً کلام کہلائے گا۔ ایک کو مضمون کہیں گے' ایک کو کتاب کہیں گے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ قرآن کریم کا تکلم فرماتے تو اس کی عظمت سے ملائکہ پر بے ہوشی طاری ہوتی تھی۔ جبرئیل علیہ السلام ہوش میں رہتے تھے۔ کچھ مدہوش سے اور بے خود سے وہ ہوجاتے تھے۔ جب ہوش میں آتے تو ملائکہ ان سے پوچھتے **مَاذَا قَالَ رَبُّنَا** اب ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا تو وہ فرماتے **قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ** حق فرمایا اور وہ بلند و بالا ہیں عظمت والی ذات ہے۔ تو حق تعالیٰ نے ہر ہر آیت کا تکلم کیا ہے اس واسطے کہ "کلام اللہ" اسے ہی کہتے ہیں کہ الفاظ بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں اور معانی بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں___ ہم نہ الفاظ میں موجد ہیں (اور نہ ہی معانی و مطالب میں اور) ہم تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجد نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم الفاظِ قرآن کے ناقل ہیں۔ اسی طرح سے معانی کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناقل ہیں اور ہم بھی ناقل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر جو معانی ڈالدیئے انہیں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے آگے پیش فرمایا تو آپ صلی

اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ مدعی نہیں بلکہ امانت کے ساتھ ناقل ہیں۔ تو امانت کاملہ کے ساتھ الفاظِ الٰہی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچادیئے اور معانیٔ خداوندی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچادیئے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ جب وحی نازل ہوئی تو ابتدا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رَٹنے لگتے تھے اور باربار اس کو پڑھتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ حق تعالٰی نے فرمایا لَاتُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ زبان کو حرکت نہ دیں' جلدی نہ کریں۔ یہی تو خطرہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھول جائیں گے۔ فرمایا اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ہم گارنٹی دیتے ہیں ہمارے ذمہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں جمع بھی کردیں اور آپ سے پڑھوا بھی دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی فکر نہ کریں۔

جمع کرنا' محفوظ کرنا' پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ حق تعالٰی نے وہ ذمہ پورا فرمایا۔ یہ الفاظ کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فرمایا ہے تو قرأت لفظوں کی ہوتی ہے' معنیٰ کی نہیں ہوتی' معنیٰ کی تفہیم کی جاتی ہے قرأت نہیں کی جاتی فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے' تو یہاں تک الفاظ کی حفاظت کی گارنٹی دی ___ معلوم ہوا کہ الفاظ خداوندی محفوظ ہیں ان میں کوئی ردّوبدل ممکن نہیں ہے۔

آگے معنیٰ کا قصہ تھا۔ تو معانی کے بارے میں بھی فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا بیان کرنا ___ تو بیان لفظوں کا نہیں ہوا کرتا ہے کھول کھول کر معانی بیان کئے جاتے ہیں۔ پڑھوانے کو بیان نہیں کہتے' قرأت کہتے ہیں۔ تو الفاظ کی گارنٹی بھی دی گئی۔ معانی کی گارنٹی بھی دی گئی۔ ان میں کوئی ردّوبدل نہیں ہوسکتا۔

تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی کے بارے میں بھی امین ہیں بلا کم وکاست آپ نے وہ معانی بیان فرمادیئے۔ الفاظ کو اس لئے نازل کیا گیا کہ حقائق الفاظ ہی میں چھپے ہوتے ہیں۔ لفظ کا ذرا ردّوبدل ہو جائے۔ معنیٰ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ الفاظ تو بعد کی چیز ہیں ایک لفظ ہو لب ولہجہ بدل جائے تو معنیٰ بدل جاتے ہیں اور کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں ___ مثال کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان میں ایک جملہ ہے "کیا بات ہے" یہ معمولی سا جملہ ہے۔ ہر شخص بولتا ہے۔ اس کے کئی معنیٰ آتے ہیں اور ہر معنیٰ کا تعلق لب ولہجہ اور طرزِ ادا سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی کیا بات ہے؟ سب سمجھیں گے کہ میں نے سوال کیا ہے کہ بھئی کیا بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ کیا قصہ ہے؟ ___ اور اگر میں یوں کہوں کہ کیا بات ہے ___ اب آپ کیا سمجھے۔ قطعاً یہ نہیں سمجھے کہ میں نے سوال کیا۔ یہ سمجھے کہ میں نے بڑائی بیان کی ہے۔ تفخیم شان بیان کی ہے کہ فلاں چیز تو بہت بڑی ہے کیا بات ہے اور اگر لہجہ بدل کے یوں کہوں کہ کیا بات ہے' اب آپ کیا سمجھے۔ بڑائی نہیں سمجھے بلکہ یہ سمجھے کہ میں حقارت بیان کر رہا ہوں یہ تحقیر کے لئے ہے اور اگر لب ولہجہ بدل کے یوں کہوں کہ کیا بات ہے۔ اب آپ کیا سمجھے؟ نہ سوال سمجھے' نہ تفخیم شان سمجھے نہ تحقیر شان۔ آپ تعجب اور حیرت سمجھے ایک ہی جملہ ہے کئی معنیٰ پر دلالت کی۔ بس لب ولہجہ کے بدلنے سے معانی بدل گئے۔

اب فرض کیجئے اگر میں یہ جملہ خط میں لکھ کر آپ کو بھیج دوں۔ تو لفظ تو خط میں آجائیں گے مگر لب ولہجہ اور طرزِ ادا تو کاغذ میں نہیں آئے گا یا تو متکلم خود آکے لب ولہجہ سے سمجھائے یا اپنا کوئی قاصد بھیجے کہ وہ ادا

کرکے بتلائے کہ یہ مراد ہے اگر ان میں سے کوئی چیز نہ ہوئی فقط کاغذ سامنے ہوا تو آپ کے نفس پر جو کیفیت غالب ہوئی وہ معنی آپ سمجھ لیں گے وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی آپ کی مراد ہوگی۔ لفظ آپ متکلم کے لیں گے معنیٰ اس میں اپنے ڈالیں گے۔ یہ تلبیس ہو جائے گی 'اِلتباس ہو جائے گا کہ لفظ اللہ کے لئے اور معانی اپنے ڈال دیئے۔ تو جس طرح سے ہر زبان میں عرف اور طرزِ ادا سے معانی بدل جاتے ہیں۔ قرآن کا بھی تو ایک عرف ہے اس میں بھی لب و لہجے اور طرزِ ادا سے معانی بدل جاتے ہیں۔ ذرا لہجہ بدل دو معانی کچھ کے کچھ ہو گئے۔ ذرا لفظوں کی مراد میں فرق سمجھ میں آگیا معانی بدل گئے۔

مرادِ باری تعالیٰ صحابیؓ رسول ﷺ بھی نہ سمجھ پائے

حضرت عدی ابن حاتمؓ جلیل القدر صحابیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ___ ابتدائے اسلام میں حکم یہ تھا کہ روزہ افطار کرکے پھر رات بھر کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ گویا سحر نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ رات اور دن کا بھی روزہ بس ایک دفعہ کھانا پینا تھا ___ ظاہر ہے کہ یہ لوگوں پر بھاری گزرا۔ تحمل نہیں ہو سکا۔ برداشت سے باہر ہو گیا تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمائی اور فرمایا کہ اللہ نے تمہارے ضعف کو دیکھ لیا ہے اب نیا حکم ہے **كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ....** ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تم تحمل نہیں کر سکتے لہٰذا رات بھر کھاؤ پیو' آرام کرو۔ یہاں تک کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان ہو جائے اور ممتاز ہو جائے اس وقت روزے کی نیت کرو۔

حضرت عدی ابن حاتمؓ نے دو ڈورے لئے۔ ایک کالا اور ایک سفید اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے۔ اب اس کو دیکھتے رہتے تھے۔ جب تک اندھیرا رہتا کھاتے پیتے رہتے۔ حالانکہ صبح صادق گزرے ہوئے تیس منٹ گزر چکے ہوتے۔ صبح صادق کے بعد کچھ نہ کچھ تاریکی رہتی ہے۔ کچھ اندھیرا ہوتا تھا کالے اور سفید ڈورے میں تمیز نہیں ہوتا تھا۔ تکیہ اٹھایا۔ دیکھ لیا ابھی دونوں میں تمیز نہیں بس پھر کھا رہے ہیں۔ حالانکہ صبح صادق ہو چکی ہوتی۔

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو فرمایا کہ اے عدیؓ ___ تم کیا کرتے ہو؟ عرض کیا' یا رسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ** کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ تو میں نے دو ڈورے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ فرمایا کہ **ان وسادتک لعریض** تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ رات دن دونوں اس کے اندر سما گئے ___ بندۂ خدا **خیطِ ابیض** سے مراد صبح صادق کی سفیدی اور **خیطِ اسود** سے مراد رات کی تاریکی ہے۔ یہ روئی کا ڈورا مراد نہیں ہے۔ تو لغت کے لحاظ سے حضرت عدی ابن حاتمؓ غلط نہیں سمجھے تھے۔ لغتاً تو خیط روئی کے دھاگے کو کہتے ہیں' لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے اور عمل بھی صحیح کیا۔ مگر حق تعالیٰ کی وہ مراد نہیں تھی۔ اس سے مراد رات اور دن ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مراد بتلائی تب ان کے روزے صحیح سمجھے گئے۔

قرآن کا اپنا عُرف

اس سے اندازہ ہوا کہ قرآن کریم کو محض لغت اور عرف کے بل بوتے پر نہیں سمجھا جاتا ___ قرآن کریم لغت عرب میں نازل ہوا ہے لیکن بہت سے الفاظ میں قرآن کریم نے اپنے معانی ڈالے ہیں۔ لغوی معنیٰ مراد

نہیں بلکہ وہ معنی مراد ہیں جو عرف شریعت میں ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ اس کے معنی رحمت اور دعا کے ہیں بس گھر میں بیٹھے آدمی پانچ وقت دعا کرلے مسجد میں حاضری کی کیا ضرورت ہے۔ بس نمازی ہو گیا۔ لیکن اس طرح نماز نہیں ہوگی۔ لغتاً تو صحیح ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا مانگنے کے ہیں۔ مگر مراد (متکلم وہ) نہیں تھی۔ مراد افعال خاصّہ ہیں کہ یوں نیت باندھو' یوں ہاتھ اٹھاؤ' یوں رکوع کرو' یوں سجدہ کرو' اس مجموعے کو صلوٰۃ کہتے ہیں ___ یا مثلاً حج کا لفظ ہے حج کے معنی لغت میں قصد کرنے کے ہیں۔ تو گھر میں بیٹھ کے قصد کرلیا اور حاجی ہو گئے۔ کیا ضرورت ہے کہ ڈیڑھ دو اور چار ہزار روپے خرچ کرکے حجاز پہنچے لغت کے لحاظ سے تو "حج" ہو گیا۔ اور حاجی بن گئے' مگر لغوی معنی مراد نہیں مرادی معنی دوسرے ہیں۔ تو قرآن میں لفظ لغت عرب کا ہے معنی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے ڈالے ہیں کہ چند مخصوص افعال کا نام حج ہے' صرف قصد کرنے کا نام حج نہیں ہے۔ ہم لغت کو رد نہیں کرتے مگر اصطلاح یہی ہے۔ گویا عرفی اصطلاح ہے اور اس کو منقول اصطلاحی کہتے ہیں کہ لفظ تو لغت عرب کا ہے مگر کسی اپنے معنی کی طرف منقول کرلیا ہے ___ اگر استاذ بتلانے والا آئے آدمی وہی سمجھے گا جو لغت کے معنی ہیں جب تک معلّم آکر تعلیم نہ دے مرادِ ربانی سامنے نہیں آئے گی۔

ضرورتِ معلّم

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا کہ قرآن کے معنی سمجھائیں۔ محض لغوی معنی مراد ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم بیت اللہ کی چھت پر رکھ جاتے اور اعلان کردیتے کہ اے لوگو! تم مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفاء ہے' اپنا علاج خود کرلیا کرو ___ مگر دنیا میں یہ اصول نہیں ہے کہ طب کی کتابیں دیکھ کر آدمی علاج کرے جب تک طبیب اور معالج نہ ہو۔ کتاب اصول بتلادے گی۔ موازین بتلادے گی' مقداریں بتلادے گی۔ نفسیات کو تو نہیں پہچانے گی' جسم کو نہیں پہنچانے گی یہ تو طبیب ہی نبض پر ہاتھ رکھ کر پہنچانے گا کہ مرض ٹھنڈا ہے یا گرم ہے۔ مرض ٹھنڈا ہوا تو گرم دوائیں دے گا۔ مرض گرم ہوگا تو ٹھنڈی دوائیں دے گا۔ تو بغیر طبیب کے معالجہ ناممکن ہے۔ جو بدنی معالجہ ہے وہ روحانی معالجہ ہے' وہاں بدنی اطباء کی ضرورت ہے۔ یہاں روحانی اطباء کی ضرورت ہے۔ بغیر طبیب کے نہ بدن اچھا رہ سکتا ہے اور نہ بغیر طبیب کے آدمی کی روح اچھی رہ سکتی ہے۔ دونوں جگہ معالج کی ضرورت ہے۔ تو قرآن نسخۂ شفاء ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام حکماء بنا کر بھیجے گئے ہیں وہ اطباء روح ہیں جو روح کے نشیب و فراز جان کر نسخہ تجویز فرماتے ہیں اور علاج کرتے ہیں۔

عنوان اور الفاظ کی حفاظت کی ضرورت

بہرحال الفاظ کی ضرورت اس لئے تھی کہ الفاظ ہی کے اندر معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں لفظ اور لہجہ بدل گئے معانی ختم ہو جاتے ہیں۔ عنوان میں معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ عنوان کا لفظ ذرا بدل دیں معانی بدل جائیں گے۔

آپ نے نام سنا ہوگا عرفی انوری ایران کا بہت بڑا شاعر گزرا ہے' اس نے بادشاہ کی شان میں قصیدہ پڑھا تو بادشاہ نے خوش ہو کر ایک نہایت اعلیٰ عربی گھوڑا انعام میں اس کو دیا۔ زین بھی تھا۔ لگام وغیرہ سونے چاندی سے مرصّع اور گھوڑا بھی اعلیٰ نسل کا تھا۔ انوری گھوڑا لے کر گھر آیا بے چارہ غریب آدمی تھا گھوڑے کو یہاں گھاس بھی میسر نہ آئی۔ شاہی اصطبل میں ہوگا تو معلوم نہیں دودھ جلیبیاں کھاتا ہوگا۔ دانے کتنے کھاتا ہوگا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ رات ہی رات گھوڑے بیچارے کا انتقال ہو گیا ــــ اب انوری کو فکر ہوئی کہ بادشاہ کو اطلاع تو ہو جائے گی۔

اگر کل اطلاع ہوئی (اور آج میں نے از خود نہ بتلایا) تو بادشاہ بلا کے کہے گا کہ اس نے شاہی عطیہ کی قدر نہیں کی۔ لہٰذا اس کی گردن اڑادی جائے ــــ "تو میں بھی گیا، گھوڑا تو گیا ہی"۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں خود ہی جا کے کیوں نہ اطلاع کر دوں۔ تو گھوڑے کے مرنے کی اطلاع دی اور کہا کہ ؎

شاہ اسپے بانوری بخشید
بادِ صر صریہ گرد اُو نہ رسید

یعنی بادشاہ نے انوری کو ایک گھوڑا انعام میں دیا۔ وہ گھوڑا ایسا تھا کہ ہوائیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اتنا تیز دوڑتا تھا کہ آندھی پیچھے رہ جاتی تھی اور گھوڑا آگے نکل جاتا تھا اتنا تیز رفتار تھا ــــ آگے رفتار کی تیزی کو بیان کیا ہے ؎

ایں چنیں تیز بُود در رفتار
در شبا شب بعاقبت می رسید

یعنی اتنا تیز رفتا تھا کہ رات کے رات ہی دنیا کے عالم طے کر کے آخرت میں جا پہنچا۔ اس کی تیز رفتاری کی کوئی انتہا ہے۔ بادشاہ کو ہنسی آگئی اور کہا کہ اس کو ایک گھوڑا اور دیدو۔

اور اگر یوں کہتا کہ حضور جو گھوڑا دیا تھا وہ مر گیا۔ تو حکم یہ ہوتا کہ اسے بھی ماردو۔ کمبخت نے شاہی عطیہ کی ناقدری کی ہے ــــ تو عنوان کا فرق ہے۔ کسی اچھے اسلوب سے خبر دی تو انعام پایا بُرے اسلوب سے خبر دیتا تو اس سے انتقام لیا جاتا۔

اگر کوئی اپنے باپ کا تعارف یہ کہہ کر کرائے کہ یہ قبلہ میرے والد بزرگوار ہیں۔ باپ خوش ہو گا کہ بیٹا سعادت مند ہے۔ باپ کی عظمت کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اگر یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہے۔ تو باپ اگر کچھ ناخوش نہیں ہو گا تو خوش بھی نہیں ہو گا۔ یوں سمجھے گا کہ بھدّہ ہے بے وقوف ہے، اس کو تمیز نہیں ہے، باپ کی عظمت کو کچھ جانتا ہی نہیں ــــ اور اگر یوں کہہ کی تعارف کرائے کہ یہ میری ماں کا خصم ہے تو باپ اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرے گا۔ حالانکہ بات غلط تو نہیں کہی۔ ماں کا خصم تھا تب تو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ خصم نہ بنتا تو صاحبزادے کہاں سے پیدا ہوتے؟ ــــ تو بات صحیح کہی مگر عنوان بھدّہ تھا، غلط تھا، اسی واسطے زجر و توبیخ اور سزا کا مستحق ہوا۔

اسلوبِ بیان

تو عنوان کے اندر مضامین چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ الفاظ کا تو اسلوب بیان ہی ہوتا ہے اور شاعر تو واقعی اسلوبِ بیان ہی کی روٹی کھاتے ہیں۔ وہ اشعار کو نظم کرتے ہیں تو اعلیٰ مضمون کی اچھی تمثیل و تشبیہ میں ذکر کرتے ہیں لوگ واہ واہ کرتے ہیں، داد دیتے ہیں۔ ایک ہی مضمون ایک شاعر بیان کرتا ہے اور اسی مضمون کو دوسرے درجے کا شاعر بیان کرے وہ زیادہ انعام لے جائے گا یہ کم لے گا۔ حالانکہ بات دونوں نے ایک ہی کہی۔ تو شاعر تو طرزِ ادا اسلوبِ بیان کا کھاتے ہیں۔ مجھے اس پر یاد آیا، ہماری اردو زبان کا محاورہ ہے "آنکھ سے آنکھ لڑجانا" یہ محبت ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھ سے

آنکھ ٹکرائی یعنی محبت قائم ہو گئی ـــــ تو استاذ ذوقؔ نے جو مانا ہوا شاعر ہے اس نے اس محاورہ کو ایک شعر میں نظم کیا ہے کہتا ہے کہ ؎

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی، مجھے ڈر ہے دل کا

یہ آنکھیں تو لڑنے میں مصروف ہیں مجھے اپنے دل کا خوف ہے

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی، مجھے ڈر ہے دل کا؛ کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

آنکھیں تو لڑیں گی اور یہ مارا جائے گا، گرفتار ہو جائے گا، اس واسطے مجھے دل کی فکر ہے تو بڑی خوبصورتی سے آنکھ لڑنے کے محاورے کو اس نے نظم کر دیا، اور اس شعر کو لوگ واقعی ضرب المثل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

اسی مضمون کو ایک ہندو شاعر نے ادا کیا ہے تمکندر رام اس کا نام ہے اس نے اس مضمون کو بڑھا دیا اور بہت نازک خیالی دکھلائی۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

دل کی نہیں تقصیر تمکندؔ آنکھیں ہیں ظالم

دل کا بالکل کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ تو آنکھیں ظالم ہیں

دل کی نہیں تقصیر تمکندؔ آنکھیں ہیں ظالم؛ یہ جا کے نہ لڑتیں، وہ گرفتار نہ ہوتا۔

یہ سارا قصور ان آنکھوں کا ہے کہ یہ جا کے لڑیں اور دل گرفتار ہوا۔ تو محاورہ ایک تھا۔ ایک شاعر نے ایک انداز سے ادا کیا، ایک نے ایک انداز سے، ذرا سا عنوان بدلا، مضمون کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کو اپنے ہی الفاظ میں نازل کیا۔ کیوں کہ اگر بندے اپنے اپنے الفاظ میں ادا کریں گے تو تغیر و تبدل لازمی ہے اور جب الفاظ میں تغیر ہو گا معانی کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ معانی میں بھی امت امین ہے لفظوں میں بھی امین ہے۔ اپنی طرف سے ایجاد نہیں کر سکتی۔

معانیٔ قرآن

بہرحال حق تعالیٰ نے الفاظ میں بھی حفاظت کی گارنٹی دی کہ ہم اس کو محفوظ رکھیں گے، اور معانی میں بھی اس کی گارنٹی دی اور معانی وہ بیان ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ہیں کہ اللہ کی مرادات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ادا فرمایا۔ وہ بھی وحی ہے جس کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ تو حدیث قرآن کا بیان ہے۔ قرآن کی اولین تفسیر حدیث مبارک ہے۔ اگر حدیث پر اطلاع نہ ہو تو آدمی کبھی مفسر نہیں بن سکتا۔ حدیث نبوی اولین تفسیر ہے جو قرآن کا بیان ہے۔ فرمایا گیا،

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ۔

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ کھول کھول کر اس کی مرادات اور معانی بیان کر دیں تو ذکر نازل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبیّن قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر جو معانی اترتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بیان کرتے تھے۔ تو بیان مراد در حقیقت حدیث ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے قرآن کے معنیٰ متعین ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ کو خوارج کے مقابلے کے لئے بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ

کریں، تو ایک وصیت کی، فرمایا کہ خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا، سنّت سے دلیل پیش کرنا۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال اور احوال سے) ابن عباسؓ کو تعجب ہوا، عرض کیا امیرالمؤمنین قرآن تو وہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعا دی ہے۔ فرمایا **اللھم علمہ الکتب والحکمۃ** ــــ اے اللہ ابن عباسؓ کو کتاب اللہ کی تعلیم دے اور اس کی حکمت ان کے قلب میں ڈالدے، تو میں تو حکمت قرآن کا حامل ہوں۔ اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ استدلال نہ کروں۔ اس کی کیا مصلحت ہے ــــ فرمایا قرآن کے جملے ذی وجوہ ہیں، اصولی جملے ہیں۔ آپ اپنے طور سے آیت کے ایک معنیٰ بیان کریں گے، فریقِ مخالف اسی آیت کا ایک پہلو لیکر دوسرا معنیٰ بیان کردیگا۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ حق واضح نہیں ہوگا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے جب آپ دلیل پکڑیں گے اس میں بولنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

قرآن کے معانی میں خود رائی

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کرکے دکھلایا اور جو ارشاد فرمایا وہ بیانِ قرآن ہے اور بیانِ قرآن ہی حدیث ہے۔ انکارِ حدیث کرکے کبھی بھی آدمی قرآن کی مراد نہیں سمجھ سکتا، منکرینِ حدیث اس لئے انکار کرتے ہیں کہ قرآن سے اپنی مَن مانی مرادیں نکالتے رہیں، حدیث بریک لگاتی ہے کہ یہ مراد نہیں ہوسکتی یہ مراد ہے۔ وہ آزادی چاہتے ہیں جو چاہیں مطلب لے لیں جو چاہیں مراد لے لیں۔ حدیث ان کا راستہ روکتی ہے اس۔ لئے وہ انکار کر گزرتے ہیں ان کا انکارِ حدیث خود غرضی پر مبنی ہے جب تک حدیث موجود ہے قرآن میں اپنی مَن مانی کارُدائیاں نہیں کرسکتے، حدیث کا انکار کرکے جو چاہے کرلیں وہ دین نہیں رہے گا وہ تو آراء کا مجموعہ ہو جائے گا۔ وہ قیاسات اور آراء ہوں گی اور رائے قرآن میں معتبر نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **من قال فی القران برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار** ــــ جو قرآن میں رائے زنی کرکے معانی نکالے اسے جہنم میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہئے۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے ــــ لیکن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ سے ہم اپنے اپنے مطالب نکالیں ــــ میں کہتا ہوں ان کو تو اپنے ایجاد کردہ مطالب نکالنے کا کیا حق ہوگا؟ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں کیا کہ جب قرآن کی کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ بھائی اس ایک معنیٰ تو یہ ہوسکتے ہیں، ایک یہ بھی اور ایک یہ بھی اور زمانے کے مناسب یہ معنیٰ ہیں۔ لہٰذا یہ معنیٰ لے لو۔ ایسا نہیں کیا الفاظ آگئے، اس کے بعد آپ منتظر رہتے کہ اللہ اس کی مراد بیان فرمادیں وہ امت کے سامنے بیان کردوں۔

بعض صحابہؓ نے کسی آیت کا معنیٰ پوچھا تو فرمایا، حق تعالیٰ نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھایا، جب وحی آگئی بیان مراد ہوگیا۔ تب فرمایا اللہ نے یہ فرمایا ہے اور یہ مراد ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو رائے زنی کا حق نہیں تو زید، عمرو، بکر کو قرآن میں رائے زنی کا کیا حق ہوگا؟ اور وہ کیا رائے دیں گے اس کا اعتبار اور وقار کیا ہوگا۔ وہ تو دیوار پر ماردینے کے قابل ہوگی۔

تو اصل چیز قرآن کے الفاظ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور مرادات ہیں۔ ان مرادات کو سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے، اسی کا نام تعلیم ہے، تو دو چیزیں ہوئیں **یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ** اور **یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ** ــــ کتاب کی تعلیم میں الفاظ بھی بیان کردیئے اور ان کی مرادات بھی بیان فرمادیں۔ تو تلاوت بھی ہوگئی اور تعلیم بھی ہوگئی گویا آپ سمجھ گئے کہ مراد یہ ہے۔

تعلیمِ حکمت

یہ ٹھیک ہے کہ آپ مرادات خداوندی سمجھ گئے' مگر انسان کے ساتھ نفس بھی لگا ہوا ہے اور عقلی احتمالات بھی لگے ہوئے ہیں۔ کل کو یہ احتمال پیدا ہو تا کہ ممکن ہے یہ معنیٰ بھی اس آیت کے اندر داخل ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معنیٰ بیان کئے مگر آیت کے عموم میں یہ بھی ہو سکتے ہیں تو یہ احتمال بھی تو ہو سکتا ہے۔ تو ممکن تھا کہ احتمالات میں اُلجھ کر اصل مرادات بھی کھودیں۔ اس لئے ایک تیسری چیز اور فرمائی کہ پیغمبر تلاوتِ آیات' تعلیم مرادات کے بعد حکمت کی بھی تعلیم دیں (اور حکمت کی دو قسمیں ہیں) حکمتِ نظری تو یہ ہے کہ مراد سمجھادو' اور حکمتِ عملی یہ ہے کہ عمل کا نمونہ کر کے دکھلایا جائے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط حکم ہی نہیں دیا۔ مراد بھی سمجھائی' عمل بھی کر کے دکھلایا کہ عمل کا نمونہ یہ ہوتا ہے جب نمونہ سامنے آیا اب سارے احتمالات ختم ہو گئے' تو یہ بات متعین ہو گئی کہ یہی معنیٰ ہیں اور یہی مراد ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلایا ہے۔

اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ "صلّوا" لوگو نماز پڑھ لیا کرو کیف ما اتفق جس طرح تمہارا جی چاہے بلکہ فرمایا صلّوا کما رایتمونی اصلّی اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔ حج کا حکم دیا تو خود حج کر کے دکھلایا کہ یوں حج کرو ___ اسی طرح سے تمام چیزیں' دوستوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے اس کے نمونے دکھلائے' دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہو اس کے عملاً نمونے دکھلائے' شادی میں کیا کرو' اس کے نمونے دکھلائے' غمی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی اس کا بھی نمونہ پیش فرمایا' گھریلو زندگی کا نمونہ پیش فرمایا' اجتماعی زندگی کا نمونہ پیش فرمایا' تو کوئی عملی اُسوہ ایسا نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہ کر دیا ہو۔

تو قرآن پاک علوم کا جامع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اعمال کی جامع ہے۔ جو قرآن کہتا ہے وہ حضورؐ کر کے دکھلاتے ہیں اور آپؐ جو کر کے دکھلاتے ہیں وہی قرآن کہتا ہے اگر ہم یوں کہدیں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن اتارے' ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن جو ذاتِ بابرکات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ وہ قرآن علم کا مجموعہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات عمل کا' اخلاق کا اور کمالات کا مجموعہ ہے۔

اس لئے اگر فقط قرآن سامنے ہوتا تو دس احتمالات نکلتے' لیکن جب عمل کا نمونہ سامنے آگیا اور سندِ صحیح کے ساتھ ہم تک پہنچ گیا۔ اب کسی کو دوسرا احتمال پیدا کرنے کی مجال نہ رہی۔ آیت کا مفہوم علمی اور عملی طور پر متعین ہو گیا ___ تو تین باتیں ہوئیں آیات کی تلاوت' یہ تو قانون کے الفاظ محفوظ کر دیئے۔ الفاظ پر ہی معانی کا مدار ہوتا ہے ___ قانون ساز مجلسیں دنیا میں بیٹھتی ہیں تو ایک ایک لفظ پر ایک ایک ہفتہ لڑائی ہوتی ہے کہ یہ لفظ رکھا جائے تاکہ یہ مفہوم ادا ہو۔ کیونکہ ذرا لفظ بدل گیا تو مفہوم بدل جائے گا تو ایک ایک لفظ پر قانون ساز مجلسیں بحثیں کرتی ہیں۔ ہفتہ ہفتہ لگ جاتا ہے برسہا برس میں قانون کی کتاب تیار ہوتی ہے' بہت سے دماغ آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں جو چیز نکھر کر سامنے آتی ہے پھر وہ لفظوں میں بند کی جاتی ہے۔ تاکہ ان لفظوں کے اندر وہی معنیٰ آئیں جو مراد ہیں۔

قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے وہ ہماری کسی مجلس کا بنایا ہوا تو ہے نہیں کہ ریزرویشن پاس کر دیا ہو کہ اس کو آیت سمجھ لیا کرو کہ یہ آیت ہے۔ وہ بندوں کی تجاویز نہیں ہیں وہ اللہ کا کلام ہے۔ تو لفظ بھی اترے اور وہی

لفظ اترے جن میں اللہ کی مرادات چھپی ہوئی ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ بھی تلاوت کئے' معانی الگ سمجھائے' عمل کر کے بھی دکھلایا۔ لیکن ایک بات اور باقی تھی کہ آیت کے لفظ بھی آگئے معانی بھی آگئے' مراد بھی سامنے آگئی۔ لیکن اگر دل میں کجی اور ٹیڑھا پن باقی ہے۔ تو ہر چیز آدمی غلط سمجھے گا۔ جب دل میں زیغ اور اُلٹا پن ہے تو کتنا ہی صحیح معنی بیان کرو' اوندھا ہی سمجھے گا' اس لئے کہ اس کی سمجھ ہی اوندھی ہے۔

اگر کوئی شخص قرآن میں نصرانی زیغ لیکر اترے' تو ہر لفظ سے نصرانیت کا طریق معلوم ہوگا کہ سارے قرآن میں نصرانیت ہی بھری ہوئی ہے۔ ہر لفظ سے وہی نکلتی ہوئی نظر آئیگی ___ اگر یہودی ذہنیت لے کر آئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر آیت میں سے یہودیت نکل رہی ہے' اس لئے کہ اس کے عموم سے وہ ہی فائدہ اٹھائے گا جو اس کے دل کے اندر ہے اور دل ٹیڑھا ہے۔

تزکیۂ قلوب اور آپ ﷺ کا اندازِ تربیت

اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں الفاظ پیش کئے جائیں' معانی پیش کئے جائیں' عمل کا نمونہ دکھایا جائے' وہاں دلوں کو بھی مانجھا جائے تاکہ ٹیڑھ بالکل نکل جائے اور قلب کے اندر استقامت پیدا ہو ___ اس کے لئے مجاہدے کی' ریاضت کی' کثرۃِ ذکر کی اور کثرتِ نوافل کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ قلب کا تعلق اللہ سے صحیح قائم ہو اور جو چیز اتر کر آئے وہ صحیح طور پر آدمی کے دل میں آئے' دل الٹا نہ ہو کہ اوندھی چیز سمجھ میں آئے اسی کو وَيُزَكِّيهِمْ میں بیان فرمایا گیا کہ نفوس کا تزکیہ کرو اور نفوس کو مانجھو ___ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نفوس کو مانجھا بھی اور حضرات صحابہؓ کا تزکیہ کیا' مکّہ کی زندگی درحقیقت تزکیہ کی زندگی تھی۔ مکّہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرہ برس گزرے ہیں اس میں یہ حکم تھا کہ اگر تم پر کوئی سختی بھی کرے تو جواب مت دو' کوئی مارے تو چپ رہو' کوئی گالیاں دے تو جواب مت دو۔ بس اتنا کام ہے کہ کلمۂ حق کہتے رہو' باقی مقابلہ مناظرہ' مجادلہ مت کرو۔ قرآن میں فرمایا گیا' فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ درگذر کرو' مقابلہ مت کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوتوال بنا کے نہیں بھیجا گیا' داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے اگر حق کے راستہ میں سختی آئے تو اسے آپ جھیلیں فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر کریں جس طرح اُولوالعزم انبیاءؑ نے صبر کیا ہے' مار کا جواب مارسے' لاٹھی کا جواب لاٹھی سے اور گالی کا جواب گالی سے نہ دیں ___ صبر و تحمل اختیار کریں۔ تو پہلا مجاہدہ تو یہی تھا کہ اڑی کڑی جھیلو سختیاں سہو اور اُف تک نہ کرو۔ اولاً اس سے قلوب منجھے' پھر انہی حضرات کو ریاضتیں کرائیں۔ رات کو نوافل میں مصروف' دن کو تسبیح و تہلیل میں مصروف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی نگرانی فرماتے تھے کہ صحابہؓ کی رات کی زندگی کیسی ہے دن کی زندگی کیسی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو گھومتے تھے کہ کسی گھر کے اندر سے کوئی بُری آواز تو نہیں آرہی ___ ان کی گھریلو زندگی صحیح ہے غلط ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو ترقّب کے طور پر (گویا نگرانی کے طور پر) اٹھے صدیقِ اکبرؓ کے گھر سے گزر ہوا تو وہ قرآن اتنا آہستہ آہستہ پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے بھی سننا مشکل تھا۔ گویا بہت ہی آہستہ آہستہ ___ آگے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کا مکان آیا تو وہ اتنے زور سے پڑھ رہے تھے کہ سارا محلّہ گونج رہا تھا' گویا بہت زور سے۔ صبح کو دونوں دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ فرمایا! اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! لاادعو اصم ولاغائب ...

اسے پکار رہا تھا جو غائب بھی نہیں ہے اور بہرا بھی نہیں ہے میں تو پروردگار کو سنا رہا تھا جو ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ مجھے چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً میں آہستہ ہی تو پڑھ رہا تھا اور اللہ تو دل کی کھٹک کو بھی سنتا ہے' مجھے چلانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا چلا کے کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے اپنی شان کے مطابق جواب دیا کہ اطرد الشیطان واوقظ الوسنان سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ چونکہ وہ اشدھم فی امراللہ عمرؓ ہیں۔ تو وہی شدت ان کے عمل میں بھی ہے۔ یہ ارحم امتی بامتی ابوبکرؓ ہیں ہر چیز میں ان کے ہاں رحمت' دھیما پن اور نرمی چھپی ہوتی ہے' انہوں نے اپنی شان کا جواب دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوبکرؓ! تم ذرا آواز کو کچھ بلند کردو اور اے عمرؓ! تم ذرا پست کرو تاکہ اعتدال قائم ہوجائے۔ افراط و تفریط سے عمل بچ جائے۔

یہ جائز ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا۔ زور سے پڑھنا بھی جائز ہے آہستہ بھی۔ یہ دلوں کی کلیں درست کرنے کا مسئلہ تھا کہ دل رفتارِ اعتدال پر آجائے۔ نہ افراط ہو نہ تفریط نہ زیادتی ہو نہ کمی' اس لئے کہ اسلام کا اصول ہی یہ ہے کہ اخلاق میں اعتدال' اعمال میں اعتدال' عقائد میں اعتدال۔ الغرض ہر چیز میں اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔

ہر عمل میں اعتدال

اعمال کے بارے میں فرمایا لاتشددوا فیشدد اللہ علیکم اعمال میں شدت مت اختیار کرو کہ اللہ بھی تم پر شدت کرنے لگے اور پھر کسی شدت کا مطالبہ ہو اور نباہ نہ سکو اور گناہگار بنو۔ تو تشدّد مت کرو اطمینان اور درمیانہ چال کے ساتھ عمل کرو۔

حضرت امّ سلمہؓ مسجد میں عبادت کیا کرتی تھیں۔ تو ایک رسی چھت میں لٹکادی تھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ فرمایا یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا گیا' ام سلمہؓ عبادت کرتی ہیں' جب نیند آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا پکڑتی ہیں تاکہ نیند میں جھوکے نہ کھائیں اور عبادت میں مصروف رہیں ___ فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آئے' پڑ کے سو رہو' لاتفریط فی النّوم نیند میں کمی مت کرو۔ جتنی عادت طبعی ہے اسے پورا کرو' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال میں اعتدال رکھو۔ اتنا دوڑ کے مت چلو کہ آگے جا کے ٹھوکر لگے اور گر جاؤ اور پھر چلنے کے قابل نہ رہو۔

دوسری جگہ فرمایا سددوا وقاربوا وروّحوا واغدوا وشئ من الدلجۃ نرمی سے چلتے رہو' درمیانی چال چلتے رہو ___ کچھ دن میں اللہ کی عبادت کرو کچھ رات میں اللہ کا نام لے لیا کرو۔ مگر اتنا جس کو نباہ سکو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصول بیان فرمادیا خیر الاعمال مادیم علیہ وان قلّ بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی ہو چاہے وہ تھوڑا ہو ___ بہت سا عمل کیا اور تھک کر مہینہ بھر بیٹھ جائے تو وہ غلط ہے اور تھوڑا کیا اور اتنا سست کیا کہ اصل مقصد بھی ادا نہ ہوا۔ دونوں چیزیں یا افراط ہیں یا تفریط ہیں' اسی لئے درمیانی چال چلو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر نیند آئی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ رسی تھام کر چلو' رہبانیت اختیار کرو۔ اعتدال کے ساتھ چلو' نیند آئے تو پڑ کے سو رہو۔ جب آنکھ کھلے پھر اللہ کا ذکر کرو' یادِ خداوندی کرو ___ تو بہرحال اسلام میں اعتدال ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نگرانی فرمائی ___ اور

حضرت عمرؓ کو فرمایا کہ ذرا آواز پست کرلو۔ صدیق اکبرؓ سے فرمایا کہ تم ذرا آواز اونچی کرو تاکہ اعتدال پیدا ہو جائے یہ جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا۔ جو شرع کا موضوع ہے۔ یہ دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دل کی تربیت اور تزکیہ بھی فرماتے تھے۔

دردِدل کا علاج

دلوں میں کھٹک پیدا ہوئی تو فوراً علاج فرماتے تھے' اس کا جائز وناجائز سے تعلق نہیں تھا' قلب کی کیفیات سے تعلق تھا ___ بعض صحابہؓ حاضر ہوئے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم میں ایمان باقی نہیں ہے اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں' تو ایمان اور عمل دونوں کا خانہ درہم برہم ہوگیا ہے' تو عمل مقبول ہی نہیں ہوگا۔ (اس لئے عمل کرنے کا کیا فائدہ؟ گویا عمل میں تعطل پیدا ہوا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کیا ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ایمان باقی نہیں رہ سکتا ___ فرمایا کیا وسوسہ ہے؟ عرض کیا دل میں ایک سوال پیدا ہوتا کہ من خلق الارض زمین کس نے بنائی؟ جواب ملتا ہے اللہ نے بنائی۔ سوال ہوتا ہے کہ آسمان کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے اللہ نے بنایا۔ چاند' سورج کس نے بنائے کہ اللہ نے بنائے' ان سارے جوابات سے دل میں ایک اصول پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہر موجود کے لئے موجد کی ضرورت ہے۔ ہربنی ہوئی چیز کے لئے کوئی بنانے والا ہونا چاہئے۔ بغیر بنانے والے کے شی نہیں بنے گی ___ تو ہمارے دل میں یہ خطرہ آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے۔ پھر اس کو کس نے بنایا ___؟ (نعوذ باللہ منہٗ) اور جب یہ دل میں وسوسہ آگیا تو کہاں ایمان باقی رہا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج فرمادیا اور ایک منٹ میں علاج ہوگیا۔ فرمایا کہ یہ جو وسوسہ آتا ہے اسے اچھا سمجھتے ہو یا بُرا ___ عرض کیا کہ اتنا بُرا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہوجانا گوارا ہے۔ یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے ___ فرمایا فاک صریح الایمان یہی تو ایمان ہے وہ ایمان ہی تو بتلا رہا ہے کہ یہ وسوسہ بُرا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو دل وسوسوں کو قبول کرتے تم سمجھ گئے کہ ایمان نہیں رہا ___ ایمان تھا جبھی تو اس وسوسہ کو بُرا جانا ایمان نہ ہوتا تو کبھی بھی بُرا نہ جانتے۔ یہی ایمان کی علامت ہے۔ جیسے کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے' من سرتک حسنتک وسائت سیئتک فانت مؤمن نیکی کرکے دل میں خوشی ہو اور بدی کرکے طبیعت میں انقباض پیدا ہو تو تم مؤمن ہو۔ اگر نیکی کرکے خوشی نہ ہو اور بدی کرکے کدورت نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے ایمان نہیں ہے عادت پڑی ہوئی ایک رسم ہے۔ وہ عملِ صالح نہیں ہے ___ تو اصل چیز یہی ہے کہ قلب درست ہوجائے تو سارا بدن درست ہوجائے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا۔ وفی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ' الا وھی القلب انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا گاجر کی شکل کا ہے (صنوبری شکل کا) اگر وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے اور دل غلط ہے تو نیت بھی غلط' عمل بھی غلط' ارادہ بھی غلط' جذبات بھی غلط' ہر چیز اول سے لیکر آخر تک غلط ہوتی چلی جائے گی۔

حضرات انبیاء علیہم السّلام کا موضوع

اس واسطے انبیاء علیہم السلام نے قلبِ انسانی کو اپنا موضوع ٹھہرایا ہے کہ قلب کو درست کردو تاکہ سارا انسان درست ہوجائے جیسا کہ فلسفیوں نے اپنا موضوع دماغ ٹھہرایا ہے کہ عقل درست کردو تو دنیا کی زندگی

بن جائے گی۔ آدمی چاہے برباد ہو جائے۔ وہ عقل سے کام لیتے ہوئے محض اسی کو درست کرتے ہیں تو عقل سے آدمی کچھ آرائش، کچھ زینت کر لے گا، لیکن عقل سے قلوب سنور جائیں یہ ممکن نہیں۔ قلوب تو ذکر اللہ اور یاد خداوندی سے سنبھلیں گے قلوب کو سنوارنا عقل کا کام نہیں۔

تو فلسفیوں نے عقل کو موضوع ٹھہرایا اور انبیاء علیہم السلام نے دل کو موضوع ٹھہرایا وہ دل درست کرتے ہیں تاکہ سارا انسان درست ہو جائے اور فلاسفہ دماغ درست کرتے ہیں۔ اس سے دماغ درست ہو جاتا ہے۔ قلب چاہے برباد ہو۔ قلب کے اخلاق چاہے تباہ ہو جائیں، اعمال برباد ہو جائیں۔ اس سے انہیں غرض نہیں مگر عقلی زینتیں اور آرائشیں باقی رہ جائیں ___ لیکن ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ نہ دنیا بنتی ہے نہ آخرت بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے ہر اگلے نے پچھلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی ہے اور کہا کہ میرے اوپر اس وقت تک ایمان نہیں بنے گا۔ جب تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے۔ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے۔ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر تمام انبیاء علیہم السلام پر جب تک ایمان نہ ہو (حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) تو مجھ پر بھی ایمان نہیں۔ چنانچہ اعلان فرمایا کہ :

قُولُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ۔

کہدو اور علی الاعلان پکار کر کہدو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اللہ نے جو ہم پر نازل کیا اس پر اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر اور جو موسیٰ علیہ السلام پر اس پر بھی، تو سارے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا اور فرمایا لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ہم ان میں تفریق نہیں کرتے یکساں طور پر سب کو اللہ کا حقانی فرستادہ جانتے ہیں ___ تو ہر نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی اور پھر پچھلے نے اگلے کی پیشین گوئی کی کہ اس کی بات ماننا ورنہ مجھے بھی نہیں مانا۔ تو یہ ایک عجیب سلسلہ ہے کہ اگلے پچھلوں کی تصدیق کر رہے ہیں، پچھلے اگلوں کی تصدیق کر رہے ہیں ___ اور اس کے بالکل برعکس فلاسفہ میں سے جو اگلا آتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا نظریہ درست ہے پچھلے سارے احمق تھے۔ انہوں نے کچھ نہیں کیا، ایک نے کہا تھا کہ زمین حرکت کرتی ہے سورج حرکت نہیں کرتا۔ پچھلے لوگوں نے کہا تھا کہ زمین ساکن ہے وہ غلط کہتے تھے۔ وہ احمق تھے، تو ان کی تحمیق کی اور اپنا نظریہ ثابت کیا ___ کسی نے کہا کہ عالم قدیم ہے۔ جس نے کہا کہ حادث ہے، وہ احمق تھا۔ جس نے کہا کہ حادث ہے اس نے کہا کہ قدیم کہنے والا احمق تھا۔ تو ہر ایک دوسرے کی تحمیق اور تجہیل کرتا ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں کہ سارے احمق ہیں سارے جاہل ہوں گے۔

جب ہر ایک دوسرے کو احمق بتلا رہا ہے تو دانش مند کون باقی رہا، اس کے نزدیک یہ احمق اس کے نزدیک وہ احمق۔ تو (فلسفہ کیا ہوا یہ تو) حماقتوں کا مجموعہ ہوا۔ (گویا ہر ایک دوسرے کو جھٹلا رہا ہے) تو مسلمان کا مدار تصدیق پر ہے تکذیب پر نہیں ہے۔ اور تصدیق ہی ایمان کا نام ہے۔ گویا ایمان ماننے کا نام ہے نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے۔ نہ ماننے کو تو کفر کہتے ہیں اور ماننے کا تعلق قلب سے ہے۔ اسے واسطے حضرات انبیاء علیہم السلام نے قلوب کا سلسلہ اختیار کیا کہ قلب کو درست کیا جائے۔

امت کے فرائض

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چار فریضے عائد کئے گئے تلاوت

آیات، تعلیم کتاب، تعلیم اسوۂ اور تزکیۂ نفوس ___ اور یہ پوری امت بحیثیت مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے۔ یہی چاروں فریضے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اس کا فریضہ ہے کہ پہلے تلاوۃ آیات کرے، قرآن کی آیات کے الفاظ پڑھ کر سنائے۔ ایسے مدارس ہوں جن میں قرآن کے الفاظ سکھلائیں جائیں۔ خواہ ناظرہ پڑھائیں یا حفظ پڑھائیں مگر قرآن کے الفاظ محفوظ رہیں کیونکہ انہی الفاظ میں معانی ہیں۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ امت میں معلمین بھی ہوں تاکہ وہ تعلیم دیں۔ اس واسطے کہ دین کے بارے میں رائے معتبر نہیں۔ قرآن ہو یا حدیث ہو وہ نقل کی جائے گی۔ سلف کے دائرے میں محدود رہ کر قرآن کے معنی متعین کئے جائیں گے۔ اگر سلف کا دامن چھوٹ گیا اور رائے زنی آگئی تو ہوائے نفس پیدا ہوگی، نفس میں آزادی پیدا ہوگی تو آدمی دین کا تبع نہیں رہے گا نفس کا تبع بن جائے گا ___ اس واسطے ہوائے نفس سے روکنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ تعلیم مراد بیان کی جائے کہ اللہ کی یہ مراد ہے اور یہ بغیر تعلیم کے نہیں ہوسکتی۔ معلم کہتے ہی اس کو ہیں جو مرادات اور مطالب خداوندی کو بیان کردے۔

اسی کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ عمل کا نمونہ بھی کر کے بتلائے، ہم آج جو نماز پڑھتے ہیں محض اس لئے صحیح نماز پڑھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ اگر پڑھنے والوں کا نمونہ سامنے نہ ہو تا کبھی نماز صحیح نہیں پڑھتے۔ فقہ کی آپ ساری کتابیں دیکھ لیں۔ رکوع، سجدے کے معنیٰ معلوم کرلیں۔ اس وقت تک نماز پڑھنی نہیں آئے گی جب تک نمازیوں کی ہیئت سامنے نہیں ہوگی اس ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اگر آپ محض کاغذوں سے نماز اخذ کریں گے تو دس ہزار قسم کی نماز ہوجائے گی۔ کیونکہ عقلیں مختلف ہیں اپنی اپنی عقل سے جو جس کی سمجھ میں آگیا اسی پر عمل کرے گا۔ تو نماز کے ہزاروں ڈھنگ بن جائیں گے۔ ایک دین کے لاکھوں دین بن جائیں گے اس لئے ان بیانات کا پابند ہونا پڑے گا۔ جن سے اسوہ اور عمل نبوی متعین ہو۔ اسی کی پیروی کرنی پڑے گی ___ اسی طرح مرادات میں پیروی کرنے پڑے گی۔ رائے کا دخل نہیں ہوگا اگر قرآن کے محض الفاظ کو سامنے رکھ لیں اور کوئی معلم و مربی نہ ہو ضروری نہیں کہ ہم مراد ربانی سمجھ جائیں۔ بلکہ آپ کے نفس میں جو کیفیت غالب ہوگی۔ وہی معنی آپ سمجھیں گے۔ تو لازمی ہے کہ آپ متعین طریق پر وہی سمجھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سمجھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھایا ہے وہ وہ ہے جو حضرات صحابہؓ سمجھے اور صحابہؓ نے جو سلف اور ائمہ کو سمجھایا آپ وہی سمجھیں گے۔ اس کے بغیر آپ مرادات ربانی تک نہیں پہنچ سکتے۔

کتاب اور شخصیت دونوں ضروری

تو کتاب کی بھی ضرورت ہے۔ نہ محض کتاب کافی ہے نہ محض شخصیت کافی، اگر شخصیت تنہا ہو اور کتاب اللہ سامنے نہ ہو تو شخصیتوں پر ذاتی احوال بھی تو گزرتے ہیں۔ ان ذاتی احوال میں کچھ ان سے ایسے افعال بھی سرزد ہوئے ہیں اگر ان کے سارے افعال شریعت بن جائیں تو شریعت اور غیر شریعت مخلوط ہو کر رہ جائے گی۔ اصلی دین باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح غلط اقوال اور احوال ہیں ___ مثلاً ایک شخص صاحبِ حال ہے۔ اس حال میں اس نے ایک "وجدیہ کلمہ" کہا۔ اپنے نزدیک وہ سچا ہے حال بھی درست ہے مگر وہ قانون نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو تلقین کریں۔ قانون وہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔

اگر منصورؒ نے انا الحق کہا تو یہ کوئی قانون نہیں کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہا جائے کہ لوگو تم بھی "انا الحق" کہا کرو ___ حالانکہ ہم یہ کہیں گے کہ منصور کا دعویٰ حق ہے، کیونکہ وہ فنافی اللہ کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے اور

فنا کے مقام پر پہنچ کر اپنا نفس او جھل ہوتا ہے۔ اپنے نفس میں بھی نگاہ کرتے ہیں تو جلوۂ خداوندی ہی نظر آتا ہے۔ ایسے میں کوئی انا الحق کہے۔ تو اس کے سامنے اس کا نفس ہی نہیں' انا تو وہاں ہے ہی نہیں۔ وہاں تو انت ہی انت ہے۔ آپ ہی ہیں جہاں کہیں ہیں ؎

ہرچہ دیدم در جہاں غیر تو نیست یا توئی' یا خوئے تو یا بوئے تو

میں دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہوں تیرے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی یا تیری ذات ہے یا "خوئے تو" تیری صفات ہیں یا "بوئے تو" تیرے افعال ہیں۔ ان سے دنیا آباد ہے ___ تو اس مقام پر جو پہنچ جائے اس کا نفس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا بھی ختم ہو جاتی ہے اور جلوۂ حق ہی بس سامنے رہ جائے گا وہ باہر دیکھے گا تو کہے گا انت الحق اپنے اندر دیکھے گا تو انا الحق کہے گا تو وہاں "انا" اپنے لئے نہیں ہے نہ "انت" دوسروں کے لئے ہے وہ تو حق کا اظہار کرتا ہے' تو منصورؒ کی زندگی کو ہم بھی سچی سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ قانون نہیں ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر آپ تلقین کریں' قانون تو صرف شریعت ہے' جس کی تلقین کی جائے گی ___ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے اور شریعت قانونِ عام کا نام ہے۔ ہر کس و ناکس کے لئے جو پیغام ہے وہ شریعت ہے۔ شخصی احوال میں جب آپ اس حال میں پہنچ جائیں گے تو ہم آپ کو سچا جانیں گے' آپ کی عظمت کریں گے اس حال کو بھی سچا جانیں گے۔ مگر اسے قانون بنا کے پیش نہیں کریں گے۔ ہر شخص کا حال الگ الگ ہے۔ ایک کا حال دوسرے کے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال قانونِ عام شریعت ہے اسٹیج پر اسی کو پیش کیا جائے گا۔ زید' عمرو' بکر اپنے اپنے احوال پیش نہیں کر سکتے۔ صرف قول پیغمبر پیش ہوگا اور افعال پیغمبر پیش ہوں گے۔ وہی شریعت ہیں۔ کسی اور کا قول و فعل شریعت نہیں ہے۔

اسی طرح اگر میرا کوئی حال ہے۔ صحیح ہے تو اللہ کے ہاں مقبول ہوں' حال غلط ہے تو اللہ کے ہاں نامقبول۔ بہر حال وہ شخصی بات ہوتی ہے قانونی بات نہیں ہوتی' اس واسطے قانون کی ضرورت پڑی اور قانون کے ساتھ شخصیت کی بھی۔ تو محض شخصیت ہو تو شخصیتوں کا مذاق ہو جائے' خاندان پرستی اور شخصیت پرستی شروع ہو جائے گی اور شخصیت سے جو سرزد ہو جائے وہ شریعت بن جائے گی' شریعت غیر شریعت مخلوط ہو جائے گی۔ اس لئے شخصیتوں کے حال کے لئے "کتاب اللہ" کسوٹی ہے اس پر پرکھ لو۔ اگر اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے مطابق نہیں ہے تو سکوت اختیار کرو۔

تو شخصیت اور کتاب دونوں کی ضرورت ہے۔ پیغمبر کی بھی ضرورت ہے اور قانونِ الٰہی کی بھی ضرورت۔ نہ محض قانون کافی نہ محض ذات کافی ہے۔ پیغمبر کی ذات تو معصوم ہے لیکن بعد میں جو ذوات آئیں گی وہ تو معصوم نہیں ہیں۔ غلط فہمی بھی لگی ہوتی ہے' غلط احوال بھی لگے ہوتے ہیں۔ جب یہ ساری چیزیں شریعت بن جائیں گی تو شریعت اور غیر شریعت خلط ہو جائے گی۔ دین کے اوپر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس لئے شخصیتوں کو کتاب کے معیار پر پرکھیں گے اور کتاب کے معانی شخصیتوں سے سمجھیں گے۔ اسی طرح سے دین چلے گا اور صحیح ہدایت پر لوگ پہنچیں گے۔

کیا صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہؒ معیارِ حق ہیں؟

تو میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر قیامت تک ہدایت کے یہی دو طریقے مقرر کئے ہیں۔ ایک قانونِ خداوندی اور ایک شخصیت جو کہ مقبول شخصیت ہو اور وہ انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں ہیں جو کہ معصوم ہیں۔

اولیائے کرام ـــــ ان کی عظمت واجب ہے۔ گو وہ معصوم نہیں۔ مگر خاص مقربین اور اولیاء اللہ محفوظ ضرور ہوتے ہیں۔ مِن جانب اللہ ان کی حفاظت کی جاتی ہے ان کو مِن جانب اللہ برائی سے روکا جاتا ہے۔ اگر نفس لے بھی چلے تو اللہ تعالیٰ اس طرف انہیں جانے نہیں دیتے۔ حفاظتِ خداوندی شامل حال ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود امکان ہے کہ غلط فہمی ہو جائے۔ امکان ہے کہ عمل غلط ہو جائے اور جب امکان آگیا تو قطعیت نہ رہی اور دین قطعی حکم کا نام ہے۔ ظنی اور امکانی چیز کا نہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کی حد تک تو بات صحیح کہ ان کا قول و فعل ہے وہ شریعت ہے لیکن دوسرے لوگوں کے حق میں یہ بات نہیں ہے کہ ان کا ہر قول و فعل شریعت بنا دیا جائے۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ وہ شریعت کا معیار تو نہیں ہیں کہ وہ شریعت بنا دیں۔ وہ شریعت بنائیں گے تو نہیں البتہ شریعت کے متبع ہیں۔ تو شریعت کے حق میں تو معیار نہیں کہ وہ شریعت بنانے لگیں لیکن فرقوں کے حق میں اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں معیار قرار دیا ہے۔ فرقوں کا حق و باطل صحابہؓ کے ذریعہ پرکھا جائے گا ـــــ حدیث میں فرمایا گیا **افترقت بنو اسرائیل علی ثنتین وسبعین فرقة** بنی اسرائیل بہتر ۷۲ فرقوں پر بٹ گئے اور میری امت تہتر ۷۳ فرقوں میں بٹے گی **کلھم فی النار الا واحدة** سب کے سب عقائد کی وجہ سے اہلِ جہنم بنیں گے صرف ایک ہی فرقہ حق پر رہے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا **مَن ھم یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟** وہ کون ہوں گے؟ فرمایا **ما انا علیہ الیوم واصحابی** جس پر آج میں ہوں اور میرے صحابہؓ قائم ہیں وہی فرقوں کے حق و باطل پہچاننے کا معیار ہیں ـــــ تو صحابہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے ساتھ شامل کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ فرقوں کے حق میں کہ کون سا فرقہ باطل ہے یا حق ہے' کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی معیار ہے اور آپ کی ذات عالی کے بعد صحابہؓ بھی معیار ہیں۔

اس لئے پہلی چیز ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی فرقے کو صحابہؓ سے محبت بھی ہے یا نہیں؟ اگر صحابہؓ سے عداوت ہے تو یقیناً وہ باطل ہے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ہوئی۔ اس لئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **من احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم**

جو میرے ساتھ محبت کرے گا اس محبت کی بنا پر صحابہ کرامؓ کی محبت آئے گی۔ جو میرے ساتھ بغض رکھے گا تو صحابہ کرامؓ کے ساتھ بھی اسے بغض پیدا ہوگا۔ اور عام لفظوں میں فرمایا کہ **حب العرب من الایمان وبغض العرب من النفاق۔**

نسبت کی وجہ سے عربوں کی محبت ایمان کی علامت ہے اور بغض نفاق کی علامت ہے' بہرحال فرقوں کے حق میں پہلی بات یہ دیکھیں گے کہ ان کو صحابہؓ سے محبت بھی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کہیں گے یہی باطل ہونے کی علامت ہے، تو محبت لازمی ہے اگر صحابہؓ سے عداوت ہے تو وہ فرقہ حق نہیں بن سکتا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہؓ سے ہمارا تعلق محض تاریخی نہیں ہے کہ انہوں نے سند اً دین کی روایتیں ہم تک پہنچا دیں اور ہم نے قبول کر لیں۔ گویا وہ چھٹی رساں ہیں کہ انہوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے وہ پورے امانت' دیانت سے پہنچا دیا۔ اس سے زیادہ کوئی کام نہیں۔ ایسا نہیں۔ یہ تو تاریخی واسطہ ہوا صحابہؓ سے ہمارا تعلق عشقی اور محبتی ہے۔ حضراتِ صحابہ کرامؓ کے ہم عاشق ہیں اور عاشق کا کام یہ ہے کہ اپنے محبوب کے اندر محو ہو۔ وہ محبوب کے اوپر تنقید نہیں کرے گا۔ یہ کام غلط کیا یہ حسن و جمال غلط ہے۔ یہ چیز اس کی صحیح نہیں ہے۔ وہ عاشق ہی کیا ہوا جو ایسا ہو۔ صحابہؓ کے ساتھ عشقی تعلق ہے محض تاریخی تعلق نہیں ہے۔

اس واسطے حضرات صحابہ کرامؓ فرقوں کے حق وباطل کے پہچاننے میں معیار بنیں گے۔
پھر دیکھا جائے گا کہ ان کے عقائد صحابہؓ کے عقائد کی مانند ہیں کہ نہیں؟ مطابق ہیں تو حق پر ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو باطل پر ہیں۔ اس حد تک صحابہؓ معیار ہیں۔ صحابہؓ سے شریعت تو نہیں بنتی کہ وہ بنادیں کہ شریعت ہے' البتہ فرقوں کے حق میں صحابہؓ کسوٹی ہیں۔ اس پر نقد اور تبصرہ کرکے ہم پہچان لیں گے کہ یہ حق ہے یا باطل ہے۔ تو جو عداوت رکھے گا وہ بھی باطل' جو بغض رکھے گا وہ بھی باطل' جو گالم گلوچ کرے گا وہ بھی باطل ہے تو ایسے تمام فرقے باطل پرست ہوں گے اور جو عشق ومحبت کرے' عظمت کرے وہی فرقہ حق پر ہوگا۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا کمالِ تقویٰ

اہل سنّت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ **الصحابۃ کلھم عدول** تمام صحابہؓ متقی اور عادل ہیں۔
قرآن کریم نے من حیث **الطبقہ** جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ صرف صحابہؓ ہیں کہیں فرمایا **رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ** اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ کہیں فرمایا **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی** اللہ نے پہلے ہی جانچ لیا تھا ان کے دلوں کو کہ یہ تقویٰ شعار ہیں۔ تو صحابہؓ کے کمالِ تقویٰ کی شہادت قرآن نے دی ہے۔
یہ ہوسکتا ہے کہ کسی صحابی سے کوئی غلطی ہوجائے۔ حتیٰ کہ عوام صحابہؓ سے معصیت بھی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ ایک متقی آدمی بھی گناہ کرسکتا ہے۔ وہ گناہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ جس کی جڑیں دل میں جمی ہوئی ہوں۔ دل میں تقویٰ جما ہوا ہو۔ باہر سے یا گردوپیش کے حالات میں مبتلا ہوکر گناہ کر گزرے اور اندر سے دل میں نفرین کی اور توبہ کی' دل سے نادم ہوا یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے ___ تو صحابہؓ کے تقویٰ باطن کی شہادت قرآن نے دی ہے' اگر کوئی عملی غلطی ہوجائے تو ان کے تقویٰ میں ذرہ برابر فرق نہیں پائیں گے۔ قرآن کریم میں خود فرمایا گیا **اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ** وہ لوگ متقی ہیں اگر شیطان کا کوئی گروہ انہیں چھوجاتا ہے اور کسی گناہ پر مائل کرتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں کہ یہ شیطان کہاں آگیا لاحول پڑھتے ہیں۔ توبہ کرتے ہیں ___ اسی سے معلوم ہوا کہ شیطان چھو تو سکتا ہے اور اپنا اثر بھی ڈال سکتا ہے مگر پھر بھی ___ کہا گیا کہ "یہ لوگ متقی ہیں" ___ تو صحابہؓ کے تقویٰ باطن کی شہادت اللہ نے قرآن میں دی ہے۔ عمل میں کوئی غلطی ہو تو اس کا امکان ہے۔ لیکن بُرا عمل بدنیتی سے کریں یہ نہیں ہے' تقویٰ موجود ہے۔ خطاءِ اجتہادی ہوگی۔
حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں جو جنگ ہوئی ہم کہتے ہیں خطاءِ اجتہادی تھی اور **المجتھد یخطی ویصیب** مجتہد خطا بھی کرسکتا ہے' صواب بھی کرسکتا ہے۔ خطا کرلے گا تو ایک اجر ملے گا۔ صواب کرے گا تو دوہرا اجر ملے گا۔ تو معصیت پہ تھوڑا ہی اجر ملتا ہے۔ معلوم ہوا کہ خطاءِ اجتہادی معصیت نہیں ہے۔ ورنہ اجر نہ دیا جاتا۔ تو مجتہد ہر صورت میں اجر کا مستحق ہے ___ تو صحابہؓ سے مسائل میں خطاءِ اجتہادی واقع ہوئی ہے۔ جنگیں بھی ہوئی ہیں' مناظرے بھی ہوئے' مباحثے بھی ہوئے۔ مگر تقویٰ باطن دونوں جگہ قائم ہے۔ خطاءِ فکری اور اجتہادی خطا ہوگی اور خطاءِ اجتہادی پر بھی اجر ملتا ہے۔ تو ان کی خطا کو معصیت کہنا یہ ضلال اور گمراہ ہونے کی علامت ہے۔
بہرحال بات دور چلی گئی میں تو صرف یہ عرض کررہا تھا کہ یہ امت بحیثیت مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے۔ پیغمبر کے جو چار کام تھے وہی کام امت کو کرنا چاہئے۔ تعلیم کتاب' تزکیۂ نفوس' تعلیم عمل' تعلیم اُسوہ اور

تلاوتِ آیات یہ ساری امت کا فرض ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرائے۔ ناظرہ ہو یا حفظ مگر الفاظ قرآن کے سامنے رہیں اور معانی و مضامین اس حد تک ضروری ہیں جس سے ہم دین سمجھ کر دیندار بن سکیں۔ سب کا عالِم بننا ضروری نہیں ہے' وہ فرض کفایہ ہے۔ ہزار دو ہزار میں ایک بھی عالِم بن جائے وہ کافی ہے۔

ہاں ساری امت خالی ہو جائے ایک بھی نہ ہو۔ پھر سارے گنہگار ہوں گے' تو سب کا عالِم بننا ضروری نہیں مگر سب کا دیندار بننا ضروری ہے اور دیندار بننے کے لئے اتنی معلومات لازمی ہیں جس سے ہم روزمرہ کے عمل کو درست کر سکیں۔ ہم نماز کیسے پڑھیں' زکوٰۃ کس طرح ادا کریں' روزہ کس طرح رکھیں' حج کے کیا فرائض ہیں' کیا واجبات ہیں کیا سنتیں ہیں۔ اتنی معلومات لازمی ہیں۔ بچوں کے لئے بھی تعلیم کا اتنا اہتمام ضروری ہے۔ خواہ وہ مدرسہ کی صورت میں ہو یا سوسائٹی کی صورت میں ہو یا تلقین کی صورت میں ہو۔

تعلیم و تربیت کے درجات

تو اعلیٰ ترین صورت تو تعلیم ہے کہ معلّم اپنی صحبت اور معیّت میں رکھ کر اسے سمجھائے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگے۔ تاکہ وہ تقویٰ شعار بنیں۔ اعلیٰ طریق یہی ہے اور یہی طریق انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ صحابی کو صحابی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ صحبت یافتہ ہے اور اسی لئے استاذ شاگردی کی اصطلاح سلف میں یہی تھی' اصحاب ابی حنیفہؒ' اصحابِ محمدؒ' اصحابِ شافعیؒ۔ یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ صحبت یافتہ بھی ہیں۔ انہوں نے محض کتاب نہیں پڑھی بلکہ معیّت سے قلب کا رنگ قلب تک بھی پہنچا ہے۔

قرآن میں فرمایا گیا : صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

تو اعلیٰ طریق تو تعلیم و تدریس ہے۔ اس سے ادنیٰ درجہ لٹریچر ہے۔ بشرطیکہ اس کا سمجھانے والا بھی کوئی ہو۔ لٹریچر میں آزاد مت ہو کہ جس کا جو جی چاہے سمجھ لے' اس کو بھی سمجھانا پڑے گا۔ اگر وہ اردو یا انگریزی میں ہو گا۔ آپ کے ہاں انگریزی میں نہیں ہے' اردو میں بہت سے ایسے رسالے چھپ گئے ہیں جن میں عقائد کے' اخلاق کے' ایمان کے ابواب کا تفصیلی ذکر ہے اس زبان میں تراجم ہو جائیں۔ ان کا مطالعہ ہو اور تفہیم بھی ہو۔ اس سے بھی نیچا درجہ گو وہ بھی ضروری ہے۔ ماں باپ کی تلقین ہے' اس لئے کہ بچے کو جو ابتداءً تلقین کریں گے۔ وہ پتھر کی لکیر بنے گی۔ بڑھاپے تک اس عمل کی عادت باقی رہے گی۔ تو ماں باپ کی تلقین اصل ہے' ماں کی گود تو بچہ کے لئے پہلا مدرسہ ہے اگر ماں کی گود علم سے خالی ہے تو بچے تک کیا چیز پہنچی گے؟ باپ خود بھی مسائل سے خالی ہے تو بچے تک کیا پہنچے گا؟

نئی نسل کی تربیت کا راز

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ فکر آپ کی بجا ہے کہ ہماری نسلیں خراب نہ ہوں' ان میں ایمان باقی رہے۔ یہاں ہر جگہ میں نے یہ فکر دیکھا اور اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ امریکہ میں جگہ جگہ شہروں میں جہاں جانا ہوا۔ یہ فکر ہر ایک کے دل میں ہے کہ میری نسل کسی طرح دین پر باقی رہے کوئی ایسی تدبیر ہو ___ تو میں نے کہا یہ بہت بڑا انعامِ خداوندی ہے کہ دلوں کے اندر یہ فکر ہے اور اس فکر کا ہونا بڑی نعمت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ فقط اولاد کا فکر نہ ہونا چاہیے اپنی بھی تو فکر ہو۔ جو حرکتیں تمہاری ہوں گی اس کی بچے نقل اتاریں گے۔ بچے میں بالطبع نقالی کی عادت ہے آپ نمازیں پڑھیں گے وہ بھی رکوع سجدے کرنے لگے گا' آپ بولیں گے وہ بھی اسی طرح بولنے کی مشق کرے گا' گالی والی دیں

گے تو آپ کو گالی دینے لگے گا۔

دیہات میں ہم کبھی جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ بھئی بچہ کیسا ہے؟ تو دیہاتی کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے اب گالی والی دینے لگا ہے تو ان کے ہاں دیہات میں گویا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بچہ گالی دینے لگے' اس لئے کہ ماں باپ کو گالی دینے کی عادت ہے تو اولاد میں بھی وہی عادت آئے گی ___ تو یہ فکر بالکل صحیح ہے کہ اولاد درست رہے۔ مگر یہ فکر جب مکمل ہوگی کہ اپنی بھی تو فکر کریں' ہم بھی تو درست رہیں' ہماری درستی سے اولاد درست ہوگی' ہم خراب ہیں تو اولاد بھی خراب رہے گی۔ **الناس علی دین ملوکھم** (لوگ اپنے بادشاہوں کا طریق اپناتے ہیں) تو گھر کے ملوک تو یہی ماں باپ ہی ہیں۔ جو ان کی روش ہوگی' وہ اولاد کی رَوِش ہوگی۔ **الناس علی دین ملوکھم** کے قاعدہ کے بموجب جتنی رعایا ہے وہ تو بادشاہ کے طریق پہ چلتی ہے۔ حکومت میں جو چیز پسندیدہ ہے عوام بھی اسے پسند کریں گے۔ تو گھر کی حکومت ماں اور باپ کے ہاتھ میں ہے۔ جو انہیں پسند ہوگا بچے بھی وہی پسند کریں گے ___ تو یہ فکر صحیح کہ بچے دین پر قائم رہیں۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ کچھ تلاوت ہو اور کچھ تعلیم مقاصد بھی ہو' کچھ عملی نمونے بھی ہو اور کچھ دلوں کا مانجھنا بھی ہو' رات دن کی تلقین بھی ہو صحیح ہے لیکن روک ٹوک بھی ہونی چاہئے۔ تو کہیں کچھ بات بنتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ **لاترفع عصا** اپنی اولاد سے کبھی لاٹھی مت اٹھاؤ۔ مطلب یہ کہ وہ تمہاری نگرانی میں رہیں چاہے وہ بوڑھے بھی ہو جائیں تب بھی تلقین جاری رکھو۔

فَذَكِّرْ اِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے۔ آیت جو میں نے پڑھی تھی اس آیت میں بہت سے علوم اور مضامین ہیں مگر نہ تو میں سارے مضامین ایک مجلس میں بیان کر سکتا ہوں اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ سارے مضامین مجھے معلوم بھی ہوں۔ یہ بڑے علماء کا کام ہے مگر جتنے ہیں میں وہ بھی نہیں ادا کر سکتا۔ اس لئے میں نے اجمالی طور پر آیت کی ایک سَرسَری تفسیر کردی اور راستہ بتادیا کہ اس راستہ پر آپ کو چلنا ہوگا ___ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے' حق تعالیٰ ہمارا دین اور دنیا دونوں درست فرمائے' اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ پر قائم رکھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بر سبیلِ تذکرہ

حامداً وّمصلّیاً

۷۔۸ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۱۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء دارالعلوم حقّانیہ کا وہ عظیم الشان سالانہ دستار بندی جلاس منعقد ہوا۔ جو ظاہری و معنوی امتیازات و برکات کے لحاظ سے دارالعلوم کی تاریخ میں امتیازی اور افادی حیثیّت سے دور رس نتائج کا حامل رہے گا۔ اپنی روایتی آب و تاب، مسلمانوں کے بے پناہ خلوص و محبت، کابرین و عمائدین ملک و ملت کی بزرگانہ و مخلصانہ ہمدردیوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلام فخر لاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہ مہتمم دارالعلوم کی شمولیت بابرکت نے اجلاس کی رونق، فادیّت اور کامیابی کو اوجِ کمال تک پہنچادیا۔ اللہ تعالیٰ کے بے پناہ انعامات و اکرامات ہی کا ثمرہ ہے کہ ابتداء تاسیس دارالعلوم حقّانیہ سے اکابرین، دیوبند و بزرگان مشائخ عظام کی مبارک توجہات اور نیک دعائیں اس جانب مبذول رہیں اور دارالعلوم حقانیہ نے اپنے مادر علمی، گہوارہ علم و عمل مرکز عقیدت، حصن حصین اسلام دارالعلوم دیوبند کے رشتہ محبت اور وابستگی کو سعادت و فلاح، کامیابی و ترقی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھا ہے۔ چنانچہ اس سال جب سالانہ اجلاس دستار بندی کے لئے حضرت المخدوم المعظم قاری صاحب مدظلہ کو دعوت دی گئی تو انہوں نے شرف پذیرائی بخشتے ہوئے مذکورہ تاریخیں مقرر فرما کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دارالعلوم میں قدم رنجہ فرمایا۔ ۲۱ اکتوبر کو فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی فرمائی اور جامع مسجد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان تقریبات میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کے علاوہ پاکستان کے اکثر اکابر "جیسے شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غور غشتی مدظلہ، حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی، شیخ الحدیث و التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی، علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا محمد مفتی نعیم لدھیانوی، مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی اور بے شمار ارباب علم و فضل موجود تھے۔ ۲۱۔ ۲۲ اکتوبر کی درمیانی رات کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی وہ بہترین سحرانگیز حکیمانہ تقریر ہوئی جس نے اہل علم و فضل و ارباب فکر و فہم اور عامۃ المسلمین کے ہزاروں کے مجمع کو گھنٹوں تک یکساں محور رکھا تھا۔ ہر ہر جملہ میں حضرت حجۃ الاسلام سیدنا الامام محمد قاسم النانوتوی کے انوار و تجلیات کی جھلک اور قاسمی علوم و معارف کا شان استدلال و عقلیت نمایاں تھا۔ مظہر انوار قاسمیہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے اپنے اس مخصوص روایتی دلکش خطاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں عقل و رایت کی پختگی کے ساتھ فلسفیانہ مگر عام فہم انداز میں کائنات عالم کے اس اشرف و اعلیٰ نوع مخلوقات انسان کی حقیقت اور پھر اس کے مقاصد و منافع تخلیق اور وجوہات افضلیت اور امتیازات خصوصیّت پر سیر حاصل بحث فرمائی اور اس ذیل میں بے شمار اسرار و حکم کی طرف رہنمائی کر کے فکر و نظر کے لئے ایک شاہراہ کھول دی۔ الحاد و دہریّت، سائنس اور مادیّت کے اس ہیجانی و طوفانی دور میں ایسے ہی استدلال، زور بیان اور تجربہ و حقائق سے مادیّت و مغربیّت زدہ پریشان اذہان و افکار کو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور گم گشتہ راہ انسانیت کو اپنی حقیقت و مقام سے شناسا کرایا جاسکتا ہے۔ آخر علوم الٰہیہ ربّانیہ کے سوا وہ کون سی خوبی ہو سکتی ہے جو اس ادنیٰ و ضعیف مخلوق خاکی انسان کو خلافت ربانی کے مقام جلیل پر کھڑا کر سکتی ہے؟ معارف نبوّت و رسالت کے سوا وہ کون سی روشنی ہے جس کو لے کر انسان ہدایت و سعادت کی بام رفیع "نیابت

نبوّت" پر فائز ہو سکتا ہے؟

انہی حقائق و معارف کی جانب حضرت قاری صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں ہماری رہنمائی کی
بیان کی دلکشی، تقریر کی جاذبیت، مضامین کی افادیت و جامعیت اور خود حضرت موصوف کی جامع الکمالا
پرکشش شخصیت نے مجمع میں **کان علی رءوسھم الطیر** کا منظر پیش کردیا تھا۔

اور جلسہ کے اختتام کے فوراً بعد ملک کے اطراف و اکناف سے اس تقریر کی مانگ شروع ہو گئی۔
دارالعلوم حقانیہ نے بھی ضروری سمجھا کہ ان ارشادات کو افادۂ عام کے لئے شائع کیا جائے۔ دوران تقریر
بعض حضرات خصوصاً برادر عزیز مکرم و محترم مولانا شیر علی شاہ صاحب فاضل و مدرس دارالعلوم حقانیہ نے
الوسع بلفظہ قلم بند کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ضبط بیان میں قدرے اجمال و کوتاہی ہونی لازمی تھی۔ جس
وجہ سے ضروری سمجھا گیا کہ حضرت قاری صاحب مسودہ تقریر پر نظر ثانی فرمادیں۔ چنانچہ اسی غرض سے
شدہ مسودہ حضرت موصوف کی خدمت میں دیوبند بھیج دیا گیا۔ حضرت قاری صاحب دام مجد ہم نے تو
اسفار، کثرتِ مشاغل کے باوجود گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر مسودہ پر نظر ثانی فرمائی۔ اور تو
تعبیرات تفصیل مضامین کے لئے خود حضرت کے الفاظ میں "باوجود غیر معمولی مصروفیت کے رات دن لگ
اسے مرتب کیا اور گویا سارا مسودہ از سرنو خود ہی لکھنا پڑا۔"

اس بنا پر اب یہ بصیرت افروز تقریر ایک گرانمایہ تصنیف کی حیثیت اختیار کرچکی ہے اور اگرچہ کچھ
سے شائع ہو رہی ہے لیکن قیمتی انسانوں اور بے شمار فوائد کی بنا پر یہ تکوینی تاخیر، خیر و حسن کا موجب بن
ہے۔ رب جلیل اس علمی و تبلیغی احسان کے بدلے حضرت قاری صاحب کو تمام اہل علم اور مسلمانوں
جانب سے اجر جزیل عطا فرمادے **شکر اللہ مساعیھم** اور قارئین کو فرمان خداوندی **وھدوا**
الطیب الآیۃ کے مصداق زمرہ میں شامل کردے، برادر محترم مولانا سیّد شیر علی شاہ صاحب شکریہ کے
ہیں، جن کی شبانہ روز سعی و محنت سے یہ گنج گرانمایہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ رہا ہے۔

تسہیل فہم اور ترتیب مضامین کے لئے عنوانات ضروری سمجھے گئے جو اس ناچیز کے لگائے ہوئے ہیں
اس لئے تعبیر مفہوم میں نقص و کوتاہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب
اہمیّت و عظمت کے بنا پر اسے ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا جائے۔ تاہم ناتجربہ کاری کی بنا پر پور
طور کامیابی نہیں ہو سکی۔ دوسرے ایڈیشن میں انشاء اللہ العزیز اس کا تدارک کیا جائے گا۔

یہ مجموعہ حضرت قاری صاحب کے تجویز کردہ نام "انسانی تفیلت کا راز" سے موسوم کیا جاتا
والکتاب یقرء من عنوانہ ؎

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان
گرما نرسیدیم شاید تو برسی

والحمد للہ اولاً واخراً والیہ یصعد الکلم الطیّب والعمل الصالح یرفعہ

محمد سمیع الحق کان اللہ
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
۳ شعبان ۱۳۷۸ھ - ۱۲ فروری ۹

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تہنیت

(تبریک و دعوت)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم
وعلی اله واصحابه اجمعین

آج بتاریخ ٦ ربیع الثانی ١٣٧٨ھ احقر حسب دعوت حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک حاضر ہوا، اور دارالعلوم ہی میں قیام کیا۔ آٹھ سال کے بعد اس سرچشمہ علم میں حاضری کا یہ دوسرا موقعہ ہے۔ ١٩٥٠ء میں احقر اس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ اس مدرسہ کے لئے نہ کوئی مستقل جگہ تھی نہ مکان۔ ایک مسجد میں غریبانہ انداز سے اساتذہ و تلامذہ نے کارِ تعلیم شروع کردیا تھا لیکن آٹھ سال کے بعد آج دارالعلوم کو اس شان سے دیکھا کہ اس کے پاس شاندار عمارت بھی ہے۔ وسیع میدان بھی ہاتھ میں ہے۔ اس کے وسیع نظم و نسق کے لئے مختلف انتظامی شعبہ جات بھی ہیں۔ شعبہ تعمیر مستقل حیثیت میں اپنا کام بھی کررہا ہے۔ اور تعمیرات بھی روز افزوں ترقی پر ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہے۔ اساتذہ ماہر فنون کافی تعداد میں جمع ہیں۔ ٢٦٠ طلبہ فارغ التحصیل کی دستار بندی بھی ہوئی جن میں مختلف پاکستانی علاقوں کے علاوہ کابل و قندھار کے طلبہ بھی ہیں۔ ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد بھی رکھی جارہی ہے۔ خلق اللہ کا رجوع ہے، اعتماد ہے اور وہ پورے بھروسہ کے ساتھ پروانہ وار اس شمع علم کے اردگرد فدائیت و عقیدت کے ساتھ ہجوم کرکے آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ مدرسہ کے جلسہ نے ایک "عظیم الشان علمی جشن" کی صورت اختیار کرلی ہے اور بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج ے صوبہ سرحد کی سب سے بڑی اور مرکزی درسگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سات سال کی مختصر مدت میں یہ ظاہری و باطنی ترقیات، بجز اس کے کہ کارکنوں کے 'اخلاص و للہیت کا ثمرہ کہا جائے' اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

ان مخلصین میں رئیس المخلصین حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی ہیں جن کے اخلاص و ایثار کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہر فن استاد کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بہ مجبوری اکوڑہ میں مقیم ہوئے اور دارالعلوم دیوبند آج تک ان کی جدائی پر ملال ہے۔ ان کی سادہ بے لوث اور مخلصانہ طبیعت اور خدمت ہی نے اس سات سال کی قلیل مدت میں اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسہ سے دارالعلوم بنادیا ہے۔ اس دارالعلوم کے احاطہ میں پہنچ کر احاطۂ دارالعلوم دیوبند کا شبہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اس نے اپنی صورت و سیرت میں دارالعلوم دیوبند کی صورت و سیرت کو محو کرلیا ہے اور وہ دارالعلوم دیوبند ہی بن گیا ہے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس سرچشمۂ فیض اور اس کے بانی کو اپنے فضل و کرم کے سایہ میں تادیر قائم رکھے اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے یہ مدرسہ نورِ ہدایت اور منارۂ روشنی ثابت ہو!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

محمد طیّب غفرلہ،

مدیر "دارالعلوم دیوبند" وارد حال اکوڑہ خٹک

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

انسانی فضیلت کا راز

"ذی شعور مخلوق، ملائکہ، جنّات، حیوانات، انسان میں سے علم صرف انسان کو بخشا، باقی تین اقسام ملائکہ، جنّات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطے سے ہوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے۔ شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیّت نہیں۔ یہ اور انواع کو بھی میسّر ہیں، کیونکہ یہ تمام علوم اپنے اندر اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں، اور وہ قویٰ جانداروں میں کم و بیش رکھے گئے ہیں۔ عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبیعت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا۔ اس سے خود اس کے نفس کی مرضی و نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آ سکتی ہے اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوّت و رسالت کے ذریعہ آتا ہے، اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیّت علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہیہ ہیں، علوم نبوّت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسّر نہیں۔ اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ - صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ۔

دار العلوم کا موضوع اور مقصد

بزرگانِ محترم!

یہ اجتماع دار العلوم حقانیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے جس میں آپ اور ہم سب اس جگہ جمع ہوئے ہیں اور دار العلوم کا موضوع اور مقصد سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو ظلمت جہالت سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لے جانا ہے۔ اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے موزوں و مناسب یہی تھا کہ میں تقریر کے لئے علم ہی کا موضوع اختیار کروں اور غالباً اسی مناسبت سے اور حضرات مقررین نے بھی اپنی تقریروں میں اب تک علم ہی کا موضوع اختیار کیا ہے اور اسی موضوع پر تقریریں ہوتی رہی ہیں تاکہ علم کی ضرورت، فضیلت اور مطلوبہ تعلیم کی نوعیت پر روشنی پڑے، اسی مناسبت سے میں نے یہ آیتیں اس وقت تلاوت کی ہیں۔ جن میں ان مذکورہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے علم کی مطلوبہ نوعیت و اہمیت بیان فرمائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ علوم کی لائن میں وہ کون سا علم ہے جو مطلوب اور نافع ہے؟ اور کیا اس کے آثار ہیں؟

اس وقت ان کی مختصر الفاظ میں آپ حضرات کے سامنے شرح کرنا مقصود ہے۔ خدا کرے آپ سمجھ سکیں۔ میری زبان اردو ہے اور اوپر کی کچھ طالب علمانہ بھی ہے۔ جس میں طبعی طور پر کچھ عربی الفاظ بھی آئیں

کے۔ ممکن ہے کہ اس کے سمجھنے میں صوبہ سرحد کے بھائیوں کو کچھ دقّت ہو۔ تاہم میں سعی کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ سہل الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کروں' اور بات کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کروں۔ امید ہے کہ اگر کوئی خاص لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آسکے تو مجموعی طور پر مطلب ضرور سمجھ میں آجائے گا۔ ورنہ اور بھی کچھ نہیں تو ثواب تو بہر حال مل جائے گا۔ جو سمجھنے پر موقوف نہیں صرف سنتے رہنے پر موقوف ہے۔!

مقدمہ و تمہید

قبل اس کے کہ میں ان آیات کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں ایک مختصر بات جو بطور مقدمہ و تمہید ہوگی' بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں جس سے آیات کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے پوری طرح سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی مہیا فرمائیں۔ زمین کا فرش بنایا اور اطلاع فرمائی کہ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا اور زمین کو فرش بنایا اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اسے ایک محفوظ چھت بنادیا۔ چنانچہ بتلایا کہ :

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا۔

اور ہم نے بنایا آسمان کو محفوظ چھت اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے تاکہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں اور فرمایا :

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا۔

برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج رکھے اور ان میں روشن چراغ (سورج) اور روشنی بخش چاند رکھا۔ پھر ان ستاروں کو چھت کے لئے سامان زینت بھی کر دکھایا اور اطلاع دی کہ :

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ۔

ہم نے آراستہ کیا آسمان دنیا کو زینت سے جو ستارے ہیں۔

پھر اس فرش خاک کو بستر بنا کر ایک وسیع ترین دستر خوان بھی بنایا جس سے ہر قسم کے غلے' ترکاریاں پھل' غذائیں اور دوائیں اگائیں۔ جس سے ہر قسم کے میٹھے کھٹے نمکین اور دوسرے ذائقوں کے پھل اور دانے نکلتے چلے آتے ہیں اور مطلع فرمایا کہ :

وَهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ۔

ان سبزیوں کو نمایاں کرنے اور حیات بخشنے کے لئے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اور فرمایا کہ :

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ۔

پھر زمین کو فرش اور خوان نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا جس میں جگہ جگہ چلنے پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا کہ :

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔

مقصود تخلیق کائنات

غرض یہ کائنات ایک عظیم ترین بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی جس میں کھانے

' چلنے پھرنے رہنے' سہنے' سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے۔ اس کائنات کی ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبان حال سے بتا رہا ہے کہ ضروریات زندگی سے لبریز یہ مکان ضرورت مند مکین کے لئے بنایا گیا ہے' خود مقصود نہیں ہے۔ یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے' محض بنانا مقصود نہیں اور بلاشبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو ان سامانوں کا حاجت مند بھی ہو اور اس ان سامانوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو تاکہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس کی آبادی اور زینت ہو۔ کیونکہ مکان مکین کے بغیر ویرانہ اور بے رونق ہوتا ہے۔ سو اس عالم میں ارادی بار اور اختیاری' تصرفات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حساس مخلوق اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہے۔ چار ہی قسم کی ہے۔

ذی شعور اور حسّاس مخلوق کی چار اقسام

ایک حیوانات ہیں جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا' گدھا' بیل' بکری' طوطا' مینا' شیر' بھیڑیا' سانپ' بچھو' پرند درند وغیرہ ہیں۔ دوسرے جنّات ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں۔ لحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں جو نوری ہونے کے سبب اور نادیدہ ہیں۔ مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں اور نر و مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں چوتھے بنی نوع انسان ہیں جو زمین کے ہر خطہ میں لبے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ یہی چار ت ہیں۔ جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ کے ے اور جائز وارث ہونے کے مستحق ہیں۔ اس زمین و آسمان میں ان کے حقوق ہیں اور وہ مالک کائنات کی سے ان کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے حقوق کو پامال کرے۔ یا انہیں منافع دنیا بے حق کر دے۔ غذا' مکان' تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حقوق قائم ہیں۔ انہیں حق رہنے کے لئے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لئے مناسب حال کھانا مہیا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہو گا۔ وہ بلاشبہ مجرم اور مستحق سزا ہو گا۔

ہر نوع کے مستقل حقوق اور اسلام میں ان کی حفاظت

چنانچہ شریعت اسلام نے جس طرح انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ اسی طرح حیوانات کے حقوق کی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بلبلاتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی حضورؐ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بلبلاتا رہا۔ آپؐ نے فرمایا۔ بلاؤ اس کے مالک کو' مالک حاضر کیا گیا۔ فرمایا یہ اونٹ شکایت کر رہا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ بجا ہے واقعی میں اس جرم کا مرتکب ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

دربارِ رسالت میں اس کی چند مثالیں

بعض صحابہؓ چڑیا کے بچے پکڑ لائے اور وہ ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اڑ رہی تھی۔ آپؐ

نے وہ بچے چھڑوا دیئے کہ کیوں ان کی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں ان کی ماں کو ستاتے ہو۔

کیڑے، مکوڑے' زمین میں سوراخ کر کے اپنے رہنے کا ٹھکانا کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سوراخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو۔ اس میں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ میں سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمہیں تکلیف نہ پہنچادے۔ وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کر کے اسے بے گھر مت بناؤ۔ اور اس کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمہیں حق نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ کو دیکھ کر چلائی کہ یا رسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیجئے کہ میں انہیں دودھ پلا آؤں۔ آپ نے فرمایا تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی؟ عرض کیا یا رسول اللہ! سچا وعدہ کرتی ہوں۔ آپؐ نے اسے کھول دیا اور وعدہ کے مطابق دودھ پلا کر فوراً واپس آگئی آپ نے اس کے گلے میں وہی رسی پھر ڈال دی۔ اور اسے بدستور باندھ دیا اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کردے۔ چنانچہ اس نے کھول دیا اور وہ اچھلتی کودتی اور حضورؐ کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جاملی۔"

اس واقعہ سے واضح ہے کہ حضورؐ نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی جانور کی رعایت تو اس کو کھول دینے سے فرمائی۔ تاکہ ہرنی کی ماتا کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دکھے۔ بچوں کی رعایت ان کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں۔ انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا تاکہ واضح ہو کہ انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے۔ جس میں رخنہ نہیں ڈالا جاسکتا اور ساتھ اس میں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک وفائے عہد لازم ہے۔ تو اس عقل مند انسان پر کیوں نہ ہوگا؟

حیوانات کے حقوق

فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لئے فناءِ مصر (شہر کے قرب و جوار) میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہو تاکہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کرسکیں اور انہیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور ان کی آزادی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ ہمارے دارالعلوم دیوبند کے محدّث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنے تو چھتوں پر ڈلوادیتے تھے کہ یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرّات اور بھورے کو چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوادیتے تھے کہ یہ ان ننھے اور ضعیف جانوروں کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا' اور اسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لئے جہنم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا اور ایک فاحشہ عورت محض اس لئے جنّت میں پہنچادی گئی کہ اس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچالی تھی۔ جیسا کہ احادیث میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔

شریعت اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ ایک جانور کو دوسرے جانور کے

سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے ہی نوع کے ایک فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر دہشت سے خشک ہونے لگے۔ بہرحال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور امن و آزادی کے حقوق ہیں۔ جن کی حفاظت کا حکم اور ان کے ضائع کرنے کی ممانعت ہے۔

ہاں کوئی جانور شرّی اور موذی ہو تو اسے بے شک بند کرنے یا مار دینے کے حقوق بھی دیئے گئے ہیں۔ سو یہ جانور ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، شریر انسان کے لئے بھی حدود و قصاص، حبس و جیل، قید و بند اور قتل و غارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور قتل **الموذی قبل الایذاء** کا معاملہ رکھا گیا ہے مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنّات کے حقوق

اسی طرح جنّات بھی اس جہان کے باشندے ہیں۔ جن کے حقوق ہیں۔ انہیں مکان غذا اور رہنے کا حق دیا گیا ہے جسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جس طرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی انہیں حق دیا گیا کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش اختیار کریں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنّات بسے ہوئے ہیں چونکہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں، اس لئے ہمیں پتا نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے۔ البتہ جو بدطینت اور شرّی فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔ بہرحال جب جنّات بدی پر آجائیں تو پھر ان کا مقابلہ، بلکہ مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنّات میں مختلف صفات و مذاہب

ورنہ جہاں تک نیک اور مؤمن جنّات کا تعلق ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے انہیں نکالنے کی فکر میں رہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی، سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی چہ جائیکہ جنّات کی کی جاتی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جنّات میں ہر قسم کے افراد ہیں، نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں، مسلم بھی ہیں غیر مسلم بھی، مشرک بھی ہیں یہودی و نصرانی بھی، چنانچہ قرآن کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنّات آسمان کے دروازوں تک آجا سکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگو سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اچک لاتے تھے۔ جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضور کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو انہیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے۔ جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے۔ جس کی بدولت ہم پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کچھ جنّات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق و مغرب میں گھومے۔ کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی، کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو ان میں سے ایک جماعت کا گزر مکہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کا طرز و انداز نرالا اور ہادیانہ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس ہدایت کی زد ٹھیک ہمارے شر کے اوپر ہے۔ سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شرّی افعال پر یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ انہوں نے جا کر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ:

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ۔
"ہم نے تو عجیب قسم کا کلام پڑھا ہوا سنا ہے جو نیکی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے' سو ہم تو اس پر ایمان لائے"۔

جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے تو ان میں کافر و مومن کی دونوں نوعیں ں پھر آگے فرمایا :

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا۔
"اور ہم اب ہرگز شرک نہیں کریں گے نہ آئندہ کسی چیز کو اسکا شریک ٹھہرائیں گے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحّد و مشرک کی تقسیم بھی تھی کچھ مشرک تھے اور کچھ موحّد' آگے فرمایا۔

وَاَنَّهٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا۔
"اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے' اس سے کہ اس کے کوئی بیوی اور بیٹا ہو"۔

معلوم ہوا کہ ان میں بعض عیسائی بھی تھے۔ جو عقیدہ زوجیّت اور ابنیت کے قائل تھے' آگے فرمایا۔

وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا۔
"اور ہم میں سے بیوقوف اللہ تعالیٰ پر حد سے زیادہ جھوٹ اور افتراء باندھتے تھے"۔

معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے۔ جو اپنی سفاہت اور بدعقلی سے خدا پر جھوٹ باندھ کر غیر دین کو دین ر کراتے تھے۔ اور وحی الٰہی کے نام سے اپنے تخیلات فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے۔ بہر حال اس سے واضح کہ جنّات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات و عقائد کے افراد پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کے رتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدکاروں کو سزا و سرزنش کی جائے جیسے انسانوں کو کی ں ہے' لیکن ان کے حقوق کو نہیں روکا جاسکتا۔

جنّات کے ساتھ رشتہ زوجیّت؟

حتّٰی کہ ان سے زوجیّت کا رشتہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ فقہاء میں یہ بحث ہے کہ مسلم جن عورت ے شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

بعض فقہاء نے اس نکاح کو جائز کہا ہے' بعض نے ناجائز۔ جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح جنس سے ہوتا ، نہ کہ غیر جنس سے' وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے۔ کیونکہ یہ نکاح ایسے ہی ہوگا۔ جیسے آدمی بکری یا گائے ے نکاح کرے تو جانور بوجہ غیر جنس ہونے کے محل نکاح ہی نہیں اس لئے نکاح نہ ہوگا۔ اور جن کی نظر اس ہے کہ جنّات میں شعور ہے اور وہ شریعت کے مخاطب اور احکام کے مکلّف ہیں' نیز انسانی شکل بھی اختیار سکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔ بہر حال جنّات کے مختلف حقوق ہیں۔ کچھ غذا کے حقوق ہیں۔ کچھ سی ہونے کے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ رشتۂ زوجیّت کے بھی ہیں۔ ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنّات کو وعظ و تبلیغ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصیبین کے جنات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا! یا رسول اللہ ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے۔ آپ تشریف لاکر انہیں وعظ و نصیحت فرمائیں اور ان سے متعلق مسائل بیان فرمائیں ان کے کچھ سوالات بھی ہیں۔ جن کا حل چاہتے ہیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ بھی ساتھ تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کے دامن میں پہنچے۔ جس پر جنّات کا یہ جلسہ جمع ہوا تھا۔ تو آپ نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلیں' عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب قماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں۔ لیکن دائرے کے اندر نہیں آسکتے۔ ان کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے' اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ :

فانها زاد اخونکم من الجن۔

کیونکہ یہ تمہارے جنّات بھائیوں کی خوراک ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کو کھالیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنّات کو "پُر گوشت" ہو کر ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجاء کرتے تھے۔ جس پر جنّات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضورؐ نے ہڈی سے استنجاء کی ممانعت فرمائی۔ جس سے جنّات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح مکانات سے بے وجہ انہیں اجاڑنا جائز نہیں جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوق ملائکہ

یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں۔ کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں۔ کچھ زمین میں۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ چار انگل جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغول عبادت نہ ہوں۔ عالم بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالم سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں۔ مثلاً ملائکہ کو نفرت ہے بدبو سے اور رغبت ہے خوشبو سے' اس لئے ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں' انہیں بدبو سے آلودہ کرنا جائز نہیں' مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہ ہے تو وہاں خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے۔ مساجد میں بخور اور خوشبویات کا جلانا شرعاً مطلوب ہے تاکہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے تاکہ انہیں اذیّت نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لئے ملائکہ استغفار کرتے ہیں، جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہو اور وضو نہ ٹوٹے ایسا ہوتے ہی استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ ایسے بندوں سے رخ پھیر لیتے ہیں گویا ہم بدبو سے انہیں ان کے مکان سے اجاڑ دیتے ہیں۔ جس کا ہمیں حق نہیں۔

ملائکہ کی بدبو اور جھوٹ سے نفرت

حدیث میں ہے کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہوتی ہے۔ جس

کی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دور چلا جاتا ہے گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر ان سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں۔ تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر بھی ہوں اور اپنی مقرّرہ جگہ پر متمکن ہوں تو آپ ان کو بھگا دیں اور ان کی جگہ چھین لیں۔ البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے۔ انہیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہوگی۔ جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اسے بھگا ہی دینا چاہئے' بہرحال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے۔ تو اس ذکر اللہ سے روکنے کی حرکت کرنا ان کی غذا چھین لینا ہے جیسے پہلے آچکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے انہیں تشویش اور اذیّت ہو۔

بہرحال ملائکہ کے حقوق بھی جنّات اور حیوانات کی طرح ہیں۔ جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق

چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ نے اسے بھی زمین آسمان میں حقوق دیئے ہیں۔ کھانے کا حق' اوڑھنے کا حق' غذا کا حق' مکان کا حق' آزادی کا حق' اسے بھی حق تعالیٰ نے اس زمین پر آباد کیا ہے' پس زمین ان چاروں مخلوقات حیوان' جن' فرشتہ اور انسان کا مکان ہے' جس پر وہ آباد ہیں۔ ان چاروں مخلوقات سے حق تعالیٰ کا معاملہ الگ الگ ہے۔ 'حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنّات سے نہیں' جنّات سے جو معاملہ ہے وہ ملائکہ سے نہیں۔ جن و مَلک سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں۔ مثلاً جانوروں سے معاملہ یہ ہے کہ انہیں قابل خطاب نہیں سمجھا گیا اور کوئی امرونہی انہیں نہیں دیا۔ کوئی قانون ان کے لئے خطابی رنگ کا نہیں اتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو کیونکہ ان میں فہم خطاب کا مادہ ہی نہیں' نہ عقل ہے نہ فہم' اور ہے تو بہت ہی ادنیٰ جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد کے سمجھنے کے لئے ہے کہ وہ اپنی غذا رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیا کریں۔

حیوانات کی پیدائش سے متعلقہ مقاصد

مگر وہ امورِ کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفاد کلی کو سمجھنے کے لئے کوئی اہلیّت نہیں رکھتے۔ صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس؟

سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو فہم و عقل مل جاتا تو کیا حرج تھا؟

جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے لئے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان میں عقل و فہم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ عقل حارج ہوتی ہے اور وہ مقاصد کبھی پورے نہ ہوسکتے ان سے متعلقہ مقاصد یہ ہیں' جنہیں اس آیت میں جمع کردیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے فرمایا :

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ

''ہم نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے لئے گرمی کا سامان ہے اور سردی دفع کرنے کی صورت مہیا ہے''۔

چنانچہ تم ان حیوانات کے اون سے گرم کپڑے' پٹو اور کمبل وغیرہ بناتے ہو۔ ان کی کھالوں میں تمہارے لئے کئی قسم کے منافع ہیں' اوڑھنے کے' بچھانے کے' زینت کے' خیمے بنا کر رہنے سہنے کے اور **مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ**

اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو، یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اٹھاتے ہو۔

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ۔

اور تمہارے لئے ان جانوروں میں رونق و جمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کی شانیں قائم کرتے ہو۔ سرکاری، قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زرّین جھولے کس کر اپنا جاہ و حشم دکھلاتے ہو جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ

"اور ان کے ذریعہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سامان منتقل کرتے ہو جس کو تم ان کے بغیر مشقت کثیر سے بھی مشکل ہی سے منتقل کر سکتے"۔

حیوانات کو عقل و فہم سے محروم رکھنے کی حکمت

ان منافع اور حیوانات کے ان خلقی مقاصد پر غور کرو۔ تو ان کے لئے فہم و عقل کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیونکہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا۔ زین رکھتا، یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا۔ تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی۔ اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے۔ بلکہ ممکن ہو جاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی۔ ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جاسکتے نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جاسکتا۔ سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہو جاتے اور انسان کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل و فہم ملنے سے ہوئی پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی جو علم حاصل کرنے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے کتے سب جمع رہتے۔ بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے تو آپ کو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا۔ غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہو جاتے۔ اس لئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں عقل و فہم نہیں دیا۔ جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

بے عقلی بھی نعمت ہے

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے۔ اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے۔ حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ جو انسان بے عقل اور بیوقوف ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں۔ جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے بیوقوف نہ ہوتے تو لیڈروں کو غذا نہ ملتی۔ اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے۔ اس لئے جانوروں میں مادہ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلابحث و مجادلہ نکال لئے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے، پامال ہو جاتے، حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی

پیدائش سے جو مقاصد متعلق ہیں۔ ان میں عقل کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو ان کے فرائض کی وجہ سے بے سمجھ رکھا گیا تاکہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں اور جب عقل و فہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لئے کوئی شرعی قانون اتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلف بنائے جاتے، پس ان کے لئے نہ امر ہے نہ نہی نہ شریعت آئی نہ کوئی تشریعی قانون صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے جس سے وہ کام پر لگے رہیں اور لگے رہتے ہیں اور روز و شب مشغول و منہمک ہیں۔

ملائکہ کو خطابِ خدا کی نوعیّت

ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطاب تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو بلکہ خطاب تشریفی کیا جو اعزازی اور تکریمی ہے۔ جیسے بادشاہ کسی مقرّب سے باتیں کرے تو اس سے اس کی عزّت بڑھائی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا۔ کلام بھی فرمائی، گفتگو بھی کی مگر ان پر کوئی شریعت نہیں اتاری کیونکہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے، کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں۔ جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے کام شر کے ہوتے ہیں۔ جس سے شر کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے۔ جیسے بدکاری، دغابازی، رشوت ستانی، زنا کاری، شراب خوری، چوری، سرزوری، بغاوت، تمرد، سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر اور برائی کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا تو انہیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ بدی نہیں کرسکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو امر کرنا تھا۔ جو سراسر خلافِ حکمت ہے اور حق تعالیٰ حکیم مطلق ہیں وہ خلاف حکمت بات سے بری اور منزہ ہیں، رہی خیر تو وہ ان کا طبعی تقاضا ہے جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں۔ عبادت بھی کرتے ہیں۔ سجدہ بھی کرتے ہیں اور اپنی طبع پاک ہی سے منشاء خداوندی کو پہنچاتے ہیں۔ اس لئے ان کو شریعت کے ذریعے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں امر خیر کرنے کے لئے کسی قانون سے تنبیہہ کی جاتی۔ پس جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا، سونا جاگنا وغیرہ ایک طبعی بات ہے۔ خواہ کوئی شریعت آئے یا نہ آئے انسان اس پر مجبور ہے کہ کھائے پئے اس لئے ان امور طبعیہ پر آمادہ کرنے کے لئے کسی شریعت کی ضرورت نہ تھی اگر شریعت نہ بھی ہوتی تب بھی ہم پیاس کے وقت پانی پیتے اور بھوک کے وقت کھانا کھاتے تو جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا طبعی بات ہے اسی طرح تمام امور خیر عبادت، نیکی، پاکدامنی صفائے باطن و ظاہر اور سلامتی ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے، شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی ہی کریں گے۔ اس لئے امور خیر کے لئے بھی کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال ملائکہ کو نہ امر شرعی کی ضرورت نہ نہی شرعی کی اس لئے ان سے خطاب تکلیفی نہیں کیا گیا، ملائکہ کو خطاب کیا گیا، مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔

جنّات کو تکلیفی خطاب کیا گیا مگر مستقل نہیں

رہے جنّات تو ان کو خطاب بھی کیا گیا اور تکلیفی خطاب کیا گیا۔ مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا۔ یعنی خود ان پر براہ راست کوئی شریعت نہیں اتاری گئی اور نہ براہ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی۔ بلکہ انسان کے واسطے سے انہیں بھی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا چنانچہ ان میں جو

یہودی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں تو راۃ خود ان کی نوع پر نہیں اتری۔ جو عیسائی ہیں حضر عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں، انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اتری اور جو مسلمان ہیں وہ حضرت محمد صلی اللہ عل وسلم کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں۔ خود قرآن براہ راست ان پر نہیں اتارا گیا، پس جو شریعت انسانوں لئے آئی ہے وہ ان کے لئے بھی آئی مگر بواسطہ انسان کے انہیں پابندِ شریعت بنایا گیا۔

جنّات میں نبوّت نہ رکھنے کی وجہ

بالفاظ دیگر ان میں نبوت نہیں رکھی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ ہے اور شر کالعدم ہے جنّات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کالعدم ہے اور نبوّت کے لئے غلبہ خیر ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی۔ ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بد فہمی یا بد عملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا۔ اس لئے انہیں تابع انسان بنایا گیا تاکہ اس کی شریعت سے وہ علم اور عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں۔ اس لئے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا۔ ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنّات کو خطاب تکلیفی کیا مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً تشریعی خطاب کیا گیا

اور انسانوں کو خطاب بھی کیا۔ تکلیف شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب فرمایا۔ یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود ان سے کلام فرمایا۔ ان میں نبی اور رسول بنائے کبھی براہ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے طور پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں اور کبھی بزبان ملکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی ملکیت پر رہتا اور انبیاء بشریت سے ملکیت کی طرف منتقل ہو کر فرشتہ سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورت ملکی کو چھوڑ کر صورت انسانی میں آتا اور انبیاء بشری چولہ میں اسے دیکھتے جس کو قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ

پہلی صورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے، جس میں وہ اپنی اصلیت پر رہتا ہے، لیکن پیغمبر کو بشری اصلیت سے ملکیت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ صورت حضور پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی۔ دوسری صورت حق تعالیٰ کے ساتھ براہ راست کلام فرمانے کی ہے جو پس پردہ رہ کر ہوتی تھی۔ یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلام حق سنتے تھے اور تیسری صورت فرشتہ کی انسانی صورت میں آکر پیغام خداوندی سنانے کی ہے جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے فرشتہ کو ملکی چولہ چھوڑ کر بشری چولہ میں آنا پڑتا تھا۔ یہ تینوں صورتیں وحی الٰہی کی تھیں۔

علم الٰہی کے لئے انسان کا انتخاب

حاصل یہ ہے کہ وحی الٰہی اور نبوّت و شریعت کی دولت سے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں نہیں آیا اور ظاہریات ہے کہ وحی علم کے اتارنے ہی کو کہتے ہیں۔ وحی کے ذریعہ علم ہی تو رسول کو دیا

جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے لفظوں میں علم الٰہی کی نعمت مستقلاً انسان ہی کو دی گئی ہے۔ جس کو اس کی بنیادی خصوصیّت اور امتیازی شان سمجھنا چاہئے کیونکہ خصوصیّت کے معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے اس لئے دوسرے لفظوں میں انسانیّت کی خصوصیّت، علم وحی نکل آتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیّت اس میں سے نکال دی جائے تو وہ چیز، وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

انسانیّت کا جوہر علم وحی ہے

اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علم وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان، انسان نہ رہے گا کہ انسانیّت کی خصوصیات اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صورت انسانوں جیسی ہو۔ سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے اور انسانیّت کا جوہر یہ علم وحی ہے، اس لئے جو انسان علم وحی کا حامل نہیں وہ دلائل بالا کی رو سے انسان نہیں صرف صورت انسان ہے اور محض صورت کہ جس میں حقیقت نہ ہو، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر ہم گھوڑے کا مجسّمہ بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل و نقل میں ذرا بھر فرق معلوم نہ ہو تو کیا اسے گھوڑا کہیں گے؟ اور کیا وہ گھوڑے کی طرح سواری کا کام دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار، پانچ سو روپیہ اٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں ___ کیونکہ وہ گھوڑا نہیں گھوڑے کی محض تصویر ہے۔ اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسّمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیّت (علم) نہ ہو تو وہ صورت انسان ہے، انسان نہیں۔ اور قدر و قیمت انسان کی ہوتی ہے۔ صورت انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ چاہئے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا جس سے واضح ہوا کہ دنیا میں قدر و قیمت انسان کی ہے، تصویر انسان کی نہیں اور آدمی حقیقت آدمیّت کو کہتے ہیں۔ محض صورت آدمیت کو نہیں ۔

گر بصورت آدمی انسان بُدے
احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بُدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند!
نیستند آدم غلاف آدم اند!

از بروں چوگور کافر پُر حلل
واندروں قہر خدائے عزّوجل

علمِ مطلق انسان کی خصوصیّت نہیں

یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیّت مطلق علم نہیں۔ یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیّت نہیں کہا جائے گا۔ کیوں کہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے۔ حتیٰ کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں۔ اس لئے مطلق علم انسانی خصوصیّت نہیں کہلائی جاسکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت و شرافت اور مخلوقات میں افضلیّت نمایاں ہو سکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ آج کی دنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی

قسمیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیت نہیں۔ جانوروں کو بھی ان سے حصہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔

فنِ انجینئری انسان کے ساتھ مخصوص نہیں

آج اگر انسان دعویٰ کرے کہ میں اس لئے افضل المخلوقات ہوں کہ میں انجینئری کا علم جانتا ہوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کر سکتا ہوں تو یہ دعویٰ قابل سماع نہ ہوگا کیونکہ انجینئری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں۔ وہ بھی دعویٰ کر سکیں گے کہ ہم بھی انجینئر ہیں اور اپنے مناسب حال راحت دہ مکانات بناتے ہیں۔

بیا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لئے عجیب وغریب قسم کا گھونسلا بناتی ہے۔ جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں۔ ماں باپ کا الگ اور بچوں کا الگ حتیٰ کہ اس میں بچے جھولتے ہیں۔ گویا مختلف رومز ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا گھاس سے بنایا جاتا ہے اور تین چار تاروں سے کیکر وغیرہ درخت میں لگا ہوا اور لٹکا ہوا ہوتا ہے اور مضبوط اتنا کہ آندھی آئے، طوفان آئے مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ آپ کا مکان گر جائے گا۔ مگر اس کا گھونسلا محفوظ رہے گا۔ کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے اور چڑیا کیوں یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھی انجینئر ہوں؟ ضرور کر سکتی ہے۔ تو پھر انجینئری انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اس کی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بناتی ہے اس کے ہشت پہلو سوراخ اس قدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پرکار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بنا سکتے پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں جو نہ بارش سے خراب ہو، نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے۔ کیا یہ انجینئری اور کاریگری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ انجینئری کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کر سکیں؟ سانپ اپنی "بلمی" مٹی سے بناتا ہے جو اوپر سے برجیوں دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں۔ کیا اسے انجینئری اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟ رہا یہ کہ آپ کہیں کہ صاحب ہم عمارتیں بڑی عالیشان بناتے ہیں۔ جن کی خوشنمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اونچی اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اور یہ جانور انجینئری میں برابر کیسے ہو سکتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے، جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے آپ اپنی ضروریات کی، جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر آپ سانپ یا بیا یا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوں گے۔ بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر ہیں۔ اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں اس لئے انجینئری کے بارے میں آپ کو دعوائے فضیلت کا کوئی حق نہیں۔

انسان اور علمِ طب

اس طرح مثلاً علمِ طب ایک تجرباتی علم ہے۔ یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے۔ اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی بساط کی بقدر پایا جاتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس عمل

کا شرف حاصل ہے لہٰذا ہم ہی اس فن کی رو سے اشرف المخلوقات ہیں۔ غلط ہے' جانور بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمیں بھی علم طب میں مہارت ہے۔ فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پر زیادہ بیماریاں آتی ہیں۔ تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں۔ جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اس لئے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں۔ لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علم طب صرف آپ کی خصوصیت قرار نہیں پا سکتا۔

مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے بعض اعزہ وہاں اونچے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی۔ اس لئے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حد تک تھی۔ بندروں کی جبلت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذا رسانی داخل ہے۔ اس لئے وہ ہمارا کافی نقصان کرتے تھے۔ کبھی برتن اٹھا کے بھاگ جاتے کبھی کپڑا اٹھا لے جاتے۔ اور صرف لے جانا ہی نہ تھا' بلکہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسے لے جانا اور منڈیر پر بیٹھ کر اسے دکھا دکھا کر چیرنا پھاڑنا جس سے ایک تو کپڑا جانے کی تکلیف ہوتی۔ اسے ضائع ہوتا دیکھ کر اور بھی زیادہ دکھ ہوتا۔ اس لئے ہمیں ایک بار غصہ آیا اور ہم نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہئے۔ جس سے سوپچاس بندر ایک دفعہ مر جائیں تو کچھ تو نجات مل جائے گی۔ اس لئے ہم نے دو روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تاکہ وہ آتے جائیں' روٹیاں کھاتے جائیں اور مرتے جائیں' اور ہم خوش ہوتے جائیں۔ اس لئے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک جنگلا میں بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ ابھی بندر آکر ان روٹیوں کو کھائیں گے' اور مریں گے اور ہمارے لئے خوشی کا سامان ہوگا۔ یعنی اگر انہوں نے ہمارے دس کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تو دس بیس کو ہم بھی مرتا ہوا دیکھیں جس سے کچھ تو دل کو چین آئے۔ چنانچہ دو تین بندر آئے۔ مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے' ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جا سکتیں۔ اس لئے روٹی کو غور سے دیکھا پھر سونگھا اور سوچا یہ نیا حادثہ کیوں پیش آیا ہے۔ پہلے تو ہم ایک روٹی بھی چھت پر پڑی ہوئی نہیں پاتے تھے۔ اب یہ روٹیوں کا ڈھیر کیوں لگا ہوا ہے؟ اس میں ضرور کوئی راز ہے؟ بالآخر انہوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا اور چلے گئے۔ ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہو گئی لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جا کر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لایا اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے ساتھ آئے اور روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گویا گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اور مشورہ شروع ہوا کہ روٹیاں اس مقدار میں یہاں کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا جانے انہوں نے باہم کیا کیا اشارے کئے ایک آگے بڑھا اور اس نے روٹیوں کو سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا' اس نے ایک روٹی توڑی اس کے ٹکڑوں کو سونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر ناکام ہو گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹہنی تھی۔ جن میں ہرے ہرے پتے تھے۔ انہوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا' ان کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنے یہ بندر تھے' تاکہ روٹیوں میں ہر ایک کو حصہ ملے۔ گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیش نظر تھا کہ ؎

نیم نانے گر خورد مرد خدا
بذل درویشان کند نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخرکار انہوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لئے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے وہ پتے چبا لئے جو ہر ایک اپنی ٹہنی کے ساتھ لایا تھا اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہے یعنی

بے وقوف ہم رہے کہ دو روپیہ کا آنا بھی گیا سنکھیے کے دام بھی بٹے کھاتے گئے کپڑا تو پہلے ہی جا چکا تھا اور اوپر سے وقت بھی ضائع ہوا اور ہوشیار یہ بندر رہے کہ سب کچھ انہیں کا ہو کے رہا۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے۔ جو ان بندروں کو معلوم تھا۔ اب بھی اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ طبیب صرف ہم ہی ہیں۔ جو جڑی بوٹی کی خاصیتیں جانتے ہیں تو یہ دعویٰ غلط ہو گا کیونکہ یہ بندر بھی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں۔ تو فن طب میں ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خوامخواہ ہی دعویٰ ہے کہ صرف ہم ہی اطباء ہیں اور فن طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہو گئے گو کچھ خصوصیات کا فرق بھی سہی۔

فنِ سیاست بھی حیوانات میں ہے

پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فنِ سیاست سہی، ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بارہ میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فنِ سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، شہد کی مکھی بھی ملت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز سے اس میں ہشت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ اپنا امیر منتخب کرتی ہیں۔ جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے۔ یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں۔ اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں تو شہد بھرا جاتا ہے ایک حصہ میں ان کے بچے ان خانوں میں پلتے ہیں۔ ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں۔ اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہیں۔ کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتے پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ لے کر آئی ہے۔ جس سے بنے ہوئے شہد میں سمیت کا سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتہ کے اندر نہ گھسنے پائے۔ تاکہ اس کے زہریلے مادہ سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک کی جان لے کر اگر پوری قوم کو بچا لیا جائے تو کوئی جرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ :

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓا أُولِي الْأَلْبَابِ۔

شہد کی مکھیوں میں قانون قصاص اور مکافاتِ جرم

یعنی ایک کی موت سے اگر پوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس قتل نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوشدلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جھکا دی جاتی ہے۔ اور کسی کو یہ خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہوا۔ بلکہ تمام قوم سر اطاعت جھکا کر مان لیتی ہے تو اولو الامر کا انتخاب، پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت،

پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم، پھر بے راہی پر مجرم کا قتل، اگر سیاست نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بکثرت ہوتا ہے اور وہاں شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے۔ وہاں کا ہم نے ایک محاورہ سنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں۔ فلاں نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ جہیز میں پلنگ، پٹریاں، میز، کرسی، زیور، کپڑا وغیرہ تو دنیا بھر میں دیا جاتا ہے۔ یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر کیا معنی ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں۔ اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہیں چھتہ بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اس گر کو سامنے رکھ کر وہاں کے یہ شہد کے کاروباری دو چار امیر مکھیاں پکڑ کر اور ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں۔ وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں اور مناسب مقام پر ان مکھیوں کو بٹھلا دیتی ہیں۔ تو وہیں شہد کے چھتے لگ جاتے ہیں اور کئی کئی دھڑی شہد ہو جاتا ہے۔ تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں دے دیا گیا۔ اس سے شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور نظم پسندی معلوم ہوئی۔

جس کی نظیر انسان میں بھی نہیں۔ سو اس نظم پسندی اور تنظیم ملت کی اعلیٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا ہے کہ صرف انسان ہی سیاست دان ہیں۔ یہ مکھیاں بھی دعویٰ کر سکتی ہیں کہ ہم بھی سیاست دان ہیں تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کر لیں کہ کوئی غذا مہیا کرے کوئی تعلیم کا کام کرے، کوئی فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرے۔ تو کام بلاشبہ عمدہ ہے، ضروری بھی ہے۔ مگر محض انسان کی خصوصیت نہیں۔ مکھیاں بھی کر سکتی ہیں۔ اس لئے یہ تنظیم کوئی وجہ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم

بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے۔ جب بطخیں سوتی ہیں تو ان کا امیر ان کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے، جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے۔ تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔ ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اٹھ کر پرواز میں آجاتی ہیں۔ اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اڑتی ہیں۔ جدھر امیر جاتا ہے۔ ادھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے۔ پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے تمام بطخیں وہیں اتر پڑتی ہیں۔ یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرہ سے آگاہ کرنا اور بچانا خود بیدار رہنا ان کو چوکنا رکھنا کیا اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لئے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اصول سیاست میں حیوانات بھی اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مکھیاں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ملت میں جرائم زیادہ ہیں، اس لئے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں۔ مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہیں۔ تو تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں

اور بطنوں کی فضیلت ہی آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کمتری اور اصل سیاست میں برابری ثابت ہوگی تو یہ دعویٰ بھی آپ کا غلط ہے کہ ہم چونکہ فنِ سیاست سے واقف ہیں ـــــ اس لئے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری

اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بُننے کا فن جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب جانداروں میں افضل ہیں تو مکڑی آکر کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں۔ دیکھئے مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تنتی ہے۔ جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں۔ وہ اتنا صاف باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صاف اور باریک نہیں ہوتی اور اتنا مضبوط جس کو آندھی اور ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارش بھی نہیں ہلا سکتی اس کی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں۔ آپ تو سوت سے کپڑا بنتے ہیں۔ وہ خدا جانے کس مادہ سے اپنا گھر بناتی ہے۔ آپ کا کپڑا پھٹ جائے گا۔ مگر اس کا بنا ہوا خیمہ 'یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔ آپ کا بنایا ہوا کپڑا میلا ہو جائے گا۔ جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔ صابن سے صاف کریں گے مگر مکڑی کے اس خیمہ کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لئے پرندے پھانسنے کے لئے جال بناتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال بنتے ہیں۔ تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کے لئے سوت کے تاگوں سے کام لیتے ہیں تو بھی مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال بن سکتی ہوں' وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں۔ ہزار بھنبھناتی ہیں چلاتی ہیں۔ مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں۔ اور اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔ غرض آپ فنونِ طبعیہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیات کہہ سکیں گے۔ ضروریاتِ زندگی کا کوئی فن ایسا نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ ہم جس قدر بھی ضروریاتِ زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں۔ حیوانات بھی اپنی ضروریاتِ زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

ضروریاتِ زندگی کا ہر فن حیوانات میں موجود ہے

حتیٰ کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں۔ تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنی پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ آپ پیتل تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں یعنی ہوائی جہازوں کے ذریعے اڑتے ہیں اور چیل کوّے وغیرہ پرندے اپنے بنے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اڑتے ہیں۔ آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے ہیں۔ تب کہیں اڑتے ہیں۔ اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔ غرض آپ اگر اڑ گئے تو پرندے بھی اڑتے ہیں۔ یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا آپ نے کپڑا بن کر تن پوشی کی اور بدن کو کپڑے سے چھپایا تو ہر چرند پرند بھی اپنی کھال اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے اس کا قدرتی ہے۔ آپ رہنے کے لئے مکان بناتے ہیں۔ جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔ آپ اپنا رزق تلاش کرنے جنگل میں جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی غذا تلاش کرتے جنگل میں جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی غذا تلاش کرتے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں۔ اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں۔ آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں۔ وہ اس مصیبت سے بری ہیں۔ کچا ہی کھا لیتے ہیں۔ آپ اگر ان کے گھاس دانہ سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ

کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔ غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں۔ جس میں وہ آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے۔ تو شہد کی مکھی اور بطخ سامنے آکر اس دعوائے خصوصیت کو باطل کردے گیں آپ کپڑا بننے اور جال بنانے کے فن کا دعوی کریں گے تو مکڑی سامنے آکر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ آپ فنِ طب کی مہارت کا دعوی کریں گے تو بندر اچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹی کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں۔ اور میں زہر کا تریاق جانے ہوئے ہوں۔ آپ فنِ پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آکر کہیں گے ہم اس فن میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجینئری اور فنِ خانہ سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درند آپ کے مقابلہ میں آکر کہے گا کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے 'لباس پہننے' علاج کرنے' مکان بنانے اور تنظیم وسیاست وصنعت کاری کرنے میں شریک ہیں۔ تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہو سکتا۔ افضلیّت کسی خصوصیّت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو اس میں ہو اوروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں۔ وہ علم شرائع اور علم احکامِ خداوندی ہے۔ جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے اور انسان اس علم کے ذریعے سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور نیابتِ خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے یہ علم کسی بھی غیرِ انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے نہ جنّات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں اور جمادات ونباتات تو کیا واقف ہوتے؟ یہ علم خصوصیت ہے انسان کی۔ علم شرائع صرف اس کی قسمت میں ہے۔ جس نے لے سب مخلوقات پر فوقیّت وفضیلت دی۔ جس کی یہ وجہ ہے کہ یہ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ علم اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ ہر کس وناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا سو اس کے لئے اس نے نوع انسانی کو مخصوص فرمایا اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا تو اس نے انہیں اپنی مرضیات ونامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں۔ اسے کرو اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اسے نہ کرو یعنی امرونہی بتلایا پس امرونہی کے قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لئے نبوّت رکھی اور یہ نبوّت نوع بشری ہی کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوّت کے علوم صرف انسان کو دیئے۔

انسانیّت کا مدار ہی علوم الٰہیہ ہیں

یعنی چار ذی شعور مخلوق 'ملائکہ' جنّات' حیوانات' انسان۔ میں سے علم صرف انسان کو بخشا باقی تین اقسام ملائکہ' جنّات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطہ سے ہوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعوی بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ' علوم وہمیہ' علوم خیالیہ' علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیات نہیں یہ اور انواع کو بھی میسّر ہیں۔ کیونکہ یہ تمام علوم اپنے اندرونی قوتیٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم وبیش سب میں رکھے گئے ہیں۔ عقل ہو یا خیال۔ وہم ہو یا طبیعت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا۔ اس سے خود اس کے نفس کی مرضی اور نامرضی اور خواہش وطلب کھلے گی۔ خدا کی مرضی نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آسکتی ہے اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوّت ورسالت کے ذریعے آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیات علوم طبعیہ' علوم وہمیہ' علوم

خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہیہ ہیں۔ علوم نبوّت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسّر نہیں۔ اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ کے ذریعے کرسکتا ہے ___ نہ کہ علوم طبیعہ و عقیلہ، وہمیہ کے ذریعہ کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسّر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی انسانیّت کا مدار بھی اس علم پر ہے۔ کیونکہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیت ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو کیونکہ جس چیز کی خصوصیّت ختم ہوجائے۔ جس سے وہ چیز وہ چیز تھی تو پھر وہ شی وہ شی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں خصوصیت باقی نہ رہے تو آپ آپ نہ رہے، اگر خصوصیّت انسان انسان میں ہو تو انسان انسان کہلائے گا ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں وہ مکان بنانے، کھانے پینے، علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں۔ پس جب انسان کی خصوصیت یہ علم الٰہی ہے۔ جس سے وہ مرضیات الٰہی سمجھ لیتا ہے تو یہ علم الٰہی جب انسان میں ہوگا تو اس کا نام انسان ہوگا۔ ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا، کیونکہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوش نما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے تب بھی رہے گا جانور ہی۔ کیونکہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جیسا کہ واضح کیا جاچکا ہے۔ بہرحال یہ بات صاف ہوگئی کہ نہ کھانا انسانیّت ہے۔ نہ پینا، نہ مکان بنانا انسانیّت ہے نہ سیاست و تنظیم اگر کوئی ماہر فن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیّت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیّت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیّت ہے اور اگر مکان سازی پارچہ بافی نظم کاری میں عقل کو بھی لگادیا جس سے یہ اشیاء مزین ہوگئیں تو گو بظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہوگیا۔ مگر حقیقت میں ان سے اور زیادہ گھٹ گیا کیونکہ عقل جیسے پاک جوہر کو اس نے اپنی طبیعت کا خادم اور غلام بنادیا اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے۔ اور عقل سرچشمہ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کردیا یہ کہاں کی عقل ہے۔ بلکہ بد عقلی ہے۔ جانور اس بے ہودگی سے بری ہے۔ اس لئے ایسا کرکے انسان اونچا تو کیا ہوتا جانوروں سے کہیں زیادہ نیچا اور کم رتبہ ہوگیا کہ جانور طبع حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام نہیں بناتے۔ اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انہوں نے طبیعت جیسے جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کا عالم وفاضل نہیں بنایا اور یہ انسان طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے انہیں مزین بنا کر ان حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ ملکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہوا۔

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے

نیز یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ طبعی تقاضوں کو پورا کرلینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، کیونکہ میں کھانا کھایا کرتا ہوں تو لوگ کہیں گے کہ احمق یہ کون سی کمال کی بات ہے۔ جانور بھی کھانا کھاتے ہیں۔ یہ تو طبعی تقاضا ہے اس میں نہ محنت ہے نہ مشقت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جوانمردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے ورنہ سارے جانور بھی فضلا اور باکمال ہوں گے یا اگر کوئی کہے گا کہ میں بڑا فاضل آدمی ہوں کیونکہ میں رات کو پڑ کر سوتا ہوں تو بھی کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے جانور بھی کرلیتے ہیں تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟

کمال نام ہے خلاف طبع کرنے کا کہ اس میں انسان کی محنت، جفاکشی اور تحمل وصبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی کو سنایا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا تو لوگ اسے باکمال سمجھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں کہ واقعی خلاف طبع پر قابو پالینا کمال ہے نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کمال ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حجۃ الاسلام سیّدنا الامام حضرت نانوتوی کا بصیرت افروز واقعہ[1]

ابھی جس بزرگ کا نام نامی آپ کے سامنے لیا گیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جن کا علم وفضل اور کمال ظاہری وباطنی معروف ہے۔ ان کا زمانہ اور پنڈت جی دیانند سواتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انہوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کئے علماء نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آکر بحث کرو۔ اس نے کہا کہ تم لوگ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف "مولبی کاسم" سے بحث کروں گا۔ چنانچہ رڑکی کے علماء نے حضرت کو خط لکھا، کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لاویں باوجودیکہ حضرت مولانا قاسم بیمار تھے۔ مگر مذہب اسلامی کی حفاظت واشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رڑکی تشریف لے گئے۔ جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدث دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی، مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور دیوبند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خدام خاص شریک سفر تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں کل ڈیڑھ ذہین ہیں۔ پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں۔ ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں بیٹھ جاتے ہیں تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتوی جب رڑکی پہنچے۔ تو انہوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا تاکہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں۔ جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر بات چیت کریں گے۔ اتنے میں پنڈت جی کے لئے ایک بڑی لمبی چوڑی (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا۔ جس میں تقریباً چار پانچ سیر پوریاں، دو ڈھائی سیر حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری تھی گویا دو تین دھڑی کا ملبہ سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لئے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہو کر باہر آئی جس میں ایک حبہ بھی باقی نہ تھا، منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے کیونکہ ایک آدمی بھلا اتنا کہاں کھا سکتا ہے، منشی صاحب کمرہ میں اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید لوگ کسی دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے۔ مگر دیکھا کہ کمرہ میں کوئی اور دروازہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے خادم سے پوچھا بھی کہ اس کھانے میں کیا اور بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ ایک آدمی اور اتنا کھانا، بہرحال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آکر حضرت سے ساری گفتگو نقل کردی۔ اس سلسلہ میں سنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس سے الگ ہو کر جب اپنے ہم جولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی مجھے ایک بات کا بڑا فکر ہو گیا۔ وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے، ہمارے حضرت جیت جائیں گے۔

---

[1] حضرت قاری صاحب کی تقریر سے قبل صاحبزادہ مولانا محمد سمیع الحق صاحب نے عربی قصیدہ ترحیب پیش فرمایا تھا جس میں موصوف کے خداداد کمالات وصفات کو سراہتے ہوئے دارالعلوم دیوبند اور حضرت حجۃ الاسلام سید نا الامام نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کا مقدس تذکرہ بھی کیا گیا تھا حضرت موصوف کا اشارہ اسی کی جانب ہے (شبیر علی عفی عنہ)

کیونکہ بحمد اللہ حق پر ہیں۔ لیکن یہ فکر ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیونکہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی دم نہیں لیں گے اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھ رہیں گے۔ تو یہ بات کیونکہ بنے گی۔ بات ہنسی کی تھی۔ تمام احباب سن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہو گئی۔ لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ نے کیا کہا تھا۔! منشی جی گھبرائے فرمایا کہ میں بات سن چکا ہوں مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس کا جواب دینا ہے۔ منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا مقولہ دہرایا۔ فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں۔ 'اول الزامی جواب ہے اور یہ کہ کیا ساری باتوں کے مناظرہ کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں۔ آخر تم لوگ کس لئے ساتھ آئے ہو۔ کھانے میں بحث ہوئی تو تم مناظرہ کر لینا۔ دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا) تم اتنے دن صحبت میں رہے۔ تمہارے ذہن میں یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں؟ کھانا ۔ بہیمیت کی علامت ہے اور ۔ بہیمیت جہالت کا شعبہ ہے تو کیا تم مجھے جہالت اور ۔ بہیمیت میں مناظرہ کرانے کے لئے یہاں لائے ہو! اگر اس ۔ بہیمیت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم مقابلہ کے لئے پیش کر دیں گے' ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے کو پیش کریں گے اونٹ کو پیش کریں گے اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کر دیں گے کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو؟

پھر فرمایا کہ علم کا شعبہ ہے نہ کھانا تو تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیونکہ مناظرہ علم کے دائرہ کی چیز ہے اس کا مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائے گا۔ جو ذی علم ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک مقفل کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد کھولا جائے اور جو تر و تازہ نکلے سمجھئے کہ وہ حق پر ہوگا۔

اہلُ اللہ کا ذریعۂ حیات

اس سلسلہ میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقاء حیات کے لئے بحمد اللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباع سنت کے لئے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکر اللہ رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تو وہی ذریعۂ حیات بن جاتا ہے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ وہ اظہار عبدیت اور امت کے لئے نمونۂ عمل چھوڑنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی انتہائی قلیل مقدار میں اور وہ بھی بے حد سادہ کھانا ۔ جیسے جو وغیرہ اور وہ بھی بے شمار فاقوں کے ساتھ اس سے واضح ہوا کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اور ان کے ترک کا نام کمال ہے ، جو جوانمردی ہے۔ طبعی تقاضے پورا کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال ہے تو ہر جانور میں ہے۔

ایسے ہی فنون طبعیہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم اور کمال علم نہیں کہ یہ طبعی علوم بقدر بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ اللہ سے باتیں کر کے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں سے بالاتر ہے اور وہ علم وحی ہے۔ جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر انہیں خوبصورت طریقوں سے نمایاں کر دینے سے ملتا ہے وہ صورتِ علم کہلائے گا حقیقی علم نہیں اور جب یہ علم الٰہی ہی انسانی خصوصیت ہے ، تو انسان کے معنی ہی علم الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے۔ اس لئے انسان نام جیسے کپڑے پہننے' گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کا نہیں ، ایسے ہی دو کان ' دو آنکھ ایک ناک اور مخصوص صورتِ زیبا کے نہیں بلکہ سیرتِ زیبا کے ہیں۔ جو علم لدنی اور علم الٰہی سے بنتی ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم

وحکمت کا چشمہ پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو۔ یا اس کا حامی ہو اس لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا

الدنیا ملعونۃ ملعون مافیھا الا عالم اومتعلم۔

دنیا بھی ملعون جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون سوائے عالم کے یا متعلم کے یا ان کے حامی اور دلدادہ کے اور وہ علم جو عالم یا متعلم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب وسنت کا علم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

انما العلم آیۃ محکمۃ اوسنۃ قائمۃ اوفریضۃ عادلۃ

بلاشبہ علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنت قائمہ ہے یا فریضہ عادلہ جو کتاب وسنت کے مشابہ ہو یعنی قیاس مجتہدیہ علم صرف انبیاءؑ سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ عقل وطبع یا وہم وخیال سے۔

علم نبوی محنت اور مجاہدات سے ہی حاصل ہوتا ہے

مگر یہ علم آتا ہے محنت اور خلاف طبع مجاہدہ اور ریاضت کرنے سے کیونکہ یہ علم علوم طبعیہ وعقلیہ کی طرح طبعی نہیں اس لئے سب علوم سے افضل ہے کیونکہ امور طبعیہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آجائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے سوال فرمایا۔

بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے۔ صحابہؓ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت وہ تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت، دوزخ ان کے سامنے ہے۔ وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیاءؑ ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو ان پر ملائکہ اترتے ہیں، اللہ کی وحی ان پر آتی ہے۔ جلال وجمال خداوندی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے معجزات ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں کیا ہوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟ تو پھر صحابہؓ نے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلم۔ خدائے تعالیٰ اور اس کے رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ نہ پیغمبر ان کے سامنے ہوں گے نہ معجزات ان کے مشاہدہ میں آئیں گے اور اوپر سے شکوک وشبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور اس پر جمیں گے تو ان کا ایمان عجیب ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے وہی زیادہ عجیب ہوتی ہے ور اگر کسی چیز کے معدات اور مویدات بکثرت ہوں اور اس کی طرف جھکانے والے اسباب بہت ہوں، رکاو بالکل نہ ہو تو اس کا حاصل کرلیا جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا، اس بناء پر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ تجلیات الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت وغضب کا قصہ تو عبادت ان کے حق میں طبعی ہے۔ اور طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرلینا کوئی حیرت ناک بات نہیں بلکہ حیرت ناک اور عجیب ہے بس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا سونا جاگنا عجیب نہیں کیونکہ طبیعت کا تقاضا ہے ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے۔

کو بجالانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کر کے اور بالفاظ دیگر اپنے نفس کو قتل کر کے رکوع و سجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے بدرجہا افضل ہے

انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی عبادت سے عجیب بلکہ افضل ہے کیونکہ وہ نفس کشی پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں پر وہ صبح کے وقت گرم لحاف میں ہے۔ اٹھ کر اور خواہشات نفس کے خلاف سردی میں پانی سے وضو کر کے اور اوپر سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اسے نیند کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور یہ کہ نرم نرم بستر سے نہ اٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے۔ سرد ہواؤں میں سکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔ مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض اپنے مالک کی رضا کے لئے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوند کریم کے حکم کی تعمیل دل و جان سے کرتا ہے تو یہ مخالفت نفس ملائکہ میں کہاں؟ اور یہ نفس کشی اور جہاد نفس ملائکہ کو کہاں میسر؟ کہ وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاد کر کے نفس کو پچھاڑا جائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ملائکہ کی توہین کر رہا ہوں۔ العیاذ باللہ۔ وہ اللہ کے مقدس بندے ہیں۔ ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں۔ جن سے کبھی بھی گناہ و معصیت کا صدور ممکن نہیں ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ ان کی توہین کفر ہے اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ صرف بیان حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمت نفس ہے۔

انسان کی عبادت پوری مزاحمتِ نفس ہے

اور انسان کی عبادت پوری مزاحمتِ نفس سے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلاف طبیعت کرنا کمال ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں کہ اس میں علم آئے۔ بلکہ جہالت اس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ اس کی جبلت میں جہل ہے علم نہیں۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔ محنت و ریاضت سے ہنر پیدا کرتا ہے طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے۔ اور کمال بھی ہے۔ کمال اس لئے ہے کہ مجاہدہ سے اسے حاصل کیا جس سے اس کے اندرونی قویٰ کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی ہے اور عجیب اس لئے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرہ سے بنایا گیا ہے۔ اور جماد لا یعقل مادہ (نطفہ) سے تیار ہوا۔ نہ نور سے بنا نہ نار سے۔ بلکہ پامال خاک سے۔ جس میں شعور کا نشان نہیں اور پھر ایسا باشعور نکلا کہ دنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔ نوری ملائکہ پر فائق ہوا اور ناری جنّات پر غالب آگیا۔ محض علم کے کمال سے۔

انسان اور ملائکہ کے علم کا فرق!

تو علم کا ان گندے مادوں اور کثیف جسموں میں اتار لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب و غریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تامّل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ پس ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اور ان کا علم ان کے اندرون سے ہے اور اندرون میں رہتا ہے۔ اس

لئے پھیل نہیں سکتا جتنا ہے اتنا ہی رہے گا۔ لیکن انسان مجاہدہ سے علم حاصل کرتا ہے اور جو چیز اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ باہر سے لاتا ہے اور اسے علم حاصل کرنے کے لئے مشقت و مجاہدہ کے ساتھ کتنے ہی راستے تحصیل علم کے لئے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور کتنی ہی منزلوں سے گزر کروہ علم کے مختلف درجات و مراتب اور علمی مقامات تک پہنچتا ہے۔ اس لئے اس کا علم پھیلتا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں تدبّر و تفکّر شامل ہوتا ہے۔ جس سے مَن بھر علم دس مَن ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ پس ملائکہ کا علم عطائی قسم کا علم ہے۔ جس میں پھیلاؤ نہیں۔ اور انسان کا علم تدبّر و تفقہ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے۔ یعنی فرشتے کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں وہ چار کے چار ہی ہیں اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبّر و اجتہاد کے ذریعے ان چار میں دس بیس مسائل اور علوم پیدا کر لیتا ہے اور نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔ اس لئے ملائکہ نے بمقابلہ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا۔

انسانی علم کی فضیلت

سُبْحَانَکَ لَاعِلْمَ لَنَا اِلَّامَا عَلَّمْتَنَا

اور انسان کے استنباط کو اور اجتہاد کو اس کے خدا نے سراہا کہ:

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْابِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ

پس علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیّت علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اسماء کی تعلیم ملی۔

جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیت علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقہ و اجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور انسان کرتا ہے۔ پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اس میں زیادہ علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

استنباط و ارتقائے علم صرف انسانی علوم کا خاصہ ہے

پس علم اور ارتقائے علم درحقیقت انسان ہی کی خصوصیّت ثابت ہوئی ہے۔ جو دوسری مخلوقات میں نہیں اور ظاہر ہے کہ جامع علم شاہیّت کی شان ہے کیونکہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی مملکت کا علم رکھنا ہے تاکہ احکام دے سکے۔ اس لئے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پر نیابت و خلافت خداوندی بھی اسی کا کام ہو سکتا تھا جو اسے مل گیا۔ اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ نائب الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے، کائنات سے کام لے اور اس میں حسب منشاء تصرفات کرے۔ اس لئے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے۔ جمادات سے الگ بیگار لیتا ہے۔ زمین سے آسمان تک اس کے تصرّفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادی کائنات کے مادوں میں علم کی طاقت سے جوڑ توڑ کر نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ سب سے پہلے علم یہ ہے کہ شئی کا نام معلوم ہو کیونکہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل و صنعت میں نئی نئی اختراعات کرنا نہ فرشتوں سے بن پڑا نہ جن و حیوان سے۔

استعداد علم کی ترقی

بلکہ صرف انسان سے۔ تو حق تعالیٰ کی ازلی عنایت اس پر متوجہ ہوئی اور اسی کو اس نے اپنی توجہ و عنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔ چنانچہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شی کا نام معلوم ہونا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اس کی طرف توجہ ہی محال ہے اس لئے کہ مجہول مطلق کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھلائے۔ جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا شی کا نام معلوم ہو جانے پر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو دیکھ بھی لوں۔ جس کا نام سنتا آرہا ہوں تو پھر حق تعالیٰ نے وہ ناموں والی کائنات پہچانوائی کہ وہ معلوم الاسماء اشیاء فلاں فلاں ہیں۔ تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے۔ انہیں پیش کیا۔ پس ان کے خواص و آثار بتلائے۔ پھر ان کے نتائج و غایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بدرجہ عالم بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیاء علیہم السلام یکے بعد دیگرے معلم بن کر آتے رہے، اور علم کے مراتب کی درجہ بدرجہ تعلیم دیتے رہے۔

تکمیل علم و خلافت

یہاں تک کہ جب انسانی استعداد جامع علم کی متحمل ہو گئی اور قرنہا قرن گزرنے اور علمی مشق کرنے کے بعد وہ ہمہ گیر علم کے لئے مستعد ہو گئیں تو آخری معلم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے حقائق الٰہیہ کی تعلیم دی اور علم کو کامل کرتے ہوئے اس کے ہر ہر حکم کی علت اور رلم پر مطلع فرمایا۔ جس سے انسان نے حقیقت علم کا سراغ پایا اور وہ قرآن حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔ پس وہ خلافت جو آدم علیہ السلام کے دور میں اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں وہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گئی۔ کیونکہ اس کا مبنی علم تھا۔ علم ابتداء میں علم الاسماء کے ابتدائی دور میں تھا۔ تو اس پر مبنی شدہ خلافت بھی ابتدائی ادوار میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حد کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی ہی کے آنے کی گنجائش نہ رہی۔ جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے تو خلافت بھی حد کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ خلافت ظاہری تو حقائق کائنات کی تسخیر ہے۔ جس کے ذریعے عناصر اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں۔ اور خلافت باطنی حقائق الٰہیہ کی تحصیل ہے۔ جس کے ذریعہ روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوں۔ سو ظاہر ہے کہ دور محمدی میں یہ دونوں ہی خلافتیں حد کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک محیر العقول مادی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں۔ جو عقل و نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ اور ایک سے ایک حیرت ناک علمی و روحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو تفقہ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقل اور تفقہ یا عقل نفسانی اور فقہ روحانی دونوں حد کمال کو پہنچ گئے۔ کیونکہ علم جامع دنیا کے سامنے آگیا۔ اس لئے خلافت صوری واسمی بھی مکمل ہو گئی اور خلافت حقیقی و معنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔

اختصاص خلافت

لیکن صورت بلا حقیقت ناپائیدار اور بے معنی ہے۔ اس لئے مادی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنی

اور جسم بلا روح کی مانند ہے۔ جس کے لئے نہ بقا ہے نہ پائیداری اس لئے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان کو ہی دی گئیں۔ نہ ملائکہ کو ملیں نہ جنات و حیوانات کو۔ کیونکہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔ ہاں یہ علم انسان ہی میں کیوں ترقی کرسکتا تھا اور کیوں وہ بہائم یا جنات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ بھی دونوں قسموں کی خلافتوں کے مستحق ہو جاتے۔

مادّی ترقی عناصر کے تصادم و ٹکراؤ کا نتیجہ ہے

سو اس کی بناء یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو یا صنعت و عمل کی ، بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے کہ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہ ہو سکتے کیونکہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ بسیط مادہ میں ترقی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اسے اس کی ضد سے ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔ مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی' اسی انداز پر آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدّت پیدا کرلی ہو۔

اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اس طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اچھل کود کرتا تھا۔ اسی طرح آج بھی کر رہا ہے۔ نہ اس کے تموّج نے کوئی جدل پیدا کی نہ جزر و مد نے' وہی تموّج آج بھی ہے' جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اب بھی ہے جو پہلے تھا۔ کوئی رخ تبدیل نہیں کیا۔ نہ اس کا رخ بدلا' نہ دھارا بدلا اسی طرح ہوا جیسے پہلے چل رہی تھی۔ اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاک تھی۔ اب بھی ہے نہ اس میں کوئی جدّت ہے نہ ندرت نہ ترقی ہے نہ ارتقاء لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے ٹکرادو تو ترقی وہیں شروع ہو جائے گی۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری آگ دھکادیں کہ آگ پانی پر حملہ آور ہو اور پانی آگ پر، وہ اسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اسے گرما دینا چاہے۔ تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جائے گی۔ جیسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے کلیں اور مشینیں چلنے لگیں گی۔ اور تمدّنی ترقی شروع ہو جائے گی اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو یہ تمدّنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جو تنہا ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضا میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھکولوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہاب ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے جو کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں اور ___ ساکن فضاء میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہو سکتے تھے' اسی طرح مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقت کو ختم کر دینا چاہتی ہے اور پانی مٹی کے جماؤ اور انجماد کو مٹا دینا چاہتا ہے تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہوگی پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے' جن سے تمدّن کی ترقی ہوگی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ترقی نام تصادم کا ہے تصادم نہ ہو تو ترقی بھی نہ ہو۔ انکو چھوڑ کر کہ اعیان میں لو تو دو پہلوان مثلاً فن کشتی و سپہ گری کے ماہر ہوں لیکن کبھی

بھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی بھی باہم کشتی نہ لڑیں تو ان کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کشتی لڑ پڑیں۔ تو ہر ایک کوشش کرے گا کہ ایک دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تاکہ مغلوب نہ ہو تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا۔ اور دنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔

علم وجہل، حق وباطل کے تصادم کی حکمت

اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہو۔ اس کے علم میں خود بخود کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ کردے تو اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی بدولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہوگی جو بغیر اس علم وجہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اسلام حق ہے اس کا علم اور قانون سچا ہے لیکن اگر اس کے مقابلہ پر کفر نہ ہو اور وہ اس سے ٹکر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کے حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہیں کھل سکتے۔ اور نہ ہی اس کی قوت نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلہ پر کفر، اخلاص کے مقابلہ پر نفاق، سچ کے مقابلہ پر جھوٹ، علم کے مقابلہ پر جہل، دیانت کے مقابلہ پر خیانت، ملائکہ کے مقابلہ پر شیاطین، انبیاء کے مقابلہ پر دجال رکھ دیئے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قومیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں۔

قوموں کے باہمی تقابل میں درسِ عبرت

اسی طرح وہ قومیں کتنی ہی جاہ وجبروت کی حامل ہوں۔ لیکن اگر ایک کی دوسری قوم سے ٹکر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلہ ہی کے وقت کھل سکتے ہیں، کبھی نہ کھلیں۔ اس لئے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب ومغلوب کے ملنے سے ہمیشہ نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دنیا کی وہ ترقیات جو عقل انسانی اور علمِ روحانی سے وابستہ ہیں اپنے اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوں۔ اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر اگلی نسلوں کے لئے مزید ترقیات کا درسِ عبرت بنیں۔ ورنہ ہر قوم ماء راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو کھودے اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی، کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے اور عالم میں فساد پیدا ہو جائے۔ اس لئے عوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لئے تازیانۂ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ بے فکری سے اپنی خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے پائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل وکرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات کے سربستہ راز ہی واشگاف ہو سکتے ہیں نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو قدرت نے اس میں ودیعت رکھی تھی۔ فرمایا:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ

ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیت ہے، جنات میں صرف شیطنت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے۔ اسی لئے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں کوئی محض آگ کی مانند ہے جیسے جنات۔ کوئی محض ہوا کی مانند ہے جیسے

ملائکہ کوئی محض مٹی یا پانی کی مانند ہے جیسے بہائم۔ سو نہ جنات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے آج تک نہ کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا منہاج اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی نہ کسی بہیمیت نے آج تک کوئی نیا راستہ ڈالا جس سے دنیا کو کوئی رہنمائی ملتی۔ جنات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ وفریب اور فساد انگیزی کرتے تھے۔ اسی نوعیت کا آج بھی کرتے ہیں۔ بہائم کھانا' پینا' چرنا اور نسل بڑھانا جیسا پہلے کرتے تھے وہی آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل کے گھاس کھانے کا اور نہ نر ومادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا نہ فرشتہ کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکروزور میں کوئی جدت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہزارہا ہزار برس پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں کیونکہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی مادہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں جو ترقی کی بنیاد تھی۔

تقابل صفات سے ترقی

بخلاف انسان کے، کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرمادیں اس میں ملکیت بھی ہے۔ بہیمیت بھی ہے اور شیطنت بھی ہے تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو اکہری قوتوں سے نہیں ہو سکتا تھا مثلاً بہیمیت کا کام کھانا' پینا اور نسل بڑھانا تھا لیکن جب اس کے ساتھ ملکیت ٹکراجاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عفت کہا جاتا ہے اور اس سے جائز وناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز' فلاں حرام' فلاں نسل کشی حلال اور فلاں حرام فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز غرض تدین کے ہزاروں گوشے عفت وپاک دامنی کی بدولت کھلتے ہیں جس سے دین ودیانت ترقی کرتے ہیں اور عفت درحقیقت بہیمیت اور ملکیت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جیسے آگ پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنت کا کام دھوکہ' فریب' دغا بازی اور مکاری ہے اس کے ساتھ اگر ملکیت کی عقل لڑا دو تو تدبیر وتدبر پیدا ہوگا جس سے مکروفریب کے بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہوگا اور مخفی تدبیروں کا حسن نمایاں ہوگا اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے۔ درندوں میں قوت غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے۔

کمال کا ظہور اور مادی وروحانی ترقی

لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت وبُردباری کو ٹکرادیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس میں عقل وہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال شہوت' غضب اور مکروفریب کے ساتھ اگر قوت عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور علمی واخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن وملک اور حیوان سے ممکن نہیں۔ کیونکہ متضاد قوتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے۔ اس لئے ترقی کی راہیں بھی انسان پر کھل سکتی ہیں۔ نہ کہ ان تین مخلوقات پر اس لئے اگر ایجادات سے دنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل' تار' فون' بجلی' اسٹیم' جہاز' کشتی سواری' مکان' ظروف' تجارت' حرفت' حکومت' انسان کے سوا کسی نے کر کے نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادات اور نقل وروایت کی استنادات دین' شریعت' مذہب' مشرب' ذوق وجدان حدس' تجربہ' علم' معرفت' قرب' اطاعت' بصیرت بھی انسان کے سوا کسی نے حتی کہ کسی پاکباز فرشتہ نے بھی کے

یں دکھلائی' یعنی انسان اس ترقی اور ان متضاد مادوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے میں زیادہ اونچا پہنچا اور جبریل کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی جہاں ملائکہ بھی پر نہیں سکتے۔ یہ اس کی قوت عقلیہ کے قوت شہوانیہ' قوت غضبیہ' قوت سبعیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

قوائے شر کا عقل پر غالب ہونے کا نتیجہ

ہاں اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور قوتیں بمقابلہ عقل کے غالب آجائیں یعنی عقل ان وں کی خادم بن جائے اور ان کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے کی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار تھ آگے کا۔ بہیمہ اور شیاطین سے درجوں اوپر کا شیطان بن جاتا ہے جس سے بہائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے تے ہیں۔ اگر اس کی عقل۔ بہیمیت کا آلۂ کار بن جائے تو بہائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے جھے گی۔ یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں ایجاد کرلے گا جو بہائم کے باپ کو بھی نہیں سوجھ سکتیں۔ ں کے ہاں عیاشی کے اڈے بن جائیں گے۔ زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن ئے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحّاش دماغ اور عیّاش دل اختراع رے گا اور اگر اپنی عقل کو مکروفریب کی قوتوں کا غلام بنا دیا تو پھر اسے وہ حیلے اور جعلسازیاں سوجھیں گی کہ طان کو صدیوں غور کرکے بھی نصیب نہ ہوں گی۔ غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو احسن تقویم کا ثبوت پیش کرے گا اور اگر عقل پر شہوت وغضب اور درندگی غالب آگئی تو بھی انسان اسفل فلین میں کھڑا نظر آئے گا۔

لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں پر علم کے ہتھیاروں ہی سے غالب آسکتی ہے۔ بلا علم کے عقل محض ل طبعی ہے جو بلاشبہ ان ہی طبعی قوتوں کے ساتھ دے گی اور انہیں اپنا کام کرنے کے نئے نئے راستے بتلائے لیکن عارف عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو۔ ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی۔ اور پھر ہر شعبہ زندگی میں انسانی الات کا ظہور ہوگا۔ اس لئے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر عقل محض سے ثابت نہیں ہوتی علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور کورا عقلی بھی نہ ہو بلکہ ربانی علم ہو جو بذریعہ وحی ذات حق کی طرف سے آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جلا دیتا ہے۔ ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ نوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے ورنہ ؎

آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا

اس لئے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری شنی وابستہ ہے۔

شریعت کی حکمرانی

اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں یعنی خلوت اور ت' انفراد اور اجتماع' دوستی اور دشمنی حکومت اور غلامی' خوشی اور غمی' راحت اور مصیبت' موت وحیات رحلہ پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے' رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی

حیثیت سے ساتھ رکھیں۔ یہی قوتیں جو جہالت میں کام کرتی تھیں۔ اب علم میں کام کریں گے۔ وہی بھیمیّت جو جہالت کے ساتھ عیاشی 'فحاشی' بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی اب شریعت کے تابع ہو کر عفت وعصمت 'پاکی' پاک دامنی اور نیکوکارری پر لے آئے گی' وہی قوت شیطنت جو بحالت جہل مکاری 'ڈپلومیسی' عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی۔ اب تابع فرمان الٰہی ہو کر تدبیرودانائی 'دانش وبینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی۔ اور بالفاظ دیگر جبلت نفسانی سے نکال کر فطرتِ روحانی کی طرف نکال لائے گی۔ اس لئے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کردی جائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم الٰہی کی کردی جائے۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا معنیٰ

تو انسان مزکّیٰ' مصفّیٰ اور مجلّیٰ ہو جائے گا ورنہ ایک بہیمہ یا ایک شیطان یا ایک درندہ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خلقی مادہ کو ضائع کرنے یا پامال کرنے کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آئی ہے۔ تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دین فطرت ہونے کے کہ اس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگادیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب۔ سبعیّت ہو یا شیطنت کسی کو بھی بے کار نہیں ہونے دیا بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلادیا ہے۔ نیکی تو بجائے خود ہے۔ اس نے تو کسی بدی کو بھی علی الاطلاق نہیں مٹایا۔ بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے۔ مثلاً جھوٹ گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلّت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلاف واقعہ کلام کرجانا داخل ہے۔ شریعت نے اسے کلیتہً نہیں مٹایا۔ بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بھول کر بھی صلح کرادو تو نہ صرف کہ یہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا۔ اور ایسا اجر جو نماز' روزہ پر ملتا ہے۔ دو بھائی باہم لڑ رہے تھے۔ آپ نے ایک بھائی کے پاس جاکر کہہ دیا کہ میاں تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو وہ تو تمہاری جدائی سے بے حد غمگین اور سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطبُ اللسان تھا اور روتا تھا کہ ہائے میرا بھائی مجھ سے جدا ہوگیا۔ ادھر دوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں۔ جس سے دونوں کے دل نرم ہوگئے اور مصالحت کو آمادہ ہوگئے۔ اور صبح کو دونوں نے معانقہ کرکے باہم صلح صفائی کرلی۔

شریعت نے جبلّی وطبعی قویٰ شر کو خیر کے طرف موڑا

تو اس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گی جس سے فتنہ کا بیج بودیا گیا اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑادیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر شریعت کے اشاروں سے ہو اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتا ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں 'یعنی کسی عیب واقعی کو اس کی پس پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی ہے اور اسے حرام رکھا۔ حالانکہ غیبت سچی بات کو کہتے ہیں اور جھوٹ ہو تو وہ افتراء ہوگا غیبت نہ ہوگی تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ۔

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کے مردار گوشت کو نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ

عبادت ہے اور نہ جھوٹ معصیت بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیّت ہے ___ یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت، غروب ہوتے وقت اور استواء یعنی سر پر ہوتے وقت ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا۔ معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔

عبادت کی حقیقت تسلیم ورضا ہے

ماہ رمضان میں روزہ فرض ہے اگر بِلا عذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں۔ لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا۔ جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے' کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں' روزہ رکھو جب ترک کرائیں ترک کردو۔ اپنی تجویز کو دخل مت دیں کہ یہ اطاعت درحقیقت عبادت ہے یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقتِ عبادت اطاعت اور تسلیم ورضا ہے۔

خودکشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لئے پیش کردینا اور سر کو ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے ___ نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بروقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل نفس اپنی نفس کے لئے کیا جائے تو معصیّت ہے کہ خلاف اطاعت ہے اور یہی قتل نفس اگر حفاظت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور دین و عبادت ہے کیونکہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیّت نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے۔ اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کرسکتے۔ ہاں مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں۔ وہ رکھوائیں تو اس کا رکھنا اور بچانا عبادت ہے وہ خود ہی اسے تلف کرائیں تو تلف کردینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ معصیت ہے، نہ اس سے بچنا عبادت ہے کہنا ماننا عبادت ہے۔ اگر کہے کے مطابق لوٹ مار بھی ہو تو عبادت ہے اور کہے کے خلاف امن و امان دینا بھی معصیت ہے۔ زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا کبر نفس ہے۔ جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ :

لَاتَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً

”خدا کی زمین پر تکبر کی چال مت چلو۔ کیونکہ تم اکڑ کر اور ابھر ابھر کر زمین کو چیر نہیں دوگے۔ اور اونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے“۔

پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی مصیبت بھر رہے ہو جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیّت اور جرم ہے۔ لیکن حج کے موقعہ پر جس طواف کے بعد سعی صفا و مروہ ہو اس میں ابتدا کے چار پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزو عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیّت ہے' نہ جھک کر چلنا عبادت ہے۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے۔ پس اصل چیز اطاعت حق نکلی اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیت بن جاتے ہیں۔ اور اگر کہے کے مطابق ہے تو جھوٹ 'لوٹ مار' تکبّر کی چال اور غارت گری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ بس اس طرح تمام خلقی قوتوں کو شریعت کے موافق استعمال کیا جائے تو وہ سب اطاعت بنتی چلی جائیں گی اور خلاف حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی۔ اس سے عبادت کی دو نوعیں نکلتی ہیں ایک افعال خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے اور ایک افعال اثم جن سے بچنا ضروری ہے۔

برو تقویٰ

پہلی نوع کو شریعت کی اصطلاح میں بر کہتے ہیں جیسے فرمایا :

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ (الآية)

اور دوسری نوع کو تقویٰ کہتے ہیں۔ جس کے ذریعے گناہ سے بچا جاتا ہے۔ عبادت کی ان دو نوعوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں نہیں بڑھا ہوا ہے بلکہ عبادت میں بھی فائق ہے۔ کیونکہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ تقویٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر کا مادہ ہی نہیں۔ وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے۔ تو ان سے بچنے کے لئے کہا بھی نہیں جاسکتا اور انسان شر کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے۔ اس لئے شرّ سے اسے ہی روکا بھی جاسکتا ہے اور اس کا رکنا عبادت بھی قرار پاسکتا ہے کہ وہ ارادۃً رکتا ہے۔ فرشتہ میں نہ شرّ کا مادہ ہے نہ اس کے شر سے بالارادہ رکنے کا سوال ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے تقوی کی نوع کی عبادت ہی فرشتہ کے لئے نہیں۔ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے تو انسان اس نوع عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں، ان میں معاشرت' معالات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لئے نہیں کیونکہ ان میں نسل کا قصہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز واقارب پیدا ہوں اور معاملات لین دین' آشتی و صلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے اس لئے بر کا دو تہائی حصّہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص نکلا' اب رہے اعتقادات سو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ اعتقاد کی اصل ایمان ہے اور ایمان کے معنی ایمان بالغیب کے ہیں۔ فرشتہ کے حق میں کوئی چیز غیب ہی نہیں کہ اسے ایمان کا مکلف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لئے اعتقادات کا حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اب اگر رہ جاتا ہے تو دیانات کا رہ جاتا ہے، یعنی نماز' روزہ' زکوٰۃ وغیرہ سو مال کی ضرورت معاشرت کے لئے ہے فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں۔ نسل نہیں اس لئے مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہو سکتا تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہی' رہا روزہ کے معنی اپنی ارادہ ونیّت سے کھانا پینا اور لذّت نساء کو ترک کرنا ہے۔ فرشتہ کے لئے نہ بیوی ہے نہ کھانا پینا تو وہاں اس عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لئے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فرشتہ کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔ اس انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبع کو برداشت کر کے ہوتا ہے۔ فرشتہ کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات وعبادات میں بھی انسان ہی فرشتہ سے افضل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں بہیمیّت اور شیطنت والی قوتیں ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرشتہ میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔ اس لئے وہ دو تہائی دین سے الگ تھلگ ہے۔ اب انسان میں قوت عقلی ہے۔ جو فرشتہ میں بھی ہے مگر اس عقل کے کتنے ہی مصرف جس سے عقلی قوت کی تفصیلات کھلتی ہیں۔ صرف انسان میں ہیں ملائکہ میں نہیں۔ اس لئے وہ اطاعت وعبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کر سکتا جو انسان پیش کر سکتا ہے۔ غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔ اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانون خداوندی کے ماتحت گزارنا ہے۔ سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملی ۔ اس لئے اسلام اور تسلیم ورضا بھی اس کی جامع اور حاوی ہو سکتی ہے۔ جو کسی دوسری نوع کے لئے

ممکن نہیں ابراہیم کو جب حکم ہوا:۔ اِذْقَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسْلِمْ اے ابراہیم مسلم بن جاؤ تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ کفر سے اسلام میں داخل ہو جاؤ بلکہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور گردن جھکا دو تو عرض کیا:۔

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

"میں مسلم بن گیا۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اعلان کردو کہ میری زندگی اور موت۔ میری نماز اور عبادت سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ رضائے نفس کے لئے نہیں۔ مجھے الٰہی کا حکم کیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمین میں سے ہوں"۔

پس اسی تفویض و تسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لئے جیے اور رضائے حق ہی کے لئے مرے اسی کی خوشنودی کے لئے صلح کرے، اسی کے لئے لڑے، اسی کے لئے محبت کرے، اسی کے لئے عداوت باندھے، اسی کے لئے دے اور اسی کے لئے ہاتھ روکے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:۔

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان

"جو اللہ ہی کے لئے محبت کرے، اسی کے لئے عداوت کرے، اسی کے لئے دے اور اسی کے لئے ہاتھ روک لے تو اس نے ایمان کامل کر لیا"۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں نہ شہوت ہے نہ شیطنت نہ غفلت ہے نہ نخوت۔ اس لئے جو اطاعت انسان کر سکتا ہے وہ فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادے ہی نہیں۔ جن کی روک تھام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔ اس لئے فرشتہ کو ان علوم کی ضرورت بھی نہ تھی جو انسان کو تھی۔ اس لئے کہ جتنی مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں۔ اتنے ہی دفاع و مدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لئے ضروری ہے۔

بنیادِ خلافت

اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اس کی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے فرشتہ کی نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل۔

تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی بنے۔ کیونکہ کمالات خداوندی لامحدود ہونے کے باوجود دو ہی نوعوں میں اصولاً منحصر ہیں کمالات علم اور کمالات عمل اور انہی دو میں انسان ساری مخلوقات حتیٰ کہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں وہی ہو سکتا تھا اور عمل چونکہ علم کے تابع ہے اس لئے اصل بنیاد خلافت علم ہی ٹھہر جاتی ہے۔ جو انسان ہی میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے، اس لئے اسی کو خلیفۂ الٰہی بنایا گیا۔

خلافتِ انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال

اسی لئے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنادیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنے والا کون ہے؟ تو حق تعالیٰ نے اولاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیاء کائنات کے نام تو بتادو' وہ نہ بتا سکے تو آدم سے فرمایا تم بتاؤ۔ انہوں نے فر فر نام گنوادیئے۔ تو بتادیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرتبہ علم اسماء ہے جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جاسکے تو اسماء کے بعد صفات اشیاء پھر خواص اشیاء پھر حقائق اشیاء وغیرہ کے علوم ہیں تم ان سے کب بازی لے جاسکو گے اس لئے مستحق خلافت انسان ہی ہے۔

بارگاہ الٰہی سے قولی و عملی جواب

رہا عملی میدان تو اس میں ملائکہ نے نوع انسانی کی مذمت کی تھی کہ وہ سفّاک ہو گا، مفسد ہو گا تو قدم قدم پر حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اول تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں تاکہ قیامت تک ان کے اس شبہ کا جواب عملی ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں آیا ہے کہ جب کہیں مجلس خیر و وعظ و نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل ہوتے ہیں جو اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ یہ مجلس ہے جس میں آج ہم اور آپ جمع ہو کر ذکر حق سن رہے ہیں۔ اس میں بلاشبہ کروڑوں فرشتے تشریف فرما ہیں۔ جب یہ مجلسِ خیر ختم ہوگی۔ تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور انہیں حق تعالیٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں تم کہاں گئے تھے۔ عرض کرتے ہیں۔ آپ کے بندوں کی مجلس میں فرماتے ہیں تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں 'مصروف تھے' آپ کی جنّت کے طالب تھے اور جہنم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنّت' دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں انبیاء سے سن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنت و نار کو دیکھ پائیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے انہیں کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جنّت بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور انہیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور انہیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی' اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں دنیا میں نہ معلوم کتنی ہو رہی ہوں گی جیسی مجلس یہاں ہو رہی ہے اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اترنا اور پھر چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کو عملی جواب دینے کے لئے ہے کہ جس کے بارے میں تم کہتے تھے کہ:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ

تم نے دیکھا کہ وہ کس درجہ عمل صالح اور بر و تقویٰ میں لگا ہوا ہے اور کس درجہ صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر خود جمے رہنے کی سعی بھی کر رہا ہے۔

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت

کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ سفکِ دماء ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق

ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت واطاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا۔ تاکہ اس کی سفّاکی اور فساد کا تخیّل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف ہو جائیں۔ چنانچہ ہر غیر معمولی عمل عبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج و زیارت کرتے ہیں۔ طواف و سعی میں دوڑتے ہیں ___ منٰی و عرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر سر سے کفن باندھ کر اپنی لذّت و آرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سب میری خوشنودی و رضا کے لئے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کو وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے **اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا** کہا تھا۔ دیکھو کیسا اطاعت و عبادت اور ترک لذّات میں اپنے رب کی خاطر مصروف ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اوپر چڑھتے ہیں اور اعمال نامے رات والے ملائکہ کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت دن والوں کو چارج دے کر اوپر چڑھتے ہیں غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج و نزول کا وقت فجر اور عصر کی نمازوں کے وقت ہی رکھا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ:۔

ترکناهم وهم یصلون واتیناهم وهم یصلون۔

”جب ہم نے انہیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے۔ اور جب ہم نے جا کر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول تھے“۔

سو یہ وہی عملی جواب ہے کہ جن کے بارے میں تم مفسد اور سفّاک ہونے کے مدّعی تھے دیکھو وہ رات دن کیسے مصروف عبادت ہیں۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح و شام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری ان پر جتائی جاتی ہے۔ تاکہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اس کی خلافت کے معترف ہوتے ہیں۔

احوال و کیفیات میں انسان کا تفوّق

پھر نہ صرف علم و عمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا و برتر ہے بلکہ احوال و کیفیات بھی دیکھی جائیں۔ جو قرب الٰہی اسے حاصل ہوتی ہیں۔ سو وہ ان احوال میں بھی ملائکہ سے بالا و برتر ہے آخر جو احوال و کیفیات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہیں وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں۔ کیونکہ نہ ملائکہ علم و عمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں۔ جس سے انسان گزرتا ہے۔ نہ ان پر وہ کیفیات عشق و محبت طاری ہوتی ہیں۔ جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم، عمل، حال سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے۔ اور نائب خداوندی بنایا جائے کہ بناء خلافت یہی دو چیزیں تھیں۔ علمِ خداوندی اور اخلاقِ خداوندی وہ دونوں جب اس میں علیٰ وجہِ الاتم ثابت ہوتے ہیں۔ تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اس میں آسکتی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیلِ خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جب کہ علمِ کامل اور عملِ کامل ہے تو یہ علم و عمل جب تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا۔ جس انداز کا خود حق تعالیٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کی علمی و عملی خلافت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

تکمیل خلافت آخرت میں ہوگی

اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے علم اور عمل وصنّاعی کی شان یہ ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کرلیا۔ (معاذ اللہ) بلکہ علم کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے۔ یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے ابھرتا ہے ایسے ہی اس کی صنّاعی بھی وسائل و آلات کی محتاج نہیں بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کُن (ہوجا) تو وہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے وہ پل بھر میں جہان بنادیتے ہیں اور ان کے ارادہ ہی سے وہ چیز خود بخود معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ

اس صورتحال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنت میں داخل ہو کر پیدا ہوگی۔ چنانچہ تو یہ ہوگا کہ تمام صنعتیں اس کی قوتِ متخیّلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب و محنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جس جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی۔ اسی کو یوں قرآن میں فرمایا گیا:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ (الآیۃ)

یعنی ماضی و مستقبل سب کچھ انسان پر روشن ہو کر اس کے علم میں آجائے گا اگلے پچھلے تمام کئے ہوئے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بخود حاصل ہوں گے۔ نہ کوئی استاد ہوگا۔ نہ کتاب؛ نفس انسانی خود مُدرک بن جائے گا اور ہر عمل کی یہ کیفیت ہوگی کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیّلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب و محنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی جتنی جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے وہ چیز سامنے آجائے گی اسی کو قرآن میں فرمایا گیا:

وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَاتَدَّعُوْنَ

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہوجائے گی کہ جو چاہا وہی ہوگیا۔ نہ اسباب کی ضرورت نہ وسائل کی؛ جب علم انسانی اسباب سے مستغنی ہوجائے گا۔ اور عمل کسب و ریاضت سے مستغنی ہو کر محض قوّت ارادہ تابع ہوجائے گا۔ بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے علم وصنعت کے مشابہ ہوجائے گا تو اس وقت انسان کی علمی و عملی خلافت مکمل ہوگی کہ وہ جس کا نائب ہے وہ علم و عمل میں نائب ہے۔ اور اس کے علم و عمل سے مشابہ اس کا علم و عمل ہوجائے گا۔ اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم و عمل تھا۔ جو علم و عمل خداوندی کے مشابہ بن گیا خلافت بھی صحیح معنی میں اس وقت مستحکم اور مضبوط ہوگی مگر جنت میں یہ استحکام خلافت جب ہی ہوگا جب میں علم و عمل کے اسباب و وسائل اختیار کرکے اسے جزو نفس بنانے کی انسان نے سعی کی ہوگی۔ ورنہ یہاں محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کامل بن جانے کے بعد حق تعالیٰ ان بندوں کو القاب و خطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب و خطابات خود ان کے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو نشاط میں ڈالنے کے لئے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خط رسانی کا کام کریں گے۔ خطوط کے لفافوں پر یہ پتہ لکھا ہوگا۔

مِنَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ اِلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ

عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے یعنی القاب بھی وہی دے دیں گے۔ جو خود ان۔

سرکاری خطابات ہیں۔ پس اس عالم میں انسان صورۃً خلیفۂ خداوندی ہے۔ اور محض خلافت کے راستہ پر پڑ تا ہے۔ آخرت میں پہنچ کر حقیقی معنی میں خلیفۂ خداوندی بن جائے گا مگر یہ منزل جب ہی آئے گی جب اس کا راستہ دنیا میں اختیار کر لیا جائے گا اگر یہاں نیابت کی یہ ظاہری صورت اختیار نہ کیا جائے جو اطاعت وعبادت سے بنتی ہے۔ تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہوگی۔ اور کیسے ہو جائے گی؟ بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ جنّات، ملائکہ اور حیوانات میں سے اس خلافت کے عہدہ کے لئے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا۔ آیا تو صرف انسان کا آیا۔

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابل خطاب ہی نہ تھے۔ اس لئے قابل ذکر بھی نہ تھے۔ قابل ذکر ملائکہ، جنّات اور انسان ہی تھے۔ سو ان ہی کا اللہ نے اس آیت میں جو میں نے ابتدا میں تلاوت کی تھی ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدانِ مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنّات میں سے ہے اس کے فہم و عمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ امر خداوندی کے معارضہ پر اتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہو گیا جو اس کی بدفہمی اور بدبختی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفۂ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیت، انسان نے علم کا ثبوت دیا کہ جنّت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علم اسماء سے اس کا علم ترقی کر گیا۔ جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعے اس نے تمام اشیاء زندگی پر قابو پالیا اور کائنات اس کے لئے مسخر ہوگئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگادیئے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اس کے مقابلہ پر چھوڑ دیا گیا کہ چوکنا رہے اور اس کا مقابلہ کر کے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے، اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہی۔ یہ علم انبیاء کو دیا اور انبیاء نے یہ علم جو جنائے خلافت ہے بنی نوع انسان کو سکھایا پس انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے استاد اور مربّی ہیں حق تعالیٰ نے ان پاکباز استاذوں کا گروہ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں بھیجا۔ اور دنیا کو حکم دیا کہ ان سے علم سیکھے، اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے چھت آسمان ہے۔ اس میں ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان و جنّات اس مدرسہ کے طلبہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام استاذ ہیں اور ملائکہ خدّام مدرسہ، نگران اور منتظم ہیں۔ طلبہ کے لئے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دستر خوان بنا دیا تاکہ طلبہ وظیفہ پاسکیں اور ان کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاق خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کو فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہوگئی جس کی بنا علم ہے۔

خلافت نبوّت

یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اوّلین خلفائے ربّانی ہیں۔ ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو علمائے ربّانی ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے:۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین۔ (الحدیث)

پھر ہر صدی پر مجدّدین کا وعدہ دیا گیا ہے جو علمائے راسخین فی العلم ہوں گے یہ حضرات علماء اس علم الٰہی

و غلو کنندوں کی تحریفوں، باطل پسندوں کی دروغ بافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک وشبہات اہل باطل اور اہل زیغ اس میں ڈالیں گے، یہ اہل علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ امّت لاوارثی امّت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے دین وعلم کا حلیہ بگاڑ دے۔ اور کسی بھی مفسد و عیّار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا :

کیف تھلک امتی انا اوّلھا۔

والمھدی وسطھا والمسیح اخرھا۔

آپ نے ارشاد فرمایا :

لاتجتمع امتی علی الضلالۃ۔

وراثتِ نبوّت

آپ نے ارشاد فرمایا کہ :

لاتزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لایضرھم من خاذلھم ولامن خالفھم حتی یاتی امر اللہ۔

پس جس امّت میں اتنی انواع کے اخلاف رشید کے وعدے دیئے گئے ہوں۔ وہ امّت لاوارث امّت نہیں ہو سکتی۔ اس کی پشت پناہی اللہ ورسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی، جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

مثل امتی کمثل المطر لایدری اولھا خیر ام اخرھا؟

پس انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اس وارث اُمّت کو ملتا رہے گا جب تک اپنا روحانی نسب حضورؐ سے جوڑے رکھے گی اور وہ ترکہ بھی علم ہے کیونکہ انبیاء روٹی اور کرسی وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم ومعرفت ___ چھوڑتے ہیں۔ اسی علم ومعرفت سے آدمی آدمی بنتا ہے اور انسانیّت اسی علم پر موقوف ہے اگر دنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف نہ لاتے تو انسان گھوڑوں، ڈنگروں کا ایک گلّہ ہوتا جو بقول ملائکہ سفّاکی اور مفسدہ پروازی کے سوا دوسرا کام نہ جانتا۔

انسانی ترقی

پس مادی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کر سکتی ہے۔ مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کرسکتی۔ عمدہ انسان صرف انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندھیرا ہو جاتا ہے نہ تقوائے ظاہر ہوتا ہے نہ تقوائے باطن۔ ظاہراً مادیات کی ترقی ہو رہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہو رہے ہیں۔ انسان نے نئی نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کر دیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی اگر وہ اڑنا چاہے تو لوہے، لکڑی، پیتل کا محتاج ہے اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو لاسلکی اور وائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل، موٹر کا محتاج یعنی خود اپنے نفس کی اندرونی طاقتوں سے یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ ان آلات ووسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنہوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزارہا

میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آوازیں پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔ فاروق اعظم نے مسجد نبویؐ سے ساریہؓ کو آواز دی تو وہ ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انہوں نے بلند پروازی دکھلائی وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوتوں سے نہ کہ مادی وسائل سے۔ اس لئے اپنے اندر جوہر پیدا کرو' لوہے' پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مسبّب الاسباب کے بندے بنو۔

آج کی یہ ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالانکہ انسانی ترقی استغناء کی ترقی ہے۔ لوہے' پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کر دینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اس جگہ باکمال ہے جہاں مشینیں ہوں' بجلی ہو' پاور ہاؤس ہو' پٹرول ہو۔ جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز' بے بس اور بے کس ہے۔ انسانِ کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو اور اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

نورِ قلب

شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولانا رومیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ رومیوں نے کہا کہ ہم اچھے صنّاع اور کاریگر ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے یہ مقدّمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے کہا۔ تم اپنی صنّاعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صنّاعیوں کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اس کے درمیان پردہ کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ چینیوں سے کہا کہ نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دوسرے نصف میں تم اپنی صنّاعی کا نمونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاستر کر کے قسم قسم کے بیل بوٹے اور پھول پتے رنگ برنگ کے بنائے اور اپنے حصّہ کے کمرہ کو مختلف نقش و نگار اور رنگا رنگ بیل بوٹوں سے گل و گلزار بنا دیا۔ ادھر رومیوں نے دیواروں پر پلاستر کو صیقل کرنا شروع کر دیا اور اتنا شفّاف اور چمک دار کر دیا کہ اس میں آئینہ کی طرح صورت نظر آنے لگی۔ جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صنّاعی ختم کر لی تو بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آئے اور حکم کیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے جو نہی دیوار بیچ میں سے ہٹی' چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گلکاری رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگی اور وہ تمام بیل بوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہو گئے۔ جسے رومیوں نے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا۔ بادشاہ سخت حیران ہوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے کیوں کہ ایک ہی قسم کے نقش و نگار دونوں طرف نظر آ رہے تھے۔ آخر کار اس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان کی صنّاعی اعلیٰ ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی صنّاعی بھی دکھلائی اور ساتھ چینیوں کی کاریگری بھی چھین لی۔

مولانا رومؒ نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل پر رومیوں کی صنّاعی جاری کر' یعنی اپنے قلب کو ریاضت و مجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دنیا کے سارے نقش و نگار اپنے دل میں نظر آنے لگیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر و سرود چمن درآ
توز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے کہ اس میں سے ہر قسم کا مادی میل کچیل نکال پھینک اور اسے علمِ الٰہی کی روشنی سے منور کر دے تو تجھے دنیا اور آخرت کے حقائق و معارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید اوستا

برکتِ عمل

مگر یہ شان مادی علوم کی نہیں۔ صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے جب کہ ان پر عمل کیا جائے حدیث میں ہے۔

عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اس میں نہ تھے اس لئے انسان اگر انسانیّت چاہتا ہے تو اولاً عالم بنے' پھر عامل بنے تب آخر کار علم لدنّی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم، علمِ دراست ہے اور انتہائی علم، علمِ وراثت ہے' یہ کتابوں کے درس و مطالعہ کا علم، علمِ دراست ہے۔

مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ

انسانیّت کی فیکٹریاں

اور اس کی عملی مشق سے پیدا شدہ بصیرت و گہرائی علم وراثت ہے مگر علم وراثت نصیب ہوتا ہے علم دراست ہی سے۔ پس یہ مدارس علم دراست سکھاتے ہیں۔ اور علم وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارس دینیہ نہ ہوں تو نہ علم دراست ملے نہ علم وراثت۔ پس یہ مدارس اس لئے قائم کئے جارہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیاء سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لئے یہ مدارس گویا سچے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔ پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں۔ جس کے ظاہر و باطن علوم انبیاء سے روشن ہوں۔ مادی علوم محض ظاہر کی ٹیپ ٹاپ اور نمائش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علوم شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں مادی علم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے۔

صورت اور سیرت میں فرق

اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے جو جاتا آتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا اسے دو دن بخار ہی آ کر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہو جاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں وہ تو ساری صورتیں اور خوبصورتیاں مٹا کر رہتی ہے البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے' اسے موت نہیں مٹا سکتی وہ قبر میں حشر میں اور اس کے بعد برابر قائم رہتی ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے :

تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون

حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہے اور موت اس حالت پر آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت کے بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لئے۔

میرا ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحبؒ[1] کے ہاں لدھیانہ جانا ہوا ان کی مسجد میں ایک کتبہ آویزاں دیکھا جس کے الفاظ یہ تھے کہ :

"مردوہ ہے جسے دیکھ کر رعب طاری ہو۔ مردوہ نہیں ہے جسے دیکھ کر شہوت ابھرے"۔

یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے۔ اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ صورت کو کہاں تک بنائیں گے جو صورت بگڑنے کے لئے ہی بنی ہے اس کو کہاں تک بنائیں گے، سنواریں گے۔ بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاقِ فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں۔

معیارِ کمال قبولِ سیرت ہے نہ کہ صورت

دنیا میں صورت فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عزّ و جاہ کا یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے۔ مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے۔ زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیل خانہ میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسنِ صورت نے پیدا کئے لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ :

اجعلنی علی خزائن الارض انی حسین جمیل

بلکہ **انی حفیظ علیم** کہا تھا یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عزّ و جاہ اور کمال پیدا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ صورتوں کی آرائش کرانے کے لئے نہیں۔

ان اللہ لاینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولت مند اور خوبصورت ہو اسے قبول فرمالے اور جو غریب و مفلس ہو اسے رد کردے۔ یہی معیار انبیاء علیہم السلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا ردو قبول حسنِ صورت سے نہیں بلکہ حسنِ سیرت سے کرتے ہیں۔ دنیا والوں کے یہاں ردو قبول کا معیار حسنِ صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ صورت کے سیاہ تھے۔ غلام حبشی تھے۔ مگر حضرت عمرؓ ان کو **ھو سیّدنا ومولانا** فرماتے اور صحابہؓ کی گردنیں بلال کے آگے جھک جاتیں، حسنِ صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں۔ بلکہ حسنِ سیرت کی وجہ سے کہ وہ بحدِ کمال ان میں موجود تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے تھے :

مارایت افضل من عطاء ابن ابی رباح

حالانکہ وہ صورت کے کالے تھے وہ صورت کی تعریف نہیں تھی۔ سیرت کی تھی جس نے کالوں کو گوروں

[1] :۔ حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی حال مقیم منڈی بہاء الدین پنجاب پاکستان جو جلسہ میں موجود تھے

کے اوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے قوّتِ علم اور قوّتِ اخلاق (یعنی قوّتِ عمل) ان ہی دونوں قوتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اسے خلافت ملتی ہے، قربِ حق نصیب ہوتا ہے اور صورت دو چیزوں سے بنتی ہے، دولت سے اور جہالت سے۔

مدارس دینیہ سیرت سنوارنے کے لئے ہیں

پس یہ مدارس دینیہ انسانیّت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیّت دنیا سے ختم ہوجائے کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں مگر وہاں انسانیّت نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورت انسانی بنائی جاتی ہے۔

زہد و قناعت

لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں ـــــ میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ حقیقت انسانیّت دکھلائی جاتی ہے اور زہد و قناعت انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے، حتیٰ کہ فقروفاقہ تک سے بھی انسانیّت حاصل کرلینی سکھلائی جاتی ہے۔ زہد و قناعت اسی علم کی بدولت قائم ہے۔ یہ علماء سو، پچاس روپیہ کی تنخواہ پر بخوشی گزارہ کرلیتے ہیں۔ ورنہ آج کل سو روپیہ کیا وقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے ـــــ کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ اس شعر کو بار بار پڑھتے اور لذّت لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

ماہیچ نداریم غمِ ہیچ نداریم
دستار نداریم غمِ پیچ نداریم

اور کبھی فرماتے ؎

لُنگکے زیر و لُنگکے بالا
نے غمِ وزدو نے غمِ کالا

اور کبھی فرماتے ؎

کس نیاید بہ خانۂ درویش
کہ خراجِ زمین وباغ بدہ

کل تک ہم زہد و قناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کرکے بتلاتے تھے لیکن آج زمانہ نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کو مشاہدہ کرادیا ہے۔ ہزاروں من غلّے والے غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ والے پریشان حال اور نالاں ہیں انہیں ہروقت مارشل لاء کے قوانین نے سُکھا رکھا ہے لیکن جن کے پاس غلّہ ہی نہیں یا بقدر ضرورت ہے وہ مطمئن ہیں پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی افراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے ؎

بقدر ضرورت یسارے بُود
کند کار ارمرد کارے بُود

ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لے کر آتی ہے۔ اور جب جاتی ہے،

جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔

اذا ادبرت کانت علی المرء حسرۃ وان اقبلت کانت کثیرا همومها

”جب دنیا جاتی ہے تو حسرت چھوڑ جاتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غم ساتھ لاتی ہے“۔

بہرحال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کا فکر کریں تو دنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درست ہو جائے گی۔ اور یہ ان ہی مدارس کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان مدارس کی اگر آپ نے امداد کی تو آپ نے ان مدارس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیونکہ یہ چندہ حقیقت میں آپ نے قرضہ دیا ہے۔ جو آپ کو مع سود کے واپس ملے گا۔ دنیا میں تو قرضہ دے کر نفع لینا سود ہے جو حرام ہے مگر وہاں آخرت میں سود جائز ہے۔ جو ملے گا اور ایک کے بدلے سات سو تک اور اس سے بھی زائد ملے گا۔ پس آپ نے اگر ان مدارس کو چندہ دے دیا تو گویا آپ نے خدائی بینکوں میں رقم کو جمع کر دیا۔ اگر آپ کے چندہ سے یہ مدارس قائم رہے اور ان کے ذریعے آدمی آدمی بنتے رہے تو آپ ہی کی قوم بنے گی۔

احسانِ عظیم

یہ مدارس صرف علم نہیں سکھلاتے، بلکہ ملک میں امن وامان کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ان مداس کی بدولت اگر متدین، خدا ترس آدمی پیدا ہوں گے تو نہ ڈکیتی ہوگی، نہ چوری، نہ زنا کاری ہوگی، نہ شراب نوشی۔ تو امن کے ساتھ گورنمنٹ کے کروڑوں روپیہ پولیس اور فوج کی غیر معمولی بھرتی کی حاجت نہ رہے گی۔ ہر شخص اپنے حق میں خود پولیس مین بن جائے گا۔ پس یہ مدارس امن وامان چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور پورے ملک کے یہ محسن ہیں۔ ان مدارس کی تقویت وبقاء میں آپ کی تقویت وبقاء ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیتیں بیان کی ہیں۔

خاتمہ

کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیت اور نیابت ملی اور کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لئے اس افضلیت کو اپنے حق میں باقی رکھیے اور جو منصب حق تعالیٰ نے بلا قیمت عطا فرمادیا ہے، اس کے تحفظ کی سعی کیجئے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ آمین!

ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔ ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔ اللھم اعذنا من الفتن ماظھر منھا وما بطن اللھم اعذنا من الفواحش ماظھر منھا وما بطن امین!

محمد طیب غفرلہ

مدیر دار العلوم، دیوبند وارد حال اکوڑہ خٹک

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤

معجزۂ علمی

ہر فن کے اندر اہلِ علم اور اہلِ کمال پیدا ہوئے۔ اور ان کے ذریعہ سے علماء کے کمالات ظاہر ہوئے' وہ علوم لا کے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آ گئیں' یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ مسلمانوں میں اس نے اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہوں گے۔ امت کی طاقت ختم ہو جائے گی' اس کی طرف لوٹیں گے' تبھی جا کر امت کی شوکت بازیاب ہوگی' ان کی قوت بازیاب ہوگی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون ، صدق اللہ العلی العظیم،

تمہید

بزرگانِ محترم!

اس جلسہ کا موضوع جیسا کہ ابھی آپ کے سامنے عملاً بھی ظاہر ہو گیا' یہ ہے کہ دارالعلوم اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلباء کرام کو سند دی جائے اور انعام تقسیم کیا جائے تاکہ دارالعلوم کی کارگزاری سامنے آجائے اور اس دارالعلوم کے معاون جو تعاون کر رہے ہیں اس کا نیک ثمرہ آپ کے سامنے آجائے ـــــ دوسرے لفظوں میں جلسہ کا موضوع قرآن کریم نکلتا ہے کہ قرآنِ عظیم کے سلسلہ میں اس کی برکات و ثمرات سامنے بھی آئیں اور انہیں بیان بھی کیا جائے۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں چند گزارشات قرآن کریم کے بارے میں اور اس کی نسبت سے دارالعلوم اسلامیہ کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ مدد فرمائے اس لئے کہ میں بہت زیادہ کمزور بھی ہوں' ضعیف بھی ہوں کچھ علیل بھی ہوں اور علم کے لحاظ سے بے حد قلیل بھی ہوں' مگر علت ور قلت کے باوجود جتنا کچھ حق تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور کچھ آپ حضرات کی توجہات کی برکت شامل حال

ہو گی، تو ممکن ہے کہ چند کلمات گزارش کر سکوں۔

کلام کی عظمت کا معیار

پہلے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ کسی بھی کلام کی عظمت یا وقعت اس کے متکلّم سے پیدا ہوتی ہے۔ جس درجے کا متکلّم ہو گا، کلام کرنے والا ہو گا اسی درجہ کلام کی عظمت اور کلام کی وقعت بھی آپ کے سامنے آئے گی۔

عربی کی ایک مثل مشہور ہے **قدر الشهادة بقدر الشهود** شہادت کی عظمت شاہدوں سے قائم ہوتی ہے اگر شاہد عادل ہے، سچا اور صحیح ہے تو اس کی شہادت بھی سچی اور شاہد میں اگر کھوٹ ہے تو اس کی شہادت کا بھی وہی درجہ ہو گا۔ تو کلام کی عظمت اور وقعت بھی متکلم ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ جس درجے کا متکلم ہوتا ہے اسی درجے کا اس کا کلام بھی سمجھا جاتا ہے ___ بلکہ اگر دو کلام کرنے والوں کا کلام مشترک ہو تو اگر ایک متکلم گھٹیا درجے کا آدمی ہے تو اسی کلام کی وقعت بھی گھٹ جاتی ہے اور اسی کلام کو کوئی بڑا آدمی کہے، اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔

کلام کی عظمت و وقعت کے لحاظ سے چند چیزیں طبعی طور پر ضروری ہیں جن سے کلام عظیم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی چیز علم اور فضل ہے اگر کلام کرنے والا عالم اور باخبر ہے تو اس کے کلام میں علم ہو گا۔ اور اس کی خبر سے اسکے علم کی وسعت واضح ہو جائے گی تو پہلی چیز کلام کے لئے علم اور خبر ہے یہ ضروری ہے جاہل آدمی اگر کلام کرے تو اس کے کلام سے وہی جاہلانہ کلمات، وہی جاہلانہ حرکات سرزد ہوں گی لوگ پہچان جائیں گے کہ بولنے والا کوئی جاہل ہے جسے بولنے کا طریقہ نہیں، بھدّا کلام کرتا ہے تو کلام کی وقعت کے لئے سب سے پہلی چیز جو ضروری ہے وہ علم اور خبر ہے۔

دوسری چیز دانش اور فہم ہے کہ کلام کرنے والے میں عقل بھی ہو، فہم بھی ہو، دانش مندی بھی ہو اگر بے وقوف آدمی کلام کرے اور کلام وہی جس میں علم اور خبر ہے مگر اس کی بے وقوفی کی وجہ سے کلام بھدّا بن جاتا ہے۔ مؤثر نہیں رہتا تو قلوب پر بھی اثر نہیں کرتا۔

تیسری چیز منصب اور مقام ہے کہ کلام کرنے والا اگر صاحبِ حیثیت ہے اس کی عرفی حیثیت اونچی ہے تو کلام بھی اونچا ہو جائے گا۔

اور چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ کلام اگر نقل ہو کر پہنچے تو اس کی سند اور تاریخی حیثیت مضبوط ہو، اگر سند نہ ہو، راوی صحیح نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کلام کا پہنچنا مشکل ہو جائے گا، پہنچے گا تو ناتمام پہنچے گا۔ تو بہر حال طبعی طور پر یہ چار چیزیں ضروری ہیں۔

ایک علم و خبر، دانش و فہم، منصب و مقام، اور صحتِ سند اور استناد ___ اسی لئے کم علموں کے کلام کی طرف لوگ کم توجہ کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی بچہ بولے تو اس کے کلام میں تر تراہٹ بھی ہو گی، لفظ بھی ناتمام ہوں گے اور سننے والے ہنسیں گے، مگر کہیں گے کہ بھئی بچہ ہے، بے چارہ بولنا نہیں جانتا۔ نہ اسے علم ہے نہ اسے خبر ہے تو کلام بھی اسی درجہ کا بے وقعت ہو جائے گا۔ چاہے بچے کو آپ شاباشی دیں گے اور آپ اس کے توتلے کو کہیں گے کہ ماشاء اللہ خوب بولتا ہے وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ہو گا۔ یہ نہیں کہ کلام کی کوئی عظمت آپ کے دل میں بیٹھ رہی ہے۔

اگر علم ہو مگر ناقص ہو تب بھی کلام ناقص ہو جاتا ہے ___ عورتوں کا کلام عموماً بے ربط سا ہوتا اس لئے کہ ان کے اندر نقصان علم بھی ہے نقصان عقل بھی ہے ___ **الّا ماشاء اللہ** کوئی عورت عالِم بنے، فاضل

بنے ___ جیسے کہ اسلام میں بہت سی عورتیں عالم وفاضل ہوئی ہیں۔ محدث بھی گذری ہیں مگر وہ ہزاروں میں ایک دو ہوتی ہیں۔ عام طور سے نقصانِ علم، نقصانِ دین اور نقصانِ عقل ہوتا ہے۔ اس لئے کلام میں بھی نقص آتا ہے۔

عورتوں کا کلام بے وقعت ہونے کی وجہ

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں حکایت فرمائی ہے کہ خاوند بیوی میں جب لڑائی ہوتی ہے۔ بیوی بھی مقابلہ پر بولتی ہے خاوند بھی بولتا ہے تو بیوی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے اور خاوند حجتیں پیش کرتا ہے، دلیلیں پیش کرتا ہے مگر اس کی وہی ایک رٹ ہوتی ہے جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے **اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ** جو بچپن سے زیورات کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے تو اس کے قلب کے اندر سونا چاندی زیادہ گھسا ہوتا ہے، علم اور خبر اس کے اندر زیادہ نہیں ہوتی ___ ذرا سی بچی ہے اس کے کان چھیدیں، اس کو مرکیاں پہنادی جاتی ہیں اور ذرا بڑی ہو ناک چھیدیں تو اس میں "سونے کی لونگ" اور "کیل" ٹھونک دی جاتی ہے اور ذرا بڑی ہو تو گلے میں چاندی کا طوق ڈال دیا جاتا ہے اور ذرا بڑی ہوئی شادی ہوئی تو ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں پڑجاتی ہیں، چھلے ڈالدیئے جاتے ہیں، گلے میں ہنسی ڈال دی جاتی ہے ___ غرض سر سے پیر تک سونے اور چاندی میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اس کی تمام تر ہمت اور تمام تر شوق اور رغبت سونے اور چاندی کی طرف ہوتا ہے مردوں کو تو یہ روگ عورتوں ہی سے لگتا ہے۔ اگر مرد مجرّد ہو وہ سونے چاندی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا بہرحال جب دل میں سونا چاندی گھس جائے تو اس میں علم کی گنجائش کم ہوتی ہے عقل کی گنجائش کم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جن کا ذکر خیر ابھی آپ نے سنا، ایک جملہ حضرتؒ نے فرمایا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو روپے پیسے کے دلدادہ تھے تو فرمایا کہ :

دست زر آلود ایں قدر بدبو می کند

جس ہاتھ کو سونا چاندی لگتا ہے تو اس میں کچھ سیاہی بھی آجاتی ہے اور کچھ بُو بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ جس زمانے میں یہ چاندی کا روپیہ چلتا تھا اور سونے کی گنّیاں چلتی تھیں جب گننے بیٹھتے تھے تو دس بیس گننے کے بعد انگلیوں پر سیاہی آجاتی تھی اور اس میں سے پھر بُو بھی پیدا ہوجاتی تھی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ :

"دست زر آلود ایں قدر بدبو می کند قلب زر آلود چہ قدر بدبو خواہد کرد"

ہاتھ کو سونا لگ جاتا ہے تو اتنی بدبو اور جس دل میں یہ سونا لگ جائے تو کس قدر بدبو پیدا ہوجائے گی؟ تو حقیقتاً عورتوں کے دلوں میں سونا اور چاندی گھس جاتا ہے اس لئے کہ شروع سے اخیر تک اسی کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں تو علم اور دانش کی طرف قدرۃً ان کی توجہ کم ہوتی ہے وہ کلام کریں گی اس میں روپے پیسے کا ذکر زیادہ ہوگا۔ اس میں قرآن کا تو ذکر نہیں ہوگا اس لئے کلام بھی ناتمام ہوگا، مؤثر بھی نہیں رہے گا۔

تو کلام کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ علم بھی صحیح ہو اور کامل ہو تو سبحان اللہ، اس کی خبر اور بحث بھی صحیح ہو اور کامل ہو تو کلام میں بھی اسی درجہ کمال پیدا ہوجائے گا۔

کلام کے اندر حقیقتِ متکلّم جلوہ گر ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ کلام کے اندر خود متکلّم جلوہ گر ہوتا ہے اگر متکلّم کے اوصاف دیکھنے ہوں' اس کا کلام سن لیا جائے۔ کوئی شاعر شعر خوانی کرے گا' ہر شخص پہچان لے گا کہ شاعر آدمی ہے اس کے کلام سے علم' ادب اور لغت یہ چیزیں سرزد ہوں گی' کوئی شیخ کلام کرے گا تو اس سے معرفت' علم اور عرفانِ الٰہی سرزد ہو گا' سب پہچان لیں گے کہ کلام کرنے والا عارف ہے اسی طرح اگر کوئی عالم کلام کرے گا تو کلام سے پہچان لیا جائے گا کہ اس کے قلب کے اندر علم ہے اس کے لفظ لفظ سے علم ٹپکتا ہے تو کلام میں دراصل خود متکلّم جلوہ گر ہوتا ہے جسے متکلّم کو دیکھنا ہو اس کے کلام کو دیکھ لے۔ اس سے وہ نمایاں ہو جائے گا۔

اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء یہ بہت بڑی شاعرہ تھی' ذہین اور ذکی بھی تھی جب شاہی دربار میں مشاعرے ہوتے اور شعراء اپنا کلام سناتے تو زیب النساء کا کلام بھی سنایا جاتا تھا اور وہ عموماً تمام شعراء کے کلام پر فائق ہو جاتا تھا لوگ سر دھنتے تھے اور اس کی بڑی داد دیتے تھے' اورنگ زیب کا ایک درباری تھا ___ اس کی زبان سے نکلا کہ کاش! میں زیب النساء کو دیکھ لیتا ___ اس لئے کہ اچھا کلام سن کے قدرۃً جی چاہتا ہے کہ متکلّم کو دیکھیں' اس کی زبان سے نکلا کہ کاش میں زیب النساء کو دیکھ لوں' مگر اوّل تو بادشاہی محل اور اوپر سے پردے کا سسٹم۔ کوئی آج کا دور تھوڑا ہی تھا کہ بے پردگی اور عریانی پھیلی ہوئی ہو پردہ بھی تھا' عورتیں مخفی رہتی تھیں۔ تو دیکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی ___ عاقل خان کا یہ مقولہ زیب النساء کو پہنچ گیا۔ اس نے کہا میرے دیکھنے کی بڑی آسان صورت ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا ؎

در سخن مخفی منم' چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد' در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح چھپی ہوئی ہوں جس طرح گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہوتی ہے اگر خوشبو کا ادراک کرنا ہے تو گلاب کی پتی کو دیکھ لو۔ خوشبو خود بخود سامنے آجائے گی تو میں اپنے کلام میں چھپی ہوئی ہوں جسے مجھے دیکھنا ہو' میرے کلام کو دیکھ لے میں اس میں جلوہ گر ہو جاؤں گی تو حقیقتاً دیکھنے کی چیز صورت نہیں ہوتی' حقیقت ہوتی ہے صورت تو ایک عارضی چیز ہے وہ محض تعارف کا ذریعہ بنتی ہے۔ اصل انسان کے لئے حقیقت ہے۔

سیرت سازی کی ضرورت

تو دانش مند کا کام یہی ہو گا کہ صورت کے سنوارنے کی بجائے سیرت کو سنوارے وہی انسان کی حقیقت ہے اور رہ گئی صورت وہ تو چند روزہ بہار ہے۔ آدمی جب بوڑھا ہوتا ہے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے نہ رنگ و روغن ہوتا ہے جو جوانی کے زمانے میں تھا' بڑھاپا ہی صورت کی رنگینی کو کھو دیتا ہے' بڑھاپا بھی نہ آئے کچھ غم لگ جائے کچھ فکر لگ جائے' کوئی بیماری لگ جائے اس سے بھی سارا رنگ روپ زائل ہو جاتا ہے صورت باقی نہیں رہتی نہ رنگ رہتا ہے تو صورت حقیقت میں قابلِ التفات نہیں ہے۔ اصل چیز سیرت ہے۔

ہمارے نوجوان بھائی خصوصی طور پر رات دن صورت کے سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ گویا اس کو درست کریں۔ بنائیں سنواریں۔ لیکن حقیقت میں یہ اپنی کوتاہی ہے جتنی محنت صورت کے سنوارنے

کرتے ہیں اگر سیرت کے سنوارنے پر کریں تو کہاں سے کہاں پہنچیں‘ تو آپ صورت کو سنوارنے کی کیا فکر کرتے ہیں اور کیا سنواریں گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ بگڑے اسے کہاں تک آپ سنواریں گے؟ روز گھنٹے گھنٹے صورت سنوارنے میں صرف کریں گے۔ شام کو بگڑ جائے گی پھر اگلے روز بیٹھ کر کے گھنٹہ بھر صرف کریں پھر بگڑ جائے گی اسے کہاں تک آپ سنواریں گے وہ تو پیدا ہی بگڑنے کے لئے ہوئی ہے۔

صورت قابلِ التفات کیوں نہیں؟

وہ کسی بزرگ کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ میں لوگ اللہ اللہ اور ذکر اللہ کے لئے آیا کرتے تھے اور خانقاہ کا کام جاری تھا ــــ ایک روز ایک صاحب داخل ہوئے‘ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مقصد یہ تھا کہ اپنے قلب کی اصلاح کریں تو شیخ کے ہاں کا طریقہ یہ تھا کہ عام مریدین کا کھانا ان کے گھر پکتا تھا ایک باندی متعین تھی۔ کھانا تیار ہونے کے بعد وہ حجرہ در حجرہ تقسیم کر جاتی تھی۔

وہ باندی حسب معمول آئی اور اس نے آ کے کھانا بانٹنا شروع کیا یہ نئے مرید صاحب ــــ جب ان کے حجرے میں باندی آئی تو باندی کچھ قبول صورت تھی ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق پیدا ہو گیا۔ اب وہ جب آتی یہ اسے بیٹھ کے گھورتے‘ شیخ کو پتہ چل گیا کہ اس کی طبیعت باندی کی طرف مائل ہوئی ہے رات دن اس کی فکر میں ہے وہ ذکر اللہ تو گیا اپنی جگہ‘ وہ صورت شکل میں اُلجھ کے رہ گئے۔ شیخ کو معلوم ہو گیا تھا‘ مگر یہ حضرات اہل اللہ زبان سے زیادہ علاج نہیں کرتے‘ تدبیر سے علاج کرتے ہیں تو شیخ نے تدبیر کی کہ ان کے دل سے اس صورت کی محبت نکل جائے۔

طریقہ یہ اختیار کیا کہ ایک دست آور دوائی منگوائی۔ جمال گھوٹہ ہو گا یا املتاس وغیرہ وہ اس باندی کو کھلایا اور ایک جگہ متعین کر دی کہ قضائے حاجت کے لئے وہاں جا کے بیٹھے۔ ایک کنڈا رکھ دیا اور ایک قدمچہ رکھ دیا ــــ صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آئے وہ رنگ و روغن ختم ہو گیا اور ہڈیاں اوپر نکل آئیں۔ بھیانک سی صورت بن گئی۔

شیخ نے فرمایا کہ کھانا لے کے اس مرید کے پاس جا اور جو معاملہ وہ کرے اس کی مجھے اطلاع دینا وہ حسبِ معمول کھانا لے کر آئی ــــ یا تو وہ انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ باندی آئے تو ذرا گھوریں آنکھوں کو سینکیں۔ اب جو آئی۔ صورت اس کی بھیانی۔ بجائے خوبصورتی کے زردی منہ پر چھائی ہوئی۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں‘ اسے بڑی نفرت پیدا ہوئی اور اس نے منہ پھیر لیا‘ کہا کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے۔ وہ بے چاری چلی گئی۔ شیخ سے جا کر اس نے سارا حال عرض کیا کہ آج تو یہ معاملہ رہا فرمایا کہ الحمد للہ علاج ہو گیا ــــ شیخ آئے اس مرید کی انگلی پکڑی کہ ذرا میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔ وہ جو حجرے میں قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں وہ دستوں کی نجاست پڑی ہوئی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئی شیخ نے کہا یہ آپ کا معشوق ہے‘ اسے لے جائیے۔ بڑی حفاظت سے اس نجاست کو رکھ لیجئے اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی آپ کو تو اس سے محبت تھی جب تک یہ اس کے پیٹ میں رہی۔ آپ عاشق رہے دلدادہ رہے یہی تو نکل گئی اور کیا چیز نکلی؟ جو آپ کی محبت ختم ہو گئی تو آپ کو نجاست سے محبت ہے باندی سے محبت نہیں ہے‘ یہ ہے آپ کا محبوب‘ اسے اٹھا کر لے جائیے ــــ وہ شرمندہ ہوئے اور دل سے وہ ساری چیز نکل گئی۔

تو حقیقت یہ ہے کہ صورت کی محبت تو نجاست کی محبت ہے اصل محبت اصل میں سیرت کی ہوتی ہے کہ

آدمی میں علم ہو، معرفتِ خداوندی ہو، تعلق مع اللہ قائم ہو جس سے سیرت بنتی ہے وہ چیز محبت کے قابل ہے یہ گوشت پوست کی محبت حقیقی محبت نہیں یہ تو نجاست کی محبت ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ محبت کے قابل سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو تو جتنا آپ سنواریں گے وہ تو بگڑ کر ہی رہے گی۔ سیرت البتہ ایسی چیز ہے کہ جب حق تعالیٰ دے دیتے ہیں تو وہ اس دنیا میں بھی قائم ہے برزخ میں بھی قائم ہے آخرت میں جاکے بھی قائم رہے گی۔ وہ بگڑنے والی چیز نہیں ہے۔

سیرت باقی اور صورت فانی ہے

اس لئے کہ سیرت کے اندر کمالاتِ خداوندی جلوہ گر ہوتے ہیں اور اللہ کا کمال زائل ہونے کے لئے نہیں ہے وہ اَبدی ہے برقرار رہے گا تو جس میں اللہ کا کمال آجائے تو وہ بھی پائیدار چیز ہے ___ صورت انسانی کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان تغیّر کا پتلا ہے تو صورت بھی متغیّر ہوتی رہتی ہے تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کلام کے اندر متکلم جلوہ گر ہوتا ہے، تو متکلم کی صورت جلوہ گر نہیں ہوتی اس کی سیرت اور حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے اس سے آدمی پہچان سکتا ہے کہ یہ متکلم کس درجے کا آدمی ہے۔

تو سب سے پہلی چیز جو ہے وہ علم اور خبر ہے۔ دوسری چیز دانش اور فہم کہ وہ ہو تو کلام میں عظمت پیدا ہوتی ہے اور تیسری چیز منصب اور مقام ہے اگر متکلم باحیثیت ہے تو کلام بھی باحیثیت ہوگا اگر اس کی حیثیت گری ہوئی ہو تو کلام کی کوئی وقعت نہیں ہوگی، ایک کلام میں کروں، آپ کریں کوئی وقعت نہیں اور وہی بات ایک صدر جمہوریہ کہہ دے تو دنیا میں اس کا اثر ہوتا ہے، سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے ملکوں کے منصوبے بدل جاتے ہیں، وہی جملہ آپ نے کہا اور وہی جملہ ملک کے وزیر اعظم نے کہا، اس کے اثرات دُور رَس ہوتے ہیں دنیا گیر ہوتے ہیں۔ یہ منصب اور مقام کا اثر ہے چونکہ منصب بڑا ہے اس لئے زبان سے نکلا ہوا کلام بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اور منصب گھٹیا ہے یا بے منصب آدمی ہے۔ تو کلام کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

اور چوتھی چیز یہ ہے کہ کلام جب ہم تک پہنچے تو صحیح سند کے ساتھ پہنچے اشتباہ نہ رہے کہ معلوم نہیں متکلم نے کلام کیا ہے یا نہیں، پورا کلام پہنچا ہے یا ادھورا پہنچا ہے، اس کی تاریخی حیثیت مضبوط ہونی چاہئے، یہ اوصاف ہونے چاہئے۔

کلام اللہ کی عظمتِ شان

جب یہ بات مسلّم اور یہ اصول طے شدہ ہے کہ جس کا علم جتنا بڑا ہوگا کلام بھی اتنا ہی بڑا ہوگا۔ جس منصب اور مقام بلند تر ہوگا، کلام بھی اتنا ہی بلند ہوگا جس میں عقل اور فہم رچا ہوا ہوگا اس کا کلام بھی اتنا ہی اونچا ہوگا ___ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اللہ ربّ العزّت کی ذات علم کے لحاظ سے دیکھی جائے تو علم اس کا لامحدود، کہیں اس کی حد نہیں ہے آپ صرف سامنے کی چیز کو دیکھ سکتے ہیں اس کے سامنے حاضر غائب سب حاضر ہیں وہ جس طرح سے ایک بادل کی گرج کو سنتا ہے اسی طرح سے زمین کی تہہ میں اگر چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چل رہی ہے تو اس کی کھسکھساہٹ بھی سنتا ہے وہ سمیع و بصیر ہے۔ آپ کان سے کوئی بات سن لیں گے جان لیں گے وہ دلوں کے مخفی رازوں کو جانتا ہے۔ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اسے دلوں کی کھٹک کا بھی علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا خطرات گذر رہے ہیں تو اس کا علم لامحدود ظاہر اور باطن پر حاوی۔ اس لئے اس لئے اس کا کلام بھی ظاہر و باطن پر حکمران ہوگا اور اتنا جامع کلام ہوگا کہ اس سے زیادہ جامعیت نہیں ہو سکتی

اس میں فصاحت بھی ہوگی بلاغت بھی ہوگی اعجازی ہوگی' بداعت بھی اعجازی ہوگی ___ تو فصیح بھی اعلیٰ' بلیغ بھی اعلیٰ اور بداعت بھی اس میں اعلیٰ ترین ہوگی اس کی کوئی حد و نہایت نہ ہوگی۔

فصاحت :

فصاحت تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کپڑا سلوائیں تو سب سے پہلے تو کپڑے کو دیکھا جائے گا کہ اس کا مادہ بھی صحیح ہے یا نہیں' اگر کپڑے کا مادہ صحیح ہے' سُوت نہایت عمدہ ہے ریشم نہایت عمدہ' تو کہیں گے کہ کپڑا نہایت اعلیٰ۔ یہ کپڑے کی ذات ہے۔ اس کو کہنا چاہئے کہ یہ فصاحت ہے کہ کلام کے اندر الفاظ نہایت بامحاورہ ہوں' کلام کے اندر لفظوں میں کوئی منافرت نہ ہو کہ کان اس کے سننے سے اکتا جائیں' کانوں پر بار گذرے بلکہ ایسا ہو کہ کان میں کلام پہنچا اور دل میں اتر گیا اور حقیقت منکشف ہوگئی تو کلام کے اندر لفظ بھی اعلیٰ ہوں کہ کوئی پیچیدگی بھی نہ ہو اور سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو' اتنا سلیس ہو کہ فوراً قلب میں اتر جائے اور اتنا جامع ہو کہ سارے حقائق اس میں چھپے ہوئے ہوں یہ تو فصاحت ہے۔

بلاغت :

ایک یہ کہ کپڑا بدن کے مطابق سِلا ہوا ہے۔ کپڑا تو بہت اعلیٰ ہے مگر درزی بھدا اس نے نہایت غلط سیا۔ جب آدمی پہن کر نکلتا ہے تو لوگ کپڑوں کو تو دیکھتے مگر کہتے ہیں کہ وضع قطع نہایت بھدی' تو اس سے کپڑے کی خوبیاں بھی غلط ہو جاتی ہیں تو کپڑے کا بدن کے مطابق ہونا یہ بمنزلہ بلاغت کے ہے۔

بداعت :

پھر اس کپڑے کے اوپر کوئی رنگ' کوئی نقش و نگار اور رنگینی اعلیٰ ترین ہو اسے کلامِ بدیع کہتے ہیں یعنی اس کی بداعت بھی اعلیٰ ہے' تو کلام اپنی ذات سے بھی اعلیٰ۔ سننے والے اور مخاطبین کے مزاج کے بھی مطابق اور اس کے اندر مرصّع و مسجّع اور مقفّٰی ہونا یہ بھی داخل' تو فصیح بھی ہوا' بدیع بھی ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام جب کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال کے منبع ہیں تو ان کے کلام کے اندر یہ ساری چیزیں انتہائی طور پر جمع ہونی چاہئے' ایسا اعجازی کہ کوئی بشر ایسا کلام نہ کر سکے اس لئے کہ بشر کا علم محدود ہے تو کلام کی بھی جامعیت کم ہوگی۔ اللہ کا علم لا محدود ہے تو کلام بھی اتنا جامع ہوگا کہ قیامت آجائے مگر اس کے نیچے سے علم ختم نہیں ہو سکتا ہر چیز کا حکم اس میں موجود۔ تو حق تعالیٰ کا کلام جامع ترین ہوگا' فصیح ترین ہوگا' بلیغ ترین ہوگا اور اعجازی بھی ہوگا۔

معجزہ کی حقیقت

تو قرآن کریم حقیقت میں معجزہ ہے۔ معجزے کے معنی یہی ہیں کہ تمام دنیا عاجز آجائے مگر اس جیسی چیز نہ لا سکے۔ حق تعالیٰ میں جتنی صفتیں ہیں وہ سب اعجازی ہیں کہ کوئی غیر خدا اسے نہیں لا سکتا نہ بنا سکتا ہے۔ اللہ نے آسمان بنایا زمین بنائی' چاند سورج بنائے۔ آپ چاند سورج تو بجائے خود ہے اس کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی بنائی ہوئی نہیں ہے یہ کسی ایسے حکیم کی بنائی ہوئی ہے کہ اس کی حکمت کی کوئی انتہا نہ ہو۔ آسمان اور چاند سورج تو اپنی جگہ ہیں یہ زمین ہے جو رات دن آپ کے قدموں میں پامال ہے۔ اس کا ایک ذرہ آپ پیدا نہیں کر سکتے اس زمین سے کام تو لے سکتے ہیں کہ ذروں کو جوڑ کر آپ چیزیں بنالیں۔ ایجادات کرلیں لیکن ایک ذرہ پیدا کرلیں یہ آپ کے بس میں نہیں ہے ___ تو جو زمین آپ کی اصل

ہے' ہروقت آپ کے سامنے ہے' ہروقت اس پر آپ چلتے پھرتے ہیں اس کا ایک ذرّہ نہیں بنا سکتے یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے اس ذات کا بنایا ہوا ہے جس کا علم لامحدود ہے' قدرت لامحدود ہے' اقتدار لامحدود ہے تو جتنی چیزیں اللہ کی صنعتیں ہیں وہ سب معجزات ہیں ساری دنیا اس کے بنانے سے عاجز ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے تو کیا ماں بناتی ہے اس کو؟ ماں کو تو یہ خبر نہیں کیا ہو رہا ہے؟ باپ بناتا ہے؟ تو باپ کو کچھ خبر نہیں کیا ہو رہا ہے؟ اور کارخانۂ قدرت کا کام جاری ہے۔ بچہ بن رہا ہے اور صورت بنائی جارہی ہے۔ یہ اسی کی صنعت ہے کہ پانی کے قطرے پر نقاشی کر دے۔ آپ پانی پر تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ لیکن اللہ کی یہ قدرت ہے کہ ایک قطرۂ ماء کے اوپر تصویر کھینچ دیں۔ اس نے صورت بنائی نقش بنائے۔ نہ ماں کچھ کر سکتی ہے نہ باپ۔ اس واسطے کہا جائے گا کہ خالق حق تعالیٰ ہیں۔ لیکن سببِ تخلیق یہ مرد اور عورت ہیں تو باپ بھی خالق نہیں ماں بھی خالق نہیں۔ خالق ایک اللہ ہے لیکن اس نے اپنی تخلیق کو دنیا میں اسباب کے ذریعے نمایاں کیا۔ مرد و عورت کو سبب بنایا جس سے بچہ پیدا ہوا ___ تو وہ خالق نہیں ہیں سببِ تخلیق ہیں۔ اسی واسطے ایک موقع پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ یہ ان چیزوں کو تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں؟ تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ ایک زمیندار ہے زمین میں منوں مٹی کے نیچے دانہ ڈال دیتا ہے۔ اس منوں مٹی کے اندر اس بیج کو پھاڑنا اور اس میں سے کونپل نکالنا۔ یہ کس کا کام ہے؟ یہ کاشتکار کر سکتا ہے؟ کاشتکار کو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو دانہ ڈال کر الگ ہو گیا اور دانہ بھی اس کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ بھی اللہ ہی کا بنایا ہوا ہے اس کا کام اتنا ہے کہ زمین میں ڈال دے اب زمین کے اندر قدرت کی جو مشینیں چل رہی ہیں کہ وہ دانہ پھٹتا ہے' اس میں سے کونپل نکلتی ہے درخت بنتا ہے' یہ صرف اسی کا کام ہے تو کہا جائے گا کہ درخت کے خالق حق تعالیٰ ہیں کاشت کار نہیں ہے اسے اپنی تخلیق کے ظاہر کرنے کا سبب بنا دیا ہے۔

منوں مٹی کے نیچے سے ایک کونپل اوپر کی طرف چلتی ہے وہ اتنی نرم و نازک ہے کہ آپ اس کو مَسل دیں لیکن وہی بڑھتے بڑھتے اتنا عظیم تناور درخت ہو جاتا ہے کہ کسی پر گر پڑے تو اس کی جان جاتی ہے ___ اس میں غور یہ کرنا ہے کہ درخت کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ نیچے کی طرف جائے۔ پتے کو آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے کو جائے گا۔ شاخ کو آپ چھوڑ دیں تو اوپر کی طرف نہیں جائے گی وہ تو نیچے کی طرف آئے گی یہ اس کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے کہ کونپل نکلی اور اوپر کی طرف جارہی ہے اس کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے مگر یہ اوپر کی طرف جارہی ہے اور ایک عظیم درخت بن جاتا ہے تو طبیعت کے خلاف مجبور کر دینا یہ بندے کے بس کی بات نہیں ہے خالق ہی کے بس میں ہے ___ تو یہ دلیل ہوگی کہ اس کو پیدا کرنے والے حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ کاشتکار اور انسان پیدا کرنے والا نہیں ہے اس کی طبیعت کے اوپر حق تعالیٰ حکمرانی کر رہے ہیں چاہے نیچے کی طرف لے جائیں چاہے اوپر کی طرف۔ بہر حال جاندار پیدا ہو یا درخت پیدا ہو یا پتھر پیدا ہو' پیدا کرنا اسی کا کام ہے بندہ سبب بن جاتا ہے اور سببِ تخلیق خود خالق نہیں ہوتا خالق وہی ہے ___ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے جتنے عجائبات پیدا فرمائے ہیں ان کے خالق وہی ہیں۔ ان میں سے آپ صنعت سے' ایجاد سے' تصرفات کر کے چیزیں نکالتے رہیں اس کی قدرت آپ کو اللہ نے دی ہے مگر یہ قدرت بھی اسی کی بخشی ہوئی ہے خود آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ اگر آپ نے عقل سے کچھ چیزیں ایجاد کر لیں تو سوال یہ ہے کہ عقل کہاں سے آئی ___ آپ نے خود تو اپنے اندر نہیں ڈال لی؟ وہ بھی اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ پھر اس عقل کو وہاں تک پہنچا دینا کہ یوں چیز بن جائے' یوں ایجاد ہو جائے یہ بھی آپ کا کام نہیں۔

آپ جب ایجاد کرتے ہیں تو ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے دل میں ارادہ کس نے ڈالا؟ پھر اللہ ہی کی طرف آپ کو رجوع کرنا پڑے گا ___ تو ارادہ، قدرت، اختیار، اگر انسان دکھلاتا ہے تو وہ اللہ ہی کا بخشا ہوا ہوتا ہے اسی لئے فرمایا کہ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے افعال کو بھی وہی پیدا کرتا ہے۔ تمہارے اندر قدرت نہیں ہے کہ اپنے افعال کو خود پیدا کرلو اور خالق افعال کہلاؤ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ بندے کو اپنی خبر نہیں ہے اسے اپنے افعال کی کیا خبر ہوگی ___؟ تو ہر چیز کی انتہا حق تعالیٰ شانہ پر ہوتی ہے۔

اگر آپ یوں کہیں کہ فلاں مکان میں آگ لگ گئی۔ کہیں گے کہ کیوں لگ گئی؟ آپ کہیں گے کہ چراغ جل رہا تھا اور چوہے نے بتی کھینچ لی اور وہ بتی سامان کے اوپر آکر پڑی وہ بھی جل گیا ___ وہ سوال کرے گا کہ بتی نیچے کیوں آئی کہ چوہے نے ڈالدی کہ چوہے نے کیوں ڈالی اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ کیوں آیا خیال؟ آگے کہیں گے کہ بھائی قدرتی بات ہے۔ اللہ نے ڈال دیا تو انتہا اللہ پر جاکر ہوگئی سب وسائل ختم ہوگئے۔

آپ کہیں گے فلاں شخص بڑا اچھا عالم ہے۔ کیوں عالم ہے؟ اس کے استاذ قابل تھے۔ انہوں نے پڑھایا لکھایا۔ بھائی استاذوں کے پڑھانے لکھانے سے یہ کیسے عالم بن گیا؟ انہوں نے محنت کی، تربیت کی، برس لگائے عالم بن گیا۔ اس نے محنت کیوں کی؟ کہ اس کے دل میں یہی جذبہ آیا۔ کیوں یہ جذبہ آیا؟ بھائی اللہ نے پیدا کردیا۔ پھر انتہاء جاکے اللہ پر ہوگئی۔ کہیں سے چلو۔ اخیر میں جاکے حق تعالیٰ شانہ پر انتہا ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ میں ظاہر کردیا کہ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ہر چیز کی انتہا تیرے پروردگار پر ہوگی وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ہر جاندار چیز اللہ کی طرف رجوع کرے گی۔

سارے امور کو سمیٹو جاکے حق تعالیٰ کے اوپر انتہا ہوجائے گی ___ آپ اور ہم موجود ہیں۔ کیوں موجود ہیں؟ اس لئے کہ دو موجودات ملے تو ہم پیدا ہوئے۔ بھئی کیوں ملے؟ ان کے دل میں جذبہ آیا۔ کیوں جذبہ آیا؟ کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا۔ پھر اخیر اللہ ہی کی طرف انتہا ہوگئی ___ تو کہیں سے آپ چلیں۔ جاکر انتہا حق تعالیٰ کے اوپر ہوگی۔ تو جتنے بھی کمالات دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ جتنی بھی ایجادات ہیں خواہ انسان کرے یا کوئی کرے، انتہا جاکے اللہ کے اوپر ہوگی کہ وہیں سے یہ خیر چلی اور دنیا کے اندر پھیل گئی ___

تو تمام چیزوں کے مرجع الامور اللہ ہی کی ذات بابرکات ہیں تو میں عرض کر رہا تھا کہ خواہ تخلیق ہو، خواہ تصدیق ہو، خواہ ہدایت ہو کوئی استاذ کسی کو پڑھائے انجام کار یہی نکلے گا کہ اللہ نے ہدایت دے دی، ہدایت بھی اس کی طرف سے آئے گی، تخلیق بھی اس کی طرف سے آئے گی۔ اس لئے کہ کمالات کا منشاء تو وہی ہے ___ تو کلامِ خداوندی جامع ہے اس لئے کہ وہ معجزہ ہے۔ دنیا سپر ڈال دے گی لیکن اس کی ثانی نہیں لاسکے گی جیسا کہ دنیا عاجز ہوکر سپر ڈال دے گی زمین کا ذرہ نہیں بناسکتی، دنیا عاجز آجائے گی آفتاب کی ایک کرن نہیں بناسکتی، ستارے کا ایک جز نہیں بناسکتی، آسمان کا ایک جز نہیں بناسکتی اس لئے کہ معجزہ ہے اور اللہ کا فعل ہے تو یہ افعال کے معجزے ہیں۔ قرآن کریم کلام کا معجزہ ہے تو جیسے وہاں دنیا عاجز ہے، کلام لانے سے بھی عاجز ہے کہ کوئی ایسا جامع کلام جو قیامت تک جزئیات پر حاوی ہو وہی کرسکتا ہے جس کا علم قیامت تک حاوی ہو اور ہر چیز اس کے سامنے مستحضر اور حاضر ہو تو قرآن صرف کلام نہیں بلکہ معجزہ ہے یعنی دنیا اس کے سامنے عاجز ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں لاسکتا۔

کلامِ خداوندی صرف قرآن پاک ہے، دوسری کتُب نہیں

اور ظاہریات ہے اگر غور کیا جائے تو کلام صرف قرآن مجید ہی ہے یعنی اور کتابیں بھی آسمان سے آئیں۔ توراۃ بھی آئی۔ زبور بھی آئی، قرآن کریم بھی آیا لیکن کلام خداوندی اگر کہا جائے گا تو وہ صرف قرآن پاک کو کہا جائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کہتے ہیں مایتکلم بہ کو کہ جس کا تکلم کرے کلام کرنے والا، وہ کلام ہے ___ اگر آپ لکھ دیں اسے مجازی طور پر کلام کہیں گے۔ بولے نہیں لکھ کردے دیا اسے متکلم کی کتاب تو کہا جائے گا کلام نہیں کہا جائے گا۔ کلام مجازاً کہیں گے ___ تو توراۃ حق تعالیٰ نے نازل کی۔ اس کے ساتھ کلام نہیں فرمایا۔ تختیاں لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئیں تو توراۃ کو کتابِ خداوندی تو کہیں گے کلام مجازاً کہیں گے۔ حقیقی معنی میں کلام نہیں اس لئے کہ تکلم نہیں فرمایا۔

انجیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قلب مبارک پر بطور مضمون کے اِلقاء فرمادیا۔ تکلم نہیں فرمایا۔ اسے مضمونِ خداوندی کہیں گے، کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے۔ کلام اگر کہا جائے گا تو مجازاً کہا جائے گا تو کلام وہ ہے جس کے ساتھ بولنے والا بولے۔ قرآن کریم وہ ہے جس کے ساتھ حق تعالیٰ نے تکلم کیا ہے اس سے بولے ہیں۔ قرآن کریم میں خود فرمایا گیا کہ نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تلاوۃ کرتے ہیں تم پر موسیٰ کے واقعہ کی ___ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جس کی ہم تلاوت کر رہے ہیں۔ تمہارے سامنے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ کوئی آیت بھیجتے تھے، کلام فرماتے تھے تو وہ کلام سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سنتے تھے اور اس کی عظمت سے بے ہوش ہو جاتے تھے یعنی اپنے آپے میں نہیں رہتے تھے تمام آسمان والے فرشتے اس کی عظمت سے مغلوب اور مدہوش ہو جاتے تھے اور بعد میں پوچھتے تھے کہ مَاذَا قَالَ رَبُّنَا ؟ ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ اس وقت جبرئیل کہتے تھے کہ قَالُوا الْحَقَّ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ اللہ نے یہ فرمایا تو قرآن کریم کا حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا اس لئے صحیح معنی میں کلام اللہ وہی ہے جس کا تکلم کیا جائے اور وہ قرآن کریم ہے۔

قرآن کریم کتابِ خداوندی بھی ہے

اور ساتھ میں وہ کتاب بھی ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اسے لوحِ محفوظ میں لکھ بھی دیا ہے، تو کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی ہے لوح محفوظ میں تو بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہے جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف "کوہِ قاف" کے برابر تھا تو جیسے کلام کرنے والا اور جیسا کاتب ہوگا، ویسی کتابت بھی ہوگی۔ اللہ کی ذات لامحدود تو قلم بھی اس کا اعلیٰ ہوگا۔ حروف بھی اس کے اتنے چوڑے ہوں گے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تو بڑے بڑے موٹے حرفوں میں لوحِ محفوظ پہ لکھا گیا ___ اور احادیث میں فرمایا گیا کہ باریک حرفوں میں اس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا تو وہ باریک حرفوں میں بھی لکھا ہوا ہے ___ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ کلام کو موٹے حرفوں میں چھاپیں تو بھی آپ حق تعالیٰ شانہ کا اِتباع کر رہے ہیں کہ انہوں نے بھی بڑے موٹے حرفوں میں لوحِ محفوظ میں لکھ دیا اور اگر آپ نے چھوٹے حرفوں میں چھاپا تو حمائل بن گئی۔ اس کی بھی نظیر ہے کہ اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اس طرح لکھا گیا ___ وہ حمائل ہی تھی باریک

باریک حرفوں سے ___ اور آپ نے اس کو عکسی قرآن میں اور زیادہ باریک کردیا۔ وہ اتنی سی ڈبیا میں آجاتا ہے کہ جیب میں رکھ لو بست ہی چھوٹی قسم کی حمائل ___ تو مسلمانوں نے کلام خداوندی کے جتنے نقشے ہوسکتے ہیں وہ سارے تیار کرلئے موٹے حرفوں میں بھی باریک حرفوں میں بھی۔

ایک عجیب نمونۂ قرآن

بروتہ میں ہم نے ایک قرآن شریف دیکھا ہے وہاں کی جامع مسجد میں وہ محفوظ ہے اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً ساڑھے تین گز ہے اور چوڑائی دو گز ہے ایک بڑی میز پر پندرہ سپارے رکھے ہوئے ہیں جو چھت تک پہنچ گئے۔ دوسری میز پر پندرہ سپارے دوسرے رکھے ہوئے ہیں خدا جانے کاتب کو کیا سوجھی ہوگی؟ کونسا قلم لیا ہوگا؟ یعنی تقریباً چار چار انگشت چوڑے اس کے حروف ہیں تو چھت تک وہ قرآن شریف آگیا تو مسلمانوں نے کوئی نمونہ نہیں چھوڑا قرآن کریم کے لکھنے میں۔ چوڑے حروف 'باریک حروف' پتلے حروف' عکسی حروف ہر قسم کے نمونے مہیا کردیئے۔

تو قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے لکھا بھی ہے 'کلام بھی فرمایا۔

کلماتِ قرآن کی طرح مرادِ ربّانی بھی مِن جانب اللہ متعیّن ہے

اور اس کے حروف کے اندر جو معانی اور مضامین ہیں وہ بھی حق تعالیٰ نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر القاء فرمائے ہیں ایسا نہیں ہوسکتا کہ ظاہر آیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس آیت کے نیچے یہ معنی کھپ سکتے ہیں اور زمانے کے مطابق اس آیت سے یہ مضمون نکل سکتا ہے لہٰذا مرادِ اللہ یہی ہے۔ یہ نہیں ہوتا ___ کلمات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اترے تو لغوی معنی تو آپ سمجھتے ہی تھے لیکن "مرادِ ربّانی" کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتظار فرماتے رہتے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے مطلع فرمادیں کہ میرا مقصد اس آیت سے یہ ہے اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے اپنے کلام میں کہ یہ قرآن ہے یہ اس کی تفسیر ہے۔ اپنے ذہن سے غور نہیں فرماتے تھے کہ اس آیت کے نیچے کتنے مضامین کھپ سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے۔ مراد بتلانا بھی اللہ کا کام ہے کہ اس کلمہ سے یہ میرا مطلب ہے۔

اس لئے کہ قرآن کریم لغت عرب پر اترا۔ لغوی طور پر تو ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ظاہر الفاظ کا یہ مطلب ہے۔ لیکن مرادِ ربّانی کیا ہے؟ تو وہ بالکل الگ چیز ہے بہت سے الفاظ ہیں کہ قرآن نے لغت سے لئے ہیں لیکن معنی اس میں اپنے ڈالے ہیں مراد اس کی اپنی ہے۔ مثلاً لفظ "صلوٰۃ" ہے۔ تو صلوٰۃ کے لغوی معنیٰ دعا کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم نے صلوٰۃ کا لفظ لیا لیکن اس میں معنیٰ اپنے ڈالے یعنی افعالِ خاصہ کہ یوں نیت باندھو' یوں ہاتھ باندھو' یوں رکوع کرو' یوں سجدہ کرو' یہ مرادِ ربّانی ہے لفظ صلوٰۃ سے دعا مانگنا مراد نہیں ہے۔ جو کہ لغوی معنیٰ ہیں۔ تو لغوی معنیٰ اپنی جگہ' عرفی معنیٰ اپنی جگہ۔ جو مرادی معنی ہے۔

یا مثلاً حج کا لفظ ہے۔ لغت عرب میں حج کے معنیٰ قصد کرنے کے ہیں تو آدمی نے گھر بیٹھ کے قصد کرلیا۔ بس حاجی ہوگیا۔ کیا ضرورت پڑی کہ ایک کثیر مقدار روپیہ خرچ کرکے پاکستان سے عربستان جائے ملک سے بے ملک ہوتا پھرے' گھر میں بیٹھ کر قصد کرلے حاجی بن جائے گا۔ تو لغوی معنیٰ مراد نہیں بلکہ مرادی معنیٰ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں تو حج سے عبادت خاصہ مراد ہے صرف قصد کرنا مراد نہیں ہے تو لغت کو قرآن نے لیا ہے مگر عربی زبان میں اپنا مضمون اس کے اندر ڈالا ہے اس کو منقول لغوی یا منقول اصطلاحی کہتے ہیں اس طرح

کی اصطلاحات ہیں بہر حال قرآن کریم محض لغت پر نہیں اترا بلکہ اس کے "معنیٰ مرادی" وہ ہیں جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر القاء فرمائے ہیں اگر محض لغوی معنیٰ مراد ہوتے تو پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حق تعالیٰ قرآن کریم کو بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دیتے اور اعلان حضرت جبرئیل کروا دیتے کہ "تم سب لوگ مریضانِ نفوس ہو' یہ نسخۂ شفاء ہے لے جاؤ اپنا اپنا علاج خود کرلیا کرو' جو تمہیں سمجھ میں آجائے" یوں نہیں کیا۔ قرآن اتارا اور پیغمبر کو بھیجا تاکہ وہ اس کی مراد بتلائیں اس کے معانی اور مطالب سمجھائیں۔ تو لغت اور چیز ہے ادیب ہونا اور چیز ہے اور علم دوسری چیز ہے۔ محض ادب دانی کے بل بوتے پر قرآن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب تک قرآن دانوں کے پاس بیٹھ کر وہ معانی نہ سمجھ لئے جائیں جو سند متصل کے ساتھ ان تک پہنچے ہیں روایات واحادیث سے مرادِ ربّانی معلوم ہوسکتی ہے۔

لغت عرب سے بدرجۂ کمالِ واقفیت کے باوجود مرادِ ربّانی از خود متعیّن نہیں کی جاسکتی

حضرت عدی ابن حاتمؓ صحابی ہیں جب قرآن کریم کی یہ آیت روزہ کے بارے میں نازل ہوئی کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ کہ رات کو کھاتے پیتے رہو جب تک کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ ہوجائے یعنی رات کی تاریکی ختم ہوکر صبح صادق نمایاں نہ ہوجائے اس وقت تک کھاتے پیتے رہو' جب صبح صادق نمایاں ہوکر پَو پھٹے کھانا پینا بند کردو۔ روزے کی نیت کرلو۔ تو صبح صادق کو خیط ابیض سے تعبیر کیا اور خیط اسود سے رات کی تاریکی کو تعبیر کیا ___ حضرت عدی ابن حاتمؓ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جب یہ آیت آئی تو خیط کے لغوی معنیٰ تو ڈورے کے ہیں انہوں نے دو ڈورے لے کر ایک کالا اور ایک سفید دونوں کو تکئے کے نیچے رکھ لیا اور انہیں دیکھتے رہتے جب تک اتنا چاندنا نہ ہوجائے کہ الگ الگ پہچان ہو' کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق کو ہوئے تیس منٹ آدھ گھنٹہ ہوچکا ہوتا اس لئے کہ صبح صادق کے بعد بھی بہت دیر تک اندھیرا رہتا ہے صورت بھی نہیں پہچانی جاتی تو انہوں نے دونوں ڈورے رکھ لئے اور دیکھتے رہتے۔ جب پوری طرح سے دونوں ممتاز ہوجاتے تب کھانا پینا بند کرتے اور روزے کی نیت کرتے حالانکہ صبح صادق کو گذرے تیس منٹ ہوچکے ہوتے۔

یہ خبر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدی! تم روزے کے لئے سحر کے بارے میں کیا کام کرتے ہو؟ عرض کیا کہ یارسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ کھاتے پیتے رہو جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ ہوجائے تو میں نے تکیے کے نیچے دو ڈورے رکھوا دیئے ہیں اور دیکھتا رہتا ہوں جب اتنا چاندنا ہوجائے کہ دونوں ڈورے الگ نمایاں ہوں تو روزے کی نیت کرلیتا ہوں فرمایا انّک وسادتک لعریض کہ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے خیطِ ابیض اور خیطِ اسود اس کے نیچے آگئے۔ بندۂ خدا خیطِ ابیض سے مراد صبح صادق ہے اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے تو تیرا تکیہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ دن رات دونوں اس کے نیچے سماگئے؟ ___ تب انہیں معلوم ہوا کہ لغوی معنیٰ مراد نہیں اصطلاحی مراد ہیں۔ شریعت کی مراد لغوی دھاگہ نہیں بلکہ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔ تو لغوی معنیٰ اور ہیں ___ ایک لغت دان قرآن کو لغت کے بل بوتے پر حل کرے گا تو دونوں دھاگوں کو اٹھا کے رکھ لے گا چاہے روزہ ہو کہ نہ ہو۔ لیکن جس نے علم قرآن حاصل کیا' مرادِ ربّانی کو احادیث کے ذریعے سمجھا اور وہ احادیث مستند علماء کے ذریعے منتقل ہوئی ہوں ___ اسے معلوم ہوجائے گا کہ مراد یہ ہے' وہ مراد نہیں ہے۔

محض لغت جاننے سے کسی زبان پر عبور حاصل نہیں ہو سکتا

ہر زبان میں کچھ لغت ہوتا ہے، کچھ عرف ہوتا ہے، لغوی معنیٰ اور ہوتے ہیں، عرفی معنیٰ اور ہوتے ہیں اگر آدمی اہلِ عرف میں نہ رہے تو نہ زبان کا لطف حاصل ہوگا، نہ زبان کے محاورے معلوم ہوں گے۔ بس ڈکشنری سے دیکھ کر پتہ چلالیا کرے گا اس سے زبان نہیں آتی۔

ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے "کریلا اور نیم چڑھا" ___ تو ہمارے اساتذہ میں حضرت غلام رسول صاحبؒ صوبہ سرحد (کے علاقہ) بفہ کے رہنے والے تھے بہت بڑے جلیل القدر عالم اور دارالعلوم (دیوبند) میں تمام علماء مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت تھانویؒ یہ سارے بزرگ ان کے شاگرد۔ سب کے استاذ، اور تھے صوبہ سرحد کے۔ اردو بولنی زیادہ نہیں آتی تھی بس ایسے ہی بولتے تھے جیسے سرحدی لوگ بولا کرتے ہیں ایک دعوت میں ان سب بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی تھے ان کے بڑے بھائی مولانا محمد حسنؒ بھی تھے۔ تو مولانا محمد حسنؒ صاحب نے مولانا غلام رسول صاحبؒ سے کہا کہ میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس ہو گئے تمہیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے مگر تمہیں اردو بولنی نہ آئی۔ مولانا کو آیا غصہ کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو میں لغو سمجھتا ہوں۔ اس لئے بولتا نہیں ہوں ___ خیر وہ سب ہنس پڑے ___ تو حکیم محمد حسن صاحبؒ نے فرمایا کہ اچھا بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں ___ "کریلا اور نیم چڑھا"۔ اب مولانا سوچ میں پڑ گئے، کہنے لگے کہ عطف نے کام خراب کر دیا یہ جو "اور" بیچ میں ہے اگر یہ نہ ہو تو معنیٰ ظاہر ہیں ___ کہا کہ اچھا تم عطف نکال دو۔ کریلا نیم چڑھا۔ کہنے لگے معنیٰ ظاہر ہے کریلا آدھا کچا آدھا پکا ___ یہ معنیٰ ہیں یعنی کریلا اردو کا لیا۔ نیم فارسی کا لیا۔ "چڑھا" ہندی کا لیا۔ تینوں کو ملا کے انہوں نے ایک مضمون بنالیا کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا، سارے ہنس پڑے تو مولانا کو بڑی حیرت ہوئی کہ ہنستے کیوں ہیں میں نے مضمون بیان کر دیا ہے۔

تب عرض کیا گیا کہ حضرت یہ لغوی مطلب مراد نہیں، مراد عرفی ہے۔ عرف میں ہے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی برائی میں مبالغہ کرنا ہوتا ہے کہ کریلا اپنی ذات سے کڑوا تھا ہی، نیم پر چڑھ گیا تو کڑواہٹ اور بڑھ گئی۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ چیز اپنی ذات سے بھی بُری اور احوال بھی بُرے پیش آگئے تو بُرائی در برائی جمع ہو گئی۔ یہ مطلب ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ کریلے کو نیم پر ٹانگ دو۔ آدھا کچا رہ جائے آدھا پکا رہ جائے یہ آپ نے لغت کے بل بوتے پر مضمون گھڑ دیا۔ یہ مراد نہیں ہے۔ تب مولانا کو واضح ہوا کہ واقعی میں پوری طرح اردو نہیں جانتا ___ یا جیسا کہ ہمارے ہاں لغت میں محاورہ ہے کہ سونے پر سوہاگہ۔ سونے پر سوہاگہ کے لغوی معنیٰ تو یہ ہے کہ سوہاگے کو پیٹھ کر سونے پر چھڑک دو۔ بس سونے پر سوہاگہ ہو گیا، لیکن مراد یہ نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب کسی خیر کے اندر مبالغہ کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ سونے پر سوہاگہ یعنی سونا تو اپنی ذات سے اعلیٰ ہی تھا۔ سوہاگہ چھڑکنے سے اور زیادہ کندن بن گیا۔ اور زیادہ چمک پیدا ہو گئی تو مبالغہ فی الخیر مقصود ہوتا ہے، یہ ہیں مرادی معنیٰ، لغوی معنیٰ تو یہ ہیں کہ سونے کے اوپر سوہاگہ چھڑک دیا جائے۔ یہ مراد نہیں۔ ہر زبان میں ایسے محاورے ہوتے ہیں۔ فارسی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ فلاں شخص آب در سوار کرو، فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔ لغوی معنیٰ یہ ہیں کہ ٹوکری رکھ کے لوٹے سے اوپر پانی ڈال رہا ہے، مراد یہ نہیں ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی عبث کام ہوتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نہیں تو ایسے مواقع پر کہا کرتے ہیں کہ ٹوکرے میں پانی ڈال رہا ہے۔ گھڑے میں ڈالتا تو کوئی بات ہوتی یہ بے کار نتیجہ ہے۔ ٹوکرے

کے نیچے سے نکل جائے گا' تو مرادی معنی اور ہیں اور لغوی معنی اور ہیں۔

واقعہ نمبر۲

ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک یورپین کلکٹر تھا اور اردو اچھی جانتا تھا اردو میں ہی کچھ شاعری بھی کرتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ تخیل پیدا ہو گیا کہ میں اردو پر پورا قادر ہو گیا ہوں اور ہندوستانی بھی ایسی اردو نہیں بول سکتے جیسی میں بولتا ہوں۔ ان کے ہاں میر منشی اور پیش کار منشی نہال احمد صاحب تھے ادیب بھی تھے شاعر بھی تھے وہ ان کے آگے دعوے کیا کرتا تھا کہ "ویل تم اردو نہیں جانتا ہم جانتا ہے" یہ خون کے گھونٹ پی کے بیچارے چپکے ہو جاتے۔ پیش کار تھے کچھ کہیں تو ممکن ہے ملازمت سے برخواست کر دے فرمانے لگے میں خاموش رہتا۔

اگلے دن صاحب نے پھر کسی بات پر دعویٰ کیا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں اور میز پر مکہ مار کے کہا کہ میں تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہوں انہیں بڑا غصہ آیا انہوں نے کہا چاہے ملازمت رہے یا نہ رہے مگر اس کے دماغ سے یہ خناس نکالنا ہے تو اس نے ایک مکہ مارا تھا انہوں نے دو مکے مارے میز پر اور کہا کہ صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو تم کیا جانو اردو کیا چیز ہوتی ہے؟ سات سمندر پار سے آئے ہو۔ ہماری مادری زبان ہے ہم جانتے ہیں۔

صاحب کو بڑا غصہ آیا اس نے کہا کہ کونسی چیز ایسی ہے جو میں نہیں جانتا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا اس محاورے کے معنیٰ بتلایئے کہ اگر میں صاحب بہادر سے فلاں بات پوچھوں تو بغلیں جھانکتے رہ جائیں ___ صاحب تو واقعی بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے یوں جھانک لیا' یوں جھانک لیا' بس ختم۔

انہوں نے کہا کہ بس یہی آپ کی اردو دانی ہے۔۔ یہ مطلب نہیں ___ کہنے لگا اور کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ اردو جانتے ہیں خود سمجھئے اس کا کیا مطلب ہے ___ کہ اچھا ہم تین دن میں ڈکشنری دیکھ کے آپ کو بتلائیں گے ___ انہوں نے کہا کہ تین دن نہیں آپ کو سات دن کی مہلت آپ دیکھ لیں۔

صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنی شروع کیں۔ لغت کی کتابیں دیکھنا شروع کیں مگر وہ تو محاورہ تھا ___ تو ساتویں دن آکر کہا کہ ویل پیش کار ہمیں تو کسی ڈکشنری میں اس کا معنیٰ نہیں ملے۔ کیا ہیں اس کے معنیٰ؟ کہا کہ پہلے اقرار کیجئے کہ آپ جاہل مطلق ہیں' آپ اردو نہیں جانتے' تب میں بتلاؤں گا۔

اب یہ کہنا پرسنلٹی کے خلاف تھا کہ صاحب میں جاہل مطلق ہوں خیر انہوں نے دبے لفظوں میں کہا کہ اچھا ہم لاعلم ہیں تو تم بتلاؤ ___ تب انہوں نے کہا کہ بغلیں جھانکنا تحیّر کی طرف اشارہ ہے جب آدمی حیرت زدہ ہوتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ یہ معنیٰ نہیں کہ ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا یہ لغت ہے' محاورہ میں یہ معنیٰ ہیں۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زبان میں بہت سے محاورات ہیں کہ ان کا لغت کچھ بتلاتا ہے عرف کچھ اور بتلاتا ہے تو جب تک آدمی اہلِ عرف میں نہ رہے اس زبان کے محاورات کو نہیں سمجھ سکتا نہ زبان کی لطافت کو سمجھ سکتا ہے۔

مرادِ ربانی کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے

تو قرآن کریم بھی بہرحال اللہ کا ایک خاص کلام ہے خاص زبان ہے اس کا بھی ایک عرف ہے اسے لغت کے پیمانے سے ناپنا اور ڈکشنریاں دیکھ کر اس کے مضامین کو پھاڑنا' اس سے مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مراد جب ہی سمجھ میں آئے گی جب متکلم خود ہی بتلائے کہ یہ میری مراد ہے آپ اندازہ تو کیجئے کہ دو آدمی ہیں۔ ایک ماں کے پیٹ میں انہوں نے پیر پھیلائے۔ حقیقی بھائی ہیں سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہ اظہار نہ کرے کہ میں یہ چاہتا ہوں۔ تو دو انسان جو ایک جنس کے ہیں ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہیں۔ ایک کا مافی الضمیر دوسرا نہیں سمجھتا جب تک کہ دوسرا اظہار نہ کرے تو اللہ ربّ العزت جو نور مطلق ہیں اور بندہ ظلم مطلق ہے یہ بھلا بتلائے کیسے اللہ کی مرادات کو سمجھ لے گا جب تک حق تعالیٰ خود نہ فرمائیں کہ میری مراد یہ ہے۔

اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا اس پر کلام اتارا' الفاظ بھی اتارے۔ معانی بھی اتارے تو آپ قرآن پاک کے الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں آپ موجد اور مخترع نہیں ہیں جیسا کہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں بنائے اللہ کے نازل کردہ ہیں اسی طرح ان الفاظ کے معانی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اختراع نہیں فرمائے بلکہ اللہ نے القاء کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں مراد آئی تو مرادات کو بتلانے والی چیز حدیث ہے اور حدیث کو جب تک قرآن سے نہ ملایا جائے۔ قرآن کے معانی اور مطالب نہیں سمجھے جاسکتے۔ جب تک اللہ کی بتلائی ہوئی مراد پیغمبر کی زبان سے ادا نہ ہو' پیغمبر کے قول و فعل سے نمایاں نہ ہو۔

جناب نبی کریم ﷺ سے متعلقہ فرائض

تو حدیث درحقیقت قرآن کا بیان ہے جب تک اسے نہ ملاؤ' مراداتِ ربانی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کو بھیجا تو چار فرائض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمائے۔

فرمایا کہ: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ﴾ ہم نے اُمیوں میں رسول بھیجا جو اُمّی ہے۔ اس کا پہلا کام یہ ہے کہ اللہ کی آیات کو تلاوت کرے' یہ تو آپ نے الفاظ پہنچادیئے۔ من و عن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کے ساتھ وہ الفاظ جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی کے ذریعے اتارے وہ پہنچادیئے تو ایک فریضہ تو ادا ہو گیا جو تلاوت آیات ہے گویا قانون خداوندی کی نص آپ نے پہنچادی۔

اب اس لفظ کے معنی کیا ہیں؟ تو دوسرا لفظ فرمایا گیا ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ کتاب کی تعلیم بھی دے تو تعلیم میں استاذ الفاظ نہیں رٹایا کرتا' الفاظ کے معانی بیان کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کام یہ ہے کہ معانی اور مرادات سمجھائیں' یہ تو تعلیم میں آتا ہے' تیسری چیز یہ فرمائی ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ حکمت کی تعلیم دیں اور حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت نظری اور ایک حکمت عملی۔ ایک فکری حکمت کہ حقائق بیان کئے جائیں ایک عملی حکمت کہ عمل کا نمونہ پیش کیا جائے تو تعلیم میں حکمت نظری تو آگئی' مراداتِ ربانی سمجھادی گئیں اب آگے عمل کا نمونہ رہ جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف معانی نہیں سمجھائے بلکہ عمل کر کے بھی دکھلایا تاکہ دوسری چیز کی گنجائش نہ رہے متعین ہو جائے کہ اللہ کی مراد یہی ہے قرآن جو کچھ کہتا

ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھلا دیا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمل کرتے ہیں وہ قرآن کے اندر ہوتا ہے تو قرآن میں قال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں حال ہے وہ جو کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔

اگر ہم یوں کہہ دیں تفنّن کے طور پر کے اللہ نے دنیا میں دو قرآن نازل کئے تھے۔ ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے ایک عملی قرآن ہے جو ذات بابرکات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ تو قرآن درجۂ قال میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل درجۂ حال میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہی کچھ کرتے ہیں جو قرآن میں ہوتا ہے تو عمل سے مراد متعین ہو جاتی ہے پھر جانبِ مخالف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

حدیث قرآن ہی کا بیان ہے

یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے جب حضرت ابن عباسؓ کو خوارج کے مقابلہ کے لئے بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا' سنت سے دلیل پیش کرنا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے۔

ابن عباسؓ نے عرض کیا کہ امیرالمؤمنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن فہمی کی دعا دی ہے اور فرمایا ہے کہ **اللھم علمه الکتب والحکمة** اے اللہ! ابن عباسؓ کو اس کتاب کا علم بھی دے اور اس کی حکمت بھی اس کے قلب میں ڈال دے تو جو میرا اصل مضمون ہے' اسی سے آپ مجھے روک رہے ہیں کہ اس سے دلیل نہ پکڑوں اور عوام کے سامنے قرآن سے حجۃ نہ پیش کروں سنت سے پیش کروں۔

فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ **القراٰن ذوالوجوہ** قرآن چونکہ دستورِ اساسی ہے اس کی ایک ایک آیت بڑی جامع اور کئی کئی معنیٰ پر ڈھل سکتی ہے' کئی کئی معنیٰ لغت کے اندر سے آسکتے ہیں' تم اگر قرآن سے حجّت پیش کرو گے' فریق مخالف اس آیت سے ایک دوسرا مضمون لیکر پیش کر دے گا کہ اس کا یہ مطلب ہے تو عوام پر حق و باطل واضح نہیں ہو گا وہ کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو دونوں کا حق مشتبہ ہو گا' حق و باطل کا فیصلہ نہیں ہو گا ___ لیکن اگر سنت سے دلیل پیش کرو گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے' اس میں جانبِ مخالف کی گنجائش نہیں ہے تو حق واضح ہو جائے گا کہ "یہی ہے" اس لئے سنت سے دلیل پیش کرنا۔ تو قرآن کریم ذی وجوہ ہے۔ ایک ایک آیت کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے۔ لغت اس کا انکار نہیں کرتا۔ لیکن مرادی معنی وہ ہیں جو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارے ہیں کہ اس آیت سے ہمارا یہ مطلب ہے۔ جب وہ مراد سامنے آئے گی' مطلب متعین ہو جائے گا ___ اور وہ مراد بغیر حدیث کے پیش کئے نہیں آسکتی بغیر سنت کے معلوم نہیں ہو سکتی۔ تو سنت قرآن کریم کا بیان ہے تعجّب ہے کہ لوگ حدیث کا انکار کر دیتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ قرآن کو مانتے ہیں تو حدیث کا انکار کر کے قرآن کیسے مانتے ہیں؟ قرآن کے لفظ ہی تو مطلوب نہیں معانی بھی تو مطلوب ہیں اور معانی حدیث بیان کرے گی۔ (تو حدیث کے انکار سے قرآن کے معانی کیسے سمجھے جا سکیں گے؟)

قرآن کا قرآن ہونا حدیث کے اوپر موقوف ہے

میں ایک دفعہ یہیں پاکستان میں کراچی سے لاہور آرہا تھا' ریل کا سفر تھا۔ اسی گاڑی میں ایک صاحب سوار

ہوئے جو ایڈووکیٹ قسم کے آدمی تھے انہوں نے اس قدر نیازمندی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا اور اتنی خدمت کی کہ ذرا میں لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو فوراً پانی بھر کے لائیں، اور کسی چیز کا اشارہ بھی کر دوں، سمجھ جائیں وہ لا کر رکھیں، بہت بڑی خدمت کی ___ خیر کئی گھنٹے تک وہ بے چارے محبت سے خدمت کرتے رہے ___ میرے دل میں قدر ہوئی کہ بھئی بالکل ہی جدید تعلیم یافتہ اور نو فکر آدمی اور اس طالب علم کے آگے اس قدر محبت سے پیش آئے، بڑی دل میں قدر ہوئی ___ وہ تھے اصل میں منکر حدیث ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے انکار حدیث (کی بحث و تمحیص) کے اوپر لائیں۔ اس لئے خدمت کو انہوں نے پیش خیمہ بنایا اخیر میں انہوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا ___ احادیث پر کچھ اعتراضات کرنے شروع کئے کہ وہ قابل اعتبار نہیں۔ ایک تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔

تو میں نے کہا، آپ کسی چیز کو مانتے بھی ہیں؟ کہنے لگے قرآن ___ میں نے کہا، قرآن کا قرآن ہونا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ پہ وحی آگئی تھی کہ یہ قرآن ہے۔ کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگے اللہ کے رسول کے ارشاد سے ___ میں نے کہا وہ ارشاد ہی تو حدیث ہے تو قرآن کا قرآن ہونا تو حدیث پر موقوف۔ حدیث کا آپ انکار کر دیں گے تو کونسی شرط ہے قرآن کے قرآن ہونے کی؟ کیسے آپ انکار کرتے ہیں؟ تو وہ چپ ہو گئے۔

کہنے لگے کہ دل سے تو حدیث کا انکار واقعی مشکل ہے۔ باقی حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ بعض قابل اعتبار نہیں ___ تو میں نے کہا جنس کو تو آپ نے مان لیا۔ آپ مُصر کیوں ہیں کہ حدیث کی قسمیں ہیں ___ میں نے کہا جہاں تک حدیث کی قسمیں ہیں محدثین نے خود ان کی صراحت کی ہے ___ کہ ہر حدیث کا ایک درجہ نہیں ہے جو حدیث متواتر ہے اور تواتر سے ثابت ہے وہ مورثِ یقین ہے اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا انکار۔ قرآن کی ایک آیت کا آدمی انکار کر دے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حدیث متواتر کے انکار سے بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

دوسرے درجہ کی حدیث مشہور ہے وہ اگر مورثِ یقین نہیں تو ظنِ غالب کی مورث تو ہے ہی۔ ظن غالب تو پیدا ہو گا اور ظن غالب پر ہزاروں احکام کا مدار ہے تو وہ بھی حجت ہو گی۔

تیسرا درجہ خبرِ واحد کا ہے۔ وہ اگر ظن غالب نہیں تو مطلق ظن تو پیدا کرتی ہے اور ظن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ___ بہت سے احکام ظن اور گمان پر مبنی ہیں کہ آدمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا وضو میں پیروں کا دھونا ضروری ہے اور ذرا بھی خشک رہ جائے، وضو نہیں ہو گا، لیکن آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایڑی دُھل گئی ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ظن غالب ہی تو ہوتا ہے کہ پیر دھل گیا اس ظن غالب پر شریعت بھی حکم دیتی ہے کہ ہاں دھل گیا۔ وضو ہو گیا ___ تو بہت سے احکام کا مدار ظن پر بھی ہوتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے وہ بھی حجت کی شان رکھتی ہے آپ کا گمان جب فعل کے جائز ہونے پر حجت بن جاتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کرے تو وہ کیوں حجت نہیں بنے گی؟ تو میں نے کہا یہ تو خود محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ہر حدیث ایک درجے کی نہیں ہے ___ تو جنسِ حدیث کو آپ نے مان لیا۔ اقسام حدیث وہ قابل اعتراض ہیں تو خود محدثین ہی تقسیم کرتے ہیں۔ اب آپ کو اعتراض کیا ہے؟ کہنے لگے اب تو کچھ اعتراض نہیں۔ میں نے کہا اب تو حدیث کا انکار نہیں کرو گے؟ کہنے لگے نہیں اب نہیں کروں گا ___ تو لاہور آتے آتے ان کا خیال درست ہو گیا۔

بہر حال قرآن پاک کا ماننا حدیث کے ماننے پر موقوف ہے۔ حدیث کا انکار کرنا خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ قرآن کے لفظ آپ مان لیں گے مگر معانی میں حدیث کو ماننا پڑے گا، میں تو کہتا ہوں کہ لفظوں میں بھی آپ کو

ماننا پڑے گا ___ اللہ کے رسول ہی کا تو ارشاد ہے کہ یہ آیت خدا کی بھیجی ہوئی ہے تو لفظ بھی حدیث سے ہی آپ نے مانے۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ارشاد فرمایا ہمیں کیا خبر تھی کہ قرآن کے یہ لفظ ہیں اور معانی یہ ہیں۔ تو لفظوں کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف' معانی کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف' مرادِ ربانی کا سمجھنا بھی حدیث پہ موقوف۔ تو منکر حدیث سب سے پہلے منکر قرآن ہے وہ قرآن ہی کو نہیں مانتا اس لئے قرآن کے نہ ماننے پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ حدیث کا انکار کردو۔ درحقیقت قرآن کا انکار مقصود ہے کہ یہ دنیا سے اٹھ جائے۔

"حجیتِ فقہ"

تو مقصد یہ تھا کہ قرآن اصل ہے اور اس کا بیان حدیث ہے اس بیان کی تشریحات اور معارف ہی ہیں جو فقہ میں مدوّن ہوگئے۔ تو بنیادی طور پر حجت قرآن ہے۔ دوسرے درجہ پر حجت حدیث ہے جو قرآن کو قرآن ثابت کرتی ہے ___ بہت سے احکام بلاواسطہ قرآن سے نکل رہے ہیں۔ بہت سے وہ ہیں جو اس کی کلیّات سے نکلتے ہیں مجتہدین ان کلیّات میں چھپے ہوئے مضامین کو نکال کر اپنے اجتہاد و بیان سے باہر پیش کر دیتے ہیں۔ تو بالواسطہ وہ چیزیں قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔

فقہ کے مسائل بھی درحقیقت قرآن ہی کے مسائل ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان مسائل کے نکالنے پر ہم اور آپ قادر نہیں ہیں جن کو اللہ نے اجتہاد کا ملکہ دیا ہے وہ قادر ہیں۔ وہ نکال کے ہمارے آگے پیش کر دیتے ہیں۔

امام شافعیؒ ایک دفعہ حرم شریف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیت اللہ سے کمر لگائے ہوئے تو علم کا ایک جوش پیدا ہوا۔ قلب میں علم کا دریا امڈا۔ فرمایا کہ آج جو مسئلہ پوچھو گے میں قرآن سے جواب دوں گا ___ ایک شخص نے آ کے عرض کیا کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ حرم میں جیسے سانپ بچھو کو پناہ نہیں ہے۔ تتیّا، بھڑ وغیرہ کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔ تتیّا کو بھی پناہ نہیں ہے وہ بھی قتل کئے جا سکتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ تو یہ کہتے ہیں کہ سانپ اور بچھو کو تو حرم میں مار سکتے ہیں لیکن بھڑ اور تتیّا کو نہیں مار سکتے انہیں بھی حرم کے اندر امن دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ تتیّا اور بھڑ حرم کے اندر ماری جا سکتی ہیں' یہ مذہب رکھتے تھے ___ تو ایک شخص نے سوال کیا کہ قرآن میں کہاں ہے کہ تتیّا اور بھڑ کا قتل حرم میں جائز ہے؟

فرمایا تو نے قرآن نہیں پڑھا۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو لاکے دیں اسے قبول کرو جس کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔ یہ آیت ہے "کہا جی ہاں آیت ہے۔ فرمایا قرآن نے وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ جو رسول لاکے دے اسے قبول کرلو اور جس سے رسول روک دیں اس سے رک جاؤ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرآن کی اس آیت سے حجت ثابت ہوا کہ جو رسول فرمادیں اس کو مان لیں۔ تو قرآن کی رو سے حدیث حجت ہوئی اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر وعمر میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتداء کرو۔ تو قرآن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننا واجب ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابوبکرؓ و عمرؓ کا حکم ماننا واجب ٹھہرا اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں یقتل الزنبور فی الحرام تتیّا (بھڑ) حرم کے اندر ماری جا سکتی ہیں۔ تو بدو واسطہ قرآن سے یہ حکم ثابت ہوگیا۔ تو بعض احکام قرآن سے بلا واسطہ نکلتے ہیں۔ بعض بواسطہ حدیث نکلتے ہیں۔ بعض احکام بواسطۂ اجتہاد و بیان نکلتے ہیں وہ انجام کار سب

احکام قرآن ہی کے سمجھے جائیں گے۔ واسطہ بلا واسطہ کا فرق ہو گا تو فقہ وحدیث وغیرہ کا انکار کر کے آدمی فی الحقیقت قرآن کا بھی انکار کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کو وہ جب ہی مان سکتا ہے جب پہلے سنت کو مانے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو مانے۔

تو بہر حال بات اس پر چلی تھی، میں دُور چلا گیا کہ قرآن کریم حق تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے اور مکتوب بھی ہے حق تعالیٰ نے لکھا بھی ہے۔ تکلم بھی فرمایا تو حقیقی معنوں میں کلام ہے تو وہ قرآن ہے۔ تورات کتاب اللہ ہے، کلام اللہ اسے مجازاً کہیں گے اور انجیل وہ مضمونِ خداوندی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القاء کردیا انہوں نے اپنے الفاظ میں اسے ادا کردیا۔ تو اس کی شان ایسی ہے جیسی حدیث۔ تو حدیث بھی تو وحی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر القاء کی گئی لیکن الفاظ آپ کے ہوتے ہیں۔ مضمون حق تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ تو انجیل بمنزلہ مضمون خداوندی کے ہے اور تورات بمنزلہ کتاب اللہ کے ہے۔ تکلم ان کے ساتھ نہیں ہوا۔

کلامِ خداوندی اَنمِٹ کیوں ہے؟

قرآن وہ ہے کہ محض کتاب کے طور پر نہیں اتارا گیا۔ حق تعالیٰ نے کلام بھی کیا ہے تو صحیح معنی میں اگر کلام ہے تو وہ قرآن کریم ہے اور ظاہر بات ہے کہ کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹتا نہیں، وہ قائم رہ جاتا ہے۔ اللہ کا کلام تو اللہ ہی کا کلام ہے۔ آپ جو بولتے ہیں وہ نہیں مٹے گا۔ وہ جم کر محفوظ ہو گیا۔ اور قیامت کے روز ایک ایک لفظ آپ کے سامنے پیش کردیا جائے گا۔ اس فضا میں محفوظ ہو گا۔ فضا میں کلام محفوظ ہے اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے اگر فضا کے اندر کلام محفوظ نہ ہو تو ریڈیو کے ذریعے کس چیز کو پکڑ کر آپ تک پہنچاتے ہیں۔ مشینوں کے ذریعہ آپ اس کلام کو کھینچتے ہیں جو فضا کے اندر محفوظ ہے اور لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں تو اگر کلام زبان سے نکل کر فنا ہو جایا کرتا تو ریڈیو کی ایجاد نہ ہوتی، آپ تک نہ پہنچتا وہ فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ فضا سے مشینوں کے ذریعے منتقل کر لیتے ہیں۔ تو کلام بندہ کرے تو مٹنے والا نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ اس کا محفوظ ہے۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ کوئی ایک لفظ کوئی ایک قول جو زبان سے نہیں نکالتے کہ تاکنے والا اس کو ٹانک لیتا ہے۔ محفوظ کرنے والا محفوظ کر لیتا ہے۔ تو فضا کے اندر یہ سارے کلام محفوظ ہیں۔

حتیٰ کہ سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم ریڈیو اور سائنسی ترقی کے ذریعے ایک نہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ کلام سنوا دیں گے جو انہوں نے حواریوں کے سامنے بطور خطبہ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جتنے کلام اب تک انسانوں نے کئے ہیں وہ سب فضا میں محفوظ ہیں ہم امتیاز نہیں کر سکتے۔ شور کی صورت میں اس کلام کو سنتے ہیں مگر ہے محفوظ ___ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ مشینوں کے ذریعے کلاموں کو متمیز کردیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے، یہ فلاں کا کلام ہے ایک وقت آئے گا کہ ہم تمہیں حضرت مسیح علیہ السلام کا خطبہ ایجادات کے ذریعہ سے سنا دیں گے تو بہر حال کلام محفوظ ہے۔ مٹنے والا نہیں ___ تو بندے کا کلام جو بولنے کے بعد مِٹ نہیں سکتا۔ تو خدا جس کلام کا تکلم کرے وہ کیسے مٹے گا؟ آپ کے کلام کو تو فضا گھیر لیتی ہے لیکن اللہ کا کلام جب چلتا ہے تو فضا کو گھیر لیتا ہے۔ فضا خود اس کلام میں محفوظ ہے وہ مٹنے والا نہیں ہے حتیٰ کہ شاہ رفیع الدینؒ نے ایک موقع پر یہ لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کرو تو تصوّر یہ باندھا کرو کہ میں نہیں بول رہا، کلام حق تعالیٰ کا ہے زبان میری حرکت کر رہی ہے۔ لیکن یہ صوتیہ لفظ اللہ کی طرف

سے اتر رہے ہیں تو فرمایا کہ اس کی مشق کرتے رہو پڑھتے رہو ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے کان میں آواز آئے گی کہ تم نہیں پڑھ رہے ہو حق تعالیٰ کی آواز ہے وہ پڑھ رہے ہیں اور جب یہ مشق ہو جائے گی وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ہمارا نبی ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتا ہم وحی کرتے ہیں تو بولتا ہے تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے کلام اللہ کا ہوتا ہے اترتا ہے زبان کے اوپر الفاظ کے واسطہ سے ___ تو اگر کوئی بندہ متبع رسول ہو فنائیت کا مرتبہ اختیار کرے اور اس تصور میں غرق ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کی برکت سے امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ تلاوت کر رہے ہیں ان کے کان میں آواز آ رہی ہے کہ اوپر سے پڑھا جا رہا ہے محض زبان میری ہے جو حرکت کر رہی ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے جب بندہ کا کلام زبان سے نکل کر نہیں مٹ سکتا وہ برقرار ہے باقی رہے گا تو اس کی حفاظت گویا طبعی اور قدرتی ہے حق تعالیٰ نے بھی فرما دیا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو یہ محفوظ رہنے والی چیز ہے کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔

سابقہ کتب کیوں مٹ گئیں اور قرآن کیوں مٹنے والا نہیں؟

فرق اتنا ہے کہ سابقہ کتب کی حفاظت کا ذمہ دار امتوں کو قرار دیا گیا تھا کہ تورات کی حفاظت تم کرو انجیل کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے زبور کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور وہ انجام نہیں دے سکیں۔ لفظوں میں بھی فرق کر دیا معانی میں بھی فرق کر دیا۔ تحریفِ لفظی، تحریفِ معنوی سب کچھ کر دیا جس سے کلام متغیر ہو گیا تو ضرورت پڑی کہ کوئی مستند کلام بھیجا جائے سابقہ کتب کو تو ان امتوں نے ضائع کر دیا اس لئے کہ حفاظت ان کے ذمہ تھی وہ نبھا نہیں سکے۔ قرآن آخری کتاب ہے۔ قیامت تک اب کوئی نیا کلام دنیا میں آنے والا نہیں ہے تو اگر وہ بھی آپ کے سپرد کر دیا جاتا اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو تورات و انجیل کا ہوا کہ وہ بدل گئیں اور یہ قیامت تک رکھنا تھا۔

اس کے علاوہ اس لئے بھی حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے کہ ہم نے یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو اول تو فطری طور پر کلام ضائع نہیں ہو سکتا مگر آپ کے قلوب سے ضائع ہو سکتا تھا تو حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا۔ سینکڑوں بچے آپ کے مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ قرآن حفظ کر رہے ہیں انہیں کچھ خبر نہیں کہ قرآن کیا چیز ہے؟ کچھ پتہ نہیں اس کے اثرات کیا ہیں؟ بس حفظ کر رہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ ہی تو حفاظت کر رہے ہیں ان بچوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں۔ اگر بوڑھے حفظ کیا کرتے تو وہ حفاظت بوڑھوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بھائی بوڑھے آدمی سمجھدار ہیں۔ قرآن کی حفاظت کے لئے یاد کر رہے ہیں لیکن بچوں میں تو یہ جذبہ نہیں یہاں محض حفاظت خداوندی ظاہر ہو رہی ہے کہ ہم حفاظت کر رہے ہیں جو بچوں کے ذریعے سے قرآن کو محفوظ رکھا ہے۔ معانی کی حفاظت علماء کے ذریعے کی اور فرمایا کہ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یہ آیات بینات ہیں جن کے حقائق اور مضامین اہل علم کے سینوں میں ڈالے گئے وہ وہاں محفوظ ہیں مٹ نہیں سکتے۔ حفاظت گاہ ایسی چیز ہے کو قرار دیا گیا کہ وہاں چور پہنچ سکے نہ ڈاکو پہنچ سکے نہ کوئی خائن پہنچ سکے وہ دلوں میں محفوظ ہیں وہاں چوروں کی رسائی ہی نہیں ہے اگر لوہے کے صندوقوں میں معانی محفوظ کئے جاتے تو ممکن تھا کہ لوگ صندوقوں کو دریا برد کر دیں، ممکن تھا زمین میں دفن کر دیں۔ ممکن تھا کہ زمین صندوقوں کو بھی گلا دے اور اوراق بھی

گلادے' کوئی چور چوری کر کے لے جائے قرآن ضائع ہو جاتا۔ تو نہ صندوق میں حفاظت کی نہ الماریوں میں ___ اہل علم کے سینوں میں حفاظت کی جہاں نہ چور پہنچ سکتا ہے نہ ڈاکو۔ یہ حفاظت خداوندی ہے کہ بچوں ور علماء کے ذریعے سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا ہے تو یہ اسباب حفاظت ہیں۔ حفاظت کرنے والے وہی ہیں یسے خالق وہ ہیں' سبب تخلیق آپ ہیں۔ درخت بنانے والے وہ ہیں سبب کاشتکار کو بنادیا۔ تو حفاظت کرنے الے قرآن کے وہ ہیں سبب حفاظت آپ کو بنادیا یہ آپ کی سعادت ہے جو بھی سبب بن جائے یہ انگلی کاٹ کے شہیدوں میں داخل ہونا ہے محفوظ تو رہنا ہی ہے یہ کلام۔ مٹنے والا تو ہے نہیں۔ آپ اور ہم ذریعہ بن ائیں تو ہماری سعادت ہے ورنہ رہے گا محفوظ ___ تو بہر حال خداوندی معجزہ ہے نہ اس کی مثل لاسکتا ہے نہ سے کوئی ضائع کر سکتا ہے۔

سندِ قرآن کی صحت

جہاں تک اس کی سند کا تعلق ہے وہ بھی حق تعالیٰ نے ایسی مستحکم بنائی کہ اس میں خلل اندازی ممکن ں۔ قرآن کی سند کے دو درجے ہیں۔ ایک اللہ سے نبی تک اور ایک نبی سے ہم تک' ایک باطنی سند ہے' ب ظاہری سند ہے۔ باطنی سند تو یہ کہ اللہ نے کلام کیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے سنا اور انہوں نے حضور صلی د علیہ وسلم کے قلب مبارک پرلا کے اتار دیا۔ تو جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کا تعلق ہے وہ تو بنائے لاص ہیں' کمالات کا منبع و مخزن ہیں۔ وہاں سے ہر چیز امانت کے ساتھ سرزد ہوگی۔ اس میں معاذاللہ کوئی غلط شائل نہیں ہو سکتی۔ تو حق تعالیٰ شانہ تو امین ہی ہیں۔ اب بیچ میں نازل فرشتہ ہے ___ حق تعالیٰ نے یہ نہیں مایا کہ یہ بے چارہ معصوم ہے۔ لہٰذا ہمارا کلام تمہیں قبول کرنا پڑے گا۔ دباؤ سے نہیں منوایا۔ بلکہ جبرئیل کے صاف بیان کئے جو نازلوں کے اوصاف ہوتے ہیں تاکہ تم عقلی اور فنی طور پر یہ سمجھ سکو کہ یہ راوی غلط قسم کا وی نہیں ہے بلکہ جتنے اصول روایت ہیں وہ سب اس کے اندر پائے جاتے ہیں ___ ورنہ یہ فرمادیتے کہ م ہمارا ہے' ہمارا فرشتہ لے کر آیا ہے' جب آئے گا ماننا پڑے گا' کوئی وجہ نہیں کہ انکار کرو' یہ نہیں فرمایا فرمایا کہ راوی کو پرکھ لو' اس کے اوصاف کو دیکھ لو' راویوں کے اوصاف اس میں پائے جائیں تو قبول کرو' ئے جائیں تو نہ قبول کرو' تو جبرئیل علیہ السلام کے اوصاف بیان کئے ہیں' سورۂ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں وصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ یہ ایک رسول کا قول ہے یعنی حضرت جبرئیل کا جو حضور اللہ علیہ وسلم تک لے کر آئے۔ تو اول تو "رسول" کہنے سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی امانت ظاہر ہوتی ۔ اس لئے کہ اللہ نے انہیں قاصد بنایا ہے۔ دنیا کو کوئی حکومت اپنا قاصد' اپنا سفیر اسے نہیں بنا سکتی جس ذرہ برابر بغاوت کا کوئی شائبہ ہو' حکومت اپنا سفیر اسی کو بنائے گی جو حکومت کی پالیسی کا محافظ ہو' حکومت قانون کا دل وجان سے دلدادہ ہو' ذرہ برابر خیانت نہ کرے' حکومت کا جو منشاء ہے اس کو دنیا کے آگے پیش ے۔ تو اول تو کسی کو قاصد بنادینا یا سفیر بنانا یہ خود قابل اعتماد ہونے کی دلیل ہے جب حق تعالیٰ نے فرمایا کہ را قاصد ہے ہمارا رسول ہے تو قاصد کے معنی یہ ہے کہ اللہ کو اس کے اوپر اعتماد ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ کہ ت جبرئیل علیہ السلام کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں قابل اعتماد شخصیت ہیں جنہیں سفیر کے درجے کا اعتماد ں ہے۔

سندِ قرآن پر اعتراضات کے جوابات

لیکن آدمی کہہ سکتا تھا کہ قاصد تو بنایا مگر قاصدوں میں بعض دفعہ کھوٹ ہوتا ہے' کچھ بدل بھی جاتے ہیں ممکن ہے کلام کو بدل دیں یا اس کے منشاء کو بدل دیں۔

تو ایک جملہ آگے فرمایا کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ وہ فقط رسول ہی نہیں ہیں بلکہ کریم النفس بھی ہیں۔ بزرگی کے آثار ان میں رچے ہوئے ہیں تو بزرگ آدمی کیسے جھوٹ بولے گا؟ ایک ادنیٰ صالح کو جسے آپ بزرگ کہتے ہیں کبھی آپ کو شائبہ بھی نہیں گزرتا کہ یہ جھوٹ بولے گا تو فرشتہ معصوم ہو کر جھوٹ بول دے' وہ بھی اللہ کے اوپر؟ بزرگ بن کر؟ یہ ناممکن ہے۔ تو فرمایا کہ رسول کا قول ہے' رسول بھی کریم ہے' کرامت والا ہے جس میں بزرگیاں رچی ہوئی ہیں۔

مگر کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی' کریم النفس بھی سہی لیکن بے چارہ ضعیف ہے۔ دبّو قسم کا آدمی ہے جہاں کسی نے تلوار دکھائی' بدل گیا کہ یہ نہیں مطلب تھا۔ جان بچانے کے لئے جھٹ مطلب کو بدل دیا تو اگر کوئی بزرگ ہو' ہو بے چارہ ضعیف النفس۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دباؤ سے کلام بدل دے۔ تو جبرئیل علیہ السلام میں بھی ممکن ہے ضعف ہو' جو ایسے کلام کو بدل دیں۔

اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّۃٍ طاقتور ہے دبّو قسم کا آدمی نہیں کہ کسی کے دباؤ ڈالنے سے بدل دے۔ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طاقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی قوم کی جب بستیاں الٹیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ارشاد فرمایا۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے ساری بستیاں اٹھا کر آسمان پہ لے جا کے پٹخ دیں تو اتنا طاقتور کسی سے دب کر غلط بات کہہ سکتا ہے؟ کون اس کے اوپر دباؤ ڈال سکتا ہے؟ تو فرمایا گیا کہ رسول بھی ہے' بزرگ بھی ہے' کریم النفس بھی ہے اور طاقت ور بھی ہے۔ دبّو قسم کا آدمی نہیں ہے کہ دباؤ ڈالنے سے کسی کی بات مان لے یا بات کو بدل دے۔

لیکن اس پر بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی' کریم النفس بھی سہی اور طاقتور بھی سہی' مگر سننے میں بھی تو غلطی ہو سکتی ہے۔ دور سے آواز آرہی ہے معلوم نہیں کیا سن لیا ہو؟ کہا کچھ تھا اور سننے میں آگیا کچھ ___ کوئی پاس قریب ہو تو بے شک یہ ممکن نہیں ہے کہ غلطی ہو مگر ایک شخص نے دور سے سنا ہے تو کتنا ہی نیک نیت ہو۔ سماعت میں فرق آسکتا ہے' کچھ کا کچھ سن لے؟

اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ کہ مقام عرش کے پاس مقیم ہے کہیں دور نہیں ہے۔ اس لئے ممکن نہیں ہے کہ سماعت میں غلطی ہو ___ وہیں تو اس کا مقام ہے۔ وہ تو ہمارے ہاں کا حاضر باش ہے۔ جو ہم کہتے ہیں بلاواسطہ وہ سنتا ہے۔ ممکن نہیں کہ غلطی کرے تو اتنے اوصاف بیان فرمادئے۔

اس کے بعد یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ کہیں کہ صاحب! بے شک رسول بھی ہے' کریم النفس بھی ہے' طاقت ور بھی ہے' عرش کے پاس مقیم بھی ہے۔ لیکن پوزیشن کچھ چھوٹی قسم کی ہے لوگ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ کوئی باحیثیت ہو کوئی منصب اور مقام اس کے پاس ہو تب تو بات قابل اعتبار ہوتی' ایک بات کہہ دے ایرا غیرا' نتھو خیرا' تو اس کی کیا وقعت ہوگی؟ ___ کوئی پوزیشن' منصب اور حیثیت ہونی چاہئے۔

تو ایک جملہ اور بڑھایا کہ مُطَاعٍ سیّد الملائکہ ہیں' سارے ملائکہ (سلام اللہ علیہم) کے سردار ہیں۔ تو جو سارے معصوموں کے سردار ہوں اور ان کے اوپر انہیں والی بنایا گیا ہو۔ ان کی عصمت میں کیا کمی رہ سکتی

ہے؟ جو سارے فرشتوں کے مخدوم و مطاع ہوں ان کے کلام میں غلطی کیسے ممکن ہے؟ تو رسول بھی ہے' کریم النفس بھی ہے' طاقتور بھی ہے' عرش والے کے پاس مقیم بھی ہے' سننے میں بھی غلطی نہیں ہے اور مطاع و سید الملائکہ بھی ہیں۔

لیکن اس کے بعد پھر ایک شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ سارے اوصاف سہی۔ مگر نسیان بھول چوک ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ممکن ہے بھول کے کچھ کا کچھ کہہ دیا ہو یا ارادۃً کچھ کمی بیشی کر دی ہو کہ بھئی وقت کے مناسب یہ ہے لہٰذا اسکی یہ تاویل کردو' زمانہ حال کے لوگ ہیں' پرانے زمانے کے لوگوں کے محاوروں کو سمجھیں گے نہیں' کوئی محاورہ ہی بدل دو۔ تو آگے ایک اور جملہ بڑھایا کہ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔ وہ نہایت امانتدار ہے ممکن نہیں کہ لب و لہجے میں بھی کوئی فرق کرے۔ ممکن نہیں ہے کہ الفاظ میں فرق کرے یا معانی میں فرق کرے۔

اب یہ سارے اوصاف ظاہر ہے کہ راویوں کے ہیں تو حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجبور ہو کر دب کر مانو کہ یہ قرآن ہے بلکہ بصیرت سے اسے قبول کرو کہ اس کے راوی کیسے ہیں؟ سند میں تو کوئی غلطی نہیں؟

پیغام رسانی میں جھوٹ اہلِ کفر بھی عیب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ اہلِ ایمان؟

سند میں کوئی غلطی ممکن نہیں۔ اول تو یہ ہمارا قاصد ہے جو کہ خود معتمد علیہ ہونے کی دلیل ہے پھر اپنی ذات سے بزرگ اور کریم النفس بھی ہے تو کریم النفس لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے یہ تو کمال ایمان کی بات ہے ___ میں تو کہتا ہوں کفار بھی اپنی حیثیت عرفی سنبھالنے کے لئے اس کی رعایت کرتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں چاہے دنیا داری کے مجمع میں ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام جب عظیم بصرہ کے نام پہنچا ہے تو ہرقل نے کہا کہ عرب کے کچھ لوگ آئے ہوں تو ان کو ذرا جمع کرو ___ میں ان کے حالات پوچھوں جنہوں نے دعویٰ نبوت کیا ہے۔ تو اس کے سامنے عربوں کا وفد پیش ہوا اس وفد کی قیادت ابو سفیان کر رہے تھے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے انہیں آگے کھڑا کیا۔ باقی جو عرب تھے انہیں پیچھے کھڑا کیا گیا اور کہا کہ میں تمہارے قائد سے سوال کروں گا اگر یہ صحیح کہے گا تو تم سب کی طرف سے صحیح تسلیم ہو گا۔ اگر غلط کہے تو تم لوگ ٹوک دینا۔

ابو سفیان سے ہرقل نے چند سوالات کئے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کبھی اس (مدعیٔ نبوت) شخص کا تم پر جھوٹ ثابت ہوا؟ کبھی عمر بھر میں کوئی غلط بات کہی ہو؟ اگر کبھی ایک جھوٹ بھی ثابت ہو تو یہ کہہ سکیں گے کہ دعویٰ نبوت میں وہ غلط ہے۔

تو ابو سفیان کہتے ہیں کہ اب مجھے شش و پنج ہوئی اس لئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے تو تھے نہیں ہو سکتا تھا کہ دور کا فاصلہ ہے۔ شام میں بات چیت ہو رہی ہے کوئی غلط بات منسوب کر دیتے کہ ہاں صاحب فلاں بات غلط ثابت ہوئی لیکن انہوں نے کہا اگر میں نے ایک جھوٹ بول دیا تو میری حیثیت عرفی ہے وہ ختم ہو جائے گی' اس لئے مجھے سچ بولنا چاہئے ___ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے کبھی جھوٹ کے اوپر تجربہ نہیں کیا۔ گنجائش اتنی نکلی کہ اکثر کی تو بات یہی ہے باقی میرے آنے کے بعد جھوٹ بول دیا ہو تو یہ الگ بات ہے اس کے سوا کوئی جملہ نہیں کہہ سکے۔ تو ابو سفیان کفر کے باوجود اس کی رعایت ان کے ذہن میں تھی کہ کوئی جھوٹ کا کلمہ نہ نکلے ورنہ میری حیثیت عرفی بگڑ جائے گی۔ تو ایک کافر جب پیغام رسانی میں جھوٹ بولنے کو عیب سمجھتا ہے۔ تو ایک مؤمن کیسے عیب نہیں سمجھے گا اور مؤمن بھی فرشتہ جو ایمان کی حدِ کمال کے اوپر ہو وہ

کیسے جھوٹ بولے گا؟ وہ کیسے امانت میں خیانت کرے گا؟ تو حق تعالیٰ نے دباؤ نہیں ڈالا کہ چونکہ ہم بھیجتے ہیں لہٰذا ماننا پڑے گا۔ نہیں بلکہ جسے بھیج رہے ہیں اس کے احوال کو دیکھو' اس کے اوصاف کو دیکھو۔ وہ اوصاف پر پورا اترتا بھی ہے کہ نہیں ___ تو اللہ تعالیٰ تو بے عیب ہے۔ منبع کمال ہے وہاں تو غلطی کا امکان ہی نہیں ___ بیچ میں امکان تھا تو فرشتے کے اوصاف بیان کئے کہ وہ راوی غلط نہیں ہو سکتا۔

کلام اللہ کو تین امانتوں نے گھیر رکھا ہے

اب تیسری ذات وہ ہے جس پر کلام اترا' وہ پیغمبر ہیں۔ پیغمبر حضرت خاتم النبیین (صلّی اللہ علیہ وسلم) کہ سارے انبیاء کے کمالات کا نچوڑ اور سارے کمالات کا منتہٰی ہیں۔ کوئی کمال ایسا باقی نہیں ہے کہ کسی نبی کو لا کر اسے پورا کرایا جائے۔ ایک نبی میں وہ سارے کمالات جمع کردیئے گئے اور قیامت تک ایک ہی آفتاب کی روشنی باقی رہے گی۔ ان پر وہ کلام اترے ___ تو نبی معصوم' فرشتہ معصوم' اور حق تعالیٰ منبع کمالات۔ تو مروی عنہ جس سے روایت چلی وہ بے عیب' فرشتہ جو کلام لے کر آیا وہ بھی معصوم و امانت دار اور جس پیغمبر پہ لے کر آیا وہ سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ___ ان کی عظمت میں کلام نہیں اور اللہ کے ناموں میں ایک نام امین ہے تو **اللہ الامین** کی طرف سے کلام اترا اور جبرئیل کا لقب بھی امین ہے' کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امین کہتے ہیں تو امین نے کلام کیا' امین لے کر آیا' امین کے اوپر اترا' تین (اعلیٰ درجے کی) امانتوں میں اوپر سے نیچے تک گھرا ہوا ہے۔ پھر اس میں غلطی کا احتمال کیا ہے؟ پھر بھی اگر آدمی نہ مانے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ نے کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا۔ اوصاف بیان کردیئے ہیں کہ ان اوصاف کا راوی غلط تو نہیں ہو سکتا' اس لئے ماننا چاہئے۔ آدمی کے دل میں انصاف ہو تو مانے گا۔

سندِ کلام اللہ میں ذاتِ نبوّت کا مقام

اب آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے تو آپ کے اوصاف شروع کئے' یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ نبی ہیں' مان لو۔ بے شک اگر نبی کہہ کر منواتے تو ماننا پڑتا۔ کیونکہ نبی کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ جھوٹ سے بَری اور بالا ہو' مگر آپ کے بھی اوصاف بیان کئے فرمایا **وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ** یہ جن پر کلام اترا ہے کوئی جنونی تھوڑا ہی ہیں۔ یہ تو خود سرچشمۂ عقل ہیں جنون کی نفی کردی۔

اب رہا عقلمند کیوں نہ کہدیا بجائے اس کے کہ جنون کی نفی کردی جائے' یوں کہہ دیا جاتا کہ آپ بہت بڑے عقل مند ہیں یہ نہیں فرمایا۔

اس لئے کہ عقل مند کہنے سے شبہ ہوتا آیا فلسفیوں میں سے کوئی فلسفی ہیں؟ جب کہ نبی اور فلسفی میں بونِ بعید ہے عقل مند ثابت کرنے کے معنی یہ تھے کہ آپ کو فلسفی ثابت کیا جائے اور نبوّت و فلسفہ میں بُعد ہے۔ اس لئے جنون کی نفی کردی کہ کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں۔ باقی یہ ہے **علی سبیل التنزّل** جب کسی بڑے آدمی کا کلام منوایا کرتے ہیں جس کے سب اوصاف مسلّم ہوں تو یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کام کرنے والا کوئی دیوانہ تھوڑا ہی ہے اس کی بات ماننا کیوں نہیں؟ تو جنون کی نفی درحقیقت ساری برائیوں کی نفی ہے۔ تو آپ کی یہی شان بیان فرمائی کہ :

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ

اب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے جو روایت سنی ہے وہ سنی بھی ہے یا محض

بخیل سے معاذ اللہ کچھ کہہ دیا ہے؟

تو فرمایا کہ صرف سنی نہیں ہے بلکہ راوی کو دیکھا بھی ہے وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ سماع ہی نہیں دیدار بھی ثابت ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آپ نے اصلی صورت میں بھی دیکھا ہے تو اب جب راوی کو دیکھا بھی ہو اس کی بات سنی بھی ہو اور پاس بیٹھ کر سنی ہو سنانے والا بھی امین سننے والا بھی امین بھیجنے والا بھی امین و امانتوں میں گھرا ہوا کلام اور صاحب کمالات راوی اور مروی عنہ تو اب خطا کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے اب خواہ مخواہ عناد سے کوئی انکار کرے تو کرے لیکن اصول کی رو سے انکار جائز نہیں ہے تو جبرئیل کو دیکھا بھی ہے ان سے کلام بھی سنا ہے۔ تو سماع و دیدار کے ساتھ روایت کر رہے ہیں۔

اب یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ بات تو ساری سچی سنی اور واقعی پورا کلام لے لیا مگر آگے کہنے میں ذرا بخل ہے کہ کوئی ہر ایک کو میں اپنا علم کیوں دوں؟ بہت سے صاحب کمال ہوتے ہیں کہ فن آتا ہے مگر سکھلاتے نہیں کہ نہیں دوسرا میرا ہمسر نہ ہو جائے۔ میں ہی تنہا اور یکتا رہوں۔ ہزاروں آدمی اپنے اپنے کمالات کو قبر میں لے گئے اور دنیا میں ان کا نشان بھی نہیں۔ بڑے بڑے اطبا بہترین نسخے اپنے سینے میں رکھ کر لے گئے۔ کسی کو نہیں بتلائے۔ تو گویا صاحبِ فن نے بخل برتا۔ ممکن ہے یہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہو؟

تو فرمایا گیا وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ غیب کی چیزیں پہنچانے میں وہ بخیل نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ غیب چیزوں کو آگے پہنچایا جائے تاکہ ہر چیز کی تمہیں ہدایت دے۔

اب یہ ممکن تھا کہ کوئی یوں کہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درست سنا مگر ہو سکتا تھا کہ شیطان نے بیچ میں کوئی کلمہ ملا دیا ہو تو وہ خلط ملط ہو گیا ہو؟

آگے اس کی بھی نفی فرمادی کہ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ شیطان کا کیا دخل؟ جب قرآن کی وحی خداوندی چلنی شروع ہوئی تو شیطان کے راستے بند کر دیئے گئے تھے۔

شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک جاتے تھے۔ ملائکہ کی کبھی کبھار کوئی بات سن کر اس میں سو جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو پیش کر دیتے تھے۔ کوئی ایک آدھ بات سچی بھی نکل آتی۔ لوگ معتقد ہو جاتے تھے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ شیطان آسمان پر اس طرح جاتے تھے اور کچھ سچ جھوٹ ملا کے دعویٰ کیا کرتے تھے لیکن ان کے راستے بند کر دیئے گئے کہ اب تک تو آسمانوں کے دروازوں سے چڑھتے تھے اب چڑھ بھی نہیں سکتے خلط ملط تو وہ کیا کرتے؟ تو شیطان کا دخل بھی نہیں ہے اور کلام بھی امین کا ہے اور امین بھی ایسا کہ کلام کے پہنچانے میں بخیل بھی نہیں بلکہ پہنچانے کا حکم ہے بلغوا عنّی ولو اٰیۃ ایک جملہ، ایک بات ایک آیت بھی میں کہہ دوں تو دوسروں تک پہنچادو، بخل مت کرو اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وسیع ارشاد فرمائیں اس میں صاف واضح طور پر فرمایا کہ فلیبلّغ الشاہد الغائب جو حاضر ہے وہ غائبین کو یہ پیغام پہنچادے تو صحابہؓ نے اس کا اہتمام کیا۔ ایک ایک روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تک آئی تو بہرحال قرآن پاک کی سند کا ایک باطنی درجہ ہے کہ وہ اللہ سے چلی فرشتہ پر آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی وہ بے عیب اور بے غبار ہے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح پہنچائیں۔ امت کو آپ نے پہنچایا اور انتہائی امانت و سخاوت سے پہنچایا کہ ایک ایک لفظ، زبر، زیر حتی کہ صوت اور آواز تک پہنچادی۔ صحابہؓ نے اسی اہتمام سے تابعین کو پہنچایا۔ تابعین نے اسی اہتمام سے تبع تابعین کو پہنچایا انہوں نے اپنے اتباع کو پہنچایا۔ یہاں تک کہ ہم تک پہنچ گیا ___ تو خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن میں تواتر طبقہ ہے ایک ایک آدمی روایت نہیں کرتا۔ ہر زمانے میں لاکھوں آدمی روایت کرتے آرہے ہیں اور محض روایت نہیں بلکہ ان کے

سینوں میں محفوظ ہے اور صرف سینوں میں محفوظ نہیں بلکہ وہ قرآن کے ساتھ حمائل بنے ہوئے ہیں کہ جو ذوق قرآن کا ہے وہ اہل علم نے اپنا ذوق بنالیا ہے' تو قرآن کا ذوق بھی پیدا کیا ___ اس لئے کھوٹ کی' غلطی کی' خیانت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سندِ قرآن پر قانوناً بھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا

تین چار آدمی مل کر اگر کوئی بات کہیں تو ہم قانوناً ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے اور یہ لاکھوں کروڑوں ہر زمانے میں جو قرآن پڑھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو وہ تو سینوں میں محفوظ ہے اور حفاظت کا یہ حال ہے کہ اس کی سورتیں گنی ہوئی ہیں۔ نہ زیادتی ممکن نہ کمی ممکن۔ کلمات اور آیات بھی اس کی گنی ہوئی کہ قرآن میں کتنی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں کے حروف الگ گنے ہوئے ہیں کہ اتنے حروف ہیں۔ کل آیتوں کے اعراب تک گنی ہوئے ہیں کہ اتنے زبر' اتنے زیر' اتنے پیش اتنے جزم اس حفاظت کے ساتھ کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر کمی بیشی ہو یا کوئی جرأت کرے کہ ایک آدھ لفظ بڑھادے یا اس میں سے گھٹا دے' کوئی ایک آدھ ہی ایسا احمق اور بے وقوف ہوگا جو تبدیلی کرے مگر امت اسے نہیں مانے گی اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔

جیسے وہ ایک صاحب کاتب تھے ان کی عادت تھی کہ جو چیز ان سے نقل کروائی جائے اس میں اپنی طرف سے کچھ گھٹاتے ضرور تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ فلاں کاتب کو (کوئی مسودہ وغیرہ) مت دینا وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دیتا ہے ___ تو قرآن شریف انہیں لکھنے کو دیا گیا کہ بھئی اس کی نقل کردو اور یہ کہہ دیا گیا کہ دیکھو یہ اللہ کا کلام ہے اس میں کمی بیشی ممکن نہیں۔ کوئی لفظ گھٹانا بڑھانا نہیں۔ اگر تم نے گھٹایا بڑھایا تو تم جہنمی بن جاؤ گے۔ قرآن غلط نہیں ہوگا پھر صحیح ہو جائے گا اور تمہاری عاقبت خراب ہو جائے گی۔ وہ کہنے لگے صاحب! یہ کلام خداوندی ہے اس میں کمی بیشی کیسے کر سکتا ہوں یہ تو لوگوں کے کلام میں اپنی مرضی سے کچھ گھٹا بڑھا دیتا ہوں۔ خیر انہوں نے لکھا' لکھ کر لائے تو بہت خوش قلم۔ پوچھا کہ بھئی گھٹایا بڑھایا تو نہیں۔ کہا نہیں بالکل نہیں۔ بھلا خدا کا کلام ہے اس میں کیسے زیادتی کمی کر سکتا ہوں۔ ہاں تھوڑی سی کمی بیشی میں نے کردی ہے وہ یہ کہ قرآن کے اندر کہیں فرعون کا نام' کہیں ہامان کا نام' کہیں قارون کا نام۔ یہ نام کیسے؟ یہ بڑے بڑے فساق۔ بھلا قرآن اور اس میں کافروں کا ذکر ___ ؟ میں نے ان کے نام مٹا کے کہیں آپ کا نام کہیں آپ کے والد ماجد کا نام لکھدیا اور کہیں آپ کے دادا کا نام۔ بس اتنا تو کیا اور کچھ نہیں۔ تو ایسا کوئی احمق ہو تو کچھ گھٹا بڑھادے وہ اپنی عاقبت خراب کرتا ہے کوئی مانتا نہیں ہے۔ ہزاروں پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے تحریف کرنی چاہی ہوگی۔ مگر وہ مٹ چکے ہیں ان کا نام ونشان تک نہیں۔ قرآن اسی طرح اپنی جگہ ہے۔

حدیث ازروئے قرآن محفوظ ہے

حدیث کے انکار کرنے والے بہت سے پیدا ہوئے۔ پہلے وضّاعین (احادیث کو وضع کرنے والے) پیدا ہوئے۔ انہوں نے گھڑ گھڑ کے حدیثیں ملائیں تاکہ اصل حدیث پر سے اعتماد اٹھ جائے' محدّثین کرام کو اللہ جزائے خیر دے انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا اور ایسے اصول وضع کردیئے' ایسے کانٹے ہاتھ میں دے دیئے کہ ممکن نہیں غلط روایت صحیح حدیث میں مل جائے' کانٹے سے پہچان سکتے ہیں' تو قرآن بھی محفوظ' حدیث بھی محفوظ اور اللہ نے اس کا وعدہ دے دیا ہے ایک تو یہ فرمایا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا

لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم نے قرآن اتارا ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ حدیث بھی محفوظ ہے۔ کیونکہ وحی جب اترتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے جلدی جلدی رٹنا شروع کرتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ رہ جائے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دو، جلدی مت کرو۔ یہ جو آپ کو خطرہ ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں تو اس کا وعدہ دیا کہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ یہ ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کے سینے میں جمع بھی کردیں گے، پڑھوا بھی دیں گے، آپ اس کی فکر نہ کریں آپ سنتے رہیں فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ جب ہم (بواسطۂ فرشتہ روح الامین) قرأۃ کیا کریں، آپ سنتے رہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کے قلب مبارک میں جمع کردیں۔ کوئی غلطی ممکن نہیں اور نہ صرف جمع کردیں گے بلکہ آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے، اسی طرح سے ادا بھی کرادیں گے ___ تو قرآن ظاہر بات ہے کہ اپنے لفظوں کے لحاظ سے محفوظ ہو گیا۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ سے اللہ نے گارنٹی دے دی، جَمْعَهٗ ___ کے لفظ سے یہی مراد ہے کہ جمع بھی کردیں گے۔ تو جمع تو لفظ ہی کئے جاتے ہیں وَقُرْاٰنَهٗ اور پڑھوا بھی دیں گے تو لفظ ہی پڑھے جاتے ہیں۔ معنیٰ پڑھے نہیں جاتے۔ تو لفظوں کے جمع ہونے کی گارنٹی دی اور یہ کہ آپ کی زبان سے ادا بھی کرادیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں جمع بھی کردیں گے۔

اب رہ گئے آگے معانی ___ کہ اس کا مطلب کیا؟ اس سے مراد کیا؟ اس کی بھی گارنٹی دی۔ فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کردینا بھی ہے کہ مراد کیا ہے؟ اور مطلب کیا ہے؟ ___ اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی۔ اس کے معانی کی ذمہ داری بھی حق تعالیٰ نے لی تو لاکھ کوئی تحریفِ معنوی کرے، جاہلانہ تاویلات کرے لیکن وہ چلنے والی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی حفاظت شامل حال ہے ___ حدیث میں فرمایا گیا ہے یحمل هذا العلم من كل خلف الخ آپ نے وعدہ دیا کہ امت کے اندر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، وہ کیا کریں گے؟ وہ علمِ خداوندی اور جو آیت و روایت ان تک پہنچی ہیں ان میں غلو کرنے والوں کے غلو کا پردہ چاک کردیں گے کہ یہ معنیٰ محبت و عداوت اور غلو کی وجہ سے لئے گئے ہیں، باطل پسندوں اور باطل پرستوں کی جو دروغ باطنیاں ہیں انہیں وہ کھول کر رکھدیں گے۔ وہ عیاں ہو کر دنیا کے آگے آجائیں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے معانی میں خلط ملط کردیں۔ لوگ جاہلانہ تاویلات کتنی کریں لیکن پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا، لفظوں اور معانی دونوں میں کوئی تحریف ممکن نہیں۔ دونوں کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے۔

تو قرآن کریم کا ایک وصف تو ثابت ہوا کہ وہ معجزہ ہے اس کی کوئی نظیر نہیں لاسکتا اس کی کوئی مثل نہیں بنا سکتا، وہ جامعیت کوئی پیدا نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ وہ جامعیت علم سے متعلق ہے اور بندے کا علم جامع تو کیا ہوگا، پورا علم بھی نہیں ___

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ لوگ اس کے علم کو نہیں لاسکتے مگر وہ جتنا چاہے دے دے اتنا لے لیں گے تو اول تو وہ علم عطائی اور پھر وہ بھی قلیل۔

سب سے زیادہ علم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ آپ اَعْلَمُ الخلائق ہیں اَعلَمُ البشر ہیں۔ دنیا میں علم کے اندر آپ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ لیکن آپ خود فرماتے ہیں کہ اللہ کے علم کے سامنے میرے علم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اتھاہ سمندر کے کنارے پر ایک چڑیا چونچ ڈالے اور اس کو کچھ تری لگ جائے وہ نسبت ہے میرے علم کو اللہ کے علم سے، تو جب علم خداوندی کے سامنے اعلم الخلائق کے علم کا یہ حال ہے تو

میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ تو جس کا علم اتنا جامع ہو گا اس کا کلام معجزہ ہی ہو گا' دوسرے کا کلام معجزہ نہیں ہو سکتا کہ اس جیسا کلام لاسکے۔ تو پہلی چیز تو یہ ثابت ہوئی کہ وہ معجزہ ہے۔

قرآن دلیلِ ختمِ نبوّت بھی ہے

دوسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ وہ فطرۃً محفوظ ہے۔ کیونکہ کلام وہی ہے۔ دوسری کتابیں کلام نہیں اور کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹ نہیں سکتا۔ وہ جوّ کے اوپر حاوی ہے' خلا کے اندر محفوظ ہے تو محفوظ ہونا بھی معجزہ ہے دنیا کی کسی قوم کے ہاتھ میں کسی پیغمبر کا کوئی معجزہ موجود نہیں ہے۔ ایک امتِ اسلامیہ ہے جس کے ہاتھ میں معجزہ موجود ہے اور معجزہ نبوّت کی دلیل ہوتی ہے۔ معجزہ سے ہی پہچانا جاتا ہے کہ یہ نبی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دو ٹکڑے کردیئے تو پہچانا گیا کہ آپ پیغمبر ہیں۔ جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہوا دنیا وہ کام نہیں کرسکتی۔ ہزاروں معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے تو معجزہ دلیل نبوّت ہوتی ہے جس سے نبی کو پہچانا جاتا ہے لیکن پچھلے انبیاء علیہم السلام کو جتنے معجزات دیئے گئے اس سے ہزاروں گنا زائد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے مگر وہ عملی معجزات تھے اور عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب عامل دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہوجاتا ہے تو پچھلے انبیاء کرام کو معجزات عملی دیئے گئے تھے تو جب وہ دنیا سے پردہ کرکے چلے گئے ان کے معجزات بھی ختم ہوگئے تو نبوّت کی دلیل باقی نہ رہی ___ عصاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کی دلیل تھی۔ آج نہ عصاء موسیٰ موجود ہے نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت۔ عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ ان کی نبوّت کی یہ دلیل تھی۔ آج نہ مسیح علیہ السلام ہیں نہ احیاء موتیٰ موجود' دلیل نبوّت موجود نہیں۔ یوسف علیہ السلام نے قمیص بھجوادی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دو' بینائی واپس آجائے گی۔ آج نہ قمیص یوسف ہے نہ حضرت بینا ہوسکتے ہیں گویا وہ معجزہ موجود نہیں جو ان کی نبوّت کی دلیل تھی۔ جتنے معجزات تھے وہ سب انبیاء کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ کیونکہ وہ عملی تھے اور عامل کے جانے سے عمل ختم ہوجاتا ہے لیکن اگر علم ہے تو عالم کے دنیا سے اٹھنے سے اس کا علم ختم نہیں ہوتا۔ ہزاروں علماء چلے گئے مگر ان کا علم محفوظ ہے اپنے علم کے پردے میں آج بھی وہ علماء زندہ موجود ہیں۔ ان کے علم کی دلیل موجود ہے کیونکہ ان کا علم کتابوں میں مدوّن ہے ___ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں ہزاروں عملی معجزات دیئے گئے سب سے بڑا معجزہ کلامی ہے جو قرآن مجید ہے اور اس کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی ___ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی دلیل بھی دنیا میں موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی طرف دنیا کو دعوت جاسکتی ہے اس لئے کہ نبوّت کی دلیل موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کی طرف نہیں بلایا جاسکتا اس لئے کہ ہمارے سامنے کوئی دلیل نہیں ہے' سب معجزات ختم ہوچکے' لیکن خاتم النّبیّن صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ اور نبوّت کی دلیل یہ معجزۂ قرآنی ہے یہ محفوظ ہے اور بحفاظت خداوندی محفوظ ہے تو دعوت بھی محفوظ ہے۔ آج اگر دعوت دی جائے گی تو قرآن کی طرف دی جائے گی' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی طرف دی جائے گی۔ اسلامی شریعت کی طرف دی جائے گی کیونکہ اس کی دلیل موجود ہے اگر کوئی شبہ کرے گا۔ اعتراض پیش کرے گا۔ قرآن نے سب چیزوں کی کفالت دی ہے دلائل موجود ہیں ہر شبہ کو رفع کیا' ہر اعتراض کا جواب اس میں موجود ہے۔ ہر مفسدہ کی اصلاح کی ہے گویا مکمل طور پر "شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُور" ہے۔

حجت وبرہان سے مسلمانوں میں اختلاف ڈالنا ممکن نہیں

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے مقابلے کئے' تیغ وسنان سے مقابلے کئے' جنگیں لڑیں۔ مشرکین کو کھڑا کیا مگر غالب نہیں آئے' مسلمانوں سے نہ صرف تیغ وسنان سے مقابلے کئے بلکہ حجت وبرہان سے بھی مقابلہ کیا تو قرآنی حجتوں کے مقابلے میں کوئی حجت نہیں پیش کر سکے عاجز آگئے ___ اخیر میں پھر نفاق کا طرز اختیار کیا کہ مسلم بن کر مسلمانوں میں نفاق پھیلاؤ۔ یہ تدبیر ان کی البتہ کارگر ہوتی۔ پھر دو پارٹیاں بن گئیں اور مسلمانوں کی جو وحدت تھی وہ پارہ پارہ ہو گئی۔ تو منافق بن کر مسلمانوں میں نفاق ڈالا جا سکتا ہے لیکن حجت و برہان اور دلیل کی رو سے کوئی چاہے کہ اختلاف ڈلوا دے' یہ ممکن نہیں ہے۔ حجت قوی موجود ہے۔ ہر باطل دلیل رد کی جاسکتی ہے۔ دلیل وبرہان سے مختلف قوموں نے مقابلے کیئے مگر عاجز آئیں۔ نہیں چل سکیں۔ تب یہ حربہ اختیار کیا کہ مسلمانوں میں کوئی بھی حجت و برہان سے عاجز نہیں ہو گا۔ دنیا کی اقوام کیوں نہ جمع ہو جائیں آج بھی ایک دس کی نسبت ہے بلکہ ایک آتا ہے تو سو کو سبق دیتا ہے' آج تک یہ چیز موجود ہے ___ تو تیغ وسنان سے مقابلہ کیا مگر نفاق کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ منافقین کے بارے کہا گیا ہے کہ اس امت میں بہت سے منافق ہوں گے جو واقع میں ایمان نہیں رکھتے ہوں گے دعوئی ایمان کا کریں گے۔ جیسے واقع میں نبوت ناممکن ہے مگر اس امت میں تیس دجال کذاب ہوں گے جو نبوت کا دعوی کریں گے۔ تو نفاق سے ممکن ہے پارٹی بنادی جائے' مگر حقائق اور حجت و برہان سے نہیں ہو سکتی تو قرآن کریم معجزہ بھی ہے۔ دلیلِ نبوت بھی ہے' کلام خداوندی بھی ہے جو اٹل اور محفوظ ہے تو اعجازی کلام خود معجزہ دلیل نبوت ہے اس لئے قیامت تک اس کی دعوت جاری رہے گی اور محفوظ بھی ہے کہ حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ بچوں کے ذریعے' بوڑھوں کے ذریعے حفاظت کرائی۔ امت میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے کہ بچوں کو تو خیر حفظ کرایا خود بڑھاپے میں حفظ کیا۔

حضرت نانوتویؒ کا حفظِ قرآن کا واقعہ

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے جب پہلا حج کیا تو کراچی کے راستہ سے کیا تھا' اس زمانے میں اسٹیمر نہیں تھی' بادبانی جہاز تھے ___ بادبان باندھ دیا گیا تو کشتی چل رہی ہے ہوا جب مخالف چلی لنگر ڈال دیئے' جس سے کشتی کھڑی ہو جاتی تھی۔ پانچ پانچ چھ چھ مہینے میں جدہ پہنچتے تھے' تو حضرت بھی بادبانی جہاز میں سوار ہوئے اور رمضان شریف آگیا' گویا شعبان میں چلے تھے' کشتی کے اندر رمضان آگیا اور اتفاق سے کوئی حافظ نہیں۔ تراویح الٓمّٓ تَرَ کَیْفَ سے ہوئی تو حضرت کو بڑی غیرت آئی کہ اڑھائی تین سو آدمی جہاز میں موجود اور تراویح میں قرآن کریم نہ سنایا جائے ایک بھی حافظ نہیں بس الٓمّٓ تَرَ کَیْفَ سے سورتیں یاد ہیں' اسی دن قرآن یاد کرنے بیٹھے' روز ایک سپارہ حفظ کرتے' رات کو تراویح میں سنا دیتے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ اس طرح سے محفوظ ہو جانا کہ بوڑھے بوڑھے بھی اس کو یاد کرلیں اور ذہن کے اندر اتر جائے' یہ بھی معجزہ ہے' آپ کسی کتاب کو جو لمبی چوڑی کتاب ہو' دلچسپی بھی ہو کوئی پانچ سو ہزار کا ناول ہو' بیس دفعہ بھی رٹیں گے تو نہ اس کے الفاظ یاد ہیں نہ اس کے معانی۔ قصے کہانیاں بھی یاد نہیں رہیں گے' روز کا مشاہدہ ہے ___ قرآن یاد کرتے ہیں تو سینوں میں اترتا جاتا ہے یہ بھی معجزہ ہے یہ اس کے اندر طاقت ہے کہ وہ قلوب میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عین فطرت کے مطابق ہے فطری چیزوں کو فطرت خود

جذب کرتی ہے۔ تو قرآن کریم جب پہنچتا ہے تو فطرتیں قبول کر لیتی ہیں چاہے شعور بھی نہ ہو تب بھی محفوظ ہو جاتا ہے تو امت میں تو لاکھوں بلکہ کروڑوں اربوں پیدا ہوں گے' حافظ ہوں گے اور ہوئے' بعد میں جوان ہو کر حافظ رہے' بوڑھے بوڑھوں نے بھی قرآن یاد کیا۔

حضرت مدنیؒ کے حفظِ قرآن کا واقعہ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو انگریزوں نے سن ۴۲ء ہجری میں گرفتار کیا تو جیل میں کوئی اور مشغلہ نہیں تھا۔ قرآن کریم یاد کرنا شروع کر دیا اور تقریباً دو ثلث یاد کیا اور روزانہ سے تراویح میں پڑھا کرتے تھے تو مولانا مرحوم کی عمر ستر پچھتر سال کی تھی اور اس عمر میں یادداشت کمزور ہو جاتی ہے مگر یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے جو اس کی طرف متوجہ ہو وہ خود اس کے قلب کے اندر آجاتا ہے۔ خود بے اعتنائی کرے تو وہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔

قرآن بے اعتنائی سے جاتا رہتا ہے

حدیث میں قرآن کو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ رسیاں باندھ باندھ کے رکھدو گے تو چلے گا' ذرا ڈھیل دو گے تو وہ تمہارے پاس سے چلا جائے گا اس لئے غنی کا کلام ہے۔ محتاج تم ہو تمہیں ہزار دفعہ اس کی ضرورت پڑے تو پڑے' وہ محتاج نہیں کہ خواہ مخواہ تمہاری طرف آئے اگر ذرا تم نے ڈھیل کی تو تمہارے سے نکل جائے گا تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے اس میں خود غناء موجود ہے۔ ہم محنت کریں یہ اس کا فضل ہے کہ وہ ہمارے اندر آجاتا ہے اور پیوست ہو جاتا ہے۔ جزء نفس بن جاتا ہے اور بے دلی کریں تو بھاگ جاتا ہے تو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی۔

بہرحال اس کے اندر احکام بھی ہیں' معانی بھی ہیں' معارف بھی ہیں' عِلَل بھی ہیں۔ یہ اسی اعجاز کا اثر ہے کہ یہ امت پوری کی پوری محافظ قرآن بن گئی۔

کثرتِ تصنیف امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے

قرآن کا یہ اعجاز بھی ہے کہ امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اتنی تصانیف دنیا کی کسی امت میں نہیں ہوئیں جتنی اس میں ہیں۔ ملکوں میں کتب خانے بھرے پڑے تھے اور ہر کتاب کو دیکھو وہ قرآن کی کسی ایک آیت کی تشریح اور تفسیر ہے۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں۔ مصر کے کتب خانوں کو دیکھو سو برس سے مصری حکومت چھاپتے چھاپتے عاجز ہو گئی مگر مصر شہر کی کتابوں کا عشر عشیر بھی ابھی نہیں چھپ سکا۔

تاتار نے جب مسلمانوں پر قبضہ کیا اور بغداد کی خلافت کو تہ وبالا کیا ہے' تو مسلمانوں نے پل توڑ دیا تھا تاکہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے۔ تو صرف ایک کتب خانہ جو دریا کے قریب تھا۔ تاتاریوں نے اس پر قبضہ کیا اور اس کی کتابیں دریا میں ڈال کر پار تک اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ تین گاڑی برابر گذاری جا سکتی تھیں اور روشنائی جو گھلی ہے تو ایک مہینہ تک دجلہ کا پانی سیاہ چلتا رہا ___ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء کو دوات میں روشنائی ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دجلہ کا پانی دوات میں بھرتے تھے اس سے قلم چلتا تھا۔ اتنی سیاہی پھیل گئی

تھی- یہ ایک کتب خانے کا حال ہے کہ جس سے تاتاریوں نے پل بنادیا اور ایسے ہزاروں کتُب خانے بغداد میں موجود تھے۔

اندلس کے اتنے کتُب خانے تھے کہ جب مسمانون کا قبضہ اٹھا اور پھر عیسائیوں نے قبضہ کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کے لٹریچر کو تباہ کرو' جب تک یہ لٹریچر باقی ہے۔ ان میں روح ایمان باقی رہے گی تو عیسائی حکومت نے مستقلاً ارادہ کیا کے مسلمانوں کے کتُب خانے تباہ کئے جائیں اس کے لئے ایک عملہ بنایا گیا جو سارے کتُب خانوں کو آگ لگادے' جلادے' تلف کردے' اس کا ایک انچارج آفیسر مقرر کیا۔ تو لکھتے ہیں پچاس برس میں اندلس کے کتُب خانے کہیں مٹ سکے ہیں۔ حکومت نے زور لگاکے پورے پچاس برس میں جاکے اندلس کے کتُب خانوں کو ختم کیا ہے۔ یہ صرف قرآن کے طفیل تھا۔ ہر ایک کتاب کسی آیت کی شرح تھی ہر کتاب کسی آیت کی تفسیر تھی تو کثرتِ تصنیف اس امّت کی خاصیت ہے۔ اس کی تصنیف کو دیکھ کر دنیا کی امّتیں آج مصنّف بنی ہیں ورنہ اگر وہ اپنی ذات سے مصنف تھیں تو تورات اور انجیل کے شباب کے زمانے میں کتنی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ زبور کے شباب کے زمانے میں کتنے کتُب خانے بھرے گئے' کوئی نشان نہیں۔ یہ قرآن ہی کے زمانے میں کیوں مصنّف بنے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہی طفیل ہے' مسلمانوں کے مواعظ' ان کی تقریریں' ان کی شعلہ بیانی غیر شعوری طور پر اقوام (عالم) میں اثر کرتی رہی۔ ان میں اتنی طاقت پیدا کی۔ اس لئے آج وہ مصنّف بنے اور تصنیفیں کیں اور امّتِ محمّدیہ (علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کے مصنّف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کو کتُب خانوں سے بھر دیا۔

قرآن کو چھوڑنے کا نتیجہ اعجازی قوت سے محرومی

تو قرآن کریم کلامی معجزہ ہے اس کے اعجازی اثرات ظاہر ہو رہے ہیں اور معجزہ ہی نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی بہت سے معجزات اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ آج امّت کے اندر اس تیرہ سو برس میں بہت سے اکابر پیدا ہوئے۔ ہر طبقے میں اہل علم پیدا ہوئے صوفیاء میں دیکھو تو جُنیدؒ و شبلیؒ اور سری سقطیؒ وغیرہ۔ ہزارہا اہلِ تصوّف گزرے ہیں ___ محدّثین میں دیکھو تو امام بخاریؒ و مسلمؒ اور اسی طرح سے کتنے محدث گذرے ہیں ___ فقہاء میں دیکھو تو امام ابو حنیفہؒ شافعیؒ مالکؒ احمد بن حنبلؒ کتنے ائمہ گزرے ہیں۔ متکلمین میں دیکھو تو کتنے ائمہ گزرے ہیں۔ ہر فن کے اندر اہلِ علم اور اہلِ کمال پیدا ہوئے اور ان کے ذریعے سے علماء کے کمالات ظاہر ہوئے۔ وہ علوم لاکے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آگئیں۔ یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ لوگوں کے اندر اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہوں گے۔ امّت کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ اسی کی طرف لوٹیں گے تبھی جاکر امّت کی شوکت بازیاب ہوگی تو قرآن کریم محفوظ اور معصوم ہے اور حق تعالیٰ نے اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی صوُرتیں

جہاں تک الفاظ کا تعلّق ہے تو حُفّاظ کا طبقہ کھڑا ہو گیا' اس نے الفاظ کو محفوظ کیا' ہر دَور میں لاکھوں حافظ تھے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے' علماء کا طبقہ کھڑا ہو گیا' اس کے معانی کو محفوظ کیا اور کتابیں لکھیں۔ کتابوں سے لاکھوں کتُب خانے بھر دیئے۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے صوفیاء کرام کا طبقہ کھڑا ہو گیا انہوں نے وہ حقائق اور معارف بیان کئے۔ دنیا ان کے معارف کو دیکھ کر حیران ہوئی گویا ایک مستقل طبقے نے اس کے

معارف کی حفاظت کی قرآن کریم کے رسم الخط کے لئے بھی ایک مستقل طبقہ علماءِ رسم الخط کھڑا ہو گیا کہ ایک ہی طریقے سے قرآن لکھا جائے دوسرے طریقے سے نہیں۔

مثلاً رَحْمٰن کا لفظ ہے۔ رحمٰن کا لفظ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ میم کے ساتھ الف ملاؤ اور نون الگ لکھو (جیسے رحمان) لیکن قرآنی رسم الخط یہ کہ میم کے ساتھ نون ملا کے اوپر کھڑا زبر لکھے۔ (جیسے رحمٰن) تو اس کے خلاف لکھنا جائز نہیں وہی لکھنا پڑے گا ___ تو علماءِ رسم الخط کھڑے ہو گئے جنہوں نے قرآنی رسم الخط کی حفاظت کی ___ اب اس کا طرزِ ادا تھا' تو قراء اور مجوّدین کو اللہ نے کھڑا کر دیا کہ اسی لب و لہجے کو جس انداز سے عرب پڑھتے ہیں' وہی انداز اختیار کرو تو انہوں نے تصحیحِ مخارج' اداءِ کلمات حتیٰ کہ صوت تک محفوظ کرنے کی کوشش کی کہ عجمی انداز سے قرآن کو نہ پڑھا جائے' مزامیر کے انداز سے نہ پڑھا جائے بلکہ اسی انداز سے پڑھا جائے جس انداز سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا' صحابہ کرامؓ نے پڑھا' تابعین نے پڑھا اور آج تک پڑھتا چلا آ رہا ہے بلحون العرب فرمایا گیا۔ نیز فرمایا گیا کہ زینوا القراٰن باصواتھم فان صوت الحسنۃ یزید القراٰن حسنا خوش آمیزی اور درد آمیز آواز سے قرآن پڑھو' اس سے قرآن کا حسن بڑھتا ہے۔

قرآن سے غیر مسلم بھی متأثر ہوتے ہیں

یہ واقعہ ہے کہ اگر صحیح انداز پر صحیح دردِ دل سے پڑھنے والا ہو کفار تک متأثر ہوتے ہیں' جو سمجھتے تک نہیں کہ معنی کیا ہیں۔

اس انقلاب سے پہلے انڈیا میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس کے صدر تھے تو مولانا محمد علی (مرحوم) فطرۃً جری تھے اور ان میں بہادری کی ایک شان تھی لاکھ دو لاکھ آدمی کا مجمع تھا تو مولانا نے کھڑے ہو کر کہا کہ جلسہ کی ابتدا قرآن شریف سے ہو گی تو لوگوں نے کہا صاحب! سیاسی جلسہ وہ بھی کانگریس کا۔ ہندو مسلم سب جمع ہیں یہاں قرآن کا کیا کام؟ ___ اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو پنڈت کہیں گے کہ ہم بھی آشوب پڑھیں گے۔ پادری صاحب کہیں گے کہ میں بھی انجیل پڑھوں گا۔ یہودی کوئی کھڑا ہو گا تو کہے گا میں بھی تورات پڑھوں گا' فرمانے لگے سب کو اجازت دوں گا کہ سب پڑھیں مگر ابتدا قرآن کریم سے ہو گی وہ سب چپکے ہو گئے۔ قاری ابراہیم رشید عرب تھے۔ مولانا نے انہیں آواز دی' انہیں بلایا۔ حیدر آباد میں جو جامع مسجد جس کا نام "مکہ مسجد" ہے اس کے وہ خطیب تھے تو اول تو عرب پھر بڑے جہوری الصّوت' بڑے خوش آواز عربی انداز سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ آپ پڑھو۔ قاری ابراہیم صاحب نے سورۃ الصّف کے دونوں رکوع کی کوئی آدھ گھنٹہ سے زیادہ میں تلاوت کی۔ وہ تلاوت کر رہے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا لوگوں کے سروں کے اوپر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں حس و حرکت ہی نہیں ___ بہت سے غیر مسلم ہندو ان کے بھی آنکھوں سے آنسو جاری۔ سمجھتے کچھ نہیں تھے مگر آنسو جاری تھے تو قرآن کریم صحیح طور پر کوئی پڑھنے والا ہو' مجوّد ہو' اچھی تجوید سے پڑھے تو کفار تک متأثر ہوتے ہیں' مؤمن کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ ___ تو قرآن کریم کی طرزِ ادا کے لئے بھی مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا۔ جس کا نام مجوّدین اور قراء ہے وہ اسی انداز سے آج تک چل رہے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمیں حضرت قاری سراج احمد صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ اللہ نے ان کے ذریعے دار العلوم الاسلامیہ کو قائم کیا اور سینکڑوں قاری پیدا ہوئے۔ اس مدرسہ کے قائم ہونے سے پہلے پنجاب بہت

دفعہ میری حاضری ہوئی۔ تو امام (مسجدوں میں) کچھ صحیح نہیں تھے بس پنجابی انداز میں قرآن کریم پڑھتے تھے ' وہی لب ولہجہ تھا۔ تو اس میں وہ لطف نہیں ہوتا تھا' لیکن اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد دیکھا جگہ جگہ مدارس میں بہترین قاری پیدا ہونے لگے ہر جگہ عمدہ قرأت والے موجود گویا ایک فیض عام ہو گیا اور قاری عبدالمالک صاحب کا بالآخر فیضان عام ہوا۔ ہندوستان میں بھی ان کا فیضان عام تھا اور یہاں آکر بھی ان کا فیضان عام ہوا۔ آج پاکستان میں سینکڑوں قرّاء موجود ہیں ___ بلکہ قرأت کے مقابلے ہونے لگے کہ کون زیادہ اعلیٰ درجے کا پڑھتا ہے اور بین الاقوامی مقابلوں میں بھی یہاں کے قرّاء جانے لگے اور یہاں سے باہر جا کر وہ اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوئے۔ یہ انہی مدارس کا طفیل ہے ___ ہمیں حضرت قاری صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے ایک مینار قائم کیا کہ آج سینکڑوں قاری اور مجوّد پیدا ہوگئے اور آپ نے یہ جو پچاس ساٹھ آدمیوں میں سندیں تقسیم کیں۔ یہ قاری ہو کر نکلے۔ تو ایک ایک آدمی اگر دس دس کو بھی تیار کرے تو پانچ سو ہزار آدمی انہی سے تیار ہو جائے گا۔ دیئے سے دیا یوں ہی جلتا رہے گا تو قرآن کا فیضان الفاظ کا الگ ہے 'لب ولہجے کا الگ ہے' معانی کا الگ ہے' حقائق کا الگ ہے' تفسیرات کا الگ ہے' حکمتوں کا الگ ہے اور ہر پہلو کی حفاظت کے لئے اللہ نے ایک طبقہ کھڑا کر دیا اسی کو فرمایا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ کہ ہم نے ہی قرآن اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے تو انہوں نے جو قرآن اتارا ہے تو فقط مضمون نہیں اتارا الفاظ بھی اتارے ہیں اور لفظ ہی نہیں بلکہ آواز بھی اتری ہے۔

محافظین قرآن خلفائے خداوندی ہیں

حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ایسی آواز سنتا ہوں کہ کانھا صلصلۃ علی صفوان جیسے چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچو تو اس سے ایک جھنجھناہٹ اور گونج کی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس قسم کی آواز سنتا ہوں' اس سے پھر الفاظ بنتے ہیں اس سے پھر معانی القاء ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن میں صوت کا بھی دخل ہے فقط لفظ ہی نہیں کہ قلب کے اوپر آگئے' بلکہ سنائے گئے اور جب سنائے جائیں گے تو بہرحال لب ولہجہ بھی ہوگا اس لب ولہجے کی حفاظت کے لئے اللہ نے مستقل طبقہ کھڑا کر دیا۔ وہ مجوّدین کا طبقہ ہے۔ تو حقیقت میں یہ خلفائے خداوندی ہیں۔ اصل پڑھنے والے حق تعالیٰ ہیں' تلاوت کرنے والے وہ ہیں۔ حافظِ قرآن وہ ہیں۔ قرآن میں خود فرمایا گیا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ہم نے اتارا ہم ہی حافظ ہیں تو اپنے کو حافظ کہا نیز فرمایا نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی وَفِرۡعَوۡنَ اے پیغمبر ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کی تلاوت کرتے ہیں تو معلوم ہوا اصل میں تلاوت کنندہ حق تعالیٰ ہیں اور فرمایا فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ اے پیغمبر! جب ہم قرأت کریں تو سنتے رہا کریں۔ معلوم ہوا کہ قاری بھی حق تعالیٰ ہیں' تو قاری بھی وہ' تلاوت کنندہ بھی وہ' حافظ بھی وہ' یہ اس کا فضل ہے کہ جو حفظ کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ آج سے جو لقب ہمارا تھا تمہارا بھی ہے ___ کوئی قرأت سیکھ لیتا ہے تو فرماتے ہیں کہ قاری تو ہم ہیں۔ لیکن آج سے ہم نے اپنا لقب تجھے دے دیا۔ اسی طرح تلاوت کرنے والے ہم ہیں مگر جب تم تلاوت کر رہے ہو تو تم بھی یہ لقب استعمال کر سکتے ہو۔

محافظین قرآن کے سرکاری اَلقاب اور ان کی عظمت

تو سرکاری اَلقاب آپ کو دے دیئے' خود حافظ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حافظ کہا' خود تالی تھے

آپ کو بھی تالی کہا' خود قادری تھے آپ کو بھی قاری کہا' یہ اس کا فضل ہے کہ اپنے اَلقاب بندے کو عطا کردیئے ورنہ بندوں کے الفاظ ممتاز ہوتے ہیں۔ مثلاً پریزیڈنٹ یا صدر جمہوریہ یا وزیر اعظم اگر کوئی دعوٰے کرنے لگے کہ میں وزیر اعظم ہوں مقدّمہ قائم ہوجائے گا کہ تو کدھر سے وزیر اعظم ہے؟ تجھے قانون کی رو سے لفظ بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ کوئی کہے کہ میں صدر جمہوریہ ہوں تو مقدّمہ قائم ہوجائے گا کہ صدر جمہوریہ ایک ہی تو ہے تو کدھر سے ہوگیا؟ تو سرکاری اَلقاب کوئی اختیار نہیں کرسکتا جب تک سرکار ہی لقب یا خطاب نہ دے دے' پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ لقب تو اپنے سرکاری ہیں اور تمہیں دے دیئے گئے کہ جب تم اس مقام پر پہنچو تو تم بھی حافظ' تم بھی قاری' تم بھی تالی۔ تم سب کو وہ لقب دیں گے یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے جنتوں میں پہنچ کر ہر جنّتی کو اَلقاب دیئے جائیں گے جو اللہ ہی کے نام سے ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنت والوں کو نشاط میں لانے کے لئے حق تعالیٰ خط وکتابت کریں گے' ملائکہ خطوط لے کر آئیں گے' جس میں مزاج پرسی' حالات کا پوچھنا اور حالات کا بتلانا بھی ہوگا۔

اگر کسی کے پاس وزیر اعظم کا خط پہنچ جائے تو اپنی پوزیشن بڑھانے کے لئے اخبارات میں چھاپے گا کہ میرے نام وزیر اعظم کا خط آیا ہے' پریزیڈنٹ کا خط آئے تو اخبارات میں چھاپ دے گا تاکہ میری عزت دوبالا ہو کہ پریزیڈنٹ نے مجھے خط لکھا ہے اگر قدیم زمانے کے بادشاہی فرامین کسی کے گھر میں ہوں تو وہ آج تک فخراً کہتا ہے کہ میرے خاندان میں شاہی فرمان چلا آرہا ہے۔ ان کا خط موجود ہے' تو بادشاہوں کے یہ خطوط آئیں تو فخر کا یہ عالم ہے اور اللہ میاں کا خط آئے تو فخر ومباہات کی کیا انتہا ہوگی؟ ___ اور اس نشاط کی کیا انتہا ہوگی' جو اہل جنت محسوس کریں گے' تو حق تعالیٰ خطوط بھیجیں گے' ملائکہ (علیہم السلام) چھٹی رساں کے طور پر خطوط لے کر آئیں گے۔ ان خطوط پہ لفافے کے الفاظ کیا لکھے ہوں گے؟ لکھا ہوگا کہ **من العزیز الرحیم الی العزیز الرحیم** عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے تو عزیز رحیم اللہ کا لقب ہے اور اہل جنت کو دیدیں گے مگر یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھنے والے کو دنیا میں ہی لقب دیدیں گے جو ان کا اپنا لقب ہے کہ ہم حافظ تو تم بھی حافظ' ہم قاری تو تم بھی قاری' ہم تالی (تلاوت کنندہ) تو تم بھی تالی تو حقیقت میں مجوّدین خلفائے خداوندی ہیں ان کو خلافت عطا کی گئی ہے' کسی کو علم کی خلافت ملی' کسی کو اخلاق کی خلافت ملی انہیں کلام خداوندی کی خلافت ملی کہ اللہ متکلم ہیں تو یہ بھی متکلم۔ تو اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوسکتا ہے؟

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اپنے بچے کو قرآن حفظ کرائے گا تو قیامت کے اوّلین و آخرین کے مجمع میں اس باپ کو تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے کل عالَمِ محشر منوّر ہوجائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن یاد کرایا اور کلامِ خداوندی کو اس کے سینے میں ڈالا گویا اس کی تاج پوشی ہوگی۔

دنیا میں کسی بادشاہ کی تاج پوشی ہوتی ہے تو اہل شہر جمع ہوجاتے ہیں معزّزین شہر اکٹھے ہوتے ہیں۔ بہت سے بہت صوبے کے افراد ہوتے ہیں اور بہت تو ہوئے تو ملک کے افراد اور اگر بہت ہی بڑا بادشاہ ہے تو بین الاقوامی طور پر وہ دعوت دے گا کہ تاج پوشی کا اعزاز ہے آپ سب آجائیں۔ تو دوسرے ممالک کے سربراہ بھی شریک ہوں گے بڑا جلسہ ہوگا لیکن ایک ہی زمانے میں ہوگا اور قیامت میں وہاں اوّلین و آخرین' آدم علیہ السلام کی ساری اولاد' اتنا بڑا جلسہ ہوگا کہ دنیا ___ میں تو ممکن ہی نہیں تو ساری اولاد آدم ہوگی اور تاج پہنانے والے حق تعالیٰ ہیں۔ اس باپ کو تاج پہنائیں گے جس نے اپنے بچے کو حفظ کرایا تھا۔ جس کی روشنی سے پورا عالَم محشر منوّر ہوگا گویا کہ بتلایا جائے گا کہ اس نے دنیا میں قرآن کی روشنی پھیلائی تو تاج وہ دیا جارہا

ہے جس کی روشنی پورے عالم محشر میں پھیلے گی تو دنیا میں یہ خلفائے خداوندی ہیں اور آخرت میں یہ تاج پوش
دشاہ بنیں گے جس کو حفظ کرا دیا اس سے زیادہ ان کی فضیلت اور ان کی بڑائی کیا ہو سکتی ہے؟
اور حفظ کرنے والے جب کہ ادا بھی صحیح ہو اور
ی لَب و لہجے سے ہو جو عربوں کا لب ولہجہ ہے پڑھیں تو اس سے قرآن کریم کا زیادہ حسن بڑھ جاتا ہے۔ **فان**
صوت الحسنۃ یزید القران حسنا تو بہر حال ہمارے قاری صاحب اور قاری صاحب نے جن مجوّدین کو
لکھا' وہ مجوِّدین' اس کی اعانت کرنے والے تمام معاونین اور انتظام کرنے والے سارے منتظمین' وہ سب
بارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی محنتوں کا نچوڑ آج ان کے سامنے آیا ہے جن بچوں پر ان حضرات نے محنت
ں آج وہ قابل بن کر اور مجوِّد بن کر آپ کے سامنے آئے اب وہ تجوید و قرآن کو دنیا میں پھیلائیں گے تو نور
بیلے گا اور روشنی پھیلے گی' یہی ذریعۂ ہدایت بنے گی۔

دین و دنیا کی ترقی کا داعی قرآن کریم

امام مالکؒ کا مقولہ ہے کہ **لایصلح اخر ھذہ الامۃ الابما صلح بہ اولھا** اس امت کے اول طبقے
ں اصلاح جس چیز سے ہوئی تھی' اسی سے اس امت کے آخری طبقے کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے ــــــ اور وہ
ہے قرآن۔ صحابہؓ کے کتب خانے میں قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں تھی اسی نے ان کی اصلاح کی' اسی سے وہ
نیچے بھی ہوئے اور بالا بھی' آج بھی مسلمان اگر بالا ہونا چاہتے ہیں تو اسی کو پکڑیں' اس کے پکڑنے والے کو
ک یوں سمجھتے ہیں کہ "ملّاں" بن جائیں گے۔ ترقی کے سارے راستے بند ہو جائیں گے' یہ محض ایک مہمل
یال ہے۔ ترقی کا داعی تو قرآن کریم ہی ہے۔ اس نے دین اور دنیا دونوں سکھلائے' اس نے علم و کمال کے
اتھ شوکت دنیا' حکومتیں قائم کرنا' نظام مملکت چلانا بھی سکھایا' قوتِ عسکری بھی قائم کی۔ جا بجا احکام ہیں کہ
لمان عسکری قوت پیدا کریں' مسلمان سپاہی بنیں' مسلمان عالم بنیں اور علم اور معرفت کے ساتھ سپاہیانہ
ندگی' سیاسی زندگی' شوکت کی زندگی' اقتدار کی زندگی بھی سکھلائی ــــــ تو یہ غلط خیال ہے کہ قرآن کریم
ھیں گے تو ترقی سے رہ جائیں گے اصل ترقی تو یہی ہے نیز دیکھا جائے تو اصل حکومت اللہ کی ہے اس لئے
صل حکومت قرآن کی ہے۔ یہ قانون فطری ہے اس کی حکومت ہوگی تو فطرت کے مطابق ہوگی' اس کے
اف ہوگی تو وہ غیر فطری ہوگی اور اس میں نقصانات' فسادات اور ہنگامے پیدا ہوں گے' اس لئے جتنا اس کی
ومت کو رائج کیا جائے رائج کرنے والے بھی خدا کے ہاں محترم بنیں گے' جو اس قانون کو لائیں گے ان کی
مت بھی اس دنیا میں بڑھ جائے گی اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے تو قرآن کریم تنزّل نہیں سکھلاتا'
ی نہیں سکھلاتا بلکہ ترفّع بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ جب تک یہ ہوا قلوب میں بھری رہی مسلمان بلند
لا رہے' جب یہ نکل گئی مسلمان پست ہو گئے' بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی
تی ہے تو اگر آپ اسے زمین پر دے کر ماریں تو دس گز اوپر کو اُچھلے گی' اوپر کو جائے گی نیچے نہیں پہنچ جائے
' اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے وہ نیچے نہیں ٹکنے دے گی' اور اگر سوئی گھسا کے ہوا نکال دو' تو جہاں ڈال
کے پُھس سے پڑی رہ جائے گی' پھر اس میں اٹھنے کی سکت نہیں تو قرآن کریم نے جو ہوا اور شوکت بھری تھی
ب تک بھری رہی اقوام نے ان کو دبانا چاہا' زمین پر پٹخنا چاہا جتنا پٹختے گئے' مسلمان اتنا ہی اوپر کو اٹھے' نہ صرف
اٹھے بلکہ دنیا کو بلند کر دیا۔ لیکن جب ہوا نکال دی کسی نے سوئی مار دی وہیں پُھس سے ہو کے رہ گئے۔ تو
لمان دنیا کی اصلاح کے لئے آیا ہے اور اصلاح جبھی کرے گا جب اصلاحیت ان کے اندر رچی ہوئی ہو یہ

بھکھکا بن کر نہیں آیا دنیا کی اقوام سے بھیک مانگے کہ ہمیں تمدّن کی بھیک دے دو، معاشرت اور رہن سہن کی بھیک دے دو' یہ دنیا کو سچا رہن سہن سکھلانے کے لئے آیا ہے' تو مسلمان سائل نہیں بلکہ معطی ہے اگر یہ دنیا سے تمدّن و معاشرت کی بھیک مانگے تو یہ اپنی توہین کرتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس معاشرت کو جو فطری ہے اس سیاست کو جو فطری ہے دنیا کے اوپر لاگو کرے' دنیا کو اس کی طرف لائے' نہ یہ کہ اس کے آگے پست ہو جائے۔ تو وہ حکمران واقعی عزّت کے مستحق ہیں' جو قرآن کو آگے رکھیں یوں کہیں کہ ہم اسلام کو چلانا چاہتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت کو چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ مبارک باد کے بھی مستحق ہیں اور سب کا فرض ہے کہ ان کا احترام کریں اس لئے کہ اصل احترام اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے۔ اس سے جو تمسّک کرے گا وہ بھی قابلِ احترام بن جائے گا۔

اختتام

بہر حال اس مدرسہ نے بحمد اللہ اس بیس پچیس سال کے اندر جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ثمرہ ہے کہ آج اتنے لوگ جمع ہیں اور قرآن کریم کے پروانے ہیں اور اس کے نمونے سامنے آرہے ہیں تو حق تعالیٰ بانی کو بھی اور منتظمین کو بھی اور معاونین کو بھی جزائے خیر نصیب فرمائے۔

تو میں ان بچوں کے لئے مبارک باد پیش کرنے بیٹھا تھا۔ یہ میرے اور آپ کے بچے ہیں' ان الفاظ سے میری مبارکباد پیش ہے۔ حق تعالیٰ اس مدرسہ کو قائم دائم رکھے اور پاکستان نیز باہر کے لوگوں کو اس سے منوّر فرمادے۔ آمین ان الفاظ پر میں ختم کرتا ہوں۔

اور ایک درخواست آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں امید ہے کہ قبول کی جائے گی۔ "بیان" جو ہوا تو بہر حال آپ نے توجّہ سے سنا اور میں معمولی طالب علم کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ جو طالب علمانہ باتیں آئیں آپ نے بہر حال سنیں۔ اب اخیر میں درخواست یہ ہے کہ اس عرض معروض سے بہر حال آپ کے اور ہمارے قلوب مِل گئے ہیں۔ ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔ قلوب مِل گئے ہیں اس لئے مصافحہ کی تکلیف نہ فرمادیں میں اپنے ضُعف کی وجہ سے اس کا تحمّل نہیں کرپاتا۔ اس لئے کہ آپ تو ایک دفعہ ہاتھ مِلائیں گے تو مجھے بیس ہزار دفعہ ہاتھ مِلانا پڑے گا' میرے اندر اتنی طاقت نہیں' اس واسطے مصافحے کی تکلیف گوارا نہ فرمادیں۔ بس دعائے خیر سے یاد رکھیں یہ ہمارے لئے کافی ہے اب جلسہ کی بقیہ کارروائی ان شاء اللہ پوری ہوگی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

راہنمائے انقلاب ﷺ

صحابہ کرامؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا، دل بدل گئے، روح بدل گئی، جذبات بدل گئے۔ پھر جہاں بھی یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کردیا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے۔ خیر تخت اُلٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کرلیا۔ قیصر کا ملک فتح ہو گیا، رُومی ماتحت بن گئے، کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا، ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی گئے۔ ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا، زبان بدل دی۔ ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ آج آپ "ممالکِ عربیہ" کہتے ہیں مصر کو، شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور بولی بولی جاتی تھی عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہؓ کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے، مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی، مصر میں پہنچے، مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہو گئی، تمدن تک بدل دیا، تہذیب تک بدل دی تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہؓ میں کہاں سے آئی؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی۔ صحابہؓ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے، اسی کو دستور العمل بنایا تو عالم کی کایا پلٹ دی۔ (از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ. فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ. وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ـ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

احوالِ واقعی

بزرگانِ محترم!

آپ حضرات نے قرآن کریم کا ترجمہ شروع کر کے ایک بہت ہی بڑی سعادت حاصل کی ہے اور بہت بڑا اِقدام کیا ہے۔ اس کی برکات دنیا میں اور آخرت میں کھلے طور پر انشا اللہ نمایاں ہوں گی' اگر آپ نے اس کو پابندی سے اختیار کیا اور اس کو اِستقامت کے ساتھ آگے بڑھایا۔

کلام' آثارِ متکلم کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہے

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور ظاہر بات ہے کہ ہر کلام میں اَثر ہوتا ہے۔ جیسا متکلّم ہوتا ہے ویسے ہی آثار اس کے کلام میں نمایاں ہوتے ہیں اور قرآن حکیم در حقیقت نمایاں کرتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات کو' اس کی صفات کو' اس کے کمالات کو' اس کے افعال کو ___ جو شخص خیال کرتا ہو کہ میں اللہ کو آنکھوں سے دیکھ لوں تو وہ دل کی آنکھوں سے قرآن کریم کی تلاوت کرے تو حق تعالیٰ نظر آجائیں گے۔

مقصودِ عبادات

کون سا ایسا بندہ ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی تمنّا نہیں ہے۔ ساری عبادتیں ہی اس لئے کرتے ہیں کہ اس کو دیکھ لیں۔

اور یہ کوئی محض طبعی تمنّا نہیں ہے بلکہ شرعی تمنّا بھی ہے یعنی شریعت نے بھی یہی ہدایت کی ہے' فرمایا ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

"اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ صورت نہیں تو کم اَز کم یہ یقین رکھو کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے"۔

یہ جو دیکھنے کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے کہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ تمنّا ہر شخص کے دل میں ہے۔ نماز کے ذریعے دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نظر ہوتی ہے چٹائی کے اوپر اور حقیقت میں نظر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے چہرے کے اوپر لیکن آج نمازی کو محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ میں اللہ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں' مگر جب قلب میں جُمتے جُمتے اَخیر وقت آئے گا اور عمر اس تصوّر میں گزر جائے گی تو اَچانک وہ جَلوۂ نگاہ کے سامنے آجائے گا جس کی تمنّا میں آدمی عبادت کیا کرتا تھا تو عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو جائے۔ تو اس حدیث میں اس کی تدبیر بتلائی گئی کہ دل میں تصوّر یہ باندھے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ ہے میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت ہوتی ہے نماز میں' اس سے حق تعالیٰ شانہٗ کے اوصاف و کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے جہانوں کا' جو رحمان و رحیم ہے۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ جس میں سارے اوّلین و آخرین جمع ہوں گے ___ آج بھی اس کی حکومت ہے مگر اس روز اس کی حکومت نمایاں ہو جائے گی سارے بنی آدم کے اوپر۔

تو حق تعالیٰ شانہٗ کو دیکھنے کی مشق کرتے رہنے سے جب عمر بھر یہ تصوّر بنے گا تو ایک نہ ایک دن وہ چیز سامنے آجائے گی جسے دل میں جما رکھتا تھا۔ یہ ایک انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کا وہ تصوّر دل میں جمالیتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے

اسی طرح سے جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے حق تعالیٰ کا دھیان دل میں جمائیں گے' وہ جم جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ جس چیز کو دل میں جمایا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ دنیا کی چیزیں چالیس دن بعد آجائیں گی' سو دن بعد آجائیں گی۔ لیکن چونکہ یہ اعلیٰ ترین جمال ہے۔ اس لئے اس میں پوری عمر چاہئے اگر پوری عمر تصوّر جمائے تو پھر وہ شئے سامنے آجائے گی اور جمالِ خداوندی نمایاں ہو جائے گا۔

اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ جس کو یہ شوق ہو کہ میں حق تعالیٰ کی زیارت کروں اس کا طریق یہی ہے کہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے ہر ہر حرف پر اس کا دھیان جمائے اور جما کر اس کو دل میں راسخ کرلے تو دنیا میں بھی جلوے نمایاں ہوں گے اور آخرت میں بھی دیدار ہو جائے گا۔ تو آپ نے بہت بڑا اِقدام کیا ہے اور بڑی سعادت کا اِقدام ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

دُستورِ حیات

اگر ترجمہ سَرسری طور پر سُنا جائے تو ثواب تو ملے گا ہی لیکن اس دھیان سے ترجمہ ہو کہ میرے اللہ نے کیا کہا ہے' یہ کیا دستورُ العمل ہے۔ جس پر میں چلوں تو ایک تو ہے محض معنیٰ سمجھ لینا ایک ہے اس معنیٰ کو دستورُ العمل بنانا کہ اس پر مجھے چلنا ہے چونکہ قرآن کریم قانون کی کتاب ہے اور قانونِ محض اس لئے نہیں پڑھایا جاتا کہ آدمی اس کو رَٹ لے' اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے اَحکام اور اس کی پالیسیاں معلوم ہوں تاکہ جرائم سے بچے اور صحیح طور پر چلے قانون کے اوپر۔ تو اللہ نے اپنا کلام نازل فرمایا مگر محض تلاوت کے لئے نہیں کہ اس کو رٹ لیا جائے۔ یہ تو ابتدائی درجہ ہے اصل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں کیا کہا جارہا ہے۔؟ یہ کلام کیوں ہے؟ اس میں خطاب کیا ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گزارنی ہے یہ میرا دستورُ العمل ہے اس نیّت اور قصد سے اور اس عزم سے جب آپ پڑھیں گے تو کیفیات کچھ اور ہوں گی تو اس لئے :

میں نے عرض کیا کہ ایک بہت بڑی سعادت کی بات آپ نے کی ہے کہ ترجمہ شروع کیا ہے۔

الفاظِ قرآن کمالاتِ خُداوندی کے مظہر ہیں

قرآن کریم کے بارے میں حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

تبرّکْ بالقرآن فانّہٗ کلام اللّٰہ وخرج منہ۔

"برکت حاصل کرو اس کلامِ خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔

کلام جو ہوتا ہے وہ متکلم کے اندر سے نکل کر سامنے آتا ہے وہ اس کے جذبات ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ میں کوئی ہنسی کی بات کہوں تو آپ ہنس پڑیں گے۔ یہ لفظوں کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ اس جذبہ کا اثر ہے جو میرے قلب میں موجود ہے کہ میں آپ کو ہنساؤں۔ لفظوں کو تو آڑ بنایا ہے۔ اگر جی چاہا کہ آپ کو رلایا جائے تو ایسا کلام کیا جائے کہ آنکھوں سے آنسوں ٹپک پڑیں تو وہ لفظوں کا محض اثر نہیں وہ ان جذبات کا اثر ہوتا ہے جن کا بولنے والے نے قصد کیا ہے آپ نے لفظوں کو آڑ بنایا۔

اور جذبات اپنے پیوست کردیئے قلب کے اندر کہ رو پڑا آدمی۔ پھر آپ کے دل میں جذبہ آیا کہ فلاں کو خوش کردوں اور ہنسادوں تو کچھ ایسے بول بولے کہ خواہ مخواہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا۔ وہ محض لفظ نہیں ہیں بلکہ وہ اندر کے جذبات ہیں، جنہوں نے الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے دل میں اثر ڈالا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم کے الفاظ نازل فرمائے ان الفاظ میں وہ کمالات چھپے ہوئے ہیں جو بولنے والے کے اندر تھے، وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں ان الفاظ کے ذریعہ۔ دنیا میں کوئی بھی جذبہ بغیر لفظوں کے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے لفظوں کو بیچ میں لانا لازمی ہے اور ان ہی الفاظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کھپایا ہے اپنے کمالات کو اور ان ہی الفاظ کے ذریعہ ان کمالات کو بندوں تک پہنچایا ہے اور ان کے دل میں اُتارا ہے ان کمالات کو اپنے دل میں حاصل کرنے کی نیت سے اگر آپ تلاوت کریں گے اور دھیان اس پر دیں گے کہ کیا کہا جارہا ہے اور میرے دل میں کمالات کس طرح اُتر رہے ہیں تو پھر اور ہی شان ہوگی۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

تبرّکْ بالقرآن فانّہٗ کلام اللّٰہ وخرج منہ۔

"برکت حاصل کرو اس قرآن سے یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکلا ہے"۔

بولنے والا جو بولتا ہے وہ اندر سے بولتا ہے لفظ آڑ ہوتے ہیں۔

یہ جو فرمایا ہے خرج منہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جس نے کلام اللہ سے اپنا پورا علاقہ قائم کرلیا ہے اس نے اللہ کے باطن سے علاقہ قائم کرلیا ہے اور جب وہ باطن سامنے آئے گا تو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ بندہ جُڑ چکا ہے حق تعالیٰ کے باطن سے 'اس کے کمالات سے۔

تو قرآن کریم ایک تبرک ہے اور جتنی بھی علم میں چیزیں ہیں وہ سب تبرکات ہیں اللہ کے۔ یہ زمین بھی اللہ کا تبرک اور عطیہ ہے جس سے ہم کام چلاتے ہیں۔ یہ آسمان اور چاند سورج بھی اللہ کے تبرکات ہیں جن سے ہم فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن آسمان وزمین چاند سورج یہ اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ہی ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ پردۂ عدم سے وجود میں آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر نہیں آئیں۔ مگر قرآن اندر سے نکل کر آیا ہے۔ یہ تو کلام ہے اس لئے قرآن سے تعلق 'اللہ تعالیٰ کے باطن سے تعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رسّی اور اس کے تھامنے کا طریق کار

آپ کو اوپر کھینچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک رسّی لٹکا دی ہے جس کے ذریعے آپ کو کھینچ لیا جائے گا۔ شیخ

محی الدین ابنِ عربی بہت بڑے صوفیاءِ دین ہیں اور بہت بلند درجہ اکابر اولیاء میں سے ہیں وہ کہتے ہیں، صرف ان کا اپنا دعویٰ نہیں، قرآن وحدیث سے بھی یہی نکلتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک جتنا علاقہ ہے یہ جہنم کا علاقہ ہے اسی میں قیامت کے دن آگ اور تکلیف دہ چیزیں نمایاں ہونگی تو اب یوں سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ہم سب جہنم میں موجود ہیں۔ حق تعالیٰ نے اوپر سے ایک رسّی لٹکائی کہ جسے نکلنا ہو وہ اس رسّی کو پکڑ لے جب ہم اس رسّی کو کھینچیں گے وہ بھی کھنچ کر ہمارے پاس آجائے گا اور اس علاقہ سے نکل جائے گا۔

یہ رسّی در حقیقت قرآن کریم ہے۔ اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے :

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا ___ بِحَبْلِ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدِ

"اللہ کی رسّی کو سب مضبوط تھام لو ___ یہ لٹکائی ہوئی رسّی ہے جو عرش سے لٹکائی گئی ہے اور زمین پر آئی ہوئی ہے"۔

جب وہ رسّی کھنچ کر اوپر جائے گی تو جنہوں نے اس رسّی کو تھام رکھا ہے وہ بھی اس علاقۂ جہنم سے کھنچ کر اوپر کو چلے جائیں گے۔ تو کفّار کو جہنم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی وہ تو ہیں ہی جہنم میں۔ مؤمن کو بھاگ نکلنے کی ضرورت ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ رسّی کو مضبوط تھام لے جب رسّی کھینچی جائے گی یہ بھی کھنچ کر اس علاقۂ جہنم سے نکل جائے گا۔

اب ظاہریات ہے کہ رسّی کوئی سَن کی بٹی ہوئی تو ہے نہیں اور ریشم کی نہیں کہ اس کو ہاتھ سے تھاما جاسکے۔ یہ تو علوم وکمالات کی رسّی ہے جس کے تھامنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ دل سے ایمان لاکر اسے دل میں جمائے۔ یہ ہاتھ سے پکڑنے کی چیز نہیں دل سے پکڑنے کی چیز ہے ___ جس نے اس رسّی کو دل کے ہاتھوں سے تھام لیا وہ بٹ گیا اللہ تعالیٰ کی رسّی میں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ وہ بھی کھنچ کر اللہ تعالیٰ کے باطن تک پہنچ جائے گا۔ یعنی اس کے ساتھ مربوط ہوجائے گا۔

عظمت ومحبّت کا تقاضا

آدمی کسی کو دُور سے بھی دیکھ سکتا ہے مگر اتنا قریب ہو کہ وہ اپنے پہلو میں ہی بٹھلادے تو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ملنا بھی ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے کسی بڑے سے ملتا ہے تو دیکھنے پر قناعت نہیں کرتا جی چاہتا ہے کہ مل بھی لوں، مصافحہ بھی کرتا ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مُلاصِق ہوگیا بدن سے اور پھر اور بہت چاہتا ہے کہ معانقہ بھی کرلوں تاکہ پوری طرح سے اس کے ساتھ پیوست ہوجاؤں گا تو محض دیکھ لینے پر ہی قناعت نہیں بلکہ ملنے وبھی آگے بڑھتا ہے اور ملنے میں بھی یہ نہیں کہ چھوڑ دے بلکہ معانقہ کرکے چمٹ بھی جاتا ہے تاکہ پوری طرح سے اس کے اثرات اس کے اندر آجائیں۔

یہ آدمی کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ انسان کی جس طرح کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس انداز سے ملنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ محبت کا یہی تقاضا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ قرآن اس لئے اُتارا کہ اس کے کلام کو پڑھ کر دیکھ لو اس واسطے کہ اس کے کمالات نظر آجائیں گے، اس کے بعد دل میں جم جائیں گے۔ جب دل نے ان کے کمالات کو قبول کرلیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رسی کو دل کے ہاتھوں سے مضبوط پکڑلیا۔ پھر جب حق تعالیٰ اس رسّی کو کھینچیں گے، تو یہ بھی کھنچ کر چلا جائے گا، ملاقات بھی ہوجائے گی، معانقہ بھی ہوجائے گا اور حق تعالیٰ کے پہلو میں جا بیٹھے گا۔

قیامت میں اوصاف کے لحاظ سے جماعت بندی

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن کچھ پارٹیاں بنادی جائیں گی‘ مختلف اوصاف کے لحاظ سے ان میں کچھ وہ ہوں گے جن کے پاس اعمال سیئہ ہیں ان میں جو عمل غالب ہوگا‘ اسی اعتبار سے گروہ بنائے جائیں گے۔ مثلاً معاذ اللہ زانیوں کا ایک گروہ ہوگا‘ چوروں کا ایک گروہ ہوگا‘ اسی لحاظ سے اور دوسری پارٹیاں ہوں گی اور کچھ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے پسندیدہ اور محبوب بندے ہیں۔ ان میں جو عمل سب اعمال میں غالب ہوگا اسی کے اعتبار سے جماعت بندی کردی جائیگی۔ مثلاً جس شخص کو اپنے اعمال میں نماز سے زیادہ شغف رہا ہے اس کو نمازیوں کی جماعت میں شامل کردیا جائے گا اور جس کو روزہ سے زیادہ شغف رہا ہے اس کو روزے داروں کی جماعت میں شامل کردیا جائے گا۔ جس میں صدقات کا غلبہ تھا اس کی ویسی ہی جماعت بنادی جائے گی اور ہر جماعت لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہوگی‘ جس میں بھی جو وصف اور عمل غالب رہا ہے اسی انداز سے ان کی جماعتیں بنادی جائیں گی۔

اسی طرح سے دنیا میں جو اہلِ مصیبت گزرے ہیں ان کی جماعتیں الگ ہوں گی مثلاً نابینا جتنے ہیں ان کی ایک جماعت کی جائے گی۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں جتنے نابینا گزرے ہیں وہ سب ایک جماعت میں ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت شعیبؑ کو کہ آخری عمر میں ان کی بینائی زائل ہوگئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں سفید جھنڈا ہوگا۔ وہ بجلی کی طرح چمکتا ہوگا۔ حق تعالیٰ ان اندھوں سے خطاب کرکے فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں تمہاری آنکھیں چھین لی تھیں۔ ایک بڑی نعمت سے تمہیں محروم کردیا تھا۔ مگر تم نے صبر کیا اور کوئی جزع فزع نہیں کیا آج تم کھلی آنکھوں ہو اور یہ حضرت شعیبؑ نورانی جھنڈا لئے جارہے ہیں۔ اب تم میرے چہرے اور جمال کو دیکھتے رہو اور اَبدالآباد تک تمہاری بینائی آج کھول دی گئی اور فرمایا جائے گا کہ :

”یمینِ عرش (عرش کی دائیں جانب) میں آکر قیام کرو۔ تم ہمارے مہمان ہو“۔

ان کے سامنے نعمتیں رکھی جائیں گی۔ خدا کا کتنا بڑا احسان ہوگا کہ میدانِ محشر بپا ہے۔ مخلوق کا حساب کتاب ہورہا ہے اور یہ نابینا لوگ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں اور اللہ کے یہاں مہمان ہوں گے اور نعمتیں استعمال کررہے ہوں گے۔

تو جب ان نابینا حضرات کی جماعت اس شان سے آئے گی اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرماکر مہمان بنائیں گے ٹھیک اسی وقت میں علماء کی جماعت آگے بڑھے گی اور علماء کہیں گے کہ ہماری ہی تلقین سے اور ہمارے ہی بتلانے سے انہوں نے صبر کیا‘ ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ان اندھوں کو یمینِ عرش میں جگہ دیدی گئی‘ حق تعالیٰ ان نابینا حضرات سے فرمائیں گے کہ انہیں کہنے دو تم آؤ یمینِ عرش میں وہ عرش کی دائیں جانب نعمتوں میں ہوں گے علماء وہیں کھڑے رہیں گے۔

اس کے بعد بُلایا جائے گا ان کو جو جُذام کے مرض میں مبتلا تھے کہ دنیا والوں نے ان کو اُچھوت بنادیا تھا۔ محشر کے دن ان کے بدن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت ایوب علیہ السلام کو اور ان کو سبز جھنڈا دیا جائیگا۔ کیونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں اُٹھائیں اور بہت بیماریاں سہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم بھی یمینِ عرش میں آجاؤ۔

پھر علماء اُبھریں گے کہ ہمارے ہی کہنے سے تو انہوں نے صبر کیا اور دل میں تسکین پیدا ہوئی اور ہمیں ہی کوئی پوچھتا نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے‘ کہنے دو تم ان علماء کو‘ تم آگے چلو۔ اسی طرح سے معاملہ ہوگا۔

اہلِ علم کا اُخروی مقام

اور اہلِ مصیبت جب سب نمٹ جائیں گے۔ پھر حق تعالیٰ علماء کو خطاب فرمائیں گے کہ کیا تم صرف نعتیں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم صرف اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ صرف اپنی ذات کا ہی نفع ڈھونڈو؟ بلکہ تم بھیجے گئے تھے دنیا کی ہدایت کے لئے یہاں لوگوں کی شفاعت کرو کھڑے ہو کر۔ جب سب کو بخشوالو گے تب تم آگے بڑھنا۔ تم اپنے کام کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ دنیا کے کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دنیا کے انسانوں کو نفع پہنچاؤ۔ اس وقت ان کا رُتبہ ظاہر ہوگا۔ وہ شفاعتیں کریں گے اور لاکھوں آدمی ان کی شفاعت کی بدولت بخشے جائیں گے۔ ربُّ العالمین فرمائیں گے کہ اب تم نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ دنیا میں ہدایت کی، یہاں شفاعت کی۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی عہدہ مل جائے، کوئی نعمت مل جائے۔ یہ تمہارا کام نہیں تھا۔ تمہارا کام یہ تھا کہ دنیا کو سب کچھ ملے اور تم الگ کھڑے رہو اس کے بعد تمہیں اَجر ملے تو بہر حال یہ جو یمین عرش میں جائیں گے یہی ہیں وہ جسے میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پہلو میں جگہ مل جائے گی کہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھا تھا، قبر میں اس کے جلوے دیکھے، میدانِ محشر میں اس کی تجلی دیکھی اور آخر میں جا کر مل جائیں گے یمینِ عرش میں حق تعالیٰ کے پہلو میں بیٹھ جائیں گے۔

تجلّیاتِ قرآنِ کریم کے ظہور کی ترتیب

یہ قرآن کا اثر ہوگا کہ آپ پڑھیں گے، پڑھ کر اس کی چیزیں جمائیں گے، دل میں اللہ تعالیٰ کے کمالات آئیں گے، عظمت بیٹھے گی، ایمان مضبوط ہوگا۔ اس کے انوار و برکات قلب کے اندر آئیں گے اور پھر وہ انوار محسوس طریق پر نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر قبر میں نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر تجلّیات کی صورت میں میدانِ محشر میں نمایاں ہوں گے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا پہلو ہے کہ بس ہمارے پاس آجاؤ۔ تو وہ ساری چیزیں پوری ہو جائیں گی جو عبادت سے مطلوب تھیں کہ دیکھ بھی لیں، اپنے معبود کے قریب بھی ہو جائیں۔ اس سے مل بھی لیں۔ اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں۔ یہ صرف قرآن کریم ہی کے ذریعہ تمنا پوری ہو سکتی ہے ___ تو آپ نے ترجمہ شروع کرا کر قرآن کریم کا درحقیقت راستہ کھولا ہے مسلمانوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور مل بھی لیں اور اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں اور اس سے مُلاحق ہو جائیں۔ آپ نے یہ بہت بڑی سعادت کا کام کیا ہے۔

قرآنِ کریم کتابِ انقلاب

یہی قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے۔ دِلوں کو بدَل دیتی ہے۔ رُوحوں کو بدَل دیتی ہے۔ جنہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا وہ تو نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے استعمال نہیں کیا اس کو اور جب تک کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے اس کے فوائد معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر ظاہر ہو سکتا ہے، جیسے قیمتی سے قیمتی دوا ہو لیکن اس کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ کیا اثر کرے گی۔ مثلاً شہد کو کہا گیا ہے کہ اس میں شفا ہے لیکن کوئی شخص شہد سے گھبرائے اور خیال کرے کہ شہد میرے گھر میں بھی داخل نہ ہو سکے تو کیا فائدہ ظاہر ہوگا۔ ایسے ہی اگر قرآن کریم سے بچتے رہیں گے کہ قرآنِ کریم کو سنے بھی نہ اور اس کے پاس پھٹکے بھی نہ، تو کیا

اس کا نور ظاہر ہوگا' اسی کے لئے نور ظاہر ہوگا جو اس کو آگے کرے' اس کو پڑھے' اس کو دل میں جمائے۔ اسی سے اس کے انوار و برکات ظاہر ہوں گے تو اس لئے دیکھا جائے ___ تو قرآن کریم ایک انقلاب کی کتاب ہے' دلوں کو بدل دے' روحوں کو بدل دے' کایا پلٹ دے' زمانہ جاہلیت جو اسلام سے قبل کا زمانہ ہے اس کے اندر دلوں میں' رُوحوں میں ہر بُرائی جمی ہوئی تھی' شرک میں وہ مبتلا تھے ___ بدعات میں وہ مبتلا تھے' منکرات میں وہ مبتلا تھے ___ چوری' ڈکیتی' زناکاری' ساری حرکتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل صحیح نہ مال درست۔ بس جیسے جانور گزارتے ہیں۔ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا۔ رات دن ڈکیتی' رات دن مار دھاڑ' قبیلوں میں جنگ اور کشت و خون' ہر وقت کا یہی مشغلہ تھا' قرآن کریم آیا' جن دلوں نے اس کو قبول کیا اور اس سعادت کو حاصل کیا تو ایک دم کایا پلٹنا شروع ہوگئی۔ پہلے ان کا نام تھا جہلائے مکہ۔ جب اس کو قبول کرلیا اب ان کا نام ہوگیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

تو جہلائے مکہ سے بن گئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا وہ زمانہ زمانۂ جاہلیت تھا اب اس کا نام ہوگیا خیرُ القرون کہ دنیا کے سارے زمانوں میں بہترین زمانہ ہے یہ' وہ لوگ جو جہالت میں مبتلا تھے۔ وہی حضرات علماء کے استاذ بنے' عرفاء کے شیخ بنے۔ پوری دنیا کو نور سے منور کردیا۔ ایک دم کایا پلٹ ہوگئی۔ جو ایک پیسے کے لئے ڈکیتیاں ڈالتے تھے' گردنیں کاٹتے تھے اور مرتے تھے پیسے کے اوپر۔ آج یہ کیفیت ہے کہ گھر بھرے ہوئے ہیں خزانوں سے اور وہ رُخ کرکے بھی نہیں دیکھتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ایک مرتبہ خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' بیتُ المال میں لاکھوں روپیہ جمع تھا۔ سونے چاندی کو خطاب کرکے فرمایا :

يَادُنْيَا غُرِّيْ غَيْرِيْ۔

"اے دنیا! دھوکہ کسی اور کو دینا"۔

ہم تیرے دھوکے میں آنے والے نہیں اور خزانچی کو اسی وقت حکم دیا کہ غرباء میں دولت تقسیم کی جائے۔ رات بھر دولت تقسیم ہوئی۔ یہ لوگ تھے جو پہلے ایک ایک پائی کے لئے جان دیتے تھے۔ آج خزانے پڑے ہوئے ہیں اور اس کو خطاب کررہے ہیں کہ ہم تجھ پر ریجھنے والے نہیں۔ ہم تجھ پر مرنے والے نہیں ہیں۔ یہ کایا پلٹ کہاں سے ہوئی؟ اس قرآن نے ہی تو دلوں کو بدل دیا تھا' روحوں کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے مال کی محبت تھی۔ اب کمال کی محبت ہوئی' پہلے مخلوق کی محبت تھی اب خالق کی محبت شروع ہوئی اور محبت میں مستغرق ہوگئے' غرق ہوگئے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ' کلھ بتی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کچھ غمگین اور اُداس ہیں۔ پوچھا کہ آج آپ اُداس کیوں ہیں فرمایا کہ خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہوگیا ہے دل کے اُوپر بوجھ پڑ رہا ہے کہ اتنی خرفات کہاں میرے سر پر لَد گئی۔ اس کی وجہ سے غمگینی ہے۔ بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر غرباء کو تقسیم کردو ___ بس تشریف لے گئے اور خزانچی کو بُلا کر حکم دیا کہ غرباء میں روپیہ تقسیم کیا جائے' یتیموں اور بیواؤں کی مَدد کی جائے۔ تمام رات مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو گھر پہنچے تو بہت ہشاش بشاش۔ بیوی کے ہاتھ چُومنے اور کہا کہ بہت عمدہ تدبیر بتلائی تھی کہ میرا دل ہلکا ہوگیا۔

تو پہلے یہ کیفیت تھی کہ ان کا دل ہلکا ہوتا تھا جب دولت زیادہ ہوتی تھی یا آج ہلکا ہونے لگا جب دولت تم

ہو جائے ـــــ یہ کایا پلٹ نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ اِنقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ دل بدل گئے۔

عورتوں میں اِنقلاب

دولت کی محبت سب سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے اور ان ہی سے یہ روگ مَردوں کو بھی لگتا ہے اگر عورتیں نہ ہوں تو یہ بھی اس روگ میں مُبتلا نہ ہوں اور یہ محبت عورتوں میں اس لئے ہوتی ہے کہ پیدا ہوتے ہی یہ زیوروں کی جھنکار میں ہی پرورش پاتی ہیں۔ آج اس کے کان میں سوراخ کر دیئے تو بالیاں پڑ گئیں۔ ناک پھوڑ دی تو اس میں لونگ گھُس گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ بندھ گئیں۔ تو پیدائش سے لے کر وہ مُبتلا ہوتی ہیں سونے چاندی میں اس لئے ان کے دل میں محبت بیٹھ جاتی ہے سونے چاندی کی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا :

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ۔

"کیا یہ عورت جو رات دن زیوروں کی جھنکار میں پرورش پا رہی ہے یہ عقلِ کامل رکھتی ہے؟"

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر خاوند سے تُو تُو مَیں مَیں ہو جائے تو خاوند تو اپنے دلائل پیش کرے گا اور یہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جائے گی۔ نہ دلیل نہ حجت' یہ اسی پر جمی رہے گی۔ تو جو کلام کی ایک قوت ہوتی ہے وہ نہیں رہتی۔ کیوں کہ علم نہیں اور علم اس لئے نہیں کہ مال یعنی سونا چاندی اندر گھُسا ہوا ہے۔ علم نُورانی ہے اور دولت سیاہ چیز ہے اور سیاہی کے ساتھ نور جمع نہیں ہوتا ہے اور سیاہی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ اب تو خیر وہ روپیہ نہیں رہا سونے چاندی کا اب تو کاغذ رہ گئے ہیں مگر جب سونے چاندی کے سِکّے تھے تو اگر پچاس روپیہ گِن لیں تو انگلیاں سیاہ ہو جاتی تھیں۔ تو سونے چاندی میں کالک بھری ہوئی ہے۔ گنتے گنتے ہاتھ پیر سیاہ ہو جاتے تھے۔

جو عورتیں رات دن پیروں میں زیور پہنتی ہیں تو ان کے ٹخنوں پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں ـــــ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے سُنا اسی کے بارے میں فرمایا کہ :

"دستِ زر آلود ایں قدر بدبو میکند۔ قلب زر آلود چہ قدر بدبو خواہد کرد"۔

یعنی جو ہاتھ سونے چاندی کو لگتے ہیں اس میں اس قدر بدبو آجاتی ہے اگر کوئی دل اٹک جائے سونے چاندی میں تو دل میں کتنی بدبو پیدا ہوگی اور کتنا تعفن پیدا ہوگا۔

تو عورتوں کے بارے میں فرمایا :

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ

"جب وہ عورتیں زیورات میں ہی نشو و نما پاتی ہیں تو ان کے اندر علم و کلام کی قوت کہاں سے ہو سکتی ہے"۔

وہ مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائیں گی نہ حجت نہ دلیل۔ دوسرا لاکھ دلیل بیان کرے وہ اپنی ہی ہٹ پر رہیں گی۔ چونکہ دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے عورتوں کے دل اتنے بدل دیئے تھے کہ بجائے محبت کے بیزاری پیدا ہو گئی تھی سونے چاندی سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ مدّہ کے

حاکم ہو گئے تھے تو انہوں نے دو بورے بھر کر گنیوں کی اور زیوروں کی اپنے خالہ کے ہاں ہدیہ کے طور پر بھیجی۔ تو اندازہ کیجئے کتنے ہزاروں اور کتنے لاکھوں روپے ہوں گے جبکہ دو بوریاں بھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف سونا اور ایک طرف چاندی یہ تمام سامان لے کر خالہ کے گھر پہنچے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میں کیا کروں گی اتنی دولت کو غریبوں میں تقسیم کردو۔ وہ دولت غریبوں کو تقسیم ہونی شروع ہو گئی صبح سے تقسیم ہونی شروع ہوئی اور شام تک دو بوریاں خالی ہو گئیں۔ باندی نے عرض کیا کہ ام المؤمنین! آپ پر فاقہ ہے کچھ آپ نے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ بیوقوف پہلے سے کیوں نہیں کہا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔ تو حالت یہ کہ ذہن میں یہ بھی نہیں کہ اتنے وقت سے فاقہ میں ہوں اور مجھے کچھ رکھ لینا چاہئے ___ اس قدر گویا کہ غنی ہو گئی تھیں زر سے اور دولت سے کہ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے فاقہ ہے کچھ مجھے بھی رکھنا چاہئے باندی کے یاد دلانے پر یاد آیا۔

تو عورتوں کے دل میں زیادہ محبت ہوتی ہے، یہ انقلاب تھا قرآن کا پیدا کیا ہوا کہ عورتوں کے قلوب کو اتنا پاک بنادیا کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ پیسہ پاس نہیں ہم فاقہ سے ہیں۔ یہ قرآن کا ہی تو انقلاب تھا ___ تو قرآنِ کریم دنیا میں بھی انقلاب پیدا کرتا ہے آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو یہ کہ دل کے اندر بجائے کفر و معصیت کے ایمان کی حلاوت پیدا کرتا ہے اور آخرت میں جہنم سے بچا کے جنت میں پہنچا تا ہے۔ فتنوں سے نکال کر امان میں پہنچا تا ہے قرآن، یہاں بھی انقلاب لاتا ہے اور آخرت میں بھی انقلاب لائے گا اور برزخ میں قبر کے اندر بھی انقلاب لائے گا۔

قرآنِ کریم کا برزخ میں انقلاب

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورۃ تَبٰرَکَ الَّذِیْ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عشاء کے بعد اس کی تلاوت کر کے سویا کرو۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا:

هِيَ الرَّافِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ هِيَ الْمَانِعَةُ۔

یہ رافِعَہ بھی ہے کہ عذاب کو رَفع کرتی ہے۔ یہ مانِعَہ بھی ہے کہ روک لگاتی ہے مصیبتوں پر، یہ مُنْجِیَہ بھی ہے جو نجات دلاتی ہے عذاب سے۔ تو قبر کے اندر نجات دلا دینا، عذاب کو دفع کر دینا اور روک دینا یہ خاصیت ہے تَبٰرَکَ الَّذِیْ کی ___ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سوتے وقت سورۃ تَبٰرَکَ الَّذِیْ پڑھ کر سویا کرو۔ اس لئے کہ سونا اور مرنا برابر ہے۔ سونے والا گویا کہ موت کے منہ میں جارہا ہے۔ موت سہل ہونے کے لئے ہی فرمایا ہے کہ سورۃ تَبٰرَکَ الَّذِیْ پڑھو۔ یہ "برزخ" میں بھی نجات دلائے گی۔ میدانِ محشر میں بھی بچائے گی۔ یہ امر ہے شریعت کا۔ اگر کوئی حافظ ہے تو حفظ پڑھ لیا کرے اور حافظ نہیں ہے تو دیکھ کر پڑھ لیا کرے ___ پانچ منٹ کی کیا بات ہے۔ عشاء کے وضو ہوتے ہی پڑھ کر سو جائے اس سے برکات حاصل ہوں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹایا جائے گا اور عذاب کے فرشتے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت سورۃ تَبٰرَکَ الَّذِیْ کو ایک شکل دے دی جائے گی وہ اس مشکل میں آ کر کہے گی کہ خبردار جو تم آگے بڑھے اس عذاب کو فوراً روک لو تو ملائکہ عذاب کہیں گے کہ ہم کو تو اللہ کا حکم ہے آپ کے کہنے سے کیسے رُک جائیں گے وہ کہے گی کہ میں اللہ کا کلام ہوں۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہیں مگر وہاں سے ہمیں کلام والے کا آرڈر ہے تو عذاب سے ہم کیسے رُک جائیں تو یہ سورت غضبناک

ہو جائے گی۔ اس پر ملائکۂ عذاب کہیں گے کہ آپ اللہ سے کہیں۔ ہمیں نہ روکیں۔ ہم آپ کے کہنے سے رُک نہیں سکتے۔ ہم تو آرڈر کے پابند ہیں وہ سورۃ کہے گی کہ ایک منٹ رُک جاؤ۔ اسی وقت عروج ہو گا اور پہنچے گی حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ میں اور جا کے کہے گی بہت غصے سے کہ یا تو اے اللہ مجھے اپنے کلام سے نکال دے کہ میں آپ کے قرآن کی سورت نہ رہوں اور اگر میں سورت ہوں تو اس کے کیا معنٰی ہیں کہ ملائکہ میری تعمیل نہیں کرتے میں تو آپ کا کلام ہوں میں آرڈر دیتی ہوں کہ وہ روکیں عذاب کو مگر وہ رُکتے نہیں یا تو مجھے قرآن سے نکال دیجئے اور رکھنا ہے تو اس کے کوئی معنٰی نہیں کہ میرا حکم نہ چلے۔ حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے:

میں دیکھتا ہوں تُو تو بہت غصّہ میں بھری ہوئی ہے ___ تو کہے گی:

وَحَقٌّ لِیْ اَنْ اَغْضَبَ۔

"مجھے حق ہے کہ میں غصّہ کروں"۔

میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں میں آپ کا کلام ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ میری تعمیل نہ کی جائے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے اس میت کو تیرے سپرد کر دیا جو مناسب سمجھے تو کر ___ اب آئے گی آرڈر لے کر کے اور ملائکۂ عذاب سے کہے گی خبردار! جو تم آگے بڑھے۔ یہ آرڈر ہے۔

تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ملائکہ منہ بسورتے ہوئے رخصت ہوں گے جیسے کوئی شرمندہ شکست کھا کر جاتا ہے کہ ہماری کچھ بات بھی نہ چلی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے واپس ہوں گے اور قبر خالی ہو جائے گی ملائکۂ عذاب سے۔

حدیث میں ہے کہ یہ سورۃ میت کے منہ پر اپنا منہ رکھے گی جیسے کوئی بوسہ لیتا ہے اور کہے گی کیسا مبارک منہ ہے کہ جس سے میری تلاوت کی گئی تھی۔ پھر سینے پر منہ رکھے گی کہ کیسا مبارک سینہ ہے کہ جس میں میں محفوظ تھی۔ پھر قدموں پر منہ رکھے گی کہ کیسے مبارک قدم ہیں کہ جن سے کھڑے ہو کر میری تلاوت کی گئی تھی اور اس وقت میت سے کہے گی کہ تو آرام سے اور اطمینان سے رہ کوئی تیرے اوپر بار نہیں میں موجود ہوں فکر کرنے کی بات نہیں۔ تو قرآن کریم دنیا میں کایا پلٹ کر دے تو قلوب کو نورانی بنا دیتا ہے۔ برزخ میں کایا پلٹ کر کے عذاب کو دفع کرتا ہے اور میدانِ محشر میں اللہ کے یمین میں پہنچا دیتا ہے ___ تو قرآنِ کریم میں ایک تبدیلی اور اِنقلاب کا مادہ ہے کہ دِلوں کو بدل دے، رُوحوں کو بدل دے، ناپاک کو پاک بنا دے۔ یہ انقلاب کا مادہ قرآن میں موجود ہے۔

اِنقلابِ عظیم

دنیا میں کتنا بڑا اِنقلاب بپا ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآنِ کریم کی تلاوت کی ہے تو لوگ بدل گئے جو جاہلینِ مکّہ تھے وہ صحابہ کرام بن گئے۔ زمانہ بدل گیا جاہلیت کے بجائے خیرُالقرون اس کا نام ہو گیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام پر پہنچے کہ اُمّت کا عقیدہ ہے کہ:

اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ۔

"سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم متّقین، پارسا، پاک دامن اور قلوب کے اندر کامل تقویٰ لئے ہوئے ہیں"۔

حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے پوچھا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ افضل ہیں یا عمر بن عبد العزیزؒ

افضل ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ صحابی ہیں اور عمر بن عبد العزیز تابعی ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ہاں حضرات صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ مگر عادل اتنے بڑے تھے کہ لوگ ان کو عمرِ ثانی کہتے ہیں۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا دور لوٹ آیا تھا۔ ان کے زمانۂ خلافت میں عدل وانصاف انتہائی درجہ پر تھا۔ اس عدل وانصاف کے باوجود تین سو نفلیں بھی ثابت ہیں جو روزانہ پڑھتے تھے۔ اور علمی مشغلہ الگ رہا تو حضرت عمر بن عبد العزیز کا بہت ہی اونچا مقام ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے ان کے دورِ خلافت میں کچھ خطاءِ اجتہادی اور خطائے فکری بھی ہوئی ہیں اس بنا پر لوگوں نے حضرت حسن بصریؒ سے دریافت کیا کہ :

"حضرت عمر بن عبد العزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ؟ حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا کہ :

اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑے کی ناک میں کچھ پانی آجائے اور اس پانی پر کچھ گرد بیٹھ جائے، وہ گرد ہزار درجہ افضل ہے عمر بن عبد العزیز سے۔ اس لئے کہ عمر بن عبد العزیز تابعی ہیں اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ صحابی ہیں اور کوئی شخص کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا"۔

صحابۂ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا دل بدل گئے، روح بدل گئی، جذبات بدل گئے۔ پھر جہاں بھی یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کرایا، قیصر کا ملک فتح ہو گیا۔ رومی ماتحت بن گئے کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا۔ ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پہنچے ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا، زبان بدل دی۔ ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔

آج آپ ممالکِ عربیہ کہتے ہیں مصر کو، شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی، مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی، شام عیسائیوں کا ملک تھا اس کے اندر رومی زبان بولی جاتی تھی، فلسطینی بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی۔ مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی بھی ہو گئی، تمدن تک بدل دیا، تہذیب بدل دی ـــــ تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کہاں سے آئی ـــــ؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اسی کو دستورُ العمل بنایا ـــــ تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

انقلابِ شر

آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جا رہا ہے کہ

لوگ خیر سے شر کی طرف آ رہے ہیں۔ علم سے جہالت کی طرف آ رہے ہیں ___ تہذیب سے بد تہذیبی کی طرف۔ تو انقلابِ خیر اور انقلابِ حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلابِ شر ترک قرآن پیدا کرتا ہے۔ قرآن کو ترک کر دو گے تو دوسرا انقلاب آتا جائے گا۔ تہذیب سے بد تہذیبی ہوتی چلی جائے گی۔ شائستگی بدل جائے گی ناشائستگی سے، علم ختم ہو جائے گا جہالت سے، اخلاقِ حسنہ جاتے رہیں گے۔ بداخلاقیاں پیدا ہوتی جائیں گی ___ اس لئے علم، اخلاق اور کمالات یہ قرآن ہی سکھاتا ہے۔ جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شاخیں سامنے کہاں سے آ جائیں گی۔

بہرحال قرآن برکت بھی ہے، ہدایت بھی ہے، نُور بھی ہے اور وہ انقلاب بھی ہے کہ جب آتا ہے تو کایا پلٹ دیتا ہے۔

جنّات میں انقلاب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنّات اور شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک پہنچ جاتے اور ملائکہ کی گفتگو سُن لیتے۔ اس میں کچھ جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں میں اس کی تبلیغ کرتے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ آپ کی بعثت کے وقت یہ سلسلہ ان کا منقطع کر دیا گیا اب کوئی آسمان پر اگر جاتا ہے تو اسے آگ کے بم مارے جاتے ہیں جس سے وہ بھسم ہو جاتا ہے۔ فرشتے ان کو آسمان کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ یہ جنّات اس جستجو اور ٹوہ میں تھے کہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کو روک دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھتے تھے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا۔ مگر کون سا حادثہ ہے، یہ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی جستجو اور تلاش میں نکلے اور ان جنّات کا وفد مکہ مکرّمہ پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرما رہے تھے قرآن کریم کی۔ انہوں نے قرآن کریم کو سُنا اور سمجھ گئے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نازل ہونے کی وجہ ہمارے راستے بند ہوئے ہیں تاکہ ہم اس میں خلط ملط نہ کر سکیں۔

تو انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا :

إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا۔

"ہم آج ایسا کلام سُن کر آئے ہیں کہ جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے، راہنمائی کرتا ہے کمالات کی طرف۔ ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے اور ہم شرک نہیں کریں گے"۔

ہمیں تو توحیدِ کامل نصیب ہو گئی اس کلام کو سُن کر۔ یہی ہے وہ کلام جس کی وجہ سے ہمارے راستے روکے گئے ہیں ___ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّات میں مشرکین بھی تھے۔ مشرکین آئے انہوں نے قرآن سُن کر توبہ کی کہ :

وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۔

"اب ہم شرک نہیں کریں گے"۔

یہ کمال تو ہمیں آج معلوم ہوا کہ توحید اتنی کامل ہے، جس کو قرآن لے کر آیا ہے۔

وَأَنَّهُ تَعَالَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا۔

"اور ہم توبہ کرتے ہیں اس سے جو ہم نے عقیدہ جما رکھا تھا کہ اللہ کے یہاں کوئی بیوی ہے اللہ کے کوئی اولاد ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر عیسائی بھی تھے جو عقیدۂ ابنیّت کے قائل تھے۔ اس سے توبہ کی جنّات نے۔

تو قرآن کے وہ الفاظ کان پڑے تھے کہ ایک انقلاب پیدا کردیا۔ کُفر سے ایمان کی طرف آ گئے' شرک سے توحید کی طرف آ گئے۔ ناشائستگی سے شائستگی کی طرف آ گئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآنِ کریم کے انقلاب کی ایک جھلک

یہی قرآن کریم ہے جو لوگوں کے دِلوں کو بدلتا ہے۔ اگر اس کو پکڑے ہوئے ہیں تو خیر کی طرف پھرتے رہیں گے اگر اسے ترک کردیا تو شر کی طرف بڑھیں گے۔ فِتنوں کی طرف بڑھیں گے۔ ایک سے دوسرے کو چین نہیں ملے گا۔ تو قرآن نے پیدا کیا ایثار' ہمدردی' محبّت' خدمت گزاری' جذبۂ اِطاعت' اپنے نفع پر اپنے بھائی کے نفع کو ترجیح دینا۔ یہ جذبات پیدا کردیئے تھے۔ خود غرضی مٹا کر لاغرضی پیدا کردی اور اس درجہ کہ موت گوارہ مگر اپنے بھائی کا نقصان گوارہ نہیں۔

غزوۂ بدر کے اندر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم زخمی ہو کر گرے۔ لشکر میں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجاہدین کی ضروریات پوری کرتے ہیں مثلاً مرہم پٹی وغیرہ۔ انہوں نے آکر مرہم پٹی کی۔ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو فرمایا پانی۔ اس وقت ایک آدمی کٹورہ بھر کر پانی کا لایا منہ کے قریب لے گئے کہ قریب سے ایک اور آواز آئی کہ پانی' فرمایا کہ پہلے ان کو پلاؤ میں بعد میں پیوں گا۔ وہاں لے گئے' ان کے منہ سے لگایا' ایک تیسری آواز آئی کہ پانی' انہوں نے کہاں کہ پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں پہنچے تو چوتھی آواز آئی۔ وہ نہیں پینے پائے کہ پانچویں آواز آئی۔ وہاں پہنچے تو چھٹی آواز آئی ___ غرض سات آوازیں آئیں۔ ساتویں تک پہنچے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ چھٹے کے پاس لوٹ کر آئے تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ پھر لوٹے کہ پانچویں کو پلادوں وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ اسی طرح لَوٹ کر واپس آتے رہے اور دیکھتے رہے کہ شہید ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ساتوں کے ساتوں پیاسے شہید ہوئے مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ میں پانی پیوں اور میرا بھائی برابر میں پیاسا لیٹا رہے۔ موت گوارہ کی مگر دوسرے کا پیاسا رہنا گوارہ نہ کیا۔

وہی لوگ جو ایک ایک پائی کے لئے دوسروں کے گلے کاٹتے تھے آج ان میں اس درجہ ایثار پیدا ہو گیا کہ موت گوارہ کی مگر دوسرے کی پیاس گوارہ نہیں۔

قرآن' انقلابِ عظیم کا سَرچشمہ

یہی وہ عظیم انقلاب ہے جو قرآن کریم نے پیدا کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اندر۔ ان ہی مشتِ خاک کو کیمیا بنادیا' سونا چاندی بنادیا اور ایسا بنادیا کہ دنیا کی کایا پلٹ دی انہوں نے ___ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ تَبَرَّکُ بِالقُرْاٰنِ برکت حاصل کرو قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے۔ یہ پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے۔ کلامِ خداوندی اس کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس سے صادر ہو رہا ہے۔ اس نے سورج پیدا کیا' اس نے چاند پیدا کیا' زمین پیدا کی اور کلام خود بخود اندر سے نکل کر آتا ہے۔ اس لئے کلام مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق میں تو رُوح بن کر کلام بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے اشیا اپنی اصلیت پر قائم اور صحیح معلوم ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کہ کلام اللہ سے برکت حاصل کرو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے

ر اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پیدا کیے ہوئے تو ہم اور آپ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنے اندر کی چیز نکال کر دی ہے تاکہ ان کے اندر اس کلام کی برکت سے تہذیب پیدا ہو۔ نگی پیدا ہو۔ تو اس اعتبار سے دو عالم ہوئے۔ ایک عالمِ خلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ایک عالم واح ہے کہ اپنے حکم سے اپنے کلام سے اس کے اندر روح ڈالی ہے۔ تو قرآن کریم در حقیقت روح الٰہی ے' روح خداوندی ہے جس سے اقوام زندہ ہوئیں۔ جس نے اسے لیا وہی زندہ ہوا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ لیٰ عنہم نے اس روح کو لیا اس لئے وہ ایسے زندہ ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں مُردوں کو زندہ کردیا انہوں نے ہم نے آج اس روح کو نکال دیا ہے پس سے پڑے ہوئے ہیں بے جان۔ جس کا جی چاہے مارے' جس کا چاہے کاٹ دے۔ جس کا جی چاہے کچھ کرلے۔ چونکہ ہمارے اندر جان ہی باقی نہیں ہے اور نہ ہی روح باقی ہے۔

اَلْقُرْاٰنُ یَعْلُوْوَلَا یُعْلٰی جیسا کہ : اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَ لَا یُعْلٰی اسلام بُلند ہے اسے کوئی پَست نہیں ر سکتا۔ اس کی رُوح جس میں آجائے گی وہ بھی بُلند ہوجائے گا۔ جس میں سے نکل جائے گی وہ پَست ہوجائے ۔

صحیح انقلاب کی تمنّا میں اُلٹی زقند

تو آج ضرورت اس کی ہے کہ قرآنِ کریم کو سنبھالا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کچھ دولت ہو رے پاس' کچھ بلڈ نگیں ہوں' کچھ جائیدادیں ہوں۔ جب ہی ہم پنپ سکتے ہیں حالانکہ پنپنے کی یہ صورت ں ہے کیونکہ یہ چیزیں چھن بھی سکتی ہیں' انقلابات میں گھر تک چھن جاتے ہیں' جائیدادیں تک چھن جاتی ں' دوکانیں تک بِک جاتی ہیں' بازار تک جلادیئے جاتے ہیں۔ اگر ان سے شوکت وابستہ ہو تو وہ سب ختم جائیں گی۔ اگر اندر رُوح بھری ہوتی ہے تو لاکھ بازار جلیں تو وہ جلتے رہیں۔ پھر سینکڑوں قائم ہوجائیں گے۔ مؤمن کو ذرّہ برابر فکر نہ ہوگی۔ نہ جلنے کی نہ آنے کی' اس واسطے جہاں اور تدابیر کرتے ہیں وہ ثانوی درجہ کی ں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان' مسلمان تو بنے اور بننے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس قرآن کی روح کو اپنے اندر ب کرلے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تعلیم

بہرحال یہ سلسلہ جو آپ حضرات نے قائم فرمایا ہے مبارک سلسلہ ہے مگر اس کو رسمی نہ بنایا جائے بلکہ بایا جائے اور پڑھانے کے ساتھ سُنا بھی جائے یعنی پڑھانے والا اور ترجمہ کرنے والا کبھی کبھی امتحان بھی ہے کہ کل ہم نے کیا بتایا تھا۔ فلاں آیت کا کیا مطلب ہے۔ اس پر آپ نے کچھ عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ لئے محض پڑھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ تربیت بھی ضروری ہے علم کے ساتھ ساتھ۔ پھر اس کو دستورِ زندگی بھی ضروری ہے۔ علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کو دستورِ زندگی نہ بنایا جائے اور پر عمل نہ کیا جائے۔

آپ نے قرآن کا ترجمہ پڑھایا' احکام سمجھائے' اخلاق بتلائے۔ پھر چند دن کے بعد جانچ بھی کرتے ں' پوچھ گچھ بھی کرتے رہیں کہ بھئی کتنا عمل ہوا' کتنا نہیں' نہیں ہوا تو اس کی ترکیب بتلائیں جیسے کہ یث میں دعائیں وارد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام لکھا دی جائیں

اور پھر سُنی بھی جائیں ان سے معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے' اخلاق درست ہوتے ہیں۔ ماحول بنتا ہے اس سے محض ترجمہ پڑھا دینا ہی ذمہ داری نہیں ہے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تربیّت

میں تو یہ کہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھانے والا عمل بھی دیکھتا رہے اور تربیت بھی کرتا رہے۔ یہ نہ دیکھے کہ بس ان کو علم ہوگیا ہے۔ یہ تو اور مصیبت بن جائے گی۔ حکمت کے ساتھ ان کی تربیت کرتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض تعلیم ہی نہیں دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو کہ صرف قرآن کے معنی بتلادیئے ہوں یا سمجھادیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی بھی مشق کرائی ہے اور عمل کی نگرانی بھی فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ تعلیم اور حکمتِ عملی

حدیث میں ہے کہ ایک قبیلہ حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ 'ہم ایمان لانا چاہتے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' بسم اللہ اہلِ قبیلہ نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ نماز نہیں پڑھیں گے' فجر اور عشا کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ باقی تین وقتوں کی پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا وہ اسلام قبول کر کے چلے گئے۔ انہوں نے نہ صبح کی نماز پڑھی اور نہ عشاء کی۔ ظہر' عصر' مغرب کی پڑھتے رہے۔

لوگوں کو تعجّب ہوا کہ جیسے تین وقت کی نماز فرض ہے ویسے ہی دو وقت کی بھی فرض ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط کیسے مان لی۔ اس پر سب کو حیرت تھی۔ مگر ایک مہینے کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں خود یہ خیال پیدا ہوا کہ بھائی فرض تو ساری نمازیں ہیں۔ ہم تین نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ دو نہیں ادا کر رہے ہیں اس پر گناہ گار ہو رہے ہیں۔ تو فائدہ کیا ہوا اسلام لانے سے؟

یہ سوچ کر پڑھنی شروع کی اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد پانچوں نمازوں کے پابند ہوگئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے انوارِ باطن سے پہچان لیا تھا کہ یہ اس شرط پر رہیں گے نہیں اور پڑھنی شروع کر دیں گے۔ اس لئے آپ نے شرط مان لی تھی ___ تو یہ حکمت تربیت کی تھی تعلیم میں تو سب برابر ہیں۔ تعلیم میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی جیسے ظہر' عصر اور مغرب فرض ہیں' ویسے ہی عشاء اور فجر بھی فرض ہیں مگر اس سے آگے عمل کی بات ہے اور عمل میں تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور تربیت میں حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلیم تو ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے طب کی کتاب پڑھادی ہو اور علاج ہوتا ہے مطب سے۔ تعلیم میں تو طبیب سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ بیان کرے گا لیکن اگر علاج کرنے بیٹھے گا تو ہر ایک کا نسخہ الگ الگ لکھے گا۔ چونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہے' بیماری الگ' تو تعلیم کے درجہ میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن عمل کرانے کے درجے میں ہر ایک کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کی رعایت کرنی پڑے گی اور اسی مناسبت سے نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مربّی بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج پہچان کر مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی اس شرط کو قبول کرلیا اور انوارِ باطن سے پہچان بھی لیا تھا کہ بعد میں اس کو یہ قبول کرلیں گے۔

اس لئے آپ نے کوئی ردوکد نہ فرمائی اور ہوا یہی اور بالآخر وہ ساری نمازیں پڑھنے لگے۔ یہ کچھ حکمت تھی تربیت کی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ ترجمہ کرانے والے تعلیم کے درجہ میں تو سب کو ایک ہی طرح سمجھائیں گے مگر اس میں تربیت کی شان بھی ہونی چاہئے اور وہ ہونی چاہئے جُداگانہ۔

ہر ایک کے مزاج کی مناسبت سے ہفتہ میں دو ہفتہ میں جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہئے کہ عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ نہیں کر رہے تو کیا رکاوٹ ہے اس کو دُور کیا جائے۔ اس طرح سے تربیت ہو کر اچھے خاصے مسلم بن جائیں گے۔

اس وجہ سے محض علم کافی نہیں ہے جب تک کہ استعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے اور عمل کرا کے اس کی مشق نہ کرائی جائے۔ اس وقت ثابت ہو گا کہ قرآن کریم نے نفع پہنچایا اور کس طرح سے اس نے کایا پلٹ کی ہے۔

"تبریک"

بہرحال یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کر دی ہیں کہ آپ حضرات قابلِ مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمۂ کلام اللہ کا آغاز کیا ہے یہ نہایت مبارک اِقدام ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے :

خیرکم مَن تعلّم القراٰن وعلّمہ۔

"پڑھنے والا بھی خیر ہے پڑھانے والا بھی خیر ہے"۔

لاياتيه الباطل مِن بين يديه ولامِن خلفه

قرآن کریم کے نہ دائیں طرف سے باطل آسکتا ہے نہ بائیں سے نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔ یہ چیز باطل سے بَری ہے۔ حقِ محض ہے۔ اس لئے جس میں سَرایت کر جائے گا اس کے پاس باطل نہ آسکے گا۔ وہ بھی حق کے اوپر جمے گا۔ تو آپ نے خیر کا کارخانہ کھولا ہے۔ پڑھانے والا بھی خیر ہو گا۔ سُننے والے بھی خیر ہوں گے پھر اس کے ساتھ عمل بھی مستقیم ہو جائے تو اس کے اَثرات اندر اُتر جائیں گے اور پھر اس کے فوائد ظاہر ہوں گے۔

یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے اس کے فوائد و برکات دنیا و آخرت میں ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

"آمین"

دُعاء

اللّٰهمّ انّا نسئلک علماً نافعاً وعملاً صالحاً ورزقاً واسعاً وشفاءً من کلّ داءٍ وارزقنا یارب حُسنَ الخاتمۃ

اللّٰهمّ ربّنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبّت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین ربّنا واتنا ما وعدتّنا علیٰ رسلک ولا تخزنا یوم القیٰمۃ انّک لا تخلف المیعاد۔

اللّٰهمّ وتوفّنا مسلمین والحقنا بالصّالحین غیر خزایا ولامفتونین

وصلّی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیّدنا ومولانا محمّد وّعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین برحمتک یاارحم الرّاحمین۔

علمی معجزہ

انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دیئے گئے تھے ___ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ علمی معجزہ بھی دیا گیا۔ عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے ___ لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے مگر اس کا علم باقی رہتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات آپ کی ذات کے ساتھ ختم ہوگئے لیکن ''علمی معجزہ'' قرآن کریم ہے' جو آج تک باقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے ___ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کردیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ○

معجزہ دلیل نبوّت ہے

بزرگان محترم!

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف معجزات دیئے ہیں معجزہ چونکہ دلیل نبوّت ہوتا ہے۔ تو

وہ نبی ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا ___ اور گویا یہ فعل خداوندی ہے کہ اس کی مثل لانے سے مخلوق عاجز ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ معجزہ دیا کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ تو احیائے موتیٰ ان کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اندھے مادرزاد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ ان میں بینائی آجاتی تھی۔ جذامیوں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے' ان کا بدن صاف ستھرا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس دور کے ڈاکٹرز و اطباء عاجز آگئے تھے اور ان بیماریوں کو لاعلاج سمجھا گیا تھا ___ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ معجزہ ظاہر کیا تو دنیا سمجھ گئی کہ یہ اسباب کے درجے کی چیز نہیں ہے ضرور مسبب الاسباب کی طرف سے یہ کوئی کرشمہ اور خرق عادت ہے۔ یہ ان کی نبوّت کی دلیل تھی۔

موسیٰ علیہ السلام آئے ان کو عصاء موسیٰ دیا گیا۔ جس کی خاصیت یہ تھی کہ اسے زمین پر ڈالتے تھے وہ اژدھا بن جاتا تھا' ہاتھ میں تھام لیتے تھے تو لکڑی بن جاتی تھی۔

اسی طرح ید بیضاء ان کو عطا کیا گیا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تھے تو سورج کی طرح سے ان کا ہاتھ چمکتا تھا۔ ہر سو روشنی پھیل جاتی تھی۔ دنیا نے سمجھ لیا کہ یہ چیزیں دوسرا کوئی دکھلانے والا نہیں۔ یقیناً یہ خدا کی طرف سے اس شخص کی نبوّت اور رسالت پر دلیل ہے۔ جو سفیر خداوندی ہے اور اس کی سفارت لے کر آیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر کی کہ ان کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا اور آگ بردو سلام بن گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ چیز دکھلانے والا ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ پر ایک ایسا عجیب معجزہ ظاہر ہوا جو ان کے مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ تو نار خلیل ان کو دی گئی۔

اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی معجزات دیئے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ظلۂ شعیب دیا گیا۔ مگر قوم نے جب نہ مانا تو ابر آیا اور ابر میں سے انگارے برسے۔ قوم عذاب میں مبتلا ہوئی ___ حضرت ہود علیہ السلام آئے تو ہوا کا معجزہ دیا گیا قوم نے نافرمانی کی۔ تیز آندھی چلی اور سات دن تک چلتی رہی یہ چھوٹی موٹی آندھی نہیں تھی اتنی عظیم آندھی تھی کہ اس نے بستیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ قوم عاد کے جانوروں کی آوازیں فضا میں سنی جاتی تھیں مکانات اوپر جاتے تھے پھر پٹخے جاتے تھے۔ یہ معجزہ تھا۔ جس سے سمجھ لیا گیا کہ یہ شخص بے شک مبعوث من اللہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو ناقۂ صالح دی گئی۔ قوم نے مطالبہ کیا کہ کوئی دلیل لاؤ سند لاؤ کہ ہم تمہیں نبی سمجھیں ___ فرمایا ___ جو تم مانگو ___ انہوں نے کہا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکالو ___ ظاہر ہے کہ بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال دے۔ یہ تو اسی ذات کا کام ہے جس کی شان یہ ہے کہ

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ

زندہ میں سے مردہ نکال دے اور مردہ میں سے زندہ پیدا کردے۔ تو پتھر جیسی ظاہری طور پر ایک بے جان چیز میں سے جاندار کو نکالنا یہ معجزہ تھا آپ یہ معجزہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں مگر چونکہ رات دن قصہ ہے اس لئے وہ عجیب معلوم نہیں ہوتا انسان کی پیدائش کیا معجزہ نہیں ہے؟ ایک جماد لا۔ عقل' ایک بے حقیقت قطرہ اس پانی پر نقاشی کرنا' نقش کھینچنا اور گندے قطرے میں سے ایک پاکباز انسان نکال کر تیار کرنا' بے عقل چیز میں سے عاقل انسان پیدا کردینا۔ بے جان چیز میں سے جان دار چیز کو نکالنا' بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کے اندر

سے اونٹنی نکال دی گئی۔ مگر چونکہ رات دن یہ قصہ ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے مشکل اور عجیب نہیں معلوم ہوتا۔ ورنہ معجزات رات دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں ___ تو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ناقۂ صالح تھی۔

یوسف علیہ السلام کو قمیص یوسف دیا گیا۔ وہ یعقوب علیہ السلام کے چہرۂ مبارک پر ڈالا گیا قمیص کا ڈالنا تھا کہ بارہ برس کی بینائی جو ضائع ہوئی تھی پانچ منٹ بعد لوٹ آئی اور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

داؤد علیہ السلام کو الانۂ حدید کا معجزہ دیا گیا۔ لوہے کو ہاتھوں میں پکڑتے تھے وہ موم کی طرح سے نرما جاتا تھا۔ جس طرح چاہتے اس سے سامان بنا لیتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح کا معجزہ دیا گیا۔ ہوائیں مسخر تھیں ان کے حکم سے ہوائیں تخت اڑاتی تھیں۔ سواریاں لے جاتی تھیں۔ ہوا پر وہ کام ہوتا تھا جو زمین پر سواری کو چلانے کا ہوتا ہے ___ اسی کو فرمایا گیا:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ۔

بہر حال تسخیر ریاح یہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ اسی طرح منطق الطیر کا معجزہ بھی دیا گیا۔ پرندوں کی بولیوں کا جاننا اور سمجھنا اور اس پر احکام مرتب کرنا یہ اعجاز سلیمانی تھا۔

تو داؤد علیہ السلام کو الانۂ حدید یعنی لوہے کو نرما دینے کا معجزہ دیا گیا' سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح' موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا اور عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتیٰ کا معجزہ دیا گیا۔ یہ تمام معجزے در حقیقت ان کی نبوت کے دلائل تھے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ مبعوث من اللہ ہیں۔ خدا کی طرف سے آتے ہیں اور اس کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کا تفوق

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے ہزاروں معجزات عطا کئے گئے اگر عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتیٰ کا معجزہ دیا گیا کہ ان کے ارشاد سے مردے زندہ ہوتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر استوانۂ حنانہ کو زندگی عطا کی گئی۔

واقعہ آپ نے سنا ہوا ہوگا احادیث میں صراحۃً موجود ہے کہ منبر بننے سے قبل مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ تو کھجور کا ایک سوکھا ہوا تنا کھڑا ہوا تھا' جس کو کاٹ دیا گیا تھا۔ اس پر ٹیک لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ایک مدت دراز تک آپؐ نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا' جب منبر تیار ہو گیا اس پر خطبہ پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ تو حدیث میں موجود ہے اس ستون میں سے آہ و بکاہ کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں اس طرح سے اس نے بلک بلک کر رونا شروع کیا جیسے فراق زدہ انسان روتا ہے۔ اور جب چیخ و پکار بڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر سے اترے' اس پر ہاتھ رکھا اور اس طرح دلاسہ دیا جس طرح سسکتے ہوئے بچے کو چپ کرایا جاتا ہے اور وہ چپ ہوا۔

تو عیسیٰ علیہ السلام نے اگر مردے کو زندہ کیا تو آپؐ کے معجزے سے ایک سوکھا ہوا تنا زندہ بنا ___ یہ معجزہ اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔

اس لئے کہ انسانی لاش میں بہر حال پہلے جان موجود تھی۔ اگر دوبارہ لوٹ آئے تو اس روح کو اس بدن

سے مناسبت تھی۔ اگر نکل سکتی تھی تو داخل بھی ہو سکتی تھی۔ اپنے محل اور مکان میں پہنچ گئی۔ اپنے سانچے میں آ کر ڈھل گئی۔

لیکن کھجور کا ایک تنا زندہ ہو اور زندہ ہو کر وہ آثار ظاہر ہوں جو جاندار میں سے ظاہر ہوئے ہیں اگر فقط اتنی زندگی ہوتی کہ اس پر ہرے پتے لگ جاتے تو کہا جاتا کہ اس کے اندر روح نباتی آ گئی۔ روح نباتی اگر اس کے خشک ہونے کی وجہ سے چلی گئی تھی وہ دوبارہ لوٹ آئی' اس کا محل تھا۔ جیسے مردے میں جان آ جائے۔

لیکن جان آئی تو ایسی آئی جو جانداروں کی سی جان ہے یعنی روح حیوانی داخل ہوئی نہ صرف روح حیوانی بلکہ انسانی افعال ظاہر ہوئے۔ تو روح انسانی داخل ہوئی اور انسانی افعال میں سے وہ افعال سرزد ہوئے جو عشاق خداوندی سے سرزد ہوتے ہیں عاشقان الٰہی کی طرح فراق نبوی میں رونا اور چلانا شروع کیا جو ایک عاشق خداوندی کا کام ہے۔ تو ایک کھجور کے خشک تنے میں جان بھی آئی تو انسانوں جیسی بلکہ کامل انسانوں جیسی۔ تو اس سے بڑا معجزہ ہے کہ ایک لاش کے اندر انسانی جان آئے جو انسان ہی کی لاش تھی۔ لاش تو ہو درخت کی اور روح اس میں کامل انسان کی پڑے یہ کہیں زیادہ اونچی بات ہے بہ نسبت اس احیاء موتیٰ کے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احیائے موتیٰ کا معجزہ دیا گیا۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا عطاء کیا گیا کہ ہاتھ روشن ہو تا تھا تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی جن کا نام غالبا حنیفہؓ ہے وہ جنگل میں جارہے تھے۔ سخت اندھیرا تھا' راستہ ملتا نہیں تھا۔ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ راستے کی کیا صورت ہو؟ کس طرح سے مجھے راہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ان کی لاٹھی اس طرح سے روشن کر دی گئی کہ پورے جنگل میں روشنی پھیلی اور راہ نظر آنے لگی ــــــ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرامؓ میں یہ کرامتیں پائی گئیں۔ یہ معجزہ ہی کا اثر تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہلائے گا جو آپؐ کے خادم کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے وہ سب کے سب بلکہ بدرجہا زائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطاء فرمائے گئے۔

سب سے بڑا معجزہ

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ جو انبیائے سابقین کو نہیں دیا گیا وہ معجزہ فی الحقیقت علمی معجزہ ہے۔ جس کو قرآن حکیم کہا جاتا ہے کہ ایسی کتاب اور شریعت لاکر پیش کی جو جامع ہدایات ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معجزہ ہے اس کی فصاحت وبلاغت وہ ہے کہ دنیا اس کے مقابلہ کرنے سے عاجز رہ گئی' معانی اور مضامین کے لحاظ سے انتہائی جامع ہے کہ اتنا جامع کلام پیش کرنے سے دنیا عاجز آ گئی۔

عرب کے لوگ فصاحت وبلاغت میں مشل تھے۔ ان کو دعویٰ تھا کہ ہم عرب ہیں۔ باقی ساری کی ساری دنیا عجم ہے۔ عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔ وہ اپنے مقابلہ میں پوری دنیا کو گونگا جانتے تھے کہ نہ انہیں بولنا آتا ہے نہ یہ شادی اور غم کی شرح کر سکتے ہیں نہ وہ اسالیب بیان ان کے ہاتھ میں ہیں جو عربوں کے ہاتھ میں ہیں قصائد لکھتے تھے اور دنیا کو چیلنج کرتے تھے کہ کوئی ہے جو ان کا مقابلہ کرے؟ ان جیسا قصیدہ لائے؟ بیت اللہ میں قصیدے ٹانگے جاتے تھے چیلنج دیا جاتا تھا کہ کوئی ان کا مثل بنا کر لائے۔ یہ گویا اس زمانے میں عام دستور تھا۔ اور عربوں کی فصاحت وبلاغت اس حد پر پہنچ چکی تھی کہ ان کی پانچ چھ برس کی بچیاں ننانوے ننانوے اشعار کے

نہایت بدیہہ قصائد برجستہ پڑھ جاتی تھیں ___ یہ سبعہ معلقہ جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے یہ وہی سات قصیدے ہیں جو بیت اللہ میں لٹکائے گئے تھے اور چیلنج کیا گیا تھا کہ ان کا مثل لائے ___ غرض اس زمانے میں عربوں کے اندر فصاحت وبلاغت کا زور تھا' اس وقت کا معجزہ جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکر پیش کیا وہ فصاحت وبلاغت ہی کا معجزہ تھا جس کو قرآن کریم کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اگر قصائد لٹکا کر چیلنج کیا اللہ نے قرآن اتار کر چیلنج کیا :

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

"اگر جن انسان سب مل کر مجتمع ہو جائیں اور اس قرآن کا مثل بنانا چاہیں تو ان کو قدرت نہیں ہے کہ وہ بنا سکیں"۔

اس لئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ خدا کا کلام ہے۔

حقیقت معجزہ

جس سے سب عاجز آجائیں یہ دلیل ہوتی ہے کہ یہ بشر کے قبضۂ قدرت کی بات نہیں ہے۔ آج آپ پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورج اور چاند خدا کا فعل ہے اس لئے کہ سارے انسان مل کو چاہیں تو سورج کی ایک کرن نہیں بنا سکتے۔ آپ کہتے ہیں زمین خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ دلیل یہی دے دیتے ہیں کہ سارے انسان جمع ہو جائیں تو زمین کا ایک ذرہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اس کے ذروں کو جوڑ توڑ کر اس سے کام لے لینا تو اور چیز ہے۔ لیکن ایک ذرہ بنا دیں جس میں وہی انبات وغیرہ کی تمام صلاحتیں ہوں جو زمین میں ہیں دنیا کے سارے فلاسفر جمع ہو کر نہیں بنا سکتے ___ چاند اور سورج تو علویات وفلکیات میں سے ہیں ارضیات میں زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جز انسان نہیں بنا سکتا۔ درخت کی ایک پتی ایسی نہیں بنا سکتا جس میں وہی خاصیتیں ہوں جو اللہ نے کسی پتے میں رکھی ہوں یہ الگ چیز ہے کہ آپ زمین کے اجزاء میں ترکیب اور تحلیل کر کے اس سے کوئی نئی چیز پیدا کرلیں۔ مگر پیدا کرنے میں آپ اسی زمین کے اور اس کے مادوں کے محتاج رہیں گے۔ خود مادے کو اپنے ہاتھ سے بنا لینا اور اس کو ایجاد کر لینا' عدم سے وجود میں لے آنا' یہ انسان اور بشر کی قدرت کی چیز نہیں ہے سارے انسان جمع ہو جائیں نہیں بنا سکتے۔ جس چیز سے سارے انسان عاجز آجائیں اس کی نظیر نہ لا سکیں اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی

اسی طرح کلام کے سلسلہ میں ساری دنیا کے فصحاء اور بلغاء عاجز آگئے اور وہ عرب عاجز آگئے جنہوں نے دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی فصاحت وبلاغت کا نمونہ لائے ___ لیکن جب قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں تو ہار مان لی اور کہا کہ :

ان فیہ لحلاوۃً وان فیہ لتراوۃً۔

اس کلام میں عجیب قسم کی حلاوۃ اور شیرینی ہے کہ ہم پیدا کرنا چاہیں تو اس کا عشر عشیر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ غرض اس زمانے کے فصحاء اور بلغاء اس چیز کو مان گئے کہ ہم اس کی نظیر لانے سے عاجز ہیں۔

ورنہ آپ خود اندازہ کیجئے کہ جب چیلنج کیا گیا تو جن لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے بے گھر کیا' انتہائی ایذاء رسانی کی' لڑائیاں ٹھانیں' مقابلے کئے یہ ساری چیزیں تھیں۔ مگر ایک آیت کی نظیر لاکر پیش کر دی ہو کسی نے یہ نہیں کیا ___ پورا قرآن تو بجائے خود ہے کسی ایک آیت کی نظیر نہیں دے سکے ___ اسی لئے قرآن نے پہلے تو یہ چیلنج کیا کہ :

عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

''اس قرآن کا مثل لاؤ''۔

پھر تنزل کر کے کہا :

قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ۔

''تم کہتے ہو کہ یہ اختراع کردہ کلام ہے تو اس قسم کی اختراع کردہ دس سورتیں تم بھی لاؤ''۔

پھر اور تنزل کیا اور کہا :

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ۔

''ایک سورۃ اس جیسی بنالاؤ''۔

سورۃ میں یہ بھی قید نہیں لگائی کہ سورۃ بقرہ جیسی سورۃ ہو جو اڑھائی پارے کی ہے۔ آل عمران جیسی سورۃ ہو یہ بھی قید نہیں' اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ کی طرح کی چھوٹی سی سورۃ بنالاؤ ___ پھر اس سے تنزل کیا اور کہا کہ :

فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ۔

''اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک بات ہی اس جیسی بنالاؤ''۔

سورت تو بجائے خود ہے ___

تو اندازہ کیجئے اس قوم کے سامنے جو چیلنج دینے کی عادی تھی اتنے بڑے چیلنج دیئے جائیں وہ دوسرے سارے مقابلے کرے' جتن کرے۔ لیکن کلام کی نظیر نہ پیش کرے تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ بشر کی طاقت سے خارج ہے اس قدر فصاحت وبلاغت سے کلام کا بھرا ہوا ہونا یہ صرف اعجاز خداوندی ہے۔

انسانی صفات کی حد اعجاز

آپ اندازہ کیجئے کہ جتنی بھی انسانی صفات ہیں اور انسانی افعال ہیں ان میں ایک حد ایسی نکلتی ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک حد تک قادر رہتا ہے پھر ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتا ہے اسی حد سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے خدائی حدود ہیں ___ مثلاً آپ دیکھتے ہیں گویا آپ میں بصر کی طاقت ہے۔ آپ فرلانگ دو فرلانگ یا میل بھر کی چیز دیکھ لیں گے۔ آسمان کے ستارے دیکھ لیں گے۔ لیکن اس کے بعد ___ ؟ اس کے بعد نگاہ عاجز ہوگی اور ایک حد نکلے گی جہاں آپ کی نگاہ عاجز ہو جائے گی' آپ تحت الثریٰ کو نہیں دیکھ سکتے' صرف سطح کو دیکھ سکتے ہیں آپ کسی چیز کے اندرونی جگر کو اپنی بصر سے نہیں دیکھ سکتے۔ بصر عاجز ہے ___ بہر حال آپ کی بصر دیکھے گی اسے دیکھنے کی قدرت ہے مگر ایک حد ایسی نکلے گی جہاں آکر عجز کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم نہیں دیکھ سکتے ___ اس سے آگے خدائی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی کی بصر ہے جو دیکھتی ہے۔

آپ میل دو میل یا پچاس میل کی بات سنیں گے۔ آلات کے ذریعے سے آپ مشرق و مغرب کی خبریں سن لیں گے لیکن آسمان کے اندر کی خبریں اور آوازیں بھی آپ سننے لگیں؟ آپ کی سماعت یہاں آکر عاجز

ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی سمع وبصر اور تکلم بھی محدود۔ ہر چیز محدود ہے ایک حد کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس حد کے اوپر آپ پہنچ کر آپ اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں اس حد سے باہر خدائی قوتیں ہوتی ہیں۔

یہی صورت کلام کی بھی ہے کہ آپ کلام کرنے کے سلسلہ میں فصیح وبلیغ اور بہترین کلام کریں گے۔ آپ بہترین شاعر بن جائیں گے۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اور پیدا ہوگا' وہ آپ سے اچھا کلام کرے گا۔ پھر اس سے اور بڑھ کر پیدا ہوگا جو اور اچھا کلام کرے گا۔ مگر ایک حد ایسی نکلے گی بشر وہاں عجز کا اقرار کرے گا کہ اتنے دقیق معانی کو میں چار الفاظ میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم **افصح العرب والعجم** ہیں۔ احادیث میں دقیق سے دقیق مضامین سہل سے سہل تعبیر سے ادا فرمائے گئے ہیں' دوزخ ونار کی کیفیات' جنت کی کیفیات' حشر کی کیفیات اور قبر کے احوال وغیرہ جو خالص کیفیاتی چیزیں ہیں ان کو اگر ادا کیا ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل الفاظ میں ادا کیا ہے' تعبیر اور عنوان نہایت سہل اور مضامین نہایت دقیق ایک عامی آدمی سمجھے گا تو اپنی بساط کے مطابق سمجھے گا۔ اسی کلام کو ایک حکیم پڑھے تو اس میں سے حکمت کی باتیں نکالے گا' اسی کلام کو ایک عارف باللہ پڑھے تو معرفت کی باتیں نکالے گا۔ تو کلام چھوٹا سا ہے مگر مضامین اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ احادیث کا ذخیرہ آپ کے سامنے ہے ان کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی حد ونہایت نہیں۔ حدیث ایک ہے۔ ہر عالم نئی سے نئی اس کی شرح کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے' ایک عالم ایک ایک پہلو لیتا ہے تو اس پہلو سے بے انتہاء علوم نکلتے چلے آتے ہیں دوسرا عالم دوسرے پہلو پر غور کرتا ہے تو اس سے بے انتہاء علم نکلتا چلا آتا ہے۔ حدیث ایک ہوتی ہے اس کے اندر سے ہزاروں دقائق اور معانی نکلتے آتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم **افصح العرب والعجم** ہیں لیکن آپ خود فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں میں بھی عاجز ہوں کہ میں ایسا کلام نہیں لاسکتا۔ کہ خدا ہی کا کلام ہے۔ تو ایک حد ایسی پیدا ہوئی کہ خالق ہی اس تعبیر کے اوپر قادر ہے۔ مخلوق کو قدرت نہیں دی گئی۔ تو تمام صفات میں' سمع' بصر' قدرت اور حیات ہو ان میں جیسے ایک حد اعجاز نکلتی ہے تو کلام میں بھی ایک حد اعجاز ہے اور وہی حد اعجاز معجزہ کہلاتی ہے ___ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معجزہ دیا گیا ہے۔

اعجاز کلام

قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے ثبوت میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے دلائل پیش کئے گئے ہیں ___ موٹی سی ایک بات یہ ہے جو سمجھنے کی ہے۔ ہر شخص اسے سمجھے گا کہ ہر انسان پر مختلف کیفیات آتی ہیں جس کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے اس حالت میں جو وہ کلام کرتا ہے وہی کیفیت اس کے کلام میں ہوتی ہے۔ اگر وہ یوں چاہے کہ اس وقت میرے کلام میں دوسری کیفیت آجائے اسے قدرت نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص غمگین بیٹھا ہوا ہے خدانخواستہ کوئی میت ہوگئی' اس کا قلب غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وقت وہ جو بھی کلام کرے گا اس میں غم کے اثرات نمایاں ہوں گے۔ اگر وہ یہ چاہے کہ میں اس وقت خوشی کا کلام کروں اسے قدرت نہیں ہوگی۔ اگر وہ تصنع اور بناوٹ کر کے چاہے بھی کہ میں خوشی کا بھرا ہوا کلام کروں۔ ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس وقت غم کی کیفیت غالب ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہوگا' وہی چیز اس

کے کلام میں آئے گی۔

اگر ایک شخص پر خوشی ہے اس کے ہاں شادی ہو رہی ہے وہ جب بھی بولے گا۔ اس کے ہر ہر لفظ سے بے ساختہ خوشی ٹپکے گی۔ اگر وہ یوں چاہے کہ میں ایسا کلام کروں جس سے بے انتہاء غم ٹپکتا ہوا ہو۔ اس کی قدرت میں نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت خوشی سے مغلوب ہے۔ تو ہر کیفیت انسان پر جب آ کر غالب ہوتی ہے اس کیفیت کے تحت جب بھی کلام کرے گا تو کلام میں اسی کیفیت کا غلبہ ہوگا۔ ایک کیفیت سامنے آئے گی۔ دوسری مغلوب ہوگی۔

لیکن قرآن کریم کو دیکھا جاتا ہے ایک وقت میں ایک آیت نازل ہوئی اس کی ابتداء میں بے انتہاء جلال خداوندی کا اظہار معلوم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے جملہ میں بے انتہاء جمال معلوم ہوتا ہے کہ بے انتہاء بشارتیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر جنت کا ذکر ہے تو اسی کے ساتھ دوزخ کا ذکر ہے اور جس وقت ہم پڑھتے ہیں تو یہ کیفیات ہمارے قلوب کے اوپر طاری ہوتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متضاد کیفیات برابر چل رہی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان تو ابن الحال ہے' ہر حال اس پر غالب آتا ہے جیسا حال ہو گا ویسا کلام کرے گا ___ لیکن حق تعالیٰ شانہ پر کوئی چیز غالب نہیں آ سکتی۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ۔

نہ خوشی غالب آ سکتی ہے نہ غمی۔ خوشی اور غمی اس کی پیدا کردہ ہے ___ اس لئے جب وہ کلام کریں گے تو اگر چاہیں کہ اس میں خوشی کی کیفیات بھری ہوئی ہوں اس میں پیدا کردیں گے۔ اگر چاہیں کہ غمی کی کیفیات ہوں تو وہ پیدا کردیں گے کیونکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہیں ___ تو قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے اندر جو لمبی آیت ہو کئی متضاد کیفیات پوری قوت کے ساتھ برابری سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کلام بشر کی طاقت سے خارج ہے بشری کلام نہیں بلکہ اس ذات کا کلام ہے جو ہر چیز کے اوپر غالب ہے اس کی صفات اور اس کی شانیں اس کے اندر بھری ہوتی ہیں جب آدمی پڑھے اور سمجھ بصیرت کے ساتھ پڑھے تو کچھ کیفیات قلب پر مترشح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

معرفت اوصاف متکلم

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کلام میں متکلم کے اثرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام کو پڑھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ کسی عالم کا کلام ہے یا جاہل کا؟ شاعر کا ہے یا غیر شاعر کا؟ ___ اس کے کلام کے طرز بیان اور مضامین کو دیکھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا کلام ہے یا ایسے شخص کا جس میں فلاں صفت غالب ہے۔

___ غرض کلام میں خود متکلم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اگر متکلم کو دیکھنا ہو اس کا کلام پڑھ لو تو اس کی کیفیت عیاں ہو جائے گی۔

اورنگ زیب کی بیٹی ''زیب النساء'' یہ بڑی شاعرہ تھی۔ اس کا کلام بہترین ہوتا تھا۔ مشاعرے جب ہوتے تھے تو اس کا کلام بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو عاقل خان جو اورنگ زیب کے زمانے کا بڑا عہدہ دار بھی تھا اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اس کی زبان سے کہیں یہ جملہ نکلا کہ کاش میں اس شاعرہ کو کہیں دیکھتا جس کا اتنا اونچا کلام ہے' اتنی اس میں بلاغت ہے۔

یہ جملہ زیب النساء کو پہنچا ___ زیب النساء نے اس کا جواب ایک شعر میں دیا۔ اگر تو مجھے دیکھنا چاہتا ہے

تو دیکھ سکتا ہے۔ میں اس کی تدبیر بتلائے دیتی ہوں۔ اس نے یہ شعر لکھ کر بھیجا کہ ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

میں اپنے کلام میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہوں جس طرح سے گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہے ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے' میں نمایاں ہو جاؤں گی ___ غرض ہر کلام میں متکلم کے اوصاف چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعراء کے کلام کی فصاحت وبلاغت کے درجات آپ اسی طرح سے قائم کرتے ہیں کہ اگر بہت اونچا شعر ہے آپ کہتے ہیں کہ کسی بڑے اونچے شاعر کا ہے۔ اگر معمولی کلام ہے آپ کہتے ہیں کہ ہاں تک بندی ہے۔

ایک بات مجھے یاد آئی کہ ہماری اردو زبان میں ایک محاورہ ہے "آنکھیں چار ہونا" اور یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب محبت کا اشارہ کنایہ کرنا ہوتا ___ اس محاورے کو استاذ ذوق نے نظم کیا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا

ایک دوسرا شاعر ہندو اس نے بھی یہی مضمون بیان کیا۔ مگر اس مضمون کو اونچا کر دیا۔ وہ کہتا ہے ۔

دل کی نہیں تقصیر کمنڈ آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

یہ ایک ہی بات دو شعروں میں ادا کی گئی۔ مگر جاننے والوں نے جان لیا کہ اس مضمون کو دوسرے شعر میں جس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے وہ بہ نسبت پہلے پیرائے کے بلند پیرایہ ہے۔ تو کلام کے اندر فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے مراتب اور تفاوت فصحاء وبلغاء سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ بہترین کلام ہے اس سے زیادہ بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جب انسانوں کے کلام میں ایسے درجات نکلتے ہیں کہ کہ بعض موقعوں پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہل ممتنع ہے اس سے آگے اب بہتر نہیں ہو سکتا۔

متکلم حقیقی

تو اللہ کے کلام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ پائی جانی چاہئے۔ جب وہ کلام کرے تو اس درجے کا بدیع ہو کہ اس سے بہتر ناممکن ہو۔ انسانی کلام کتنا ہی بدیع ہو مگر اس سے بہتر ممکن تو ہو گا اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح وبلیغ انسان پیدا ہو جائے۔ لیکن اللہ جو کام کرے گا یا کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کا نظیر ہے نہ اس کے کلام کا نظیر ہو سکتا ہے نہ اس کے لئے کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہو سکتا ہے۔ اس لئے فرما دیا گیا کہ :

لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ۔

اس کے کلام کے مثل کوئی نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ اس کی ذات وصفات کا مثل کوئی موجود نہیں۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ

اس کی ذات کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے' وہ سمیع اور بصیر ہے۔

جب ذات بے چوں اور بے چگون ہے اور صفات کی کوئی نظیر نہیں ہے تو پھر افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ تو صفات میں سے کلام بھی ہے۔ کلام کرنے کا حق تو اللہ ہی کا ہے۔ ہم اور آپ متکلم تو اس کے پرتو سے بن گئے ہیں اگر کلام کا پرتو نہ پڑے تو ہمیں متکلم ہونا نصیب نہیں ہو سکتا۔ سمع اور بصر اس کی صفت ہے۔ اس کا پرتو پڑا تو ہم بھی سمیع اور بصیر کہلائے۔ موجود حقیقی وہ ہے۔ اس کے وجود کا پرتو پڑا گیا تو ہم موجود کہلانے لگے۔ ورنہ ہم میں کوئی اپنا ذاتی اور اصلی وجود نہیں ہے۔ تو جب ہماری ہر چیز حق تعالیٰ کے پرتو سے ہے' اصل صفات اس کی' ظلی صفات ہماری ہیں' اصل وجود اس کا ظلی وجود ہمارا' اصل کلام اس کا ظلی کلام ہمارا تو اصل فصاحت وبلاغت اس کی ہوگی ہماری فصات وبلاغت ظلی ہوگی۔

غرض جب اصل فصاحت وبلاغت ہمارے اندر ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایک کا ظل دوسرے ظل کے مشابہ ہو سکتا ہے۔ اصل کے مشابہ تو جب ہو جب کوئی دوسرا اصل پیدا ہو اور اصل ایک ہے تو اصل کلام ایک ہی رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے حقیقت میں جیسے افعال کے معجزے ظاہر فرمائے زمین ایک معجزہ ہے' آسمان ایک معجزہ ہے' چاند اور سورج ایک معجزہ کہ جن کی نظیر لانے کی کسی کو قدرت نہیں' تو کلام کا معجزہ بھی ظاہر فرمایا اور وہ قرآن کریم ہے جس کا مثل ناممکن تھا۔ نہیں لایا گیا اور آج تک نہیں لایا گیا۔

دنیا کی اقوام نے دن رات مقابلے کئے مگر اس جیسا کلام لا کر پیش کر دیں۔ جس میں ویسی ہی معنویت ہو اتنے ہی پہلو بھرے ہوئے ہوں' اتنی ہی جامعیت ہو اور اتنی ہی فصاحت وبلاغت ہو یہ کوئی نہ کر سکا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے یعنی خدا کا کلام ہے بشر کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجاز نمائی

پھر یہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی قرآن کریم نے معجزات بنائے اس واسطے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے سے بڑے بڑے اکابر اولیاء پیدا ہوئے ان اولیاء کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہوئیں تو قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ہاتھ پر معجزہ نمایاں بھی کرتا ہے ___ فرق اتنا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر جو خرق عادت ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ ولی کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہو اسے کرامت کہتے ہیں۔ ابو حنیفہؒ سفیان ثوریؒ وغیرہ یہ اکابر مجتہدین گزرے ہیں یہ انبیاء نہیں تھے مگر نبیوں جیسے کام کئے ایک ایک نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو ایمان سے رنگا اور ایک ایک خطہ کو ایمان واسلام سے رنگین بنا دیا۔

صوفیاء کے طبقے پر نگاہ ڈالو ___ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ کے بارے میں کسی مسلمان کی نہیں بلکہ ایک عیسائی کی شہادت ہے۔ جس کا نام مسٹر آرنلڈ ہے' اس نے پریچنگ آف اسلام کتاب لکھی ہے کہ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ کے دست مبارک پر ننانوے لاکھ آدمیوں نے ہندوستان میں اسلام قبول کیا ہے۔ تو ایک فرد نے ننانوے لاکھ کو مسلم بنایا ___ خود حضرت شیخ کے خلفاء کے ہاتھ جو لوگ اسلام لائے' ان کی تعداد الگ ہے ___ تو ایک شیخ معینؒ نے وہ کام کیا جو انبیاء بنی اسرائیل کرتے تھے کہ جس خطے میں بیٹھ گئے' لاکھوں اور کروڑوں کو باایمان بنایا۔ ایمان کی روشنی پیدا کر دی' تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے اور اس پر عمل کی بدولت لوگ ایسے مقامات پر پہنچے' ولایت کے ان مرتبوں پر

پہنچے جن کے ہاتھوں پر خرق عادت اور کرامتیں ظاہر ہوئیں' الہامات ظاہر ہوئے۔

شرائع ظلیہ

یہ جتنے آئمہ مجتہدین ہیں اگر انبیاء علیہم السلام پر اصلی شریعتیں ظاہر ہوئیں تو ان مجتہدین کے قلوب پر ظلی شریعتیں ظاہر ہوئیں۔ یعنی انہوں نے ان ہی شریعتوں میں سے استنباط کر کے مستقل احکام دیئے۔ انہی شریعتوں میں اجتہاد کر کے احکام نکالے اور کتابوں کی کتابیں بھر دیں۔

یہ کتاب وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی کلیات میں جو چیزیں چھپی پڑی تھیں۔ مجتہد کے فہم نے ان کو اندر سے نکال کر کے نمایاں کر دیا یہ الہامی چیزیں تھیں۔ حق تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ڈالیں' انہوں نے ان کو واضح کر دیا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ

مجھے امام احمد بن حنبلؒ جو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں کا واقعہ یاد آیا ___ استاذ بھی امام ہیں اور شاگرد بھی امام ہیں۔ اور دونوں صاحب مذہب اور صاحب فقہ ہیں ___ امام شافعیؒ کا فقہ حجاز میں پھیلا۔ اس لئے کہ ان کی ابتداء حجاز میں ہوئی انتہا مصر میں جا کر ہوئی۔ مصر کی اکثریت شوافع کی ہے۔

امام احمد بن حنبل مغربی ممالک کی طرف گئے۔ تو نجد اور یمن کے اندر حنبلیت پھیلی ہوئی ہے۔ لاکھوں انسان فقہ حنبلی پر چل رہے ہیں۔

چونکہ امام شافعیؒ کا اخیر زمانہ مصر میں گزرا ہے اور امام احمدؒ سے ملاقات کئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ تو امام شافعیؒ نے احمد بن حنبلؒ کے نام خط لکھا۔

> "بہت عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے اور ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مصر آنے کی کوئی صورت بن پڑے تو کوشش کرو مصر آجاؤ۔ جی چاہتا ہے کہ اخیر عمر میں تمہیں ایک دفعہ اور دیکھ لوں ___"۔

امام احمد نے جواب لکھا کہ :

> "میں حاضر ہو رہا ہوں"۔

دن اور تاریخ متعین کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو حاضر ہو رہا ہوں ___ چنانچہ مقررہ وقت پر امام احمد بن حنبلؒ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور اسی تاریخ کو مصر پہنچے جس کا وعدہ لکھا تھا۔ امام شافعیؒ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔

جب امام نکلے تو جتنے علماء تھے سب کے سب امام شافعیؒ کے ساتھ چلے۔ علماء جب چلے تو جتنے حکام اور زعماء تھے وہ بھی ساتھ ہوئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ وقت بھی استقبال کے لئے آگیا۔ ایک بڑا عظیم جبھہ گویا ملک کے اجلہ اور اکابر استقبال کے لئے آئے اور پورے مصر میں خوشی تھی کہ آج امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہے ہیں۔

امام شافعیؒ کی بچیوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کودتی پھرتی ہیں کہ ہمارے ہاں امام وقت مہمان ہونے والا ہے ___ خدا خدا کر کے امام احمدؒ پہنچے' امام شافعیؒ کے ہاں قیام کیا۔

امام شافعیؒ نے کھانا لا کے رکھا ___ امام شافعیؒ کی مہمان نوازی مشہور اور تاریخی چیز ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے عجائبات تاریخ کا حصہ ہیں ___ غرض امام شافعیؒ نے بہت شغف اور توجہ کے ساتھ مہمان نوازی کی اور کھانا لا کر رکھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کھانا، کھانا شروع کیا مگر اس طرح سے کھایا جس طرح کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے اور کافی مقدار میں خوب پیٹ بھر کے کھایا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ معلوم نہیں کتنے وقت کا کھانا نہیں ملا ___ وہ زمانہ تقویٰ اور طہارت کا ہے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے گھر میں امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے یہ کیسا امام وقت ہے، جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے یہ عوام الناس کا کام ہے کہ پیٹ بھر کے کھائیں۔ اتقیاء کا یہ کام نہیں ہے۔ وہ تو سنت کے تابع ہوتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور تابعین کی سنت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھالیا۔ لیکن اس طرح سے گر پڑ کے کھانا کہ بہت وقت کا بھوکا ہے یہ شان اتقیاء کی نہیں ہے۔ تو یہ کیسا امام وقت ہے؟

امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا ___ فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے۔ مگر میں بول یوں نہیں سکتا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میری زبان سے یہ نکلا کہ بھائی کم کھاؤ۔ تو یہ موضع تہمت ہوگا کہ میں شاید اپنی روٹی بچانا چاہتا ہوں ___ اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں مگر حیرت مجھے بھی ہے کہ احمد بن حنبلؒ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا؟ کھانے کی طرف اس طرح سے متوجہ کیسے ہوئے؟

رعایت مقام

اتقیاء کے کھانے کی شان یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب جہاد میں جاتے تھے تو یہ نہیں تھا کہ سامان رسد کے طور پر وہاں انڈے کیک اور پیسٹریاں پہنچتی تھیں۔ کچھ سوکھے ٹکڑے زنبیلوں میں بھرے ہوئے ہیں بہت بھوک لگی۔ چبا کر کھالئے۔ کسی کے پاس وہ بھی نہیں کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں وہ کھالیں۔ یہ بھی نہ ہوا تو بعض کے پاس گٹھلیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں، گٹھلیاں منہ میں ڈال لیں گویا نفس کو بہلا دیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں اور نفس سمجھ گیا کہ مجھے میری غذا مل گئی تو غذائیں یہ تھیں اور چوبیس گھنٹے جہاد میں مصروف تھے ___ یہ روحانی و معنوی قوت ہوتی تھی۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے ایک بادام بھی کوئی غذا ہے۔ شراح لکھتے ہیں کہ وہ خود حضرت شیخ ہیں۔ اپنے کو چھپانے کے لئے ایسے لکھا کہ میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے

اور حالت یہ تھی کہ ان کے ایک تراجم میں موجود ہے رات کو جب ذکر اللہ کرتے تھے تو اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ سرائے میں ذکر کرتے تھے، دو فرلانگ پر شہر ہے ہر گھر میں اس طرح پر آواز پہنچتی تھی جیسے ہمارے دروازے پر بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں یہ ان کی قوت کی حالت تھی۔ یہ روحانی و معنوی قوت تھی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ دو دو مہینے ایسے گزرتے تھے کہ بیت نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا اسودین پر گزر ہوتا تھا ایک کھجور کھالی، ایک کٹورا پانی پی لیا، یہ غذا ہوتی تھی اور جب صوم وصال رکھنے پر آئے تو یہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔

بہرحال انبیاءؑ کی شان بھی کھانے پینے کے بارے میں انتہائی تقلیل کی ہے‘ صحابہ‘ اولیاء اور اتقیاء کی شان بھی انتہائی قلت کی ہے ___ اتقیاء کی یہ نظیریں سامنے تھیں‘ ان کو سامنے رکھ کر لڑکیوں نے اعتراض کیا کہ احمد بن حنبلؒ کیسا متقی شخص ہے؟ اور کیسا امام ہے یہ جس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ___؟

امام شافعیؒ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا اور فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے مگر میں میزبان ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ خیر وہ بات ختم ہو گئی۔

عشاء کا وقت آیا اور امام احمد بن حنبلؒ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے امام احمد کے لئے بستر کیا اور لوٹا بھر کر پائی کار کھا تاکہ رات کو تہجد کے لئے اٹھیں تو تکلیف نہ ہو۔ لوٹا بھرا بھرایا مل جائے۔ رات کا یہ سب سامان کر کے بچیاں چلی گئیں۔

امام احمدؒ تشریف لائے چارپائی پر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کو جب اٹھ کر گئے۔ بچیاں بستر تہ کرنے آئیں تو معلوم ہوا لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے ___ اب تو ان کے غصہ کا پارہ انتہائی طور پر چڑھ گیا اور انہوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑ کے کہا کہ یہ تمہارے شاگرد جن کو تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے اور اتقیاء امت میں سے ہیں کیسا متقی ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے؟ اور رات کے اوقات میں نوافل پڑھنے کی اسے توفیق نہ ہو؟ تہجد یہ نہ پڑھے؟ یہ کیسا نئی قسم کا امام ہے ___ اب امام شافعیؒ سے بھی ضبط نہ ہو سکا آخر احمد بن حنبلؒ کے استاد تھے۔ تو بُلا کر کہا کہ :

اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔ میں کل سے دیکھ رہا ہوں اور صبر کر رہا ہوں تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ میں اس لئے نہیں بولا کہ میں میزبان تھا۔ میرے اوپر تہمت آتی۔ بہرحال میں نے صبر کیا۔

لیکن اب جب دیکھا کہ رات کو تہجد تک کی توفیق نہیں ہوئی‘ تو میرے سے نہ رہا گیا۔ تو تمہارے حالات میں یہ تغیر کب سے پیدا ہوا ___؟ یہ تو افسوسناک حالات ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ ہنسے اور عرض کیا‘ حضرت! واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔

شان عمل اور شان اجتہاد

فرمایا کیا واقعہ ہے ___؟

کہا کہ واقعہ یہ ہے آپ کو میرے زیادہ کھانے کے اوپر اعتراض ہوا۔ حقیقۃً میں نے زیادہ کھایا ہے اور کافی کھایا۔ عمر میں کبھی اتنا نہیں کھایا تھا جتنا یہاں کھایا ___

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا دستر خوان بچھا تو اتنی حلال کی کمائی تھی اس کے اوپر آسمان سے انوار و برکات کی بارش تھی‘ میں نے عالم میں اتنی پاک کمائی نہیں دیکھی۔ میں نے ارادہ کیا جتنا زیادہ سے زیادہ کھا سکوں کھالوں ممکن ہے پھر ایسی پاک غذا مجھے نصیب نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے زیادہ کھایا چاہے مجھے سات دن روزے رکھنے پڑیں۔ مگر اتنا منور اور بابرکت لقمہ حلال میں نے آج تک عالم میں نہیں دیکھا۔

اور فرمایا اس کھانے کی دو برکتیں میرے اندر نمایاں ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی ___ عملی برکت تو یہ نمایاں ہوئی کہ میں نے آج عشاء کے وضو سے تہجد پڑھی اور صبح کی نماز بھی پڑھی یہ وجہ ہوئی لوٹا استعمال نہ کرنے کی۔ وہ بھرا ہوا رکھا رہ گیا۔ میں رات بھر عبادت میں رہا۔

اور علمی برکت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن حکیم کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے نکالے اور علوم کے

دروازے مجھ پر کھل گئے۔ یہ لقمۂ حلال کی غذا کی برکت تھی۔

شرط معرفت

حقیقت یہ ہے کہ نور معرفت حلال غذا سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لقمہ حلال کا ہو۔ ایمانی وروحانی قوتیں لقمۂ حلال کے تابع ہیں۔

انسان کا پیٹ حوض بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے گا نلوں اور نالیوں میں بھی وہی آئے گا۔ اگر پیٹ میں پاک غذا ہے تو قلب میں پاک آثار آئیں گے اور دماغ میں بھی۔ اقوال بھی پاک نکلیں گے اور اگر لقمہ حلال نہیں ہے پھروہی ظلمت اور کدورت ملے ہوئے اقوال وافعال ہوں گے۔ اور ایسی ہی حرکات بھی ہوں گی۔

اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ لقمہ حلال کا اہتمام کرتے تھے کہ ہماری کمائی پاک ہو۔ اس کمائی سے ہی قلب میں نور معرفت پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے شاہ جی عبداللہ صاحب ان کا نام تھا۔

بے پڑھے لکھے امی محض تھے۔ مگر صاحب نسبت بزرگوں میں تھے انہوں نے اپنے گزر اوقات کا ذریعہ گھاس کھودنا وغیرہ مقرر کر لیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھڑی بیچتے تھے۔ اور گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے۔

دیوبند میں جتنے لوگ اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدتے تھے' منڈی میں جب پہنچتے تو سینکڑوں گٹھڑیاں گھاس کی ہوتی تھیں۔ مگر سب منتظر رہتے تھے کہ ہم شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے ہر ایک اس کوشش میں ہوتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہمارا جانور ان کا لایا ہوا گھاس کھائے گا تو گھر میں برکت ہوگی۔

جب شاہ جی عبداللہ صاحب نظر پڑتے تو لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے بس جس نے جا کر پہلے ہاتھ لگایا۔ شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے۔ اور چھ پیسے لے لیتے تھے۔

اس چھ پیسے کی تقسیم ان کے ہاں کیا تھی ___؟

دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ ان دو پیسوں میں اس زمانے میں کچھ ادھیلے کچھ پائیاں ملتی تھیں تو وہ ایک ایک دو دو بچوں کو' یتیموں کو' بیواؤں کو اور غریبوں کو وہیں کھڑے کھڑے تقسیم کر دیتے ___ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ کچھ تیل لے لیا' کچھ نمک' لکڑی وغیرہ سستا زمانہ تھا تو دو پیسے روز میں گھر والوں کا خرچ ہو جاتا تھا۔

اور دو پیسے جو بچتے تھے۔ انہیں جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب وہ چھ سات روپے بن جاتے اس رقم سے ہمارے اکابر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ 'حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ' حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی دعوت کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں۔ یہ فقط عالم ہی نہیں عارف باللہ بلکہ صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ سال بھر ہمیں شاہ جیؒ کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ان کے گھر کا کھانا کھائیں' اور فرمایا جس دن کھانا کھاتے تھے۔ تو چالیس چالیس دن قلب میں نور رہتا تھا اور قلب میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی عبادت کر لیں' نوافل پڑھ لیں' تلاوت کر لیں۔ ہر وقت طاعت وعبادت کو جی چاہتا تھا۔ اس اکل حلال کی یہ

برکت قلوب میں نمایاں ہوتی تھی۔

سلب توفیق

لقمۂ حلال در حقیقت ایسی چیز ہے کہ اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے۔ آج کی بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں ہے۔ علم تو عام ہو گیا۔ ہر شخص جانتا بوجھتا ہے۔ پھر بھی بد عملی ہے؟ توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے ــــ اور توفیق لقمۂ حرام یا مشتبہ لقمہ کی وجہ سے سلب ہوتی ہے اکل حلال پورا میسر نہیں ہے۔ بقول غالب کے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لئے کہ مشتبہ غذاؤں نے طبیعت پر بندش عائد کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے توفیق سلب ہو جاتی ہے ــــ غرض آج کے گناہوں کا سبب لاعلمی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت کی قساوت یا ظلمت یا عدم توفیق یا سلب توفیق یہ چیزیں باعث بنتی ہیں۔ اس لئے کہ لقمہ صحیح نہیں رہا۔

میں دیکھا کرتا ہوں' یہاں تو نہیں مگر ادھر اپنے نواح میں دیکھا ــــ یہ جو آج کل شوگر مل ہر جگہ ہیں۔ ہمارے ہاں دیوبند سے لے کر دہلی تک ہر اسٹیشن پر ایک شوگر مل ہے۔ اس کی وجہ سے گنے کی کاشت بڑھ گئی۔ تو گنے ریل گاڑی اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ بعض مل والوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریلیں ڈلا رکھی ہیں تو وہ کھیتوں میں گھومتی ہیں اور وہاں سے گنا مل میں پہنچاتے ہیں تو مال گاڑی کے ڈبے ہر وقت بھرے ہوئے کھڑے رہتے ہیں ــــ تو میں نے دیکھا کہ مسافر جب اترتے ہیں دیکھتے ہیں کہ مال گاڑی گنوں سے بھری کھڑی ہے تو کوئی بیس گنے کھینچ لایا' کوئی چالیس کوئی پچاس اور کھا رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھا کرتا ہوں کہ یہ لوگ گویا یوں سمجھ کے کھا رہے ہیں کہ ان کے باپ کا مال ہے۔ انہیں کوئی احساس نہیں کہ یہ غیر کا مال ہے۔ ہمارے لئے اس کا کھانا حلال ہے یا حرام ہے۔ کوئی حس باقی نہیں جیسے جانور' مثلاً بیل جس کھیت میں گھسا' منہ مارتا ہوا چلا گیا' اسے اس کی کیا تمیز کہ میرے مالک کا کھیت ہے یا غیر کا۔ یہی حالت انسانوں کی ہو گئی ہے۔ بس کھانے کی چیز سامنے آنی چاہئے۔ پھر حلال ہو یا حرام۔ بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ! ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہو گی؟ اس قسم کے مال سے سوائے قساوت' ظلمت اور تاریکی کے اور کیا پیدا ہو سکتا ہے۔ لقمۂ حرام سے نیکی کا جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ نیکی کا جذبہ ہمیشہ لقمۂ حلال سے ابھرے گا۔

پچھلے زمانے میں اہل اللہ جب بیعت کرتے تھے' پہلی شرط یہ لگاتے تھے کہ لقمۂ حلال بھی میسر ہے یا نہیں؟ اگر تمہاری غذا مشتبہ ہے تو سارا دن بھی ذکر اللہ کرو گے تو قلب کے اوپر آثار نمایاں نہیں ہوں گے۔ اس لئے لقمۂ حلال کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاک کمائی سے نور معرفت پیدا ہوتا ہے اور پاک کمائی کی طرف جذبہ ــــ ؟ یہ ظاہریات ہے کہ اتباع انبیاء علیہم السلام سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

لقمۂ حلال کی قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔

ایک دوسرے کا مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ حق کے ساتھ کھاؤ' جائز طریق پر کھاؤ' ناجائز طریق پر

مت استعمال کرو۔

یہ چوری، ڈکیتی، رشوت، جو اسب اسی لئے تو ممنوع ہوئیں کہ یہ کمائیاں ناجائز ہیں۔ ان کے کھانے سے قلب پر برا اثر پڑے گا، مشتبہ کمائی سے برا اثر پڑے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں ___ یعنی جن مواقع میں صرف ہوتا ہے۔ ان مواقع کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مال کیسے مواقع سے آیا ہوگا۔ اگر پاک جگہ پر خرچ ہو رہا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ پاک طریق پر کمایا گیا ہے ___ اگر ناپاک مواقع پر صرف ہو رہا ہے، میں سمجھ لیتا ہوں یقیناً ناجائز طریق پر کمایا گیا ہے، پاک مال کبھی بھی ناپاک جگہ پر خرچ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ناپاک مال پاک جگہ پر نہیں لگ سکتا۔

مشتبہ چندے سے احتراز

دارالعلوم دیوبند میں بمبئی کے سیٹھ آئے تھے۔ لکھ پتی لوگوں میں سے تھے دارالعلوم کو دیکھا۔ بہت خوش ہوئے پسند کیا اور اعلان کیا کہ پچیس ہزار روپیہ بھیجوں گا ___ تو ہمارے بزرگوں نے اس کے اوپر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا ___ جیسے مثلاً یہ ہوتا کہ انہوں نے اعلان کیا تھا اس پر کوئی شکریہ ادا کیا جاتا یا کوئی دعائیہ کلمات کہے جاتے، جس سے ان کا دل بڑھتا ___ بس چپ ہو کر بیٹھ گئے ___ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بے چارے نے تو کتنی جی داری کا ثبوت دیا۔

پچیس ہزار ___ یہ آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے۔ پینتالیس برس پہلے پچیس ہزار کی قیمت ایسی ہی ہے جیسے اسی ہزار ___ پھر دینی مدارس میں پچیس ہزار کی رقم آئے تو ان کے مصارف تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے بلحاظ مصارف وہ رقم بہت تھی ___ تو بظاہر ان کا کوئی شکریہ یا دعاء وغیرہ کے کلمات یا خوشی کا کچھ غیر معمولی اظہار ہوتا۔ سارے ہی چپ بیٹھ گئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی ___ خیر وہ سیٹھ صاحب اعلان کر کے چلے گئے ___ ایک مہینہ گزرا، دو مہینے گزرے۔ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے عرض کیا کہ آپ نے یاد دہانی نہیں فرمائی۔ دارالعلوم کو اگر اتنی رقم مل جاتی تو دارالعلوم کے بہت سے کام چلتے۔ ایک شخص نے وعدہ کیا اعلان کیا کم سے کم وعدہ کی یاد دہانی فرمادیں۔ میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئے ___ پھر مجھے حیرت ہوئی کہ اس شخص کو نہ شکریہ نہ دعا دی اور اب بھی یاد دہانی کے لئے کہہ رہا ہوں تو چپ ___ پھر میں نے کسی دوسرے وقت یاد دہانی کرائی کہ کم سے کم ایک خط تو لکھ دیں کہ بھائی یہ رقم بھیج دے ___ اس وقت کچھ منہ بنا کر فرمایا کہ:

"یہ رقم دارالعلوم میں آ نہیں سکتی"۔

میں نے کہا آخر کیوں؟ ___ فرمایا:

ان کا سارا کام سود بٹے پر چلتا ہے۔ آبکاری کے محکمے میں ان کی ملازمت ہے اور اسی قسم کی ان کی ساری کمائی ہے۔ وہ کمائی یہاں نہیں آئے گی نہ یہاں چلے گی اور نہ انہیں بھیجنے کی توفیق ہوگی۔ ہم کیوں یاد دہانی کرائیں ___ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ ان حضرات کو ہمیشہ ایسی کمائی کا چندہ قبول کرنے سے انکار رہتا تھا۔ جس کو یہ مشتبہ سمجھتے تھے ___ اور وہ اس بنا پر کہ اگر چندہ صرف کیا گیا تو طلباء پر بھی وہی اثر پڑے گا، ان کے علم میں برکت نہیں رہے گی۔ ان کی معرفت ختم ہو جائے گی۔ اس واسطے گریز کرتے تھے۔

بہر حال اہل اللہ کے ہاں یہ مسئلہ ہمیشہ بہت ہی زیادہ قابل توجہ رہا ہے کہ کمائی مشتبہ نہ ہونی چاہئے۔ پاک ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اسی پر توفیق اور اعمال کا دارومدار ہے۔ تو تقلیل تو بجائے خود ہے کہ حلال میں سے بھی کم سے کم ہو۔ یہ تو خیر بڑوں کی شان ہے۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو رکھیں کہ کمائی حرام اور مشتبہ نہ ہو۔

شان اتقیاء

تو میں نے عرض کیا کہ آج بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب ہیں ہمارے اندر احتیاط باقی نہیں ہے۔ تقویٰ اور طہارت چھوڑ فتویٰ بھی باقی نہیں کہ فتویٰ کے مطابق ہماری کمائیاں صحیح ہوں ___ سب کو میں نہیں کہتا الا ماشاء اللہ ایسے آج بھی موجود ہیں جو برابر اپنی کمائی میں احتیاط کرتے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہ امت خالی نہیں ہوگی ___ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ۔

میری امت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بارش۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زمین کے لئے بارش کا پہلا قطرہ زیادہ نافع ہوا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ یعنی میری امت میں خیریت مشترک ہے۔ کمی اور زیادتی کا فرق رہے گا۔ لیکن خیر سے امت کبھی خالی نہیں ہوگی۔ اس لئے متقیوں سے یہ امت کبھی خالی نہیں ہوسکتی ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا ہے فرمایا :

لا تزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خالفھم ولامن خذلھم حتی یاتی امر اللہ۔

میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہے گا جو منصور من اللہ ہوگا' موید من اللہ ہوگا' حق کہتا اور سناتا رہے گا' حق ہی پر عمل کرتا رہے گا۔ اس کے خلاف کرنے والے اس کو گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں لفظ طائفۃ فرمایا یعنی چھوٹی جماعت۔ یہ تو ہوگا کہ وہ کم ہو جائیں گے۔ مگر موجود رہیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ امت میں باقی نہ رہیں گے اسی طرح فرمایا :

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ۔

فرمایا میری امت ساری کی ساری مل کر گمراہی پر جمع نہیں ہوگی اہل حق اس میں ضرور باقی رہیں گے اور اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ خدانخواستہ سارے کے سارے (ایسے مشتبہ حرام کمائی والے) ہی ہیں۔ مگر ہاں اکثریت ایسوں کی ہوگئی ہے۔ قلیل طبقہ ہے جو احتیاط برتتا ہے اور تقویٰ وطہارت کو پیش نظر رکھتا ہے ___ تو بات اس پر یاد آئی تھی کہ لقمۂ حلال سے ہی انسان میں توفیق ہوتی ہے نہ صرف عمل کی بلکہ اس سے علم اور معرفت بھی پیدا ہوتی ہے۔

کمال دانشمندی

تو امام شافعیؒ اس وقت خوش ہوئے اور لڑکیوں سے کہا کہ دیکھا تم نے کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے؟ یہ امام کی شان ہے کہ وہ قلیل کھائے تب اس میں سے دین پیدا کرلیتا ہے۔ کثیر کھائے تب اس میں سے دین پیدا کرلیتا ہے۔ تو دیندار حقیقی معنی میں وہی ہے کہ اس کو دنیا جہاں بھی ملے وہ اس میں سے اپنے لئے دین

پیدا کرلے۔ یہ بدعقلی ہے کہ آدمی دین کو بھی دنیا بنالے اور دانش مندی یہ ہے کہ دنیا میں سے اپنے حق میں دین اور خیر نکال لے۔

غرض امام شافعیؒ اس پر بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا کہ دیکھو امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے۔

بات اس پر یاد آئی تھی کہ اکل حلال اور قلیل کھانے میں بہرحال ایک نور اور ایک معرفت ہے اور اس سے آدمی چلتا ہے۔

عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثلت

تو قرآن کریم ایک معجزہ ہے' اس پر چل کر لوگ ولی بنے' کامل بنے اور امت اولیاء سے بھر گئی اور ایسے ایسے اولیاء کاملین پیدا ہوئے جو :

كانبياء بنى اسرائيل-

تھے' وہ نبی نہیں تھے' مگر انہوں نے کام ایسے کئے جیسے نبیوں کے ہوتے ہیں۔ نبیوں پر اگر وحی آتی تھی تو ان پر الہام ہوا۔ نبیوں کے ہاتھوں پر اگر معجزے ظاہر ہوئے تو ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں ___ نبیوں نے اگر اصلی شرائع پیش کیں تو انہوں نے شرائع وضعیہ پیش کیں جنہیں اجتہادی شرائع کہتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام سے مماثلت پیدا ہوگئی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

كانبياء بنى اسرائيل-

یہ حدیث گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ مگر اس کے ہم معنی اور بھی حدیثیں ہیں۔ مضمون قدر مشترک کے طور پر ثابت ہے کہ اس امت کے اولیاء' اتقیاء اور علماء کارناموں اور کارگزاری کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کے مثل ہوئے ہیں۔ یہ ان کی ساری چیزیں عمل بالقرآن سے پیدا ہوئی ہیں۔

تو بات اس پر چلی تھی کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزے بناتا بھی ہے۔ یعنی معجزے کی شبیہ چیزیں اولیاء کے ہاتھ پر نمایاں ہوتی ہیں جب وہ عمل بالقرآن کرتے ہیں۔ تو قرآن کریم معجزہ ہے جو نبوت کی دلیل ہے۔

علمی معجزے کا امتیاز

اس سے ایک اور بات واضح ہوئی ___ وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دے دیئے گئے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ علمی معجزہ بھی دیا گیا' عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے ___ لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ مگر اس کا علم باقی رہتا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن علمی معجزہ قرآن کریم ہے جو آج تک باقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

دوام کتاب دوام نبوّت کو مستلزم ہے

موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ آج ان کی نبوّت پر ایمان لے آؤ اور دلیل مانگی جائے تو نہ عصاء موسیٰ ہے نہ ید بیضاء ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں آج نہ احیاءِ موتی ہے نہ ابراء اکمہ وابرص ہے، جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ شعیب علیہ السلام کی نبوّت کو پیش کیا جائے تو ان کی نبوّت کی کوئی دلیل موجود نہیں ___ لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کو پیش کیا جائے اور دلیل کا مطالبہ ہو تو یہ دلیل موجود ہے، یہ معجزہ کلامی اور علمی ہے۔ جو عالم کے دنیا سے اٹھنے کے بعد ختم نہیں ہوگا بلکہ آج بھی بدستور موجود ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی ابدی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کی دلیل قائم ہے ___ غرض اور انبیاء علیہم السلام کی نبوّتیں حق ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں سچی ہیں مگر آج ان کے دلائل عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی دلیل آج دنیا میں موجود ہے اس لئے نبوّت قائم ہے اور اس کے بارے میں چیلنج کیا جاسکتا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ قرآن کی وجہ سے یہ نبوّت دائمی اور ابدی ہے اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت چونکہ قیامت تک باقی رکھنی تھی اس لئے دلیل نبوّت وہ دی گئی جو باقی رہ سکے ختم نہ ہونے پائے ___ اور وہ "علمی معجزہ" ہے۔

معارضۂ قرآن کا عذاب

معجزے کی شان یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی معجزے کے مقابل آئی ہے، جبھی فنا ہوگئی ___ صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا گیا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال کر دو۔ انہوں نے باذن اللہ اونٹنی نکال کر دکھائی۔ قوم نے اونٹنی کا مقابلہ کیا اور اس کو ختم کیا۔ تو قوم کے اوپر عذاب آیا اور اس کا صفایا کردیا گیا ___ غرض جب بھی دنیا میں معجزے کے مقابل کوئی قوم آئی ہے جبھی گر گئی ___ قرآن کریم ایک معجزہ ہے ___ یہ الگ چیز ہے کہ ہم اپنی سستی یا غفلت سے عمل میں کوتاہی کریں ___ لیکن خدانخواستہ اگر کوئی قوم مدمقابل آئے گی اور قرآن کے معارض پڑے گی۔ تو یقیناً خسارے میں پڑے گی، یقیناً کسی نہ کسی عذاب میں پڑے گی ___ وہ عذاب چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو۔ اس امت پر وہ عذاب تو نہیں آئیں گے جو پچھلی امتوں پر آئے ہیں ___ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ :

> لیس عذاب امتی الخسف والمسخ و الرجف ان عذابها القتل والفتن والزلازل۔
>
> "میری امت کا عذاب یہ نہیں ہے کہ صورتیں مسخ کردی جائیں۔ جیسے پچھلی امتوں کی گئیں یا پوری امت زمین میں دھنسا دی جائے یہ نہیں ہوگا یا پتھر برسا کر ختم کردی جائے یہ نہیں ہوگا یہ عذاب ختم کردیئے گئے"۔

میری امت کا عذاب کیا ہے ___ ؟

فتنے پھیلیں گے، ایک دوسرے کو مزہ چکھائیں گے، ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں گے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔

فرماتے ہیں :

اللہ اس پر قادر ہے کہ اس امت پر اوپر سے عذاب برسادے' نیچے سے عذاب ابھار دے ___ یا ان کے اندر عذاب ڈال دے ___ وہ کیا ہے؟ یَلْبِسَكُمْ شِيَعًا ___ ان میں وہ گروہ بندی پیدا کر دے۔ ایک پارٹی دوسرے کو مزہ چکھاتی رہے' چین سے نہ بیٹھے ___ یہ جبھی ہو گا جب لوگ قرآن "جو معجزہ ہے" کے معارضے پر آئیں گے ___ قرآن کریم کو ماننے پر آئیں 'اختلافات ختم ہو جاتے ہیں' معارضہ کرنے پر آئیں' نزاعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نزاعات کا برا اثر پھر امت ہی کے اوپر پڑتا ہے۔

افتراق امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ

اگر اس کو امام مان کر سارے طبقات اس پر جمع ہو جائیں اور اس کی شرح حدیث ہے' اس پر جمع ہو جائیں اور آئمہ وعلماء راسخین نے جو جو مسائل اس سے استنباط کئے ہیں اس پر جمع ہو جائیں تو فی الحقیقت قوم کو کوئی گمراہ کرنے والا اور مٹانے والا نہیں ہے۔ اس کی قوت بنی بنائی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابدا ان تمسکتم بھما

فرماتے ہیں کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا' اگر تم ان دونوں چیزوں سے تمسک کرتے رہو گے۔ تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے' کبھی مغلوب نہیں ہو گے۔

کتاب اللّٰہ وسنتی۔

اللہ کی کتاب اور میری سنت ___ یعنی اسوہ اور میرا طریق عمل جب ان دو کو اختیار کر لو گے ___ تو ان دو کو ثقلین فرمایا گیا ___ یہ وزنی چیزیں ہیں یہ ہٹنے والی نہیں ہیں' مٹنے والی نہیں ہیں۔

جب طوفان آتا ہے ___ اگر آدمی تنکے کا سہارا پکڑے تو تنکا بھی بہہ جائے گا اور آدمی بھی بہہ جائے گا' کوئی درخت بہتا ہوا آ رہا ہے گو بڑا نظر آئے' مگر وہ بھی بہتا ہے' اسے پکڑے گا تو یہ بھی بہہ جائے گا ___ لیکن اگر آدمی کسی عظیم الشان چٹان کی پناہ لے۔ تو چٹان کو طوفان نہیں ہلا سکتا۔ تو اس شخص کو بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس لئے کہ وہ ثقیل اور وزنی چیز ہے کہ کتاب وسنت کو ثقلین کہا گیا۔ یعنی یہ دو اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹلنے اور ہلنے والی نہیں ہیں۔ ان کو کوئی دوسرا نہیں ہلا سکتا ___ اگر ان دو چیزوں کو ہم مضبوط تھام لیں۔ تو یہ ایسی ثقیل اور وزنی چیزیں ہیں کہ پھر طوفان ہمیں بہا نہیں سکتا۔ یقیناً ہم اپنی جگہ اٹل ہو جائیں گے۔ ایک قوی حجت ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی۔

اگر ہم عقلی حجت پیش کریں تو جس سے بھی ہم کوئی معقول بات کہیں گے وہ کہے گا میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں میں بھی ایک معقول بات پیش کرتا ہوں۔ ہم طبعی بات پیش کریں گے' وہ کہے گا میرے اندر بھی طبیعت ہے' ہم اپنے مزاج کی بات منوانا چاہیں گے' وہ کہے گا میرے اندر بھی مزاج موجود ہے میری بات آپ کیوں نہ مانیں ___ لیکن جب آپ ایسی چیز پیش کریں گے جو سب مزاجوں سے بالاتر اور سب طبیعتوں سے اونچی ہو گی اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں۔ یہ دو ایسی وزنی اور اٹل چیزیں ہوں گی کہ ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔ تو ایک قوی حجت اللہ نے ہمارے ہاتھ میں عطاء کی ہے۔

اور وہ قرآن وسنت ہے کہ یہ اٹل چیز ہے اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں ہے ___ بہرحال قرآن کریم معجزہ بھی ہے معجزہ نما بھی ہے' اس پر چل کر آدمی خود معجزہ نما بھی بن سکتا ہے۔ ہزاروں اولیاء بنے' ہزاروں کاملین تیار ہوئے۔ اسی کتاب وسنت کے عمل نے تیار کئے کہ یہ خود مستقل حجت ہے ___

تو قرآن کریم کو علم کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین علم اس میں ہے' عمل کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین عمل کی کتاب ہے اس کا وظیفہ پڑھو تو وظیفے کی بہترین کتاب ہے اس میں سے حکمت نکالو تو بہترین حکمت کی کتاب ہے آج اس کے علم و حکمت سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔

علوم القرآن

امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے دنیا کی کسی امت نے تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہیں کیا جتنا اس امت نے کیا ہے۔ تصانیف کے راستے ڈال دیتے ہیں۔

تاتار کی جنگ کے موقع پر تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا ہے تو بغداد میں کتنے کتب خانے تھے یہ تو آپ تاریخ میں دیکھیں' تعداد آپ کو معلوم ہوگی۔ صرف ایک کتب خانے کا مؤرخین حال لکھتے ہیں کہ بغداد کے کنارے پر جو دجلہ دریا بہتا ہے اس کا پل توڑ دیا گیا تھا تاکہ دشمن اندر نہ آسکے ___ لیکن بہرحال دشمن اندر پہنچ گئے اور بغداد کو فتح کر لیا ___ پل ٹوٹا ہوا تھا ___ تاتاریوں کو آنے جانے کی ضرورت تھی دریا گہرا تھا تو مسلمانوں کے ایک کتب خانے کو لے کر اس کی کتابوں سے دریا کو بھرنا شروع کیا پاٹتے پاٹتے اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر برابر آجاسکتی تھیں۔ صرف ایک کتب خانے کی کتابوں کا یہ عالم تھا۔

نیز مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی روشنائی سے دھل دھل کر پانی جو بہا ہے تو ایک مہینے تک علماء کو روشنائی لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دریا کا پانی اتنا سیاہ ہو گیا تھا کہ اس سے بے تکلف لکھا جا سکتا تھا۔ تو اندازہ کیجئے جس شہر کے ایک کتب خانہ کا یہ حال ہو اس شہر کے دوسرے کتب خانے کتنے ہوں گے۔ اس ملک میں کتنے ہوں گے۔

اندلس ''اسپین'' کی حکومت جب تباہ ہوئی ہے تو ایک عیسائی عورت نے اس کی تاریخ لکھی ہے جس کا نام **حاضر الاندلس وغابرھا** ہے تو اس میں تعصب دکھلایا ہے کہ عیسائیوں نے تعصب میں آکر ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر تباہ کیا جائے۔ اگر یہ کتابیں باقی رہ گئیں۔ تو ان کا عروج پھر ممکن ہے۔ اس لئے ایک مستقل مہم قائم کی گئی کہ ان کتب خانوں کو ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے افراد چنے گئے۔ ایک محکمہ قائم کیا گیا کہ کتب خانوں کو جلادیا جائے یا دریا برد کیا جائے اور ضائع کیا جائے۔ اس کے لئے ایک مستقل انچارج آفیسر مقرر ہوا ___ تو وہ لکھتی ہے کہ کتب خانوں کی کتابیں لائی جاتی تھیں اور جلائی جاتی تھیں۔ پچاس برس میں جاکر پورے ملک کے کتب خانے ختم ہوئے ہیں' تو اندازہ کیجئے کتنے کتب خانے ہوں گے' ہندوستان کے کتب خانے' آپ کے پاکستان کے کتب خانے' بہت سے قدیم کتب خانے ہیں' جن کو کیڑے چاٹ رہے ہیں' پڑھنے والا کوئی نہیں' ہزاروں کتب خانے اب بھی موجود ہیں جو کیڑوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح حجاز کے کتب خانے' نیز مصر کے کتب خانے' مصری حکومت چھاپتے چھاپتے تنگ آگئی ہے۔ مگر سلف کی کتابیں عشر عشیر بھی نہیں چھپی ہیں' ہزاروں' لاکھوں کی تعداد میں اب بھی باقی ہیں جو چھپ سکتی ہیں۔ یہ اتنا ذخیرہ اس قرآن و سنت ہی کی بدولت تو قائم ہوا۔ یہ علماء نے جو تصانیف کی ہیں یہ قرآن ہی کی تو شرح ہو رہی ہے۔

کتاب مبین کا خاصہ

تو قرآن وحدیث کا اندازہ کیجئے کہ یہ اسلوب بیان کتنا جامع اور بلیغ ہے کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے ہزاروں کتب خانے جمع ہو گئے۔ اب بھی عشر عشیر ہوا ہے۔ ہزاروں' لاکھوں کتابیں اب بھی باقی ہیں جو شرح

طلب ہیں، تو اس سے قرآن کے علم کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علم معجزے کا علم ہے کسی انسان کے علم کی تعبیر میں علم کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوتا کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے صدیاں گزر جائیں اور اس کی شرح ختم نہ ہو۔ یہ کتاب مبین ہی کا خاصہ ہے۔ خدائی کتاب ہے اور اسی کے علم ہی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ علماء، عرفاء، حکماء، عرفاء اور صوفیاء ہزاروں طبقات کھڑے ہوئے اور اس کی شرح کی اور وہ شرح ہوتی جا رہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ :

لا تنقضی عجائبہ۔

قیامت آجائے گی مگر قرآن کریم کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے، برابر چلتے ہی رہے گے اور نکلتے ہی رہیں گے اور آج بھی علماء ہزاروں تصانیف کرتے جا رہے ہیں اور استدلال آیات سے یا احادیث ہی سے ہوتا ہے ___ تو اندازہ کیجئے ایک ایک آیت مستقل ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف تصانیف کی ہیں بلکہ فنون کی بنیاد ڈالی۔ بیسیوں فنون اور علوم ایجاد کئے، ہر ہر فن کے اندر پھر لاکھوں کتابیں ہوئیں۔ تو یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ ___ کہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کہ اس کتاب کے اندر سے اتنا علم نکلتا چلا آرہا ہے کہ لاکھوں کتب خانے بھر گئے، لاکھوں کتابیں بن گئیں اور آج بھی بنتی جا رہی ہیں اور جو نیا مسئلہ یا حادثہ سامنے آتا ہے اس میں سے اس سے اس کا حکم نکلتا چلا آتا ہے یہ سوائے اعجاز کی قوت کے اور کون سی قوت ہے؟

اصلاحی نصاب

بہر حال قرآن کریم معجزہ ہے اور مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ معجزہ انہیں عطا فرمایا اور اللہ کا ایک تبرک جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے وہ ان کے اندر موجود ہے۔ وہ آج بھی اس کی طرف توجہ کریں تو ان کا علم، عمل اور تقویٰ پھر اونچے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے آثار پھر ویسے ہی نمایاں ہو سکتے ہیں جیسا کہ کسی زمانے میں نمایاں ہوئے تھے۔

امام مالکؒ نے فرمایا :

لا یصلح اخر ھذہ الامۃ الابما صلح بہ اولھا۔

اس امت کے اخیر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس چیز سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی ہے۔ تو امت کا اولین طبقہ صحابہ کرامؓ کا ہے۔ ان کی اصلاح کا ضامن یہی قرآن ہوا ہے۔ ان کے کتب خانے میں قرآن کے سوا اور کوئی کتاب نہیں تھی یا قرآن تھا یا اللہ کے رسول کا کلام تھا جو ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اسی نے ان کی اصلاح کی۔ زمانۂ جاہلیت کو تبدیل کیا، اس میں انقلاب پیدا کیا۔ انقلاب پیدا کرنے والی یہی کتاب مبین تھی ___ جو قوم کہ دنیا کی تمام اقوام میں ذلیل سمجھی جاتی تھی، حقارت کی نگاہوں سے عربوں کو دیکھا جاتا تھا۔ وہ پچاس برس کے اندر اندر اتنی اونچی بن گئی کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، حکومتوں میں انقلاب پیدا کر دیئے، دنیا میں جہالت کی بجائے علم کو فروغ دیا اور پھیلا دیا۔ یہ انقلاب ان کے اندر اس کتاب مبین ہی نے پیدا کیا۔ اس کے سوا کوئی اور کتاب نہیں تھی۔ اسی کا علم اور اسی کا عمل تھا۔ جس نے انہیں اتنا آگے بڑھایا۔ تو جو چیز ان کی اصلاح کا ذریعہ بنی وہی آج ہماری بھی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔

مرکز علوم

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم اور فنون کی تعلیم چھوڑ دیں۔ تمام علوم و فنون آپ حاصل

کریں۔ آپ سائنس، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی اور علوم طبعیہ و عقلیہ بھی حاصل کریں ___ لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی تو ہونا چاہئے جس کے ارد گرد وہ گھومیں۔ سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج و تبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کر رہے ہیں یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی، دنیا ہی کار آمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجر و ثواب بھی مرتب ہونا شروع ہو جائے گا۔ اگر دین و کتاب و سنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم و فنون اس کے ارد گرد گھمائے جائیں، جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے اس کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم و فن کام دے گا اور ہر علم و فن باعث اجر اور باعث اصلاح و تقویٰ بنے گا۔

تبریک

بہر حال اس وقت یہ چند کلمات میں نے قرآن کریم کے متعلق اس لئے عرض کئے کہ دار القرآن میں یہ جلسہ ہو رہا ہے تو وہ لوگ مبارک ہیں جنہوں نے دار القرآن قائم کر کے قرآن کے فروغ کا راستہ ڈالا۔ قرآن کے الفاظ کا اور اس کے لب و لہجے کے پہنچانے کا ___ اور یہی پھر آگے قرآنی علوم کو پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو وہ افراد یقیناً قابل مبارکباد ہیں جنہوں قرآن کی تبلیغ اور ترویج کے لئے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی اور قائم کئے۔ اسی میں ہمارے لئے صلاح اور فلاح ہے۔

اس وقت یہ چند جملے اس ذیل میں ذہن میں آگئے تھے جو میں نے عرض کئے۔ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو قرآن کریم پر چلنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

اللهم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، اللهم اعذنا من الفتن ما ظهر منها وما بطن۔

اللهم اجعل القران اماما لنا و اجعله حجة لنا وارزقنا عمله بفضلک العظیم یارب العالمین

اللهم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین وصلی الله تعالی علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد واله وصحبه اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

معارف القرآن

قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں' ایک معانی ہیں' جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں۔ حقائق کے تحت معارف ہیں' اور معارف میں کیفیات ہیں' جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں ___ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ و معانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں' بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب و اذہان کی تربیت و تزکیہ بھی ہے' جو الفاظ و معانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق و معارف کے ادراک کے قابل بھی ہوں' اور ان معارف کی کیفیات کا محل بھی بن سکیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام

بزرگانِ محترم!

جلسہ کی مناسبت سے میں نے جو حدیث تلاوت کی اس کا مفہوم اور ترجمہ یہ ہے ___ "تم میں سے وہ شخص بہترین ہے جو قرآن کریم حاصل کرتا' یا دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ خود پڑھتا ہے یا دوسروں کو پڑھاتا ہے"۔

خیر کی دو بنیادیں

اس امت کے لئے سب سے پہلے جو چیز لازم کی گئی اور جس کو سراپا خیر قرار دیا گیا' وہ اللہ کی کتاب "قرآن مجید" ہے۔ جس کے متعلق احادیث میں'

"اصدق الحدیث کتاب اللہ اوخیر الحدیث کتاب اللہ"

فرمایا گیا ___ یعنی سراپا سچ سراپا خیر' اللہ کی کتاب ہے۔

اسی طرح نبی کریم کی بابرکت ذات کیلئے خیر الھدیٰ ھدی محمد کا اطلاق فرمایا گیا۔ یعنی بہترین سیرت، سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے ــــ یہ دو بنیادیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، اوّل کتاب اللہ، دوم رسول اللہ ــــ رسول تو اللہ نے اس امت کو وہ عنایت فرمائے جو خیر البشر ہیں، جو تمام بنی آدم اور تمام ملائکہ بلکہ پوری کائنات میں افضل ترین ہیں۔ اور کتاب اللہ قوانینِ خداوندی میں سب سے اعلیٰ ترین اور جامع و اکمل ترین قانون ہے۔ اس کی تعلیم و تعلّم کو بہترین مشغلہ قرار دیا گیا۔

بُنیادوں کی خیر

اور یہ انہی بنیادوں کی خیر ہے، جو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جاری ہوئی، اسی سبب یہ امت "خیر امۃ" کے لقب سے سرفراز ہوئی ــــ کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تم ہی وہ بہترین امت ہو جس کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وجود بخشا گیا۔ گویا بنیادیں بھی خیر و برکت، اور بنیادوں کے ذریعے تربیت یافتہ امت بھی "خیر امۃ" پھر یہ خیر مطلق چند طبقات پر حاوی ہوئی۔ تو وہ طبقات بھی کامل و اکمل طریقہ پر باعثِ خیر بنے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خیرالقرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ــــ زمانوں میں بہترین زمانہ میرا ہے، پھر اس سے ملا ہوا، پھر اس سے ملا ہوا۔

ان زمانوں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین فضیلت صحابہ کرامؓ کو نصیب ہوئی، اور قرآن کریم نے مِن حیث الطّبقۃ جس کو محترم اور مقدّس قرار دیا، وہ یہی صحابہ کرامؓ کا طبقہ ہے، جس میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ مطلق اس طبقہ کو ہی خیر فرمایا گیا، قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے اس طبقہ کی خیریت اور تقدّس کو بیان فرمایا گیا، ارشاد ہوا :

وَالسّٰبِقُونَ الاَوَّلُونَ مِنَ المُھٰجِرِینَ وَالاَنصَارِ وَالَّذِینَ اتَّبَعُوھُم بِاِحسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنھُم وَرَضُوا عَنہُ

جنہوں نے اسلام کی پہلی پکار پر لبیک کہا، وہ مہاجر ہوں یا انصار یا ان کے سچے دل سے پیروی کرنے والے، اللہ ان سب سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ــــ اس میں جانبین کی باہمی رضا و خوشی بتائی گئی۔ تو یہ طبقہ مطلقاً خیر مطلق قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے خوش، اور رضا و خوشی کا یہ اعلان چونکہ قرآن کریم کے ذریعے فرمایا گیا، جو دوامی کتاب ہے۔ جس کا وجود قیامت تک باقی رہے گا۔ بلکہ آگے جنت میں بھی جاری و ساری رہے گا اور ایک لحاظ سے یہ ابدی کتاب ہے لہٰذا اعلان رضامندی بھی ابدی ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور ہر زمانہ میں ہوتا رہے گا، اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں صحابہ کرامؓ کی خیر میں فرق پڑے، ورنہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اِعلان عام نہیں رہے گا۔ اعلان کی عُمومیت ہی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ سے ابد تک راضی ہے اور رہے گا۔ اس کی رضا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ سے راضی رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا۔

مشیتِ الٰہی بندہ کے تابع

صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اسی تعلقِ رضا کو نسبت کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے تابع ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ بندہ کی جو مرضیات ہوں ان سے خوش ہو، جانبین کا یہی رضا "نسبت" کہلاتا ہے۔ جس

ہ کو یہ نسبت حاصل ہوجائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عافیت میں رکھے تب راضی، ی و دکھ میں رکھے تب خوش، جو بھی تقدیر خداوندی ہو، بندہ اس پر مطلقاً رضا کا اعلان بھی کردے۔ اور دل ، بھی راضی ہو، اور جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر راضی ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ ا بندہ کی ہر منشاء پر راضی ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ بندہ کا جو منشاء ہو وہ پورا فرماتے ___ یہی وہ مقام ہے جس کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ شان بھی عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں اس قدر جلدی فرماتے ہیں کہ اِدھر آپ کے یں خواہش پیدا ہوئی اُدھر اللہ تعالیٰ نے فوراً پورا فرمادیا۔

اسی کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ مشیتِ الٰہی بندہ کی مشیت کے تابع ہوگئی۔ جو بندہ چاہتا ہے وہی ہوجاتا ہے۔ ر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ آپ کی جو خواہش ہوتی، پوری ہوجاتی۔ وجہ اس کی یہ لہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا خیر تھے، اسی طرح آپ کی خواہش بھی خیرِ مطلق ہوتی تھی۔ ریا شر کی خواہش نبی کے ذہن کو چھو بھی نہیں سکتی۔ انبیاء کرامؑ کے قلوب اتنے پاکیزہ و مقدس اور صاف ے ہیں کہ ان میں جو ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے، جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، خیرِ مطلق ہوتی ہے، جب وہ خیر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی چلتی ہے، اور خیر ہی کی ئی ہوتی ہے ___ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی، لہ بندہ کی ہر خواہش پر راضی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمرؓ جدھر گھومتے، حق ھر گھومتا ہے۔ بظاہر تو صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جدھر مشیتِ خداوندی اور حق ہوتا ہے، ہم اُدھر ہی ں۔ اور یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمرؓ گھومتے ہیں حق بھی اُدھر ہی گھومتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایک مقام تو مبتدی کا ہوتا ہے کہ وہ تابع مطلق ہوتا ہے۔ جدھر حق ہو اُدھر ہی جائے۔ اور ایک مقام منتہی کا ہوتا ہے۔ یہ مقام جانبین کی رضائے کامل سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ بندہ اضی اور بندہ اللہ سے راضی ___ اور یہ مقام پوری امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے صحابہ کرام ن اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا۔

خیرِ عمل

ل پوری امت کو دیگر اُمم کے مقابلے میں خیرِ امت قرار دیا گیا۔ پھر اس خیریت کو خیرالقرون قرنی یہ عہدِ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا۔ اس کے بعد عہدِ صحابہؓ میں موجود مسلمانوں میں سے یں اس فرد کی ترجیح فرمائی گئی جو خود قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم س کی رغبت دلائے!

ضد کم من تعلم القرآن وعلمہ اس کو عمل خیر کہا گیا ہے۔ قرآن کریم خود بھی خیر، اس کو پڑھنے والے بھی خیر کے مستحق۔

حفاظتِ قرآن کریم

ظاہر میں قرآن کریم دو چیزوں' الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے۔ اور یہ دونوں مُنزّل مِن اللہ ہیں۔ دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ الفاظ قرآن جب نازل ہوتے تھے۔ اسے جوں کا توں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' صحابہؓ و حاضرین کو سنا دیتے۔ کوئی لفظ کم کرتے نہ زیادہ' اس معاملہ میں جس طرح آپؐ امین تھے' اسی طرح معانی کے سلسلہ میں بھی آپؐ امین تھے۔ الفاظ کی طرح معانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِلقاء کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت کا جو مقصد' مطلب و معنیٰ آپؐ کے قلب مبارک پر اِلقاء ہوتا' آپؐ اسی کو روایت فرما دیتے۔ اپنی طرف سے کوئی معنیٰ بیان نہیں فرماتے۔

آپؐ الفاظ میں بھی امین تھے' اور معانی میں بھی امین۔ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے اور معانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے۔ اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں قیامت تک کوئی خَلل نہیں پڑ سکتا۔ یہ الفاظ و معانی قیامت تک باقی رہیں گے۔ تحریف کرنے والے ہزار تحریف کریں مگر حق غالب ہی رہے گا الفاظ بھی باقی رہیں گے۔ اور معانی بھی ___ خود قرآن کریم نے ہی اس کی گارنٹی دی ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔

ابتداءً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادتِ شریفہ تھی۔ جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ جلد جلد اس کو پڑھنے لگتے تاکہ الفاظ زبان پر چڑھ کر محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ۔

بھولنے کے خطرہ کے پیشِ نظر جلد جلد زبان کو حرکت نہ دیجئے۔ اس کے الفاظ آپؐ کے قلب میں جمانے اور زبان سے ادائیگی کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ گویا الفاظِ قرآن کی حفاظت' اور یادداشت کی حفاظت' اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی' کہ آپؐ کے قلبِ مبارک سے پڑھوا بھی دیں گے۔ نہ جمع میں کوئی غلطی ہوگی' اور نہ پڑھنے میں کوئی چوک ہوگی ___ یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ بھی تھا اور وعدہ بھی۔

عربی میں "علیٰ" الزام کے لئے آتا ہے' جس چیز کو کوئی اپنے اوپر لازم کرتا اور ذمہ لیتا ہے' اس کی تعبیر علیٰ سے کی جاتی ہے مثلاً کوئی کہتا ہے علیّ الف درھم تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ پر لازم ہے کہ تم کو ایک ہزار روپیہ دوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے ___ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ الفاظ قرآن آپؐ کے قلب میں جمع و محفوظ بھی کر دیں' اور آپؐ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ گویا قراءۃ بھی دوامی ہے' جس میں کبھی اور کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا۔ اور جمع قرآن بھی دوامی ہے کہ اس میں تحریف و ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ معانی پڑھے نہیں جاتے' سمجھے جاتے ہیں۔ تو یہاں قُرۡاٰنَهٗ فرما کر الفاظ پڑھانے اور زبان پر جاری کرانے کی ذمہ داری لی گئی۔ معانی سے متعلق یہاں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ قرآن کے لفظی معنیٰ "پڑھانا" کے ہیں۔ معانی کی ذمہ داری ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ میں لی گئی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنیٰ کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ پہلی آیت میں قُرۡاٰنَهٗ فرما کر الفاظ کی ادائیگی اور قرأت کی ذمہ داری لی۔ اور اس آیت میں بَيَانَهٗ فرما کر معانی بیان کرنے اور سمجھانے کی ذمہ داری لی۔

خلاصہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے دونوں اجزاء الفاظ و معانی کی ذمہ داری لے لی ہے۔ یعنی قرآن پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کے معنیٰ و مفہوم کو' جو قرآن کے موضوعات ہیں' سمجھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

قرآن اور بیانِ قرآن

اور یہ بیان ہی دراصل حدیث کہلاتا ہے' اور حدیث ہی کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی مقاصد کو واضح فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کے ساتھ بیان قرآن باقی نہ رہے' تو لوگ کچھ کا کچھ مطلب لیں گے۔ ایک معنیٰ کے ہزار معنیٰ بنیں گے ___ قرآن کی اوّلین تفسیر حدیثِ نبوی۔ قرآن مجید میں اس کو بیان بھی کہا گیا ہے :

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔

الفاظ جب آچکتے ہیں' تو اس کے معانی بیان ہوتے ہیں۔ اس لئے 'بیان' معانی پر صادق آتا ہے۔ الفاظ' بیان نہیں کہلاتے۔ وہ تلاوت کئے جاتے ہیں' پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کے جو الفاظ آچکے ہیں' اور ان کے جو معانی اور مُراداتِ ربّانی ہیں ان کو بیان کردینے کا نام تبیین ہے۔ یعنی واضح کردینا۔ تبین للناس سے معلوم ہوا کہ حدیث بیان قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک متن اُتارا' جس کا نام قرآن مجید ہے' اور اس متن کی ایک شرح اتاری' جس کا نام حدیث ہے۔ اس کی تاکید لفظ بیان سے کی اور اس سلسلے میں خود ذمّہ داری لی۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کہ بیان کرنا بھی ہمارے ذمّہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی' تو وہ اپنی جامعیّت کے لحاظ سے کئی معنوں میں ڈھل سکتی ۔ مگر آپؐ نے کبھی اس طرح نہیں فرمایا کہ اس آیت کے ایک معنیٰ یہ ہوسکتے ہیں' ایک یہ ہوسکتے ہیں۔ اور زمانہ کے مطابق فلاں معنیٰ ہیں۔ لہٰذا یہ معنیٰ مراد ہیں ___ بلکہ اس آیت کی مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی آپؐ کے قلب پر اِلقاء فرماتے' خود آپؐ مراد پر غور نہ فرماتے کہ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔ یہ مراد بھی نکلتی ہے ___ مرادِ ربّانی روایت اور نقل سے حاصل ہوسکتی ہے' عقل سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ مراد کے دائرے میں رہ کر آپ عقل لڑائیں گے تو حکمتیں کھلیں گی۔ اور وہ حکمت' قرآن کہلائے گی۔ لیکن خود مراد کو عقل سے متعیّن نہیں کیا جاسکتا۔ مراد اللہ تعالیٰ ہی بیان فرمائے گا کہ اس آیت سے میرا یہ مطلب تھا۔ اگر مراد آیت عقل سے ہی متعیّن کی جاتی تو قرآن کئی اقسام کے ہوتے۔ جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب روزہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ ابتداء میں یہ حکم تھا کہ رات کو سو کر جب بھی آنکھ کھلے' اس وقت سے اگلے افطار تک بیچ میں کھانا پینا منع ہے۔ پھر اس میں تخفیف فرمائی اور ارشاد فرمایا :

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

یعنی صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق کا اُجالا ظاہر ہو تو اب کھانے پینے سے رُک جاؤ' اور روزہ کی نیت کرو۔

اس آیت کے نُزول کے بعد لوگوں نے دو قسم کے دھاگے کالے اور سفید تیار کرائے' اور سرہانے رکھ لئے۔ جب سفید دھاگہ کالے سے ممیّز ہوجاتا' تب کھانا پینا بند کرتے۔ حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے بھی اسی طرح کے دھاگے تیار کرائے۔ اور تکیے کے نیچے رکھ دیئے' ان کو دیکھتے رہے۔ جب کالا دھاگہ سفید دھاگہ سے بالکل ممتاز نظر آتا' تو روزہ کی نیت کرتے۔ حالانکہ اس وقت صبح ہوئے خاصا وقت پندرہ بیس منٹ گزر چکے ہوتے ___ ان حضرات نے باعتبارِ لغت یہ صورت اختیار کی تھی جو لُغوی اعتبار سے غلط بھی نہ تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی چونکہ یہ مراد نہ تھی اس لئے سب کی دلجمعی نہ ہوئی' اور معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ نے حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے دریافت فرمایا' اے عدی! تم کیا صورت کرتے ہو ___ ؟ انہوں نے عرض کیا' میں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کے نازل ہونے کے بعد

دو ڈورے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں۔ اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں۔ جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے کھاتا پیتا رہتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اے عدی ___ تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے کہ اس میں دن رات چھپ گئے۔ کیونکہ کالے ڈورے سے رات مراد ہے' اور سفید ڈورے سے مراد دن ہے۔ دھاگوں کے ڈورے مراد نہیں اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہاں لغوی معنیٰ مراد نہیں۔

مرادِ قرآنی اور لُغت

یہیں سے معلوم ہوا کہ لفظ کے ایک لغوی معنیٰ ہوتے ہیں اور ایک مرادی۔ قرآن مجید اُترا تو لغتِ عربی میں ہے۔ لیکن ہر جگہ لُغت مراد نہیں۔ بعض جگہ قرآن کریم نے لغت تو زبانِ عرب سے لیا' مگر معنیٰ اس کے اندر اپنے ڈالے اور وہی مرادی معنیٰ کہلاتے ہیں۔

اب دیکھئے صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت عربی میں اس کے معنیٰ دعا مانگنے کے ہیں۔ ایک آدمی دعا مانگ لیتا ہے تو لغت کے لحاظ سے اس نے صلوٰۃ ادا کرلی۔ یہاں باعتبارِ لغت رحمت بھیجنا' اور دعا مانگنا تو صحیح ہے۔ مگر اسے نماز پڑھ لینا کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ صلوٰۃ کے لفظ کی مراد یہ نہیں ہے۔ اس سے مراد کچھ خاص اعمال و افعال ہیں کہ یوں نیت باندھو' اس طرح قیام کرو' رکوع و سجود کرو' یوں قعدہ میں بیٹھو وغیرہ۔ اس مجموعہ کو صلوٰۃ کہتے ہیں ___ یہاں قرآن نے لفظ لغتِ عربی کا لیا ہے مگر معنیٰ اپنے ڈالے' کہ یہاں صلوٰۃ سے ہماری مراد یہ ہے۔ اس مراد کی وضاحت کے بعد صرف دعا مانگنے کو نماز نہیں کہا جا سکتا' اور آدمی نماز کی ادائیگی سے بَرِیُ الذِّمہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح لغتِ عرب میں "زکوٰۃ" کے معنیٰ پاک کردینے کے ہیں۔ آپ ہاتھوں پر پانی ڈال کر دھو کر پاک کرلیں' زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ یہ ہزاروں روپیہ کی زکوٰۃ نکالنے کے معنیٰ کہاں سے نکال لئے۔ لغت میں تو اس کا کہیں پتہ نہیں۔ یہاں بھی قرآن کریم نے زکوٰۃ کا لفظ تو لغتِ عرب سے لیا مگر اس کے معنیٰ خود متعین کئے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال' روپیہ پیسہ ہو' اور اس پر پورا سال بھی گزر جائے تو اس مال سے خاص مقدار کی رقم اللہ کی راہ میں نکالنا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ تو زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ جتنے بھی ہوں' مراد وہی عرفی معنی ہی ہیں' جو قرآن کریم نے مراد لئے ہیں۔ اللہ جل شانہ' نے بہت سے الفاظ لغتِ عرب کے لے کر ان میں اپنے معنیٰ ڈالے' وہی مرادی معنیٰ ہوتے ہیں۔ معلّم ان ہی معانی کو سمجھاتا ہے' بتاتا اور ان کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر مرادی معنیٰ ضروری نہ ہوتے' لغوی معنیٰ ہی کافی ہوتے' تو اتنا کافی ہوتا کہ حضرت جبرئیل علیہ السّلام قرآن مجید کا نسخہ لاتے۔ بیت اللہ کے چھت پر رکھ دیتے اور اعلان کردیتے اے لوگو! تم روحانی مریض ہو۔ یہ تمہارے لئے نسخۂ شفاء ہے تم زبان دان ہو' عربی سمجھتے اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اپنا علاج کرلیا کرو۔ پھر پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر مسائل کہیں بھی لغت سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی' وہ لغت سے اللہ کی مراد متعین کرکے لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے اور اللہ کے نزدیک اس آیت کا کیا مطلب ہے؟

مقاصدِ بعثتِ نبی ﷺ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور آپ کے چار وظیفے متعیّن و مقرّر فرمائے۔

پہلا وظیفہ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اور امت تک ان کو پہنچائیں۔ آپ نے یہ وظیفہ پوری امانت کے ساتھ انجام دیا اور پورا قرآن امت کو سنایا' ان تک پہنچایا۔

اس کے بعد دوسرا وظیفہ یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ کتاب کی تعلیم دو! تعلیم کا مطلب ہے کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے جو مطلب اور مراد متعین کی ہے' وہ انہیں سمجھائیں۔ آپ نے وہ معانی سمجھائے اور مراداتِ ربانی بیان فرمائیں۔ یہ تعلیم کا وظیفہ ہوا۔ جب نبی خود کوئی مراد متعین فرمادے تو اس کے اندر کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔

پھر تیسرا وظیفہ تعلیم حکمت بیان فرمایا یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حکمتیں بھی سکھلائیں ___ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمتِ نظری' حکمتِ عملی ___ بقاعدۂ بلاغت حکمتِ نظری تعلیم کے اندر ہی آگئی۔ اس کے بعد عملی مراد ہے۔ اور وہ "اسوۂ حسنہ" ہے آپ کی مقدس سیرت ہے ___ آپ نے مراداتِ ربانی نہ صرف سنائیں' اور نہ ان کی تعلیم پر اکتفا فرمایا۔ بلکہ عملی طور پر بھی ان کا نمونہ پیش فرمادیا۔ اب نہ کوئی خطرہ باقی ہے نہ خدشہ' اور نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے۔

اگر صرف لفظوں سے لوگوں کو عمل متعین کرنے کو کہا جاتا' تو ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ متعین کرلیتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ پر عمل بھی فرمایا۔ اور ان مراداتِ ربانی کی ہیئت بھی دکھلادی۔ اب اس میں کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا ___ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کے متعلق جو عمل کرکے دکھلایا گیا۔ اسی کے مطابق عمل کرو۔ صلّوا کما رأیتمونی اصلّی جس طرح مجھے نماز پڑھتے تم نے دیکھا ہے' اسی طرح نماز پڑھو۔ میرا اسوہ و عمل تمہارے لئے نمونہ ہے۔ تم اپنی مرضی کے مطابق اس کی ہیئت متعین نہ کرو۔ میرا عمل اللہ کی مراد کے مطابق ہے' اور اللہ تعالیٰ کو یہی ہیئت مطلوب ہے۔ اس کے بعد کوئی خدشہ کوئی خلجان اس ہیئت کے متعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

اس کے بعد چوتھا وظیفہ یہ بھی فرمادیا ___ کہ لفظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنادیں۔ معنیٰ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھادیں' اور عمل کرکے بھی دکھلادیں۔ مگر ان کے دلوں میں صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ ان معانی کو قبول کرلیں۔ اس ہیئت پر اعتقاد جمالیں' اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے قلب کی صلاحیت کی کہ ذہن بھی صحیح ہو' ذہن صحیح نہ ہو' اس میں ٹیڑھ اور کجی ہو تو اوندھے معنیٰ سمجھتا ہے' اس لئے بطورِ وظیفہ چہارم فرمایا وَیُزَکِّیْہِمْ ان لوگوں کے دلوں کو بھی مانجھ دیجئے۔ ان کے دلوں میں استعداد اور صلاحیت بھی پیدا کیجئے' کہ جب اللہ کا کلام ان کے کانوں میں پڑے تو اس کا مطلب ٹھیک وہی سمجھیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور عمل کی ٹھیک وہی ہیئت اختیار کریں۔ جو اللہ تعالیٰ کا منشاء اور اس کا مطلوب ہے ___ محض لفظوں سے کوئی شخص عمل کا نمونہ اختیار نہیں کرسکتا۔ جب تک عملی نمونہ اس کے سامنے نہ ہو۔ اور عملی نمونہ کو اختیار کرنے کی رغبت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک دل کی کدورات صاف کرکے' اس کو مانجھ کر پاک و مصفّٰی نہ کردیا گیا ہو۔

اُسوۂ حسنہ کی ضرورت

میں کہتا ہوں کہ روٹی پکانا بظاہر معمولی بات ہے۔ ہم اور آپ روزانہ گھروں میں روٹی پکتے دیکھتے ہیں۔ مگر آپ محض دیکھتے رہنے سے روٹی پکانے کا عمل نہیں کرسکتے ہیں۔ جب تک اس عمل کی مشق نہ کر ... [illegible]

آپ دیکھیں گے کہ پیڑا کس طرح بنایا جاتا ہے' اس کو روٹی کی شکل کس طرح دی جاتی ہے' پھر اس کو توے پر کس طرح ڈالا جاتا ہے۔ جب آپ اپنے ہاتھ سے اس عمل کو دہرائیں گے' عملی طور پر اس کی مشق کریں گے۔ تب آپ کو روٹی پکانی آئے گی۔ محض بیٹھے دیکھتے رہنے سے آپ کبھی روٹی نہ پکا سکیں گے۔ روٹی پکانے کے عمل اور ہیئت کو دیکھنے کی طرح اول ہر عمل کی ہیئت دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ سے ہیئت ذہن نشین نہیں ہوا کرتی' اور مشق کے بغیر عمل کی صورت ظہور پذیر نہیں ہوتی۔

خیاطی ایک فن ہے۔ اس فن کی آپ ہزار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ سوئی چلانی نہیں آئے گی۔ جب تک درزی کو سوئی چلاتے دیکھ نہ لیں' آپ سوئی نہ چلا سکیں گے ___ اسی طرح دنیا کی سب صنعتوں اور حرفتوں کا حال ہے کہ کوئی بھی صنعت بغیر سیکھے سکھائے نہیں آسکتی' جب تک سکھانے والا عملی نمونہ نہ دکھائے' محض الفاظ اسے صناع نہیں بنا سکتے۔

یہی حال "دین کی صنعت" کا بھی ہے کہ محض الفاظ کے اتار دینے' ان کی معانی سمجھا دینے کے باوجود عمل کی ہیئت ان کے ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔ عملی نمونہ ضروری ہے تاکہ وہ الفاظ معانی کو صحیح عمل اور ہیئت منطبق کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو اسی لئے مبعوث فرمایا کہ وہ اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکامات کے الفاظ بھی سکھائیں' ان کے مفاہیم و معانی بھی بتائیں' اور الفاظ و معانی سے جو عمل مطلوب ہے اس کا نمونہ بھی ان کے سامنے رکھیں' اور اسی کے ساتھ ان کے ذہن کو بھی مصفّٰی اور منوّر کریں۔ اور ذہن سازی فرمائیں' تاکہ وہ کلامِ الٰہی کے اوندھے سیدھے معانی نہ سمجھیں۔ اور پیغمبر نے جو نمونہ عمل ان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے گریز اور بے رغبتی نہ برتیں' بلکہ ذوق و شوق اور کشادہ دلی کے ساتھ اس نمونہ کو حرزِ جان بنالیں' اگر ذہن کی صفائی کے لئے الفاظ و معانی کافی ہو جایا کرتے' تو انبیاء علیہم السلام کے لئے "وظیفہ تزکیہ" لازم نہ کیا جاتا ___ ذہن کی صفائی کے لئے خاص طرح کی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدات و ریاضت کے ذریعہ اپنے صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین کے قلوب کا تزکیہ فرمایا۔ ان کو مجلّٰی اور مزکّٰی کیا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کو اللہ کا کلام سنایا جاتا تو ان پر وہی اثرات ظاہر ہوتے جو کلام اللہ کے اثرات ہیں۔

اللہ کا یہی کلام آپ عام مسلمان کو سنائیں' تو عملی طور پر معتقد ہو گا کہ یہ اللہ کا کلام ہے' اس کی بے ادبی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر اس سے آگے کے اثرات کا اس پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ اس کے برخلاف اللہ کا یہی کلام کسی عارف باللہ کو آپ سنائیں' تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ اس لئے کہ اس کا دل منجھا ہوا ہے۔ مجاہدات و ریاضات سے اس کا قلب روشن ہے۔ اسی روشنی میں کلامِ الٰہی کے جو اثرات وہ مشاہدہ کرے گا' عام مسلمان ایسا نہیں کر سکے گا۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر اللہ کی کثرت' نماز کی ادائیگی' جہاد اور دیگر مجاہدات کے ذریعہ اپنے صحابہؓ کی تربیت فرمائی' ان کے قلوب کو مانجھا' مصفّٰی و مزکّٰی کیا۔ اور ان کا رخ بدل دیا۔ پہلے ان کا رخ دنیا کی طرف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش کی طرف ان کا رخ کر دیا۔ پہلے وہ فرشی تھے۔ آپؐ کی تربیت نے عرشی بنا دیا۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں' ایک معانی ہیں' جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں' پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں' حقائق کے تحت معارف ہیں' اور معارف میں کیفیات ہیں۔ جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں۔ ___ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد' محض الفاظ و معانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں' بلکہ اس کا

مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت وتزکیہ بھی ہے' جو الفاظ ومعانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق ومعارف کے اِدراک کے قابل ہوں' اوران معارف کی کیفیت کا محل بھی بن سکیں۔

قرآن کے ساتھ اجتماعِ خیر

اس تربیت وتزکیہ کا مدار مربّی ومزکّی کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس لئے کلام اللہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی بعثت بھی ضروری گردانی گئی۔ جہاں بھی کسی صحیفۂ الٰہی' یا کتاب اللہ کے نزول کا ذکر ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس صحیفہ یا کتاب کے نزول کے مورد' پیغمبرورسول کا ذکر بھی لازماً ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی چار مشہور کتابیں چار پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ تورات کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام' زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام' انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام' اور قرآن مجید کے ساتھ ہمارے پیغمبر رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ غرض کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ قانون تو آیا ہو مگر شخصیت نہ آئی ہو۔ اس لئے کہ دارومدار شخصیت پر ہوتا ہے' کاغذوں اور تختیوں' یا ان پر کندہ حروف پر نہیں ہوتا۔

ان حروف والفاظ کی تلاوت شخصیت کرے گی' اوران کے معانی بھی شخصیت بتلائے گی۔ اور نمونۂ عمل بھی شخصیت بنے گی۔ کسی کتاب کے اوراق تو نمونۂ عمل نہیں بنیں گے۔ دلوں کو مانجھنے' ان کو مصفّٰی ومزکّی کرنے کا کام بھی شخصیت انجام دے گی کتابوں پر لکھے ہوئے یا تختیوں پر کندہ الفاظ تو دلوں کو نہیں مانجھیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر قانون کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے۔ جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیرالکُتُب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اوراس خیرُ البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیرُ البشر ہوں گے۔ اوروہ صحابہ کرامؓ ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیرُ البشر کا **قرن خیر القرون** ہوگا۔ ایسی خیردرخیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیر مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیر وابستہ تھی۔ زمانہ کی خیر' مکان کی خیر' ذاتِ اقدس کی خیر شاگردوں کی خیر' اورجب گوناگوں خیر یکجا اور مجتمع ہوگئی تو خیرالکتُب کا نزول ہوا' اوراس کے متعلق فرمایا گیا :

خیرکم من تعلم القران وعلمہٗ

تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں' وہ بہترین لوگ ہیں ___ جس کتاب کے اندر باہر' اردگرد اوپر نیچے ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں' وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی

اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ___ ''قرآن سے برکت حاصل کرو' یہ اللہ کا کلام ہے' اوراس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ **(اوکما قال علیہ الصّلوٰۃ والسلام)** ___ کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے' بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں' کلام اس سے صادر ہورہا ہے۔ سرزد ہورہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام

پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات و برکات مخلوق خداوندی ہیں۔ مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطنِ خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے۔ اور کلامِ خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا :

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا

اور حدیث شریف میں حَبلُ اللہ کی تفسیر اَلقرآن حبلُ اللہ کے الفاظ سے فرمائی گئی کہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی۔ تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے' اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے باطنِ حق سے وابستہ ہو جائیں گے۔

باطنِ قرآن جنت ہے

بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں' جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ ایک قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا "رتّل وارتق" پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا' وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔

یہاں آپ کو جو آیات الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی' تو کوئی گھوڑا' کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی۔ تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا' شرط پانی کا لگنا تھا۔

شادی بیاہ میں آتشبازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر سا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے' یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے اور خوب داد دیتے کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے' اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے کبھی بگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالمِ آب و گل میں موجود ہیں خزانہ علم و عرفان ہے' پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے' اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف و الفاظ گل و گلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون و راحت تھے' اور انہیں علم و عرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے۔ وہی الفاظ اب ان کے لئے جنت نگاہ باغ و بہار اور لعل و جواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پر بہار اور گہوارہ شادمانی و مسرت بنا دیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور و قصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی

وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کرلیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ وبہار میں تبدیل ہوجائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لاکر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے کے بجائے آج ایمان لاکر یہ جنت کیوں نہ حاصل کرلیں۔

جس مسلمان نے پورا قرآن حفظ کرلیا، اس نے گویا پوری جنت اپنے قلب میں سمیٹ لی۔ جب عالم آخرت میں حرفوں اور لفظوں میں سمٹی ہوئی یہ جنت کھلے گی، اور پھیلے گی۔ تو وہ دیکھے گا کہ یہ تو قرآن حکیم تھا، جو اب جنت بن گیا۔ اس دنیا میں مؤمن اپنے اندر جنت لئے بیٹھا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی اصل شکل سامنے نہیں ہے، اس لئے اسے پتہ نہیں کہ کتنی عظیم چیز وہ اپنے اندر لئے بیٹھا ہے، جب آیتوں کی حقیقت کھلے گی، اور وہ اپنی اصل شکل بدل کر سامنے باغ وبہار بنی نظر آئیں گی، تو اس نعمت کا اندازہ ہوسکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مؤمن اپنی ذات میں جنت ہے۔ قیامت میں اس کو جو چیز جنت کے نام سے ملنے والی ہے۔ وہ یہیں قرآنی الفاظ کی شکل میں اس کو عنایت کردی گئی ہے۔ اب جو بھی یہاں قرآن پڑھ رہا ہے، وہ گویا جنت سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر ذخیرہ کررہا ہے، وہی جنت جب کھلے گی، تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ تو مجھے دنیا ہی میں مرحمت فرمادی گئی تھی۔

بہرحال قرآن حکیم حق تعالیٰ کے باطن سے وابستہ ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ اجر وثواب کے حصول کا باعث بھی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیاں نامۂ اعمال میں ذخیرہ ہورہی ہیں۔ اور یہی قرآن جنت کے محلات وقصور، گل وگلستان بھی ہیں۔

غرض قرآن شریف کی عجیب شان ہے، اسے پڑھو تو اس سے بہتر وظیفہ نہیں۔ اس کا علم سیکھو تو اس سے بڑھ کر کوئی علم نہیں۔ اسے دستورِ زندگی بناؤ تو اس سے بڑھ کر کوئی قانون نہیں۔ اگر اس کے حقائق کھولو تو اس سے بہتر حکمتیں نہیں، اگر اس کی کیفیات اپنے اوپر طاری کرلو تو اس سے بڑھ کر سکونِ قلب کوئی نہیں ___ نعمتوں کا جو تصور بھی کوئی قائم کرے، وہ سب کی سب اس کے اندر جمع ہیں، جو یہاں علمی شکل میں ہیں عالمِ آخرت میں باغ وبہار کی شکل میں آجائیں گی۔ اور یوں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم ایک عظیم الشان اور حدِ نظر تک وسیع باغ ہے۔ جس میں ہزاروں لاکھوں پھول کھلے ہوئے ہیں، اور ہمہ اقسام خوشبوئیں موجود ہیں۔

تورات اور میدانِ حشر

چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ میدانِ حشر میں جب اقوامِ عالم جمع ہوجائیں گی، تو اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ سے پوچھیں گے کہ وہ کتاب "تورات" کہاں ہے جو ہم نے تیرے اندر رکھی تھی؟ وہ عرض کرے گی کہ وہ تو جبرئیل علیہ السلام لے گئے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام سے سوال ہوگا، لوح محفوظ سے تم تورات لائے تھے؟ وہ عرض کریں گے، جی ہاں لایا تھا۔

پھر سوال ہوگا، اسے کہاں لے گئے ___ ؟ وہ کہیں گے "تورات" کو میں نے موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر نازل کیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوگا کہ کہ جبرئیلؑ سے تم نے تورات سنی؟ وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ تورات سنی۔ اس کے معنیٰ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، پھر آپؑ نے کیا کیا؟ موسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے۔ میں نے وہ تورات اپنی امت کو پہنچادی ___ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہوگا۔ وہ "تورات" اب اپنی امت کو

سنا کر دکھاؤ۔ آپ پوری تورات وہاں تلاوت فرمائیں گے۔ دنیا میں تورات کے الفاظ پڑھے اور سنائے گئے' اس کے معنی سمجھائے گئے۔ اور آج کی تلاوت نے الفاظ ومعانی میں پوشیدہ حقائق مجسم شکل میں سامنے کردیئے' جس سے معلوم ہوا وہ ایک عظیم الشان باغ ہے۔ اور اس سے قلب پر عجیب وغریب کیفیات طاری ہو رہی ہیں۔ حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں۔ تو امت موسیٰ (علیہ السلام) کے لوگ کہیں گے یہ تورات تو ہم نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔ ہم وہاں الفاظ ومعانی کی افہام و تفہیم میں الجھے رہے۔ یہ حقیقت کہ تورات کیا ہے' آج ہم پر کھلی! پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے کبھی نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم اور میدانِ حشر

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوگا کہ قرآن آپ تک پہنچا؟ تو آپ نے اس کا کیا کیا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرمائیں گے۔ "جی ہاں" قرآن مجھ تک پہنچا اور اسے میں نے اپنی امت کو تلاوت و تعلیم کے ذریعہ پہنچایا۔ ارشادِ ربانی ہوگا۔ اب یہاں بھی اس کی تلاوت کیجئے۔ (تاکہ اقوامِ عالم کے سامنے قرآنی الفاظ ومعانی کی حقیقتیں' اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوجائیں اور سب دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے کس طرح پورے عالم کا احاطہ کیا ہوا تھا)۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منبر بچھایا جائے گا۔ آپ اس پر تشریف فرما کر قرآن کریم کی اول سے آخر تک تلاوت فرمائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے' جن لوگوں کو قرآن نہیں پہنچا' باحسرت ویاس ___ کہیں گے۔ کاش دنیا میں ہم کو یہ کتاب ملی ہوتی۔ یہ تو بہت ہی عجیب وغریب کتاب ہے۔ اس کے اندر عجیب خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ تو دنیا میں الفاظ قرآنی کی تلاوت کرنے' اس کے معانی کو سمجھنے سے دل پر جو روحانی کیفیات واثرات طاری ہوتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آج کی تلاوت سے سب مجسم شکل میں آجائیں گے' اور معلوم ہوگا کہ قرآن تو اتنا بڑا اور عظیم الشان باغ ہے' جس نے پورے عالم اور کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور اس میں سدا بہار پھولوں اور رنگ برنگ بوٹوں کی دنیا آباد ہے' جن کی مہک بے مثال ہے۔

اس حقیقت کو عیاں دیکھ کر خود صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حیران ہوں گے کہ قرآن حکیم کا یہ رُخ تو ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے تلاوت قرآن کی کیفیات سے صحابۂ کرامؓ کے قلوب پُر رہتے تھے' لیکن ان کیفیات کو آج جس شکل میں وہ مجسم دیکھ رہے ہیں' اس سے دنیا میں وہ واقف نہ ہو سکے تھے۔

جلوۂ حق کی موجودگی کے ساتھ' تمام انبیاء وملائکہ علیہم السلام اور تمام امتوں کے اجتماع میں جب قرآنی حقائق مجسم ہو کر سامنے آئیں گے' تو حیرانگی کا عجیب عالم ہوگا۔ سارے لوگ گنگ ہوں گے۔ جن کو یہ نعمت نہیں ملی' ان کو حسرت ہوگی۔ اور جن کو یہ نعمت ملی' ان کو افسوس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے بے خبر رہے۔ اور اس کو پسِ پشت ڈال کر کتنا بڑا خسارہ اور محرومیاں سمیٹتے رہے۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کو بطورِ ورد پڑھو کہ اس سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں۔ اس کا علم سیکھو کہ اس سے بہتر کوئی علم نہیں۔ حکمتوں کی تلاش ہو تو اس میں غور و فکر کرو کہ حکمتوں سے بھرا ہوا اس جیسا کوئی اور کلام نہیں۔ معارف کی جستجو ہو' تو قرآن سے بہتر معارف کا ذخیرہ کہیں نہیں۔ انہیں چیزوں کا یہ لفظی ومعنوی مجموعہ' جب اپنی حقیقی صورت میں مجسم ہوگا' تو وہی جنت کہلائے گی' یہ وہی جنت ہوگی جسے قاری

قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے' یہی جنت بالآخر اس کا مسکن وماویٰ بنے گی ___ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا۔ اور پہچانے گا' تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے' جو میرے یہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے نا آشنا رہا تھا۔ اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آ گئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضوفشاں ہیں' اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں' غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال وہر آن خیر مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیر مطلق' آخرت میں بھی خیر مطلق اس کا پڑھنا بھی خیر مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیر مطلق' یہی بات اس فرمانِ نبویؐ میں ارشاد فرمائی گئی ہے :

خيركم من تعلم القران وعلمه

"قرآن حکیم کا پڑھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے"۔

اہلِ قرآن کے احوال

اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں' جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں۔ البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے! ہمارے استاذ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان "اویسیہ خاندان" کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادر زاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا' بلا مجاہدے اور ریاضت من جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا۔ ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحبؒ کے نانا شاہ محمد حسین صاحبؒ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ ان کے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ :

"یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا۔ یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے"۔

تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیم قرآن کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے۔ ان کے ایک داماد تھے' جن کا نام "اللہ بندہ" تھا وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے' وہ کہتے "اللہ بندہ" فرماتے صحیح نام بتاؤ۔ وہ پھر کہتے حضرت میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ۔ آخر میں کہتے۔ حضرت میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے۔ اچھا بیٹھ جاؤ۔ بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال وجواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لو لگی ہوئی تھی' اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ "دنیا وما فیہا" سے بے خبر رہتے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے۔ اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ وریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

لوگوں نے آپ کو بتایا' میاں جی! لڑکے شرارت کرتے' اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرا لیتے ہیں۔ فرماتے بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہو گا۔ جاؤ بچو چھٹی کرو۔ یہ آپؒ کا پختہ عقیدہ وخیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا ___ عربی کا مقولہ ہے المرأ يقيس على نفسه ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا' کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے' وہ خاموش رہتے تھے۔

ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے ان کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کردیا کہ یہ میری زمین ہے۔ (دعویٰ کرکے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے' دعا کیجئے زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا' اچھا بھائی دعا کرتا ہوں زمین تمہیں مل جائے ___ ادھر حافظ محمد احسن صاحبؒ کو اطلاع ہوئی کہ کسی نے میری زمین پر جھوٹا دعویٰ کردیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین ان کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحبؒ کی خدمت میں آئے' اور کہا' حضرت میں بھی مسلمان ہوں۔ زمین میری ہے۔ فرمایا اچھا تم اپیل کردینا' زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا' پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا ___ انہوں نے اپیل کی۔ اپیل میں یہ جیت گئے۔ ان کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جیؒ کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا۔ میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آگیا' مکان بند کرکے بیٹھ رہے۔ جو آیا کہہ دیا میں نابینا ہوگیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں' جو آرہا ہے اس سے کہہ دیتے' کہ فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے۔ میں نابینا ہوگیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولاناؒ مزاج پُرسی کو پہنچے۔ احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا۔ اجی میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے' اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔

مولانا بہت زیرک و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے' کہنے لگے حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کردینا آتا ہے' جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آجاتی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے پانی پر کچھ پڑھ کر دم کیا' اور چھینٹا مار کر کہا حضرت جی! آنکھیں کھولئے۔ بینائی واپس آگئی۔ بینائی گئی کہاں تھی' وہ تو موجود ہی تھی۔ آنکھیں کھول کر فرمایا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ میری بینائی واپس آگئی۔

ادھر لطیفہ یہ ہوا کہ دوسرے دن مولانا کی مسجد کے سامنے نابیناؤں کا مجمع اکٹھا ہوگیا کہ مولانا کو ایسا پانی دم کرنا آتا ہے جس سے بینائی واپس آجاتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی علاج کے لئے آگئے۔ مولانا نے ان سے کہا بھائی یہ ترکیب تو میں نے میاں جیؒ کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ میرے پاس کوئی پانی وانی نہیں۔

برکاتِ قرآن حکیم

قرآن حکیم کا شغل ایک مبارک شغل ہے۔ اللہ کی کتاب سے واسطہ رہے گا' تو اس کے ذریعہ اللہ سے بھی واسطہ رہے گا۔ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا کہ اس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راستہ سے کروڑوں بندگانِ خدا' خدا تک پہنچ بھی گئے۔ کسی کو نجات عطاء ہوئی' کوئی اس کے ذریعہ درجات پر فائز ہوا' جس کا قرآن مجید سے جتنا گہرا واسطہ اور ربط رہا۔ اسی قدر بلندئ درجات حاصل ہوتی رہیں۔

غرض کروڑوں انسان قرآن کریم کی بدولت فائز المرام ہوچکے ہیں' اور کروڑوں اور ہوں گے' (اور تاقیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ انشاء اللہ)

حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کریم‘ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مجسّم شکل میں حاضر ہوگا‘ تو اللہ تعالیٰ ں سے فرمائیں گے‘ ”آج میں تیری وجہ سے کتنوں کو بلند درجات پر فائز کرتا ہوں‘ اور کتنوں کو پستی و گہرائی ں ڈالتا ہوں۔ جو تجھ پر عمل کرتے تھے‘ تیرے علم میں مشغول تھے‘ ان کے لئے رفعِ مراتب اور بلندیٔ جات اور بہترین اجر و جزا ہے۔ اور جو تجھ سے اِعراض کرتے‘ اور بھاگتے بھاگتے پھرتے تھے‘ نہ انہوں نے ے پڑھا‘ نہ تیرے پیغامات پر عمل کیا‘ وہ آج پست و ذلیل ہوں گے‘ اس گریز کی سزا پائیں گے‘ اور ذلت سوائی میں مبتلا ہوں گے :

یضع بھا اقوام ویرفع بھا اقوام

(اللہ تعالیٰ اس قرآن حکیم کے ذریعہ کچھ اقوام کو بلند اور کچھ کو پست کرتا ہے)

اس سارے بیان سے قرآن کے خیرِ مطلق ہونے کا بخوبی پتہ چل گیا___ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ھانے والا اور پڑھنے والا تو قرآن سے براہ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر خیر ہے ہی۔ اس کی اشاعت میں کسی ے کی مدد کرنے والا بھی اس خیر میں شامل اور برابر کا شریک ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر ”کلمہ خیر“ کہنے والا ی اس خیر میں داخل ہوگیا۔ غرض قرآن سے کسی بھی طور پر وابستگی خیر سے محروم نہیں رہنے دیتی۔ اس لئے یں سمجھنا چاہئے کہ خیر تو سارا قرآن پڑھنے‘ پڑھانے والا سمیٹ کر لے گیا۔ باقیوں کے حصہ میں کیا رہا۔ نہیں ہے۔ پڑھانے والے‘ جانی و مالی مدد کرنے والے‘ پڑھنے پڑھانے کے ذرائع قائم کرنے والے‘ ان کی بری کرنے والے‘ سب اسی خیر میں شامل و شریک ہیں۔ کوئی خیر سے محروم نہیں۔

حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مجلس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ علم کی گفتگو ہوتی ہے‘ تو مجلس کو لاکھوں‘ کروڑوں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ مجلس کے اختتام پر جب فرشتے اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ‘ تو ارشادِ ربانی ہوتا ہے کہاں گئے تھے؟___ اللہ تعالیٰ کا یہ سوال ناواقفی کا نہیں‘ کیونکہ ان کے علم سے چیز باہر نہیں‘ بلکہ بطورِ حکمت ہوتا ہے___ ملائکہ علیہم السلام کہتے ہیں آپ کے بندوں کی ایک مجلس گئے تھے___ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں‘ اس مجلس میں میرے بندے کیا کر رہے تھے___؟ وہ کہتے ہیں‘ آپ ذاب سے ڈر رہے تھے۔ آپ کی نعمتوں کے طالب تھے۔ جنت کے طالب اور عذابِ جہنم سے پناہ کے ے تھے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں‘ کیا انہوں نے جنت دیکھ لی ہے‘ جو اس کے طالب تھے۔ اور کیا جہنم کا عذاب ا ہے‘ جو اس سے پناہ مانگ رہے تھے؟

فرشتے عرض کرتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں۔ آپ کے پیغمبر نے جو ان کو بتایا‘ اس پر ایمان ریقین کر کے یہ خواہشیں کر رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فرشتو! تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے افراد بھی شریک تھے‘ میں نے ں مغفرت کر دی‘ جو مانگتے تھے وہ دے دیا جس سے پناہ چاہتے تھے‘ اس سے ان کو بچالیا۔ اس سے نجات ___ شرکاءِ مجلس کے لئے کتنی بڑی عجیب بشارت ہے۔

رشتے عرض کرتے ہیں‘ کہ اے اللہ اس مجلس میں سارے ہی تیرا ذکر کرنے والے‘ تجھ سے انعام کی ی کرنے والے‘ تیرے عذاب سے بچنے کی دعا کرنے والے نہیں تھے۔ کئی تو مجمع دیکھ کر بطور تماشائی ں پر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے‘ وہ بھی اس مجلسِ شریک قرار دیئے گئے۔ وہ بھی اس مغفرت میں داخل ہیں۔ شریکِ مجلس ایسے لوگ ہیں کہ جن کے

آس پاس کھڑے ہونے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

تو قرآن کریم کا پڑھنا پڑھانا خود سراپا خیر ہے ہی۔ اس مجلس کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے والا بھی انشاء اللہ اس خیر سے محروم نہ رہے گا۔ چاہے وہاں وہ تعلیم و تعلّم کی غرض سے نہ بھی آیا ہو۔ یہ اتنی وسیع رحمت ہے کہ آس پاس والے بھی اس کے احاطہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کتنے مبارک ہیں وہ لوگ' جو قرآن کی تعلیم دیتے' اور اس کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں شب و روز منہمک و مشغول ہیں۔ اور کتنے خوش بخت ہیں وہ طالب علم جو کلام اللہ پڑھنے اور سیکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مسرت کا موقع

قرآن کی تعلیم کی آغاز و افتتاح' امر واقع یہ ہے کہ نہایت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ ہم جتنا بھی اس پر خوش ہوں' کم ہے ___ اس لئے کہ انسان کی خوشی کے دو ہی موقعے ہیں۔ ایک جب وہ کسی کام کی ابتدا یا افتتاح کرتا ہے۔ دوسرا جب وہ اس ابتدا کی انتہا کو پہنچتا ہے' اور حصولِ مقصد میں کامیاب ہوتا ہے ___ آپ جب کسی بچہ کو مکتب میں بٹھاتے ہیں' تو خوشیاں مناتے اور مٹھائی بانٹتے ہیں' کہ زندگی کے ایک بڑے اور اچھے مقصد کی ابتدا ہو رہی ہے اور جب وہ بچہ عالم فاضل بن کر مقصد کی انتہا پر پہنچتا ہے تب بھی خوشیاں منائی جاتی ہیں' جلسے کئے جاتے ہیں' مٹھائی بانٹی جاتی ہے ___ کوئی باغ لگاتا ہے' تو خوشی مناتا ہے' اور جب اس باغ میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع

تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ___ ابتدا و انتہا ___ بچہ جب پیدا ہوتا ہے' تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں' دعوتیں ہوتی ہیں' جلسے کئے جاتے اور جب وہ مرتا ہے' تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے' کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی' اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزاری' اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا

ع چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا' غم کی بات نہیں' خوشی کا موقع ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں۔ روتے ہیں' خوش تو نہیں ہوتے' ___ میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے۔ بلکہ اس کی جدائی پر' یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ "اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر" موت پر رنجیدہ ہوتے' تو اس پر روتے' اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود و محبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے۔ موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتے ہے۔ یہ غمی کی چیز کب ہو سکتی ہے؟ ___ غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے' اور اس کا دنیا کا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے :

الموت تحفة المؤمن

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے؟ تحفہ پر تو اظہارِ مسرت و خوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے :

ان الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب (اوکما قال علیہ الصلٰوۃ والسلام)

موت درمیانی پل ہے' جو محب کو حبیب سے ملاتا ہے۔ جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو' وہ باعثِ گریہ و ملال کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے؟ محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت

کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو گیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا۔ اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے، وہ منقطع ہو گیا، اس سے محروم ہو گئے اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے۔ موت پر رونا نہیں ہے۔

بہر حال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے، اور موت بھی خوشی کا مقام ___ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے، اور جب اس سے فارغ ہو جائے، اس کا حافظ وہ عالم ہو جائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے، البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے، وہ توقعات پر ملتی ہے۔ کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی توقع کی خوشی ہے، اور فراغت و انتہا کی خوشی کمال پر ہوتی ہے کہ ابتدا میں جو امید باندھی گئی تھی، وہ پوری ہو گئی ___ مراد حاصل ہو گئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہو گا، عالم فاضل بنے گا، صناع و کاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسب توقعات کامیاب گزار کر سلامتی ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے۔ تو بھی خوشی ہوتی ہے گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت

بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت علامت ہے۔ کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو، تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (جمعہ پ ۲۸)

معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے ___ اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہو گی، تو موت کی تمنا میں (بوقتِ آزمائش) کوئی جھجک نہ ہو گی۔

حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی ملتا ہے کہ :

اللّٰھم حبّب الموت الیٰ من یعلم انّی رسول اللّٰہ

"اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا اور اس کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے"۔

(اٰمین ثمّ اٰمین بجاہ سیّد المرسلین علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

لایتمنّین احد کم الموت

"تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔

اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے "انا نکرہ الموت" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں، اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ وہ چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد و مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو! کہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ ___ اور جس کے دل میں اللہ محبت' اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے' اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ سے مضامین احادیث بھی مختلف ہیں' ان میں باہم کوئی تضاد یا خلاف نہیں غرض جس طرح ولادت خوشی کی چیز ہے' موت بھی خوشی کی چیز ہے۔

تقریبِ مسرت

توجو بھی قرآن کریم کا آغاز کررہے ہیں۔ ان کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر اور کوئی تقریب کیا ہوسکتی ہے؟ ہمارے بزرگوں کی تقریبات کا جو انداز تھا' اور کونسی تقریب ان کے نظروں میں اہم تھی' اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ میرے جدِ محترم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ نے غالبًا اپنی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب اس طرح کی' کہ چُپ چپاتے مسجد میں خود نکاح پڑھایا' اور گھر آکر لڑکے سے کہا یہ تمہاری دلہن ہے' اسے لے جاؤ' گھر والوں کو پتہ بھی نہیں تھا' سب حیران تھے ___ لیکن میرے والد محترمؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے قرآن مجید حفظ کرلیا' تو بڑی دھوم دھام کی شاہانہ دعوت کی۔ جب سب لوگ کھاپی کر فارغ ہوئے' اور رخصت ہوگئے' تو تنہائی میں مجھ سے فرمایا۔ میاں احمد! تم حافظ بھی ہوگئے تمہاری عزت افزائی بھی ہوگئی' دعوت بھی ایسی دوبارہ نہ ہوگی۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا۔ لیکن یہ قرآن میں نے تم کو اپنے لئے پڑھایا ہے (تاکہ آخرت میں یہ میرے کام آئے) اس لئے والد محترمؒ کا یہ معمول تھا کہ دوپارے روزانہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے تلاوت فرماتے تھے۔

بہرحال قرآن کریم کا آغاز بھی مبارک' اور انجام بھی مبارک۔ آج افتتاح ہے۔ اس تقریب سے بڑھ کر کوئی تقریب نہیں۔ نہ اس خوشی سے بڑھ کر کوئی خوشی ہے۔ تقریبات تو شادیوں اور پیدائشوں کی بھی ہوتی ہیں' مگر اصل تقریب افتتاحِ قرآن ہی کی ہے۔ جس کا افتتاح بھی مبارک' انجام بھی مبارک' ایسے موقع تقریب کی مبارکباد دینا بھی مبارک ___ تو ہماری حاضری آپ کو مبارکباد دینے کے لئے ہوئی ہے۔ آپ حضرات بہترین کام کا افتتاح فرما رہے ہیں' حق تعالیٰ اس کا انجام' اس کی انتہا بھی بہترین فرمائے۔ جس طرح اس کا آغاز بہترین فرمایا ہے۔

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی برکات کا حصہ مقرر فرمائے' اور آخرت میں بھی۔

اللّٰھم انس وحشتنالی قبورنا۔

اللّٰھم ارحمنا بالقرآن العظیم۔ واجعلہ لنا اماماً ونوراً وھدیً ورحمۃً۔

اللّٰھم ذکّرنا منہ مانسینا وعلّمنا منہ ماجھلنا۔ وارزقنا تلاوتہ آناء اللیل وآناء النھار۔ واجعلہ لنا حجّۃً یارب العٰلمین۔

اللّٰھم اجعل القرآن رضاء قلبی وجلاء حزنی فاغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا۔ وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکٰفرین۔

اللھم وتوفّنا مسلمین والحقنا بالصّالحین۔ غیر خزایا ولا مفتونین۔

وصلّی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیّدنا محمّد وّآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

برحمتک یا ارحم الراحمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

عظمتِ حفظ

میدانِ محشر میں آدم علیہ السّلام کی ساری اولاد جمع ہوگی اوّل سے لے کر آخر تک اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے، جلسہ ہوگا اور صدر حق تعالیٰ شانہٗ ہوں گے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم بھی ہوں گے۔ ابھی حِساب و کتاب نہیں ہُوا ہوگا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے قرآن حفظ کرایا تھا، اس کی تاج پوشی کی جائے گی۔

تو اوّلین و آخرین جمع، تاج پہنانے والے حق تعالیٰ اس سے بڑھ کر ایک حافِظ کے لئے فخر و اِعزاز کا اور کونسا موقعہ ہوگا؟

(از حضرت حکیمُ الاسلام مدّ ظلہٗ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔
الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمِ ۔

ظُلمت کدہ میں روشن چراغ

بزرگانِ محترم!

آج ہم سب کے لئے بے انتہا خوشی اور مسرّت کا دن ہے کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافِظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی گئی اور سَند عطا کی گئی اور ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے اپنا کلامِ مبارک اُتار دیا۔ حق تعالیٰ کا کلام کسی بندے کے سینے میں آجانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے، حق تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اور اس کی صفاتِ کمال نُورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمتِ محض ہے۔ اس ظلمت کدہ میں یہ چراغ روشن ہو جانا اور نورِ مطلق کی کِرنیں اس میں گھومنا اور اِنشراحِ قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے اور قرآنِ کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔

سرچشمۂ حیات

اگر غور کیا جائے تو یہ ایک حیات اور ایک زندگی ہے' اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا' اقوام کو بھی زندہ کیا او
عربوں کو بھی زندہ کیا' اور ان میں زندگی کی روح ڈالی' خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ حق
تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا :

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔

"اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی رُوح آپ کے اندر ڈالی'
مراد ہے قرآن کریم"۔

آگے فرمایا گیا :

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِنَا۔

"آپ اس سے پہلے یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آپ واقف
نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اس وحی اور اس روح کو نُور بنا کر آپ کے اندر
ڈالا"۔

جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے۔

تو قرآنِ کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ رُوحِ خداوندی ہے اور نوعیت اس کی عل
اور کمال ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں علم کو رُوح بتلایا گیا ہے۔

ہم اور آپ اپنے عُرف میں جانتے ہیں کہ رُوح باطنی چیز ہے اور وہی زندگی ہے بدن کی' بدن کی کوئی زندگی
نہیں اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے اس
دن یہ بدن بھی پاش پاش ہو کر گندگی میں شمار ہوتا ہے۔ تو حقیقتہً یہ زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس
روح کے رُوپ میں اللہ کے کمال کی ہے۔ تو قرآن کریم جس کو روح کہا گیا ہے وہ روحِ خداوندی ہے او
حقیقت میں ایک معدنِ حیات اور سرچشمۂ زندگی ہے۔

یہ روحِ خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی کہ جو پُشت ہاپُشت سے مُردہ چلی آ رہی تھی۔ د
جس کو حقیر و ذلیل جانتی تھی۔ کوئی ان کو اونٹ کی مینگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا۔ کوئی ان کو جُہلائے عرب
خطاب دیتا تھا۔ کوئی جاہلینِ مکّہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابات سے ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ رو
ان کے اندر بھر گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام جُہلا
عرب تھا ان کا نام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو گیا۔

پہلے ان کو نفرت سے یاد کیا جاتا تھا۔ اب ان کو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کے اعزاز کے ساتھ یاد
جاتا ہے۔ اس روحِ خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا "زمانۂ جاہلیت" اب اس کا نام "خیر القرون" ہے۔
زمان میں بھی زندگی آئی' مکان میں بھی زندگی آئی اور اعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا
زندہ کیا۔

سُپر طاقتوں کی شکست کی بُنیادی وجہ

اور۔ دُنیا کی مُردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلادی اور مُردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پاکر بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصرو کسریٰ کا کبر و غرور خاک میں ملادیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خرافات کو مٹانا تھا جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ قیصریت و کسرویت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے اپنے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تاکہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں چنانچہ رعایا کا ہر فرد آکر سجدہ کرتا تھا اور فریاد کرتا کہ میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں ___ تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا تھا' وہ قیصرو کسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا۔ رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی۔ اس کی غلامی کے معنیٰ صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند اُمراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند افراد فائدہ اُٹھائیں' مساوات تھی نہ عدل و علم تھا۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جنگیں مُلک گیری کے لئے نہیں تھیں' وہ ...ت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں ملانا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور ...ند تعالیٰ کے بندوں میں عدل و مساوات کی راہ میں حارج تھا ___ اس وقت دنیا میں قیصرِ رُوم اور کسریٰ دو بڑی ...ی حکومتیں تھیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی میں سب سے بڑی رُکاوٹ تھیں۔ اس وقت دنیا میں وہی دو ...متیں تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ اوصافِ کمال' عالم میں ...ں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔ یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے۔ ...ں میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت و کسرویت ہے اس لئے ان حضرات نے ملک سے قیصریت ...سرویت کو مٹایا' بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ جاکے اُلٹا۔ جب جاکے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام ...لا' دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عَبد بنے ہوئے تھے وہ عباداللہ بنے' وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنے۔ ...ب میں مساوات آئی۔ ان میں زندگی آئی۔ تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا اور روح ہی معدنِ حیات ہے ___ اس سے گویا واضح ہوگیا کہ قرآن کریم زندگی ہے اور جس قوم میں یہ ...یت کر جائے گا وہ زندہ ہوجائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مُردہ ہوجائے گی۔

حافظِ قرآن کا باطل سے تحفّظ

اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہوگا۔ باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا ہے۔ ...واسطے کہ قرآن کی شان مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

"وہ جو ایمان لے آئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز پر قرآن پر"۔

فرمایا :

وَهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (القرآن الحکیم)

"وہ اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اُتارا گیا ہے"۔

تو مثبت طریق پر تو قرآن کو حق کہا ہے۔ اصل میں حق یہی ہے۔ دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ:

لَايَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَامِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ

"یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں باطل نہیں پھٹک سکتا"۔

یہ حق ہی حق ہے۔ اندر سے بھی حق، اوپر سے بھی۔ نہ باطل اس کے اندر ہے نہ اس کے آس پاس آسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سرتاپا حق۔ اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی کے سینے میں گھسے گا تو اس کے سینے میں بُطلان کہاں سے آجائے گا۔

اور دوسرے جب حق ہے تو اس میں باطل نہیں آسکتا۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے، کل کو معانی اس کے پڑھ لیں گے تو معانی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قُربِ خداوندی ملا۔ دوسرا وصف یہ کہ مشابہت ملی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ مجسّم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ اس کے اندر قرآن رُوح بن کر سرایت کر گیا ہے اور وہ حق ہی حق ہے۔ بُطلان اس کے آس پاس نہیں باطل دُور سے ہی بھاگے گا۔

حافظِ قرآن کی حیاتِ دائمی ہے

اگر اس پہلو کو دیکھیں کہ وہ حَیات ہے اور آپ نے حَیات کو اپنے اندر ڈال لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ ہیں مُردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مُردنی بدن پر طاری ہوگی اور بدن پہلے ہی سے باطل ہے۔ اسے موت آجائے تو کون سے بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کا زندگی کا سامان تو وہ دَوامی زندگی ہے۔ تو حافِظ اور قاری مَرنے والا نہیں۔ روح اس کی جاری و ساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے نہ قاری مرتا ہے نہ عالِم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے۔ اس کی روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اس روح کا فیضان اس عالَم میں پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس بھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے وہاں بھی غذا مِل رہی ہے۔ یہاں بھی مِل رہی ہے۔ یہاں بھی اس کی غذا عِلم و معرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا عِلم و معرفت ہے اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ عِلم و معرفت ہوگا۔ تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے۔ برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہوگا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر قیمت نہیں۔

تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عالَمِ آخرت میں بھی زندہ اور روح کی غذا یہی قرآن کریم ہے جس سے حیاتِ اَبدی ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظِ قرآن مرتا نہیں وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں، ایک جتنی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ مگر روح جو لے کر گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ وہ ایسے

مٹنے والی چیز نہیں وہ قرآن ہے جو روح ہے بلکہ روحِ خداوندی ہے۔ تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا۔ جس حد تک وہ قرآن کو لے چکا ہے اور حیات اس کی دائمی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا بی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے کس کے ایسے نصیب ہیں ___ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہوگا۔

حافظِ قرآن کے والد کی تاجپوشی

حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاجپوشی کی جائے گی یعنی میدانِ حشر میں جہاں اوّلین و آخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا محشر منوّر ہوگا۔ اعلان ہوگا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔ یہ آج اس کی عزّت افزائی ہو رہی ہے' جو تاج پوشی کی گئی ہے۔

دنیا میں اگر کسی کی تاجپوشی کی جائے یہ عظیم ترین اعزاز ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فخر و اعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہو تو اس ملک کے جو اَعیان' ہیں وہ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے۔ اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے ___ اور ایک یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آویں گے یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں ہے پھر تاج پوشی ناقص رہی۔

مگر میدانِ محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہوگی۔ اوّل سے آخر تک۔ اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہوگا۔ صدر حق تعالیٰ شانہٗ ہوں گے۔ ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے' جلسہ کے تمام آفاق پر' زمینوں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوئی ہوں گی۔ بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔ اس میں مسلم غیر مسلم بھی ہوں گے۔ ابھی حساب وکتاب نہیں ہوا ہوگا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا اس کی تاج پوشی کی جائے گی۔ تو اوّلین و آخرین جمع' تاج پہنانے والے خدا تعالیٰ۔ تو اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز اور کون سا موقعہ ہوگا۔ حافظ کو اپنی ذات سے جو تھا وہ تھا ہی۔ اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنایا گیا' ان کی تاج پوشی کی گئی اور اوّلین و آخرین میں شور یہ ہوگا' بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔ تو بہرحال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آسکتا جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہو گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے' اسے القاب ملے گا حق تعالیٰ کے' حیات ملی اسے دائمی۔ اس کے اثرات متعدّی ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے۔ اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی۔ اوّلین و آخرین میں شہرت ہوئی۔ تو گویا قرآن کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں۔

قرآنِ حکیم کی اَبدی حکومت

اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔

حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا

جا' جنت کے درجات کماتا جا۔ اس کی جزا یہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے۔ ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں۔ لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآنی آیتوں کی تعداد ہے۔ اب کوئی قرآن کی آیت ہے چار حرفوں کی۔ اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔ تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔ لطائف الگ نکل رہے ہیں۔ عِلَل الگ نکل رہے ہیں۔ اَسرار الگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حدّ و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی' آیت ایک ہی ہے۔ تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا۔ لیکن مجمل دیکھا جائے تو انواعِ علوم کی اتنی ہیں جتنی آیات ہیں۔ اور درجات جنت کے اتنے ہی ہیں جتنی آیتیں ہیں۔ تو فرمایا جائے گا اس حافظ قرآن سے کہ تلاوت کرتا جا۔ جہاں تک تیری طاقت ہے۔ درجات کماتا جا اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے۔ جیسے آیت کے اندر تفصیلات ہیں۔ لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں۔ تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حدّ و نہایت نہیں ہے اَبدالآباد گزر جائے گا۔ مگر وہ سیر و سیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں کماتا رہے گا۔

تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں' برزخ میں ہی نہیں' حشر میں ہی نہیں' جنت میں اَبدالآباد تک رہے گی۔ اس واسطے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

قرآنِ کریم کے اَبدی آثار کی وجہ

ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے وہ گم نہیں ہوتا وہ مٹتا نہیں' اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ ساری فضا کو گھر لیتا ہے۔ ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے۔ تو فرق یہ ہے کلام اللہ تعالیٰ نے فضا کو گھیرا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا۔ اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا' اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا ہے :

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ

کوئی لفظ' کوئی ہاں ہوں تم اپنے منہ سے نہیں نکالتے کہ ٹانکنے والا اسے ٹانک لیتا ہے' محفوظ کر لیتا ہے۔ ہر ہر لفظ محفوظ ہے۔ ہر ہر ادا محفوظ ہے اور آواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی' وہ عمل بھی' وہ ہیئت بھی' وہ قول بھی' اس قول کی آواز بھی' وہ زمانہ بھی ہر چیز محفوظ ہے۔ تو بہرحال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو گم نہیں ہوتی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ ہمارے اور آپ کے کلام کو تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں جس جس میں وہ کلام جذبات ہو گا۔ وہ اِنشاء اللہ تعالیٰ گم ہونے والی چیز نہیں ہے آخرت تک اس کے آثار و بَرکات چلتے ہی رہیں گے۔

حافظِ قرآن کا حقِ شفاعت

حدیث میں ہے کہ حافظِ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے دس کی شفاعت کر' خواہ وہ ماں باپ ہوں' بھائی بند ہوں۔ تجھے حق ہے دس آدمیوں کی شفاعت کا جس کی چاہے شفاعت کر اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا ہے تو پچاس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہو گا ان کو' اگر گھر میں پچاس آدمی نہیں

ز باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔ گھر والے تو بخشے ہی جائیں گے۔ باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی۔

کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزّت و عظمت کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ بخشا بخشوایا ہے۔ جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جارہا ہے کہ تو شفاعت کر دس آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔ اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا۔ شہداء کو حق دیا جائے گا' کسی کو سات' کسی کو دس آدمیوں کی فاعت کا۔ اب اگر سارے ہی گھر والے حافِظ ہیں تو ان کی شفاعت کہاں تک پہنچے گی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ں۔

اَبدی سربُلندی

بہرحال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حِفظ کرایا ہے۔ وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ اں بھی ان کے لئے بَرکات ہیں وہاں بھی ان کے لئے برکات ہیں۔ بچہ بھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب ں کرتے ہیں' پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حِفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ یہ ہے باپ یہ ہے۔ اس باپ کا احسان ہے جو اس بچہ کو قرآن حِفظ کرایا۔ تو دنیا میں بھی سرنام ہوا اور خرت میں تو تشہیر ہوگی ہی۔ اولین میں آخرین میں تو بچہ بھی اور ماں باپ بھی سارے کے سارے ہی سرنام ں گے۔

عظمتِ قرآنِ کریم

بہرحال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے وقت اتنا نہیں ہے کہ اور ے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آبھی نہیں سکتے۔ یہ دو چار پہلو ذکر کردیئے گئے ہیں کہ یہ ن کے پہلو ہیں جن سے قرآن کریم کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن آئیں کہ بڑی اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی' حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطا فرمائی۔

اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آکر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کی پگڑی باندھے اور آپ سپاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کردیں؟ حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ور آپ لوگ بَری ہیں خدانخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ نے تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہی ہیں۔

نِگاہِ محبّت

مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بُری لگتی ہے۔ اس کا عَیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبت کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبت اور ں سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عَیب دار کے عَیب بھی چُھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں یاں نظر پڑیں تو خوبیاں سراہنی شروع کردیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں؟

ور سادگی سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تو آپ نے اپنی تعریف کی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا دیا ہے۔ آپ نے اپنی وُسعتِ قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھایا آپ

میں وُسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھادیا۔ تو وُسعتِ قلبی کا ثبوت آپ دیں۔ تو شکریہ میں کیوں ادا کروں یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

برکتؒ سے بڑھ کر برکتؒ

اور میں کہتا ہوں کہ نہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو اور نہ ہم تمہارا شکریہ ادا کریں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا۔ ہمیں توفیق دی کہ ان کو پگڑی باندھیں' ہمیں توفیق دی کہ ان کو سَند دیں اور اس قرآنِ کریم کی تعلیم کو ہم آگے چلائیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت جو ہمیں توفیق عطا فرمائی۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کردیا کہ مسلمانوں کا اِجتماع یہ خود ایک مستقل نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے۔ قرآن کے بھی اِفادے کے لئے وہ آگے بڑھیں تو یہ برکت دَربرکت دَربرکت ہے۔

تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطا فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکر کے وہ ہیں۔

ولہٗ الثناء الحسن ولہٗ الکبریاء فی السّمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم۔

عزّت والا وہ' شکر کا مستحق وہ' حمد وثنا اس کے لئے۔ تو ہم سب مل کر اس کی حمد وثنا کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلّم اور ہمارے قاری صاحبؒ کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطا فرمائے اور ہمارے اس قصبے اور علاقے کے لوگوں کو اور زیادہ توجّہ عطا فرمائے۔

"آمین"

اللّٰھمّ تقبّل منّاانّک انت السّمیع العلیم۔

قرآن معدنِ حیات ہے

بعد از خطبہ مسنونہ

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم○بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

اَلٓمّٓ ذَالِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ○

صدق اللہ العظیم○

قرآن روح خداوندی ہے

بزرگانِ محترم! آج ہم سب کے لئے بے انتہاء خوشی اور مسرت کا دن ہے کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی گئی اور سند عطاء کی گئی اور ان کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام مبارک اتار دیا۔ خدا کا کلام کسی بندے کے سینے میں آجانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بابرکات اور اس کی صفات کمال نور مطلق ہے اور بندہ عظمت محض ہے، اس ظلمت کدہ میں یہ چراغ روشن ہو جانا اور نور مطلق کی کرنیں اس میں گھومنا اور انشراح قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے، اور قرآن کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایک حیات ہے اور ایک زندگی، اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا، اقوام کو بھی زندہ کیا اور ان میں زندگی کی روح ڈالی۔ خود قرآن کریم میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

وَكَذَالِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا

اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی روح آپ کے اندر ڈالی، مراد ہے قرآن۔

آگے فرمایا گیا:

مَاكُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا.

آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے؟ اس سے بھی واقف نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے؟

ہم نے اس وحی اور اس روح کو نور بنا کر آپ کے اندر ڈالا کہ جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے، تو قرآن کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ روح خداوندی ہے اور نوعیت اس کی علم اور کمال ہے تو دوسرے لفظوں میں علم کو روح بتلایا گیا ہے، ہم اور آپ اپنے عرف میں جانتے ہیں کہ روح باطنی چیز ہے اور وہی زندگی ہے بدن کی، بدن کی کوئی زندگی نہیں، اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن

بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے اسی دن یہ بدن بھی پاش پاش ہو کر گندگی شمار ہوتا ہے تو حقیقتاً زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس روح کے روپ میں اللہ کے کمال کی ہے، تو قرآن کریم جس کو روح کہا گیا ہے وہ روح خداوندی ہے اور حقیقت میں ایک معدن حیات اور سرچشمہ زندگی ہے۔ یہ روح خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی کہ جو پشت ہاپشت سے مردہ چلی آرہی تھی۔ دنیا جس کو حقیر وذلیل جانتی تھی، کوئی ان کو اونٹ اور مینگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا، کوئی ان کو جہلاء عرب کا خطاب دیتا تھا، کوئی جاہلین مکہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابوں سے ان کو یاد کیا جاتا تھا، لیکن جب یہ روح ان کے اندر بھری گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام جہلاء عرب تھا، ان کا نام ہو گیا صحابہ کرام۔ پہلے ان کو نفرت سے یاد کیا جاتا تھا، اب ان کو رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کے اعزاز کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس روح خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا "جاہلیت کا زمانہ" اب اس کا نام "خیر القرون" ہے۔ تو زمان میں بھی زندگی آئی، مکان میں بھی زندگی آئی اور اعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا کو زندہ کیا اور دنیا کی مردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلادی، اور مردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پاکر جو بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصر وکسریٰ کا کبر وغرور خاک میں ملا دیا، اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خرافات کو مٹانا تھا کہ جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں، قیصریت وکسرویت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تاکہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں، چنانچہ رعایا کا ہر فرد آکر سجدہ کرتا تھا، اور فریاد کرتا کہ میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں، تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا ہے وہ قیصر وکسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا، رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی، اس کی غلامی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند امراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند افراد فائدہ اٹھائیں، نہ مساوات تھی اور نہ عدل وعلم تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہؓ کی جنگیں ملک گیری کے لئے نہیں تھیں، وہ تخت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں ملانا تھا جو اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کے بندوں میں عدل ومساوات کی راہ میں خارج تھا۔ اس وقت دنیا میں قیصر روم وکسریٰ کی دو بڑی بڑی حکومتیں تھیں جو اللہ کے دین کی بلندی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ اس وقت دنیا میں وہی دو حکومتیں تھیں انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا یہ اوصاف کمال عالم میں نہیں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔

یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے۔ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت کسرویت

ہے۔ اس لئے ان حضرات نے ملک قیصریت کسرویت کو مٹایا، بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ الٹا جب جاہ کے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام پھیلا، دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عبد بنے ہوئے تھے۔ وہی عباد اللہ بنے، وہ اللہ کے بندے بنے، سب میں مساوات آئی اور ان میں زندگی آئی تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا ہے اور روح ہی معدن حیات ہے، اس سے گویا واضح ہو گیا کہ قرآن زندگی ہے اور جس قوم میں یہ سرایت کر جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مردہ ہو جائے گی خود اپنے اوپر غور کر لیجئے۔

قوم مسلم کا حال

جب تک مسلمانوں میں قرآن کی روح رہی وہ بلند و بالا رہے، جس دن یہ روح نکلی ہے اسی دن سے ذلت کے ساتھ دین سے نکلے جارہے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ گیند ہوتی ہے کہ اگر زمین پر دے کر مار دو تو وہ گدا کھا کر زمین سے دس گز اوپر جائے گی، اور سخت ہے تو جتنا زیادہ زور سے دے کر مارو گے اتنا ہی زیادہ بلندی کی طرف جائے گی۔ یہ ربڑ کی خاصیت نہیں وہ جو ربڑ نے اپنے اندر ہوا بھر رکھی ہے اس کی یہ خاصیت ہے کہ وہ نیچا نہیں دیکھ سکتی، زمین پر دے کر مارو گے تو اوپر کی طرف جائے گی۔ لیکن گیند سے ہوا نکال دو تو جس جگہ آپ ڈال دیں گے وہ وہیں پڑی رہے گی۔ اس میں اٹھنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں رہے گی۔ یہی حال مسلم قوم کا ہے جب تک اس میں روح قرآنی ہے جب تک اس کی عزت و روح ایمانی زندہ رہی۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ اقوام نے جتنی قوت سے دبانا چاہا اور زمین پر جتنے زور سے دے کر مانا چاہا اتنی ہی یہ اوپر اٹھی لیکن ہوا نکل گئی یہ خالی خول رہ گئی، تو جس نے جہاں پٹخ دیا وہیں پڑی رہی، اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ لوگ کہتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں دنیا کی اقوام کی کہ دوسروں نے ہمیں ختم کر دیا، ہمارے گھر جلا دیئے گئے، ہم پر ظلم کیا۔ خاص طور پر یہود کے عربوں پر مظالم، حقیقت یہ ہے کہ ظلم انہوں نے نہیں کیا، قصور اپنا ہے تم نے ان پر ظلم کیا ان کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں، اگر انہوں نے تم کو جلایا تو میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی مردہ لاش پڑی ہوئی ہو تو ہر قوم کا فرض ہے کہ اس کو جلا دے یا دفن کر دے۔ اگر نہ جلایا جائے یا نہ دفن کیا جائے تو تعفن ہو جائے گا اگر مردہ لاشوں کو کسی قوم نے جلا ہی دیا یا دریا برد کر دیا تو کیا غلطی کیا اس قوم نے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آنکھ پھر کر بھی نہ دیکھے تو وہ روح پیدا کیجئے جسے زندگی ملے، تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ نگاہ بدل سکے، لیکن لاشہ بننے کے بعد تو ہر قوم کا فرض ہے کہ اسے جلا دے یا دریا میں ڈال دے، یہ تو قصور آپ کا ہے اس قصور کو آپ ختم کیجئے اور اپنی اصلاح کیجئے۔

خیر امت کون ہے؟

آپ کو خیر امت کا خطاب دیا گیا کہ دنیا کو ہدایت کرے اور زندگی بخشے۔ جب امام ہی مردہ بن کر پڑا رہا ہو تو پھر مقتدیوں کی نماز کہاں سے ہو گی۔ اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو مقتدی کتنے ہی خشوع و خضوع سے

کھڑے ہوں نہ ان کی اطاعت ہوگی، نہ عبادت بنے گی، پہلے امام تو اپنی نماز درست کرلے پھر مقتدیوں کی بھی نماز درست ہوگی تو آپ میں وضو نہیں، آپ میں طہارت نہیں، آپ میں سماحت نہیں، عدل نہیں، انصاف نہیں، تو دنیا میں ظلم پھیلے گا۔ اقوام کی برائیوں کی ذمہ داری آپ کے اوپر ہے۔ آپ کی برائی کی ذمہ داری کسی قوم کے اوپر نہیں۔ جو امام بن کر آیا ہے وہ خود درست کرے، اگر وہ مقتدیوں سے کہنے لگے کہ تم نے میری نماز خراب کردی تو مقتدی کہہ سکتے ہیں کہ تو نے بگڑ کر ہماری نماز بگاڑ دی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، آپ کا فرض ہے خیر بن کر دکھائیں، خیر امت تو آپ ہی کو کہا گیا ہے۔ وہ خیریت اپنے اندر پیدا کریں۔ اور وہ خیریت جب ہی پیدا ہوگی جب قرآن کریم کو اپنے اندر رچالیں، بسالیں اور وہی زندگی اپنے اندر پیدا کرلیں جس کو قرآن کہا گیا ہے۔

قرآن بہترین مصلح ہے

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ :لا یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا یعنی اس امت کے اخیر کی اصلاح اسی سے ہوسکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی ہے۔ امت کے اولین طبقے کی اصلاح کا ضامن یہی قرآن کریم ہے۔ صحابہؓ کے کتب خانہ میں کوئی کتاب نہیں تھی، بجز کتاب خداوندی کے، اسی کو لے کر آگے بڑھے تو جس چیز سے امت کے اولین طبقے کی اصلاح ہوئی ہے اسی چیز سے امت کے آخری طبقے کی اصلاح ہوگی، اور وہ قرآن کریم ہے۔ جو منبع حیات ہے، اس بات کا آپ تجربہ کرچکے ہیں۔ جب تک یہ چیز باقی تھی تو آپ کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ بدر کے میدان میں تین سو تیرہ آدمیوں نے مکہ کی قسمت پلٹ دی یا آج آپ ہیں کہ ستر کروڑ ہیں اور آپ کی قسمت بدل رہے ہیں دوسرے لوگ، آپ میں یہ طاقت نہیں کہ دنیا کو بدل سکیں۔

بہر حال قرآن کریم کا ایک وصف حیات ہے۔ زندگی ہے، جب تک یہ حیات نہیں پیدا کریں گے مردنی رفع نہیں ہوسکتی۔ آپ لاکھ شور مچائیں مگر آپ کے لئے معدن حیات یہی ہے آخر یہ حیات کہاں سے آئی تھی کہ فرمایا:

اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ

تم اگر بیس ہوگئے تو دو سو پر غالب ہوتے۔ اور ہزار ہوگے تو دو ہزار پر غالب ہوگے۔

اور وہ محض کوئی آرڈر ہی نہیں تھا اور وہ محض کوئی منقبت نہیں تھی۔ اس پر تو صحابہ نے عمل کرکے دکھادیا۔ اسلام میں کثرت کوئی چیز نہیں، وہاں قوت اور معنویت دیکھی جاتی ہے، اگر ایک ہے مگر اس میں معنویت ہے تو ہزار بے معنی انسانوں پر اپنی قوت معنوی سے غالب آئے گا۔

خالد بن ولید کی بہادری

مسلمانوں کا مقابلہ ماہان بن ولی سے ہوا۔ مسلمانوں کے لشکر کے کمانڈر تھے خالد بن ولید، ماہان کے پاس

ساٹھ ہزار کا لشکر تھا اور مسلمان دس ہزار تھے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کی قوت کتنی ہے۔ صحابہؓ میں سے ایک ہزار ٹھہر گئے اور تین سو آدمی منتخب کئے گئے کہ جا کر یہ پتہ چلائیں کہ دشمن کا لشکر کہاں ہے اور اس کی تعداد کتنی ہے اور اس کے پاس سامان کیا ہے؟ خالد بن ولید سے کہا گیا کہ آپ تین سو آدمی لے جائیں، انہوں نے کہا کہ تین سو کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ساتھ آپ تیس آدمی کر دیجئے بس یہ کافی ہیں۔ وہ صرف تیس آدمی لے گئے۔ صحابہؓ نے کہا کہ آپ کی قوت ایمانی آپ کو مبارک، مگر دنیا عالم اسباب ہے، تیس آدمی کچھ نہیں ہوتے، آپ کم سے کم ساٹھ آدمی لے لیجئے۔ تیس آدمی مجبور کر کے اور بڑھائے گئے، اور ساٹھ آدمی لے کر پتہ لگانے کے لئے گئے۔ باقی حضرات اپنے قیام پر ہی ٹھہر گئے۔ تو چند میل کے فاصلے پر جا کر معلوم ہوا کہ وہاں دشمن کا لشکر پڑا ہوا ہے، اور ساٹھ ہزار اس کی تعداد ہے، اس کی تعداد کا بھی، اس کی قوت کا بھی پتہ چل گیا تو خالد بن ولیدؓ نے فرمایا کہ بھائی! لشکر تو سامنے آ گیا، اب انہیں اطلاع کی جائے یا ہم خود جنگ کر لیں، میری رائے تو یہ ہے کہ ادھر اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے، جتنے آئے ہیں وہ کافی ہیں ان سے لڑنے کے لئے۔ صحابہ نے کہا ہے کہ بے شک ہم شوقِ شہادت میں آئے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ جب شہادت سامنے ہے تو پھر دشمن کی کثرت کی کیا پرواہ، اور اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان حضرات کو اطلاع دی جائے ساٹھ آدمی ہم ہیں۔ خالد بن ولیدؓ نے ساٹھ آدمیوں کو صف بنا کر کھڑا کیا۔ دوسری طرف ساٹھ ہزار کا لشکر تھا۔ توماہاں بن ولی نے آگے بڑھ کر کہا اے خالد! ہم سمجھتے تھے کہ مسلمان قوم بڑی سمجھدار قوم ہے مگر تم لوگ تو احمق معلوم ہوتے ہو۔ ساٹھ ہزار سے لڑنے کے لئے تم ساٹھ آدمی لے کر آئے ہو۔ ہم تم پر رحم کھاتے ہیں اور ہم تمہیں دو دو بورے کھجوروں کے دے دیں گے، یہیں دو دو چار چار اشرفیاں دے دیں گے، تم چند بھیک منگے لوگوں کو لے آئے ہو، جو ہم تمہیں دیں گے یہی تمہارے لئے کافی ہوگا۔ کیوں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہو، جاؤ یہاں سے۔ خالد بن ولید نے کہا کہ تو واعظ بن کر آیا ہے یا کمانڈر بن کر آیا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی تو اپنی بزدلی کو واعظ کے پردے میں چھپا رہا ہے۔ تم میں لڑنے کی طاقت نہیں۔ یہ سن کر اس کے غصے کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے ساٹھ ہزار کو حکم دیا کہ پکڑ لو ان ساٹھ آدمیوں کو، تو ساٹھ ہزار نے حملہ کیا اور صحابہ ان میں گھس گئے۔

راوی کہتا ہے کہ گھستے ہوئے نظر آئے پھر پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں ہیں سوائے تلوار کی چمک کے اور کچھ کھچ کی آواز کے ساتھ کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی، تین گھنٹے میں جنگ کا فیصلہ ہوا، ساٹھ نے ساٹھ ہزار کا منہ پھیرا اور سرحد سے باہر نکال کر پھر واپس ہوئے، اور وہ دس ہزار منتظر ہیں کہ وہ ساٹھ آدمی اب خبر لے کر آئیں گے، اب جہاد شروع ہوگا اور وہ سارے مجاہدین جنگ کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ یہاں ساٹھ آدمیوں نے جنگ کا فیصلہ بھی کر دیا، اور سرحد سے باہر کر دیا۔

ہر جگہ قوت ایمانی کار گر ہے۔

یہ جو فرمایا کہ تم دس آدمی بھی ہو گے تو ہزار پر غالب ہو گے یہ محض خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقعی اس کے اندر قوت کار گر ہے، اور عملاً یہ نمایاں ہو چکا ہے، کبھی صحابہؓ نے یہ پرواہ نہیں کی ہے کہ ہم تھوڑے ہیں اور دشمن تعداد میں زیادہ ہیں۔ ہمارے پاس سامان نہیں اور ان کے پاس سامان ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ روح کہاں سے آئی تھی، کہ ایک ایک کو ہزار پر بھاری کر دیا، جب روح نکل جائے گی تو سوائے گوشت کے آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔ آپ کبھی غالب نہیں ہوں گے تیر و تفنگ سے، آپ کبھی غالب نہیں ہوں گے ہتھیاروں سے، آپ کے اندر طاقت اُسی ایمانی قوت کی تھی جس نے تلوار کو بھی حرکت دی اور نیزہ کو بھی حرکت دی، تو اسی ایمانی قوت نے حرکت دی۔ اگر آدمی بڑا مضبوط ہو، دیکھنے میں ہتھیار بھی ہیں لیکن دل چڑیا کا سا ہے اور اس میں جان بھی نہیں تو تلوار ہی کیا کام کرے گی۔ تلوار بھی جب ہی کام کرتے ہے کہ جب دل میں طاقت ہو، لڑنے والی چیز دل ہے۔ ہاتھ نہیں لڑا کرتا اور دل کی قوت ہے قوت ایمانی، قوت توحید اور یہی قوت ہے جو دلوں کو قوت بخشتی ہے اس سے لڑیں گے۔ تو بہر حال قرآن کا ایک وصف تو یہ ہے کہ وہ حیات ہے۔ وہ زندگی پیدا کرتا ہے۔ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

عربی زبان ثقیل نہیں ہے

دوسرا ایک بڑا وصف قرآن کا جو ہے وہ موقعہ کے مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ جو بچے آپ کے سامنے آئے۔ جن کو آپ نے قرآن کی پگڑی باندھی، ایک گونہ مشابہت حاصل ہوئی نبی کریم سے اس واسطے کہ قرآن کریم کے بارے میں حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ **انه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين** یہ اتارا ہوا کلام ہے اللہ رب العزت کا، اس کو لے کر نازل ہوئے روح الامین، یعنی حضرت جبرئیل۔ آپ کے قلب مبارک پر اے محمدؐ! تاکہ آپ دنیا کو ڈرائیں اور تبلیغ کریں اور انذار فرمائیں، اور اس کی عربی مبین ہے۔ یعنی واضح زبان ہے کھلی ہوئی ہے جس کے ادا کرنے میں کوئی پیچ پیچ نہیں ہے۔ کوئی تعقید نہیں، زبان کو مروڑنا نہیں پڑتا ہے۔ واقعی زبان عربی کے اندر فصاحت وبلاغت اور سلاست و بداعت کی ساری چیزیں جمع ہیں جس کو ادا کرنے میں زبان کو توڑنا موڑنا نہیں پڑتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زبان عربی خود زبان کو چلا رہی ہو کہ مجھے ادھر چلنا ہے۔ اے زبان! تو بھی ادھر کو ہی چل۔ تو ساتھ ساتھ زبان بھی چلتی ہے۔

دوسری زبانیں ثقیل ہیں

عربی زبان سے پہلے جو زبان رائج تھی اور جس میں آسمانی کتابیں بھی آئیں۔ وہ عبرانی یا سریانی زبان تھی۔ اس کے بعد اللہ نے عربی پیدا فرمادی اور دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی زبان کی اصلاح یافتہ صورت عربی زبان، اس کے ثقل کو ختم کر کے خفت پیدا کر دی گئی بس وہ عربی بن گئی، اور وہ میں اس سے سمجھا کہ مجھے تورات کی ایک آیت یاد آئی، وہ قریب قریب عربی ہے۔ مگر ہے وہ پیچیدہ لب ولہجہ میں۔ عربی نے اس کو واضح

کردیا تورات میں حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا جس میں پیشن گوئی نبی کریم کی فرمائی، آیت کے لفظ یہ ہیں: نابی مخر بخ ما خوخ یا خیم لخ الوھح فتسمعون یہ کیا چیز ہے اس کی تشریح یہ ہے نابی یعنی نبی مخربخ یعنی من قریلك ماخوخ یعنی من اخیك، یا خیم لخ یعنی یقیم لك، الوھح یعنی الھك فتسمعون یعنی فتسمعون ۔ یعنی ایک نبی آنے والے ہیں جو تمہارے قریب میں ہوں گے، تمہارے عزیز ہوں گے تمہارے بھائیوں میں سے ہوں گے، وہ الوہیت کو قائم کریں گے خداوندی نور دکھلائیں گے، اب آپ فرق پیدا کیجئے ان دونوں عبارتوں میں صرف خا کے سوا کچھ نہیں۔ باقی معنی میں کوئی فرق نہیں، خبر دی ہے اس میں کہ نبی کریمؐ تمہارے قریب ہی آنے والے ہیں۔ تمہارے بنی اعمام میں سے ہوں گے اور وہ اللہ کی الوہیت کو قائم کریں گے۔ دینا میں اس کی توحید کو پھیلائیں گے اس کے علم کو اس کے دین کو پھیلائیں گے۔ تو عربی زبان مبین ہے، کھلی ہوئی ہے، ثقیل نہیں، اس کا جو کلمہ ہے واضح ہے کانوں پر بھی بھاری نہیں۔ دل پر بھی بھاری نہیں، اور اپنے معانی کے لحاظ سے بھی بھاری نہیں ہے۔ اس میں ہر پہلو سے خفت ہے اس لئے یہ کلام مبین ہے۔

قرآن کے الفاظ و معانی منزل من اللہ ہیں

بہر حال یہ فرمایا گیا کہ:

"وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ"

"یہ نازل کردہ کلام خداوندی ہے جس کو روح الامین آپ کے قلب پر لے کر آئے ہیں"

تو قرآن کریم کی پہلی شان تو یہ ہے کہ وہ دل میں بیٹھا حضورؐ کے اور جب ذخیرہ جمع ہوا تو آپؐ کے قلب مبارک نے اسے ضبط کر لیا۔ اس کے الفاظ کو بھی اس کے معانی کو بھی۔ اس کے بعد دوسری چیز ہوئی کہ زبان مبارک سے آپؐ نے امت کے سامنے پڑھا، جس کو قرآن نے دوسری جگہ بیان کیا ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ

"جب وحی نازل ہوتی تو عادت یہ تھی کہ آپ اسے رٹنا شروع کر دیتے تھے کہ میں بھول نہ جاؤں"

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ

"زبان مت ہلاؤ"

آپ فکو یہی تو خوف ہے کہ بھول نہ جاؤں، فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ

"ہماری ذمہ داری ہے ہم جمع کر دیں گے سینے میں

وَ قُرْاٰنَهٗ

”اور ہم اسے آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے۔ ادا بھی کرا دیں گے۔“
تو آپ حافظ بھی بنیں گے۔ آپ کے سینے میں قرآن بھی محفوظ اور قرات بھی آپ کی زبان پر ہو گی۔ پھر اتنی ہی گارنٹی نہیں کہ سینے میں جمع کر دیں، اور زبان سے پڑھوا دیں۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

پھر اس کے معنی و مضامین کو کھولنے کی بھی گارنٹی ہم لیتے ہیں۔
کہ جتنے اس کے مطالب اور مرادات ربانیہ ہیں وہ بھی آپ پر منکشف کر دیں گے، تو اللہ رب العزت نے تین چیزوں کی ذمہ داری لی ہے سینے میں جمع بھی کر دیا، زبان سے پڑھوا بھی دیا اور زبان سے ان معانی کو ادا بھی کرا دیا۔ تو حضورؐ کی شان یہ ہے کہ قلب مقدس میں قرآن جمع ہوا زبان مبارک سے الفاظ جاری ہوئے، اور سینے صافی سے معانی و مضامین کھلنے شروع ہو گئے۔

حافظ قرآن کو تشبہ حاصل ہے نبی کریمؐ سے

ایک بچہ حفظ کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے دل میں جمع کرتا ہے قرآن کو، اس کو تشبہ حاصل ہو نبی کریمؐ سے، جیسے کہ آپ کے قلب پر قرآن اترا ویسے ہی اس بچہ کے قلب پر قرآن اترا۔ اس کے بعد آپ نے زبان سے پڑھا، جب یہ بچہ قرات کرتا ہے تو دوسری مشابہت ہوئی نبی کریمؐ سے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ ترقی دے اس مدرسہ کو جہاں انہوں نے قرآن کے الفاظ پڑھائے ہیں وہاں معانی بھی پڑھا دیں۔ تو ثم ان علینابیانہ بھی اس کے ذریعہ ظاہر ہو جائے اور کھول کھول کر معانی و مطالب بھی بیان کریں، تو قرآن کریم کی ایک شان تو یہ ہے کہ وہ حیات ہے اور زندگی ہے اور دوسری شان یہ ہے کہ اس سے مشابہت ہوئی ہے نبی کریمؐ کے ساتھ کہ قرآن سینے میں اترا تھا اور اس کے حافظ تھے اور زبان سے بھی اس کو ادا کرتے تھے۔

دین کے ہر شعبہ کو مستقل ایک طبقے نے سنبھالا ہے

حقیقی معنی میں قرآن کے حافظ اولاً خلفاء خداوندی ہیں، پھر معانی میں خلفاء ہیں علماء، پھر اخلاق میں خلفاء ہیں حضرات صوفیاء ت الفاظ قرآن میں حفاظ خلفاء ہوئے، اگر وہ ان الفاظ کو یاد کر کے امت تک پہنچائیں تو قرآنی تعبیرات محفوظ نہیں رہ سکتی، تو حق تعالیٰ نے مختلف خلفاء اپنے پیدا کئے، اور خلیفہ وہی ہے جس میں اصل کی صفات کچھ نہ کچھ چلی آئیں۔ تو علماء نے معانی کی صفات اپنے اندر لیں، فقہاء نے تفقہ کی صفات اپنے اندر جمع کر لیں متکلمین نے عقائد کو جمع کیا، حفاظ نے قرآن کے الفاظ کو جمع کیا۔ قراء نے اس کے طرز ادا کو محفوظ کیا، اور تجوید سے پڑھ کر سنایا، تو ایک ایک پہلو کے لئے مختلف جماعتیں کھڑی ہو گئیں۔ حفاظ کھڑے ہوئے الفاظ کی حفاظت کے لئے، قراء کھڑے ہو گئے لب و لہجہ کی حفاظت کے لئے، علماء رسم الخط کے لئے طرز کتابت کے لئے، فقہاء کھڑے ہو گئے اس کے علم کی حفاظت کے لئے، یہ تمام خلفاء خداوندی ہیں، کسی نے لفظوں کو سنبھالا، کسی نے معانی کو سنبھالا، کسی جماعت نے قرآنی حقائق کو سنبھالا

کسی نے قرآنی علل اور اسرار کو سنبھالا، اور سب کی سندیں جا کر ملتی ہیں حق تعالیٰ شانہٗ سے، وہ استاذ ہیں خلفاء قرآن کے۔

حفاظت قرآن پر بیان اسناد

اب یہ سندیں جو آپ نے ان حافظوں کو دیں اور ان پر ان کے اساتذہ نے دستخط کئے جن سے انہوں نے پڑھا ہے، ان اساتذہ کو سند دی ان کے اساتذہ نے، ان کو سند دی ان کے اساتذہ نے، اسی طرح سلسلہ اوپر تک چلا گیا، تو سب کے استاذ الاساتذہ نبی کریم ہیں، اور آپ پر قرآن لے کر آئے حضرت جبرئیل امین کو پڑھایا حق تعالیٰ نے تو اخیر میں حق تعالیٰ استاد ٹھہرتے ہیں ان تمام حفاظ اور قراء کے تو ہماری سند اللہ تعالیٰ کی سند تک جا پہنچی۔ دنیا میں آج کون سی آسمانی کتاب ہے کہ جس کی سند استاد، دادا استاد یا پردادا استاد تک بھی پہنچی ہو اس کی سند کا سلسلہ ہی موجود نہیں۔ انجیل کے بارے میں آپ نہیں بتا سکتے کہ کہاں اتری، اور کون لے کر آیا، یہ کس طرح ہم تک پہنچی ہے ہاں ان آسمانی کتب کی جتنی حفاظت کی ہے وہ قرآن نے کی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی کتاب انجیل بھی ہے۔ خود انجیل والے جو ہیں ان کو سند کا پتہ نہیں۔ کہاں سے یہ کتابیں لے کر آئے ہو کہیں گے ہمارے باپ دادا سے چلی آ رہی ہیں۔ لیکن اسناد متصل جس کا سلسلہ پیغمبر تک پہنچا دے اس کا کوئی وجود نہیں اور مسلمانوں نے کتاب آسمانی کی وہ حفاظت کی ہے کہ جس کی نظیر آج دنیا میں موجود نہیں ہے، مجھے اگر آج کوئی کہے کہ قرآن شریف کس نے پڑھایا؟ تو میں کہوں گا، قاری عبدالوحید صاحب نے اور ان کو پڑھایا قاری محمود صاحب مکی نے ان کو پڑھایا محمود صاحب مصری نے، اور چلتے چلتے ابی ابن کعب تک سند پہنچ جائے گی اور پھر نبی کریم تک کہ قرآن کے الفاظ تک کی سند مسلمانوں میں محفوظ ہے۔ پھر اتنی محفوظ کتاب کہ سورتیں اس کی گنی ہوئی، رکوع اس کے گنے ہوئے حرف گنے ہوئے، کلمات گنے ہوئے، زیر وزبر گنے ہوئے ہیں۔

مفسرین لکھتے ہیں اور مستقل کتابیں مدون ہو گئیں کہ قرآن کو اٹھا کر دیکھئے کہ حروف و کلمات تک گنے ہوئے محفوظ ہیں کہ اتنے لاکھ حروف ہیں۔ اتنے ہزار جملے ہیں، اتنے رکوع ہیں، اتنی سورتیں ہیں تو اب کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، پھر ہر زمانہ میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں حفاظ موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں قرآن لکھا ہوا ہے۔ لکھی ہوئی کتاب دریا برد ہو سکتی ہے، اس کے حروف مٹائے جا سکتے ہیں، لب و لہجہ بدل جائے، معانی بدل سکتے ہیں لیکن قرآن کی کسوٹی وہ ہے نہ لب و لہجہ بدلے گا اس کے لئے کہ سر کے اوپر قراء کھڑے ہوئے ہیں، کہیں گے یہ پڑھو، اس طرح مت پڑھو۔ کتابت نہیں بدل سکتی کیونکہ علماء رسم الخط کھڑے ہوئے ہیں، کہیں گے کہ یہ لکھا جائے گا جیسے حضورؐ کے زمانہ میں لکھا گیا۔ مطلب بدلو تو علماء کھڑے ہوئے ہیں انہوں نے قواعد اور موازین بنا دی ہیں کہ عربیت اور شریعت کے لحاظ سے یہی مطلب ہو سکتا ہے دوسرا مطلب نکل ہی نہیں سکتا ہے۔ تو معانی کی حفاظت، الفاظ کی حفاظت، لب ولہجہ کی

حفاظت اور رسم الخط کی حفاظت، واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے صحیح دعویٰ کیا ہے کہ:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون

ہم ہی نے یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

سوائے حفاظت خداوندی کے یہ شکلیں بن نہیں سکتیں، توراۃ اور انجیل کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ

"تورات کو اتارا ہم نے، احبار اور رہبان اور ربانیوں سے کہا کہ تم ذمہ دار ہو اس کی حفاظت کے مگر حفاظت نہیں کر سکے۔

اگر قرآن کی ذمہ داری بھی ہم اور آپ پر چھوڑ دی جاتی تو اس کی بھی وہی گت بنتی جو توراۃ اور انجیل کی بنی ہے اور پھر یہ آخری کتاب ہے، آئندہ کوئی کتاب آنے والی نہیں تھی اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی گارنٹی خود لی کہ ہم نے ہی یہ کتاب اتاری ہے اور ہم ہی اس کے حفاظت کے ذمہ دار ہیں، اور اس کی ہر صفت کا ظہور خود قرآن کریم ہی سے ظاہر ہے، قرآن کی صفت اول اس کا حفظ ہے مگر اس کا پہلا تعلق خود ذات خداوندی سے ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصل حافظ تو حق تعالیٰ ہیں۔

اصل میں حافظ حق تعالیٰ کی ذات گرامی ہے

دینوی اسباب کے ذیل میں ہی اللہ کی صفات کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً وہ رازق ہے۔ مگر اس کی رازقی کو ظاہر کرتے ہیں زمین، کاشت کار، اور تخم ریزی اور کھیت کو زندگی بخشنے والی بارش، وہ خالق ہے مگر مرد اور عورت کا فطری تعلق اور بچے کا نو مہینے پیٹ میں رہنا، اس کی صفت تخلیق کا مظاہرہ ہے۔ وہ ہادی ہے، مگر اپنی ہدایت کو ظاہر کرتا ہے علماء اور شاگردی اور استاذی کے ذریعہ۔ وہی اصل میں حافظ ہیں اور قرآن کے حفاظت کرنے والے ہیں، مگر ان کا حفظ ظاہر ہو رہا ہے۔ اس طرح سے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے دلوں میں محفوظ کر دیا، او بچوں کے ماں باپ کے دلوں میں جذبہ پیدا کر دیا کہ بچوں کو حفظ کرائیں۔ ورنہ چھ چھ برس کے بچوں کو کیا خبر کہ قرآن کیا چیز ہے۔ نہ معنی کی خبر، نہ یہ خبر کہ یہ وحی ہے اور کلام خداوندی ہے، مگر لگے ہوئے ہیں رٹنے کے اندر محفوظ کرنے کے لئے۔ یہ سوائے حفاظت خداوندی کے اور ہے کیا؟ اور پھر اس یہ کہ کوئی وعدہ نہیں کہ تم حافظ قرآن بنو گے تو کلکٹر بنادئے جاؤ گے، مجسٹریٹ بن جاؤ گے، ہندوستان کے پریزیڈنٹ بن جاؤ گے بلکہ وعدہ یہ ہے کہ حفظ کرلو گے تو لوگوں کی گالیاں سننی پڑیں گی، کوئی کہے گا کہ دقیانوسی تھے۔ کوئی کہے گا کہ قدامت پسند ہے، کوئی کہے گا کہ وقت ضائع کنندہ ہے۔

ان سب کے باوجود ماں باپ کے دلوں میں جذبہ ہے کہ بچوں کو مدرسہ میں داخل کرو اور قرآن یاد کرو اور بچپن میں کہ رٹ رہے ہیں یہ سوائے حفاظت خداوندی کے اور کیا ہے، اگر واقعی بڑے بوڑھے یاد

کرتے تو اللہ کی حفاظت نمایاں نہ ہوتی۔ یہ کہا جاتا کہ بڑے بوڑھوں نے سنجیدگی سے سمجھا کہ بھائی خدا کی کتاب ہے، اس کی حفاظت ہونی ضروری ہے۔ یہ ان کی حفاظت سمجھی جاتی، مگر یاد کرایا جا رہا ہے، چھ چھ برس کے بچوں کو عقل نہ شعور، یہ سوائے حفاظت خداوندی کے اور کیا ہے جس کا وعدہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

حافظ اصل میں ہم ہی ہیں۔

اور پھر کتنی کریم بارگاہ ہے کہ اصل میں تو حافظ وہ ہیں۔انا له لحافظون اور اصل میں قاری حق تعالی شانہ کی شان ہے جیسا کہ فرمایا کہ

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ

تلاوت کرنا ہماری شان ہے تمہارے اوپر ہم تلاوت کرتے ہیں۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ

ہم ہی موسیٰ اور فرعون کا قصہ تلاوت کرتے ہیں۔

تو حافظ ہونا بھی انہیں کی شان اور تلاوت کنندہ ہونا بھی ان ہی کی شان ہے، اور قاری ہونا بھی ان ہی کی شان ہے جیسے فرمایا

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ

اے پیغمبر! جب ہم قرات کریں تو سنتے رہو۔

تو حافظ بھی وہی، قاری بھی وہی، تالی بھی وہی لیکن یہ کتنی کریمی ہے کہ جو بچہ یاد کرلے فرماتے ہیں جو ہمارا لقب تھا آج سے وہ ہم نے تمہیں دے دیا۔ ہم بھی حافظ تم بھی حافظ، پھر زبان سے اسے پڑھ دیا تو فرمایا کہ جو ہمارا لقب تھا ہم نے تمہیں دے دیا کہ ہم بھی قاری آج سے تم بھی قاری، تم تلاوت کرنے بیٹھ گئے، ہمارا نام تھا تالی (تلاوت کنندہ) ہم آج سے یہ لقب تم کو بھی دیتے ہیں تو سرکاری القاب رعایا کے سپرد کردیئے گئے یہ سوائے فضل و کرم کے اور کیا ہے۔

مثلاً ہندوستان کا پریزیڈنٹ اور وزیر اعظم ہے، اگر آپ آج یہ دعویٰ کریں کہ میں وزیر اعظم ہوں تو مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ آپ اعلان کریں کہ پریزیڈنٹ آف انڈیا ہوں تو مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ خاص لقب ہے سرکاری لقب ہے۔ آپ انہیں اختیار نہیں کرسکتے مگر یہ اللہ کی بارگاہ کی کریمی ہے کہ جب ان کے کلام پاک کو یاد کرلیا اور سینے میں لے لیا تو کہا کہ جو ہمارا لقب تھا آج سے وہی لقب تمہارا بھی ہے۔ سرکاری القاب دے دیتے ہیں۔ غرض اس طرح ایک تو مشابہت پیدا ہوئی تھی نبی کریمؐ سے کہ جیسے آپ کے قلب کے اندر قرآن آیا اور پھر زبان مبارک پر آیا یہی شان اس حافظ بچے کی ہو جاتی ہے کہ پہلے اس کے سینے میں قرآن آجاتا ہے اور پھر اس کی زبان پر آتا ہے اس کو تشبہ حاصل ہوا نبی کریمؐ سے اور اس سے بڑھ کر مشابہت

یہ کہ سرکاری خطابات دے دیئے گئے جو اپنے خصوصی خطابات تھے کہ اللہ کے ساتھ اتنا قریب کہ لقب ان کا آ گیا اور رسول کے ساتھ اتنا قریب اور مشابہت حاصل ہو گئی تو اور کیا چاہتے ہو، یہ سب کرنے کے بعد ثمرہ یہ مل گیا کہ اللہ کا قرب اور رسول کے ساتھ تشبہ، کس کے یہ نصیب کہ رسول کے ساتھ تشبہ ہو اور سرکاری خطاب دیئے جائیں یہ سب اللہ کے فضل و کرم ہے۔ ورنہ حافظ حقیقی تو ذات خداوندی ہے اور جس بندہ کو حفاظت قرآن کے لئے حق تعالیٰ منتخب کریں یہ اس کی خوش نصیبی اور خوش قسمتی ہے۔

حق اور باطل جمع نہیں ہو سکتے

اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہو گا باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا ہے۔ اس واسطے کہ قرآن کی شان مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

وہ لوگ جو ایمان لے آئے حضرت محمدؐ پر نازل شدہ چیز پر یعنی قرآن پر۔

فرمایا:

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

وہ اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اتارا گیا ہے۔

تو مثبت طریق پر تو قرآن کو حق کہا ہے اصل میں حق یہی ہے، دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ

یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے دائیں اور بائیں طالب نہیں پھٹک سکتا۔

یہ حق ہی حق ہے اندر سے بھی حق، اوپر سے بھی حق، نہ باطل اس کے اندر اور نہ اس کے آس پاس آ سکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سراپا حق، اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی سینے میں گھسے گا تو اس سینے میں بطلان کہاں سے آ جائے گا۔ دوسرے جب حق ہے اس میں تو باطل نہیں آ سکتا ہے۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے کل کو معانی اس کے پڑھ لیں گے۔ تو معانی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قرب خداوندی مال۔ دوسرا وصف یہ کہ مشابہت نبی کریمؐ سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ مجسم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر قرآن روح بن کر سرایت کر گیا ہے۔ اور وہ حق ہی حق، بطلان اس کے پاس نہیں، یہی باطل دور بھاگے گا۔

حافظ قرآن کبھی نہیں مرتا

اگر اس پہلو کو دیکھیں تو وہ حیات ہے اور آپ نے حیات کو اپنے اندر ڈال لیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے

کہ آپ زندہ ہیں، مردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مردنی بدن پر طاری ہوگی اور بدن پہلے ہی سے باطل ہے، اسے موت آجائے تو کون سی بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کی زندگی کا سامان ہو تو وہ دوامی زندگی ہے۔ تو حافظ اور قاری مرنے والا نہیں، روح اس کی جاری و ساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے، نہ قاری مرتا ہے، نہ عالم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے اس کی روح زندہ رہتی ہے اس روح کا فیضان اس عالم میں پہنچتا رہتا ہے اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس پھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا، بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے غذا وہاں بھی مل رہی ہے یہاں بھی مل رہی ہے، یہاں بھی اس کی غذا علم و معرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا علم و معرفت ہے۔ اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ علم و معرفت ہی ہوگا تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہوگا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہاں بھی محروم ہی رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر و قیمت نہیں، تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عالم آخرت میں بھی زندہ، اور روح کی غذا یہی قرآن کریم جس سے حیات ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظ قرآن مرتا نہیں، وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں ایک حسی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے مگر روح جو لے کر گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ، وہ اس سے ہٹنے والی چیز نہیں وہ قرآن ہے، وہ روح ہے، روح خداوندی ہے تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا۔ جس حد تک وہ قرآن کو لے چلا ہے اور حیات دائمی اس کی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا نبی کریمؐ کے اور اللہ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے، کس کے ایسے نصیب ہیں۔ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہوگا۔

محشر میں حافظ قرآن کے باپ کی تاج پوشی ہوگی

حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاج پوشی کی جائے گی۔ یعنی میدان حشر میں جہاں اولین و آخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا محشر منور ہوگا۔ اعلان ہوگا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔ یہ آج اس کی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ جو تاج پوشی کی گئی ہے، دنیا میں اگر کسی کی تاج پوشی کی جائے یہ عظیم ترین اعزاز ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فخر و اعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہو تو اس ملک کے جو اعیان ہیں وہ جمع ہوتے ہیں، اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے ہیں اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آئیں گے۔ یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں گے، پھر

تاج پوشی ناقص رہی، گر میدان محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہوگی اول سے لے کر آخر تک، اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہوگا اور صدر حق تعالیٰ شانہٗ ہوں گے ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے۔ جلسہ سے تمام آفاق پر زیروں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوں گی۔ بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔ اس میں مسلم غیر مسلم سبھی ہوں گے، ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہوگا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا تھا اس کی تاج پوشی کی جائے تو اولین و آخرین جمع، تاج پہنانے والے حق تعالیٰ تو اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کون سا موقعہ ہوگا، حافظ کو اپنی ذات سے جو تھا وہ تھا ہی اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنادیا گیا۔ ان کی تاج پوشی کی گئی اور اولین و آخرین میں شور یہ ہوگا کہ بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا، تو بہر حال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آسکتا۔ جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہوگئی حضورؐ سے، اسے القاب ملے حق تعالیٰ شانہٗ کے، حیات ملی اسے دائمی، اس کے اثرات متعدی ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی اولین و آخرین میں شہرت ہوئی تو گویا قرآن کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔

حافظ قرآن اور جنت کے درجات

حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا کہ واتل وارتق تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا، جنت کے درجات کماتا جا، اس کی جزا یہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے، ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآنی آیتوں کی تعداد ہے۔ اب جیسے کوئی قرآن کی آیت ہے چار حرفوں کی اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔ تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔ لطائف الگ نکل رہے ہیں، علل الگ نکل رہے ہیں، اسرار الگ، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی، آیت ایک ہے۔ تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا لیکن اگر مجمل دیکھا جائے تو انواع علوم کی اتنی ہی ہیں، جتنی آیتیں ہیں اور درجات اتنے کے اتنے ہی ہیں۔ جتنی آیتیں ہیں تو فرمایا جائے گا کہ اس حافظ قرآن سے تلاوت کرتا جا جہاں تک تیری طاقت ہے درجات کماتا جا، اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے جیسے آلات کے اندر تفصیلات ہیں لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حدود و نہایت نہیں ہے، ابد الآباد گزر جائے گا۔ مگر وہ سیر و سیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں کماتا رہے گا۔ تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں برزخ میں ہی نہیں حشر میں ہی نہیں، جنت میں ابد الآباد تک رہے گی۔ اس واسطے کہ یہ اللہ کا کلام ہے میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

ہمارے کلام کو فضا حاوی اور اللہ کا کلام فضا کو حاوی

ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے وہ گم نہیں ہوتا وہ مٹتا نہیں اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ کا کلام جب چلتا

ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے تو فرق یہ ہے کہ کلام اللہ نے فضا کو گھیر ا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جیسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا۔ اسی پر ریڈیو ایجاد بنی، کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے قرآن کریم نے فرمایا ہے: مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید کوئی لفظ کوئی ہاں ہوں تو اپنے منہ سے نہیں نکالتے کہ تا نکنے والا اسے ٹانک لیتا محفوظ کر لیتا۔ ہر ہر لفظ محفوظ ہے۔ ہر ہر ادا محفوظ ہے اور اواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی، وہ عمل بھی، وہ ہیئت بھی، وہ قول بھی، اس قول کی آواز بھی، وہ زمانہ بھی، وہ مکان بھی، ہر چیز محفوظ ہے تو بہر حال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو نہیں گم ہوتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ ہماری اور آپ کی کلام تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے، وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں جس میں وہ کلام جذب ہو گا۔ وہ انشاء اللہ گم ہونے والی چیز نہیں ہے، آخر تک اس کے آثار و برکات چلتے ہی رہیں گے

حافظ قرآن کو شفاعت کا حق دیا جائے گا

حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے پانچ کی شفاعت کر خواہ وہ ماں باپ ہوں، بھائی بند ہوں، تجھے حق ہے پانچ آدمیوں کی شفاعت کا، جس کی چاہے شفاعت کر اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا تو پچیس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہو گا۔ ان کو اگر گھر میں پچیس آدمی نہیں تو باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔ گھر والے تو سارے بخشے ہی جائیں گے۔ باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزت و عظمت کی بات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود بخشا بخشایا ہے۔ جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جا رہا ہے کہ تو شفاعت کر پانچ آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔ اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا، شہداء کو حق دیا جائیگا، کسی کو سات، کسی کو دس آمیوں کی شفاعت کا، اب اگر سارے ہی گھر والے حافظ ہیں تو اس کی شفاعت کہاں تک پہنچ گئی؟ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

حافظ قرآن کے والدین ہمیشہ سربلند رہتے ہیں

تو بہر حال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حفظ کرایا ہے وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ یہاں بھی ان کیلئے برکات ہیں۔ وہاں بھی ان کیلئے برکات ہیں بچہ ابھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب پیش کرتے ہیں پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ یہ بچہ یہ ہے۔ باپ یہ ہے اس باپ کا احسان ہے جو اس بچہ کو قرآن حفظ کرایا تو دنیا میں بھی سرنام ہوا اور آخرت میں تو تشہیر ہو گی ہی اولین میں اور آخرین میں تو بچہ بھی اور والدین بھی سارے کے سارے ہی سرنام ہونگے۔

دیگر مختلف

بہر حال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے ہیں وقت اتنا بھی

نہیں کہ ان سارے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آ بھی نہیں سکتے ہیں۔ یہ دو چار پہلو ذکر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے پہلو ہیں جس سے قرآن کریم کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن میں آئیں کہ واقعی بڑی برکت اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی، حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطاء فرمائی اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آ کر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کو پگڑی باندھے اور آپ نے سپاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کر دیں، حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ہے اور آپ لوگ بری ہیں۔ خدانخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہیں ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بری نہیں لگتی ہے۔ اس کا عیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبتیں لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، محبت اور اخلاص سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عیب دار کے عیب ہی چھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں ہی نظر پڑیں تو خوبیاں سراہنی شروع کر دیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں اور سادگی سے میں کہتا ہوں کہ یہ تو آپ نے تعریف کی ہے، اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھا دیا۔ آپ میں وسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھا دیا۔ تو وسعت قلبی کا ثبوت دیں تو شکریہ میں کیوں ادا کروں۔ یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں شکریہ ادا کروں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا، ہمیں توفیق عطاء فرمائی تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کر دیا کہ مسلمانوں کا اجتماع یہ خود مستقل ایک نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے اور قرآن کے بھی افادے کے لئے وہ آگے بڑھیں تو یہ برکت در برکت در برکت ہے۔ تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطاء فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکریہ کے وہ ہیں

فلہ الاسماء الحسنی ولہ الکبریاء فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم

عزت والا، وہ شکر کا مستحق ہے وہ، حمد وثناء اس کے لئے تو ہم سب مل کر اس کی حمد وثنا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلم اور ہمارے قاری صاحب کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطاء فرمائے کہ مدرسہ کو آگے بڑھادیں اور آج ہم نے پانچ حافظوں کو دستار باندھی اللہ ہمیں موقعہ نصیب کرے تو ہم پچاس پچاس کے سروں پر پگڑیاں باندھیں اور گھر گھر میں حافظ قرآن نظر آئیں اور اس کی برکت سے یہ شہر مالا مال ہو۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ٥

خلافت تجوید

یہ الفاظ اور لب ولہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قراء اور مجوّدین نے اسی لب ولہجے کی حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق آئے۔ مگر لے وہی اختیار کرتے ہیں جو اوپر سے چلی آرہی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــ اَمَّا بَعْدُ ـــ

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبَرَّكُوْا بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ كَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ۔ (اَوْ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)۔

جوہر دنیا

بزرگان محترم!

یہ دنیا دو چیزوں سے آباد ہے وہی دو چیزیں اس دنیا کا جوہر اور روح ہیں۔ ایک اللہ کا کام اور اللہ کا کلام۔

ایک طرف[1] آپ کے سامنے یہ دنیا کھڑی ہوئی ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، آسمان کا خیمہ اوپر تنا ہوا ہے، آسمان میں سورج اور چاند کے انڈے روشن ہیں، جن سے اس دنیا میں روشنی اور جگمگاہٹ ہے ـــ مختلف قسم کی جاندار اور بے جان مخلوق اس میں آباد ہے اور بس رہی ہے ـــ یہ سب چیزیں اللہ کا کام ہیں۔ یہ اس کی صنعت و صناعی اور کاریگری ہے جو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے ـــ یہ سب چیزیں فی الحقیقت اللہ کے انعامات اور اس کے تبرکات ہیں۔ سورج اور چاند بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے، زمین اور آسمان بھی اللہ

---

[1] دار القرآن لسبیلہ چوک، کراچی میں بتاریخ ۱۳؍۵؍۱۲ یہ بیان ارشاد فرمایا۔

کا ایک عطیہ اور تبرک ہے ـــــ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئی۔ اللہ کے پیدا کئے ہوئے سے پیدا ہوئی ہے، لیکن خدا کے اندر سے نکل کر نہیں آئی، اس نے ایک معدوم شی کو وجود دیا، تخلیق کی، پیدا کیا اور نمایاں فرما دیا تو اس کی ایجاد سے ہی یہ ساری چیزیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔

امتیازی عطیہ

لیکن وہ تبرک اور عطیہ جو اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے اس کے باطن سے نکل کر ظاہر ہوا اور آپ کے سامنے آیا وہ اللہ کا کلام ہے ـــــ تو یہ ساری چیزیں مخلوق کہلائیں گی۔ لیکن کلام مخلوق نہیں ہو سکتا۔ ـــــ جب آپ کوئی چیز بناتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ چیز بنائی، میں نے عمارت بنائی، چارپائی بنائی، برتن بنایا ـــــ لیکن جب کلام کرتے ہیں تو یوں نہیں کہا کرتے کہ میں نے اپنے کلام کو بنایا یا میں نے اپنے کلام کو پیدا کیا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کلام کیا۔ تو کلام متکلم کے اندر سے سرزد ہوتا ہے، صادر ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔ باہر کی چیز بنائی جاتی ہے۔ جس کو وجود دیا جاتا ہے، تو یہ زمین اور آسمان اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے، اس کے پیدا کئے سے پیدا ہو گئے اور نمایاں ہو گئے ـــــ لیکن کلام خداوندی خود اس کی ذات میں سے نکلا ہے اور نکل کر ہمارے سامنے آیا۔ تو سب سے بڑا تبرک اور عطیہ جو بلاواسطہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا، وہ آج مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔

امتیاز مسلم

تو یہ ایک مسلمانوں کا امتیاز اور خوش قسمتی ہے کہ براہ راست عطیہ خداوندی اور تبرک الٰہی ان کے ہاتھ کے اندر موجود ہے۔ اللہ کے اندر سے نکلا اور ان کے اندر داخل ہو گیا ـــــ اسی واسطے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

تبرک بالقرآن فانہ کلام اللہ وخرج منہ۔

"قرآن سے برکت حاصل کرو، اس لئے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔

کلام خداوندی ـــــ یوں تورات بھی ہے، انجیل اور زبور بھی ہے ـــــ لیکن حقیقی معنی میں کلام وہ ہوتا ہے جس سے تکلم کیا جائے اور بولا جائے۔ تورات سے حق تعالیٰ بولے نہیں بلکہ الواح لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں ـــــ اسی طرح انجیل بھی کلام خداوندی ہے مگر اس کا تکلم واقع نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر اس کا الہام کر دیا گیا۔ الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں۔ مضمون حق تعالیٰ کا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مبارک الفاظ میں اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی طرح سے زبور کے ساتھ بھی تکلم واقع نہیں ہوا۔

امتیازی کتاب

قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ نے اس کا تکلم کیا، اسے پڑھ کر سنایا ـــــ اسی واسطے قرآن کریم میں قرأت کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی، تلاوت کی نسبت بھی اپنی طرف کی اور تکلم کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ فرمایا گیا :

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔

"جب ہم قرآن کریم کی قرات کریں تو اے رسول! سنتے رہو اور اس کی پیروی کرو"۔
کہیں فرمایا:

نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ۔

"اے پیغمبر! ہم آپ کے اوپر تلاوت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور فرعون کا قصہ"۔
بہر حال حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو تالی اور تلاوت کنندہ بھی کہا اور قاری بھی اپنے کو کہا ___ اور حافظ بھی اپنے کو کہا۔ فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

"اور ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے اور ہم ہی اس کے حافظ اور نگہبان ہیں"۔
تو حافظ بھی وہ ہیں، قاری بھی وہ ہیں اور تلاوت کرنے والے بھی وہ ہیں تو یہ خصوصیت قرآن کریم کی ہے کہ اس کی تلاوت بھی اللہ کی طرف سے واقع ہوئی، اس کا تکلم بھی ان کی طرف سے واقع ہوا، اس کی قرأت بھی ان کی طرف سے واقع ہوئی۔

صوت سرمدی

کلام کے لئے بہر حال کچھ آواز کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ:

کیف یاتیک الوحی یارسول اللّٰہ؟

"یا رسول اللہ! آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ کیا کیفیت ہوتی ہے؟"
تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

یاتینی مثل صلصلۃ الجرس۔

میرے اوپر وحی اس طرح سے آتی ہے جیسے گھنٹہ بجا کر جب چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس میں ایک قسم کی گونج ہوتی ہے جو کئی منٹ تک اس کی آواز آتی رہتی ہے، میں ایسی ایک گونج دار آواز سنتا ہوں ___ کہیں یہ فرمایا ___ چکنے پتھر کے اوپر اگر ایک لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے کھینچا جائے تو ایک مسلسل جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، میں اس قسم کی آواز سنتا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں کسی قسم کی صوت اور آواز کا بھی دخل ہے اگرچہ اس کی کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ مگر بہر حال تکلم کے لئے صوت ہوتی ہے تو صوت سرمدی کے ساتھ قرآن کریم سنایا گیا۔

عظمت کلام

جبریل علیہ اسلام نے اولاً کلام کو سنا ___ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ وحی فرماتے تو اس کی ہیبت اور عظمت سے تمام ملائکہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے خود جبریل علیہ السلام پر بھی اس کی ہیبت و عظمت اور جلال سے غشی طاری ہوتی تھی ___ سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام افاقہ پاتے تھے، اس کے بعد دوسرے ہوش میں آتے تھے تو ملائکہ پوچھتے تھے:

ماذا قال ربنا؟

"کیا فرمایا ہمارے پروردگار نے؟"

قال الحق وھو العلی الکبیر۔

کہتے : "حق فرمایا اور وہ علی و کبیر ہے"۔

خلافت تجوید و قرأت

اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام جبریل علیہ السلام سنتے تھے اس سماع کی ہیبت سے ہی غشی طاری ہوتی تھی تو تکلم کے ساتھ صوت اور آواز واقع ہوتی ہے' جب آواز عظیم اور ہیبت ناک ہوتی ہے تو اس کی ہیبت سے ضروری ہے کہ غشی طاری ہوتی ہے ___ اگر گرج زور سے ہو جائے تو یقیناً دل دہل جاتے ہیں اور بعض دفعہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے آدمی تو آدمی ___ آواز جب زور دار آتی ہے تو اس سے پہاڑ تک شق ہو جاتے ہیں' عمارتیں گر جاتی ہیں' مکانات گر پڑتے ہیں ___ تو قرآن کریم کی آواز جب سنائی دیتی تھی تو ملائکہ جیسی طاقت ور مخلوق بھی ہیبت زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتی تھی ___

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت واقع ہوئی اور تکلم واقع ہوا اور کوئی خاص قسم کی آواز بھی تھی جس سے تکلم ہوتا تھا۔ جس کو ملائکہ سنتے تھے اور بعض اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سنا ___ تو قرآن کریم میں ایک طرف الفاظ ہیں' ایک طرف اس کے معنی ہیں اور ایک طرف اس کا تکلم اور لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے۔ بجنسہٖ آج اس کا ایک ایک لفظ' اس کا ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے اور لکھا پڑھا موجود ہے۔ بعض قرآن کریم چھاپے گئے ہیں جن میں رکوعات کی تعداد اور سورتوں کی تعداد' حروف کی اور' لفظوں کی تعداد اور زیر و زبر کی تعداد تک لکھی گئی ہے۔ اس کو حفاظ نے محفوظ کیا ___ اس کے معانی کی علماء اور فقہاء نے حفاظت کی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قانونی حیثیت دی تھی' اس کو علماء نے سمجھا۔ اس کے لب ولہجہ اور طرز ادا کی قراء اور مجودین نے حفاظت کی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے سنا' جبریل علیہ السلام سے سنا تو ایک خاص لب و لہجے سے پھر آپ نے تلاوت فرمایا اور اپنے صحابہ کو آپ نے سکھلایا۔ اس میں سے بہت سے قراء اور مجودین نے سنا اور سن کر دوسروں کو سنایا اور سکھلایا ___ تو قرآن کریم کی طرز ادا کی مجودین نے حفاظت کی ___ اگر الفاظ میں حفاظ خلفاء خداوندی ہیں اور معانی میں اگر خلفاء الٰہی علماء ہیں تو اصوات اور طرز قرأت میں خلفاء ربانی قراء اور مجودین ہیں جنہوں نے طرز ادا کی حفاظت کی ___ اس کے رسم الخط کی حفاظت کی۔ وہ اسی انداز میں آج بھی لکھا جاتا ہے جس انداز میں قرن اول میں لکھا گیا ___ مثلاً آپ الرحمٰن لکھیں گے تو یہ لکھنا مکروہ اور ممنوع ہے کہ میم کے ساتھ الف ملا کر "الرحمان" لکھا جائے میم کے ساتھ نون ملا کر لکھیں گے اور میم پر کھڑا زبر دے دیں گے۔ یہ اصل رسم الخط ہے۔ تو اسی طرح پورے رسم الخط کی حفاظت کی گئی ہے۔ علماء رسم الخط نے اس کے قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک فن کی صورت دی۔ تو پورے ایک طبقے نے اس کی حفاظت کی۔

اس کی حکمتوں کی حفاظت حکماء اسلام نے کی ___ اس کے اندر تاریخ کے جتنے جملے موجود ہیں' ان کی تفصیلات مؤرخین نے کیں ___ اس میں جتنے حقائق موجود ہیں' ان کو صوفیاء کرام نے منضبط کیا ___ تو قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے مستقل ایک ایک طبقہ کھڑا ہو گیا۔ الفاظ کے لئے حفاظ' معانی کے لئے علماء' رسم الخط' آواز اور طرز ادا کے لئے قراء اور مجودین' حکم اور مصالح کے لئے حکماء' حقائق کے

لئے صوفیاء' اور علل و اسرار کے لئے فقہاء ___ تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی۔ اسی طرح سے قرآن کریم محفوظ ہوا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

''ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔

امتیازی حفاظت

تو حقیقی حفاظت تو حق تعالیٰ شانہ کی ہے ___ لیکن اللہ کی جتنی صفات اور کمالات ہیں' وہ اس دنیا میں بذیل اسباب نمایاں ہوتے ہیں ___ خالق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن تخلیق مرد و عورت کے ملنے سے واقع ہوتی ہے تو سبب تخلیق مرد و عورت ہیں اور خالق حق تعالیٰ ہیں۔ ماں باپ کو خالق نہیں کہا جائے گا' سبب تخلیق کہا جائے گا۔ رزاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن رزق رسانی کا ذریعہ زمین کو بنایا' اس سے غلہ اگتا ہے۔ کاشتکار اس میں محنت کرتا ہے تو کاشتکار ظاہر میں محنت کرتا ہے۔ حقیقت میں کاشتکاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا :

ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

''تم زراعت کرتے ہو کہ ہم زراعت کرتے ہیں؟''

تم نے تو بیج ڈال دیا' اس بیج کی منوں مٹی کے نیچے حفاظت کرنا' اس میں سے کونپل نکالنا' کونپل میں مادے اور جوہر رکھنا' پھر اس کونپل میں دانہ پیدا کرنا' یہ کاشتکار کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ تو محض دانہ ڈال دینا یہ کاشت نہیں ہے۔ اس میں سے بنانا' بنا کر درخت نکالنا' درخت میں سے پھل نکالنا' اصل کاشتکاری یہ ہے۔ تو فرماتے ہیں'

ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

''تم زارع اور کاشتکار ہو کہ ہم کاشتکار ہیں؟ ہم کھیتی کرتے ہیں کہ تم کرتے ہو؟''۔

اور فرمایا :

ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ

تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ نر و مادہ مل گئے۔ رحم مادر میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح سے مخلوق بنائی جا رہی ہے؟ کس ترتیب سے اسے ابھارا جا رہا ہے؟ یہ تو کرنے والا جانتا ہے۔ وہی کرتا ہے' خود اس ماں کو خبر نہیں جس کے پیٹ میں یہ ساری مشینری چل رہی ہے اور کارخانہ چل رہا ہے ___ تو اس اندھیری کوٹھڑی میں پانی کے اوپر نقاشی کرنا یہ اسی صانع حکیم کا کام ہے جس کی قدرت لامحدود ہے ___ اسی طرح سے کلام کو تکلم کرنا' فرمایا تم تکلم کرتے ہو' ظاہر میں تم ہو مگر حقیقت میں کلام ہمارا ہوتا ہے۔ حفاظت بظاہر تم کر رہے ہو مگر حقیقت میں ہماری حفاظت ہے۔ ظاہر میں تم قاری ہو مگر حقیقت میں ہم قاری ہیں جو قرآن کریم کی قرأت کر رہے ہیں۔ تو حفاظت خداوندی بذیل اسباب نمایاں ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں جب کہ قرآن کریم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہے یعنی سو میں سے ایک دو کی ہے۔ مجموعی طور پر قوم متوجہ نہیں ہے جیسا کہ توجہ کا حق ہے قرآن کی تعلیم پر کوئی مادی وعدہ نہیں ہے کہ آپ نے اگر قرآن پڑھ لیا تو آپ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے گا یا قرآن پڑھ لیا تو چند لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے یا کوئی جاگیر آپ کو مل جائے گی؟ کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں ___ اس کے باوجود یہ دارالعلوم کس طرح سے

قائم ہیں؟ یہ حافظ خانے کس طرح سے قائم ہیں؟ ہزاروں آدمی کیوں چلے آرہے ہیں؟ یہ محض قرآن کا معجزہ ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور دلوں پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ آؤ پڑھو اور پڑھاؤ۔ بظاہر اس میں کوئی دنیوی مفاد نہیں ہے۔ پھر بھی آنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں میں ڈالا جارہا ہے۔ وہ آرہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں اور قرآن کی حفاظت ہو رہی ہے۔

پھر حفاظت بھی چھوٹے بچوں سے کرائی جارہی ہے۔ عموماً قرآن کریم پڑھنے والے چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں ___ بڑے آدمی اگر پڑھتے تو یہ تہمت آسکتی تھی کہ وہ حفاظت قرآن کی غرض سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف حفاظت منسوب ہوتی کہ اگر یہ عقلاء اور بڑے بوڑھے متوجہ نہ ہوتے تو قرآن محفوظ نہ ہو سکتا۔ تو وہ اگر حفاظت کرتے تو ان کے ارادے کی طرف نسبت ہوتی کہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت کی ہے ___ لیکن بچوں سے حفاظت کرائی جارہی ہے۔ جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے؟ اور حفاظت ہو رہی ہے تاکہ اس کی حفاظت کی نسبت خالص اللہ کی طرف ہو کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں' بچے حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ تو بڑوں کے ذریعے حفاظت ہوتی تو حفاظت کی نسبت ان کی طرف ہوتی جس سے تہمت آتی ___ اس لئے عادت اللہ یوں چلی کہ چھوٹے چھوٹے بچے پانچ پانچ' چھ' چھ اور سات سات برس کے جن کے سینوں کے اندر قرآن کریم محفوظ ہے تاکہ یہ حفاظت براہ راست اللہ کی حفاظت سمجھی جائے' بہر حال فرمایا گیا :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

"ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔

تو حقیقی حفاظت حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔

حفاظت بطریق حفظ

اور اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے ایک ایک مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے حفاظت کی ___ تو یہ قراء اور مجودین بھی فی الحقیقت قرأت کے اندر خلفاء خداوندی ہیں ___ ان کی سند بھی جا کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پہنچتی ہے۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چیز استناد کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہے' حدیث ہے' فقہ ہے اصول فقہ ہے۔ سب چیزیں سند کے ساتھ ہیں۔ حدیث کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑے کی سند ہم سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ ایک ذرا سا جملہ آپ روایت کریں گے اس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گی ___ محدثین نے حدیث کے راویوں میں سے چار لاکھ راویوں کی تاریخ مدون کردی۔ ان کا کیریکٹر ان کا کردار' ان کا حافظہ' ان کا ضبط' ان کی عدالت اور ان کے نام ونسب محفوظ کردیئے کہ یہ راویان حدیث ہیں ___

اسی طرح سے قرآن کریم کی حفاظت سند کے ساتھ کی گئی ہے ___ یہ جتنے قراء اور مجودین ہیں' ان کو سند دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود مولانا قاری عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ علیہ سے قرآن کریم پڑھا اور تجوید کے ساتھ پڑھا تو ان کی سند میرے پاس محفوظ ہے ___ تو مجھے قاری عبدالوحید صاحب نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادی نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبداللہ صاحب مکی نے پڑھایا' ان کو قاری ابراہیم رشید مصری نے پڑھایا اور پھر آگے ان کے استاذ' یہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو بواسطہ جبریل حق تعالیٰ سے حاصل کیا اور جبریل کہتے ہیں کہ میں نے براہ راست حق تعالیٰ سے سنا۔ تو ایک قاری کی سند اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو جس طرح سے قرآن کریم کے الفاظ کی سند محفوظ ہے اسی طرح سے اس کے لب و لہجے کی سند بھی محفوظ ہے اس کے معانی اور علوم کی سند بھی محفوظ ہے اس کے کلام کے جتنے پہلو ہیں وہ سب سند کے ساتھ محفوظ ہیں' ایک ایک نقطہ تک اس کا حفاظت کیا گیا ہے۔ تو فرمایا :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

''ہم نے اس کو نازل کیا' ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

تو حفاظت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ زبان سے پڑھا جائے یا لکھا جائے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تکلم بھی واقع ہوا اور لکھا بھی گیا۔

حفاظت بطریق کتابت

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سب سے پہلے لوح محفوظ کے اوپر لکھا گیا ہے۔ جیسا کاتب ہے ویسی ہی اس کی کتابت ہے۔ ویسے ہی اس کے حروف ہیں ___ بعض سیر کی روایتوں میں ہے کہ لوح محفوظ میں قرآن کریم لکھا گیا اور اس کا ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر ہے۔ تو جیسا اس کا لکھنے والا ہے ویسے اس کے حروف ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے لوح محفوظ کو دیکھ کر قرآن حفظ کیا ___ پھر اسی قرآن کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا یہ گویا ان پر انعام کیا گیا۔ تو اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اور لوح محفوظ میں بھی درج ہے اور جبریل علیہ السلام کے قلب میں درج کیا گیا ___ اس کے بعد میں پھر بیت العزت میں قرآن اتارا گیا۔ یہ آسمان اول کے اوپر یعنی آسمان دنیا میں ایک مقام ہے۔ پورا قرآن آسمان دنیا کے اوپر بیت العزت میں اتار دیا گیا۔ اور وہاں سے پھر تیئیس برس میں رفتہ رفتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل ہوا۔ ایک ایک آیت' دو دو آیت حسب موقع حسب واقعہ اترتی گئی ___ تو گویا اللہ سے چلا لوح محفوظ تک آیا' پھر جبریل تک آیا' پھر بیت العزت میں آیا' پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔

حفاظت بطریق تواتر

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پڑھایا' صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تابعین کو پڑھایا۔ تو قرآن کریم میں تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ ایک تو ضابطہ کا تواتر ہوتا ہے۔ حدیث متواتر اس کو کہتے ہیں جس میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے چلے آرہے ہوں اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ بہرحال تین ہو یا تین سے زیادہ۔ یہ اعلیٰ ترین تواتر سمجھا جاتا ہے ___ لیکن قرآن کریم میں تین تین کا نہیں بلکہ ہزاراں ہزار کا ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں حافظ رہے۔ ہر قرن کے اندر ایک طبقے نے دوسرے طبقے سے سنا' دوسرے نے تیسرے سے سنا۔ اس طرح سے سند چلی۔

محیط بالدیانت کتاب

تو مروی عنہ جس سے روایت کی گئی وہ حق تعالیٰ شانہ ہیں' راوی اول وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ پھر

حفاظت کے ساتھ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ کے قلب مبارک پر اس کو اتارا گیا ___ جس کو ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا :

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔

"یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اس کو لے کر روح الامین نازل ہوئے اور قلب محمدی کے اوپر لے کر آئے"۔

حق تعالیٰ شانہ کی صفت اس کے اسماء میں سے امین ہے کہ وہ امانت والا ہے۔ حضرت جبریل کی صفت روح الامین' وہ خود امانت والے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت محمدنِ الامین ہے کہ امانت والے ___ اور یہ امانت کا لفظ وہ تھا جس کو اپنوں نے ہی نہیں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ نبوت سے پہلے تمام کفار مکہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آتے تو کہتے :

جاء محمدنِ الامین

"امانت والا آگیا"۔

تو کلام امین سے چلا' امین لے کر آیا اور امین کے قلب پر اترا۔ تو امانت کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پہنچ گیا۔ سند میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ راوی اور مروی عنہ پوری عدالت لئے ہوئے ہوں' پورا ضبط لئے ہوئے ہوں' پوری امانت داری کے ساتھ پہنچائیں ___ تو اللہ سے بڑھ کر امانت والا کون ہو سکتا ہے؟ اور جبریل علیہ سلام سے بڑھ کر امین کون ہو سکتا ہے؟ اور خاتم الانبیاء سے بڑھ کر انسانوں میں امانت والا کون ہو سکتا ہے؟ تو تین امینوں کے اندر یہ کلام رہا پھر سند کا سلسلہ چل نکلا۔

سند قرآن پر از روئے قرآن بحث

اسی واسطے ایک جگہ قران کریم میں اس کی سند بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ محدثین کوئی حدیث بیان کریں تو راویوں کے اوپر نقد تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کے راوی کیسے ہیں' پہنچانے والے کیسے ہیں جس درجہ کا راوی ہو گا اسی درجے کی روایت ہو گی ___ تو ایک سورۃ میں مستقل طور پر قرآن کریم کی سند پر بحث کی گئی ہے۔ فرمایا گیا :

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ

گویا راوی اول جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لئے ان کا وصف بیان کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا :

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ

"یہ کہا ہوا ہے ایک رسول کا جو کریم ہے" ___ تو لفظ "رسول" سے تعبیر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول کس کے ہیں؟ اللہ ہی کے رسول ہیں اللہ تعبیر فرما رہے ہیں ___ ہر شخص اپنا رسول اور قاصد اسے بناتا ہے جس پر پورا اطمینان ہو۔ اگر ذرا بھی بے اعتمادی ہو اسے قاصد نہیں بنایا جا سکتا۔ معمولی معمولی باتوں پر اسے قاصد بناتے ہیں جس پر پورا اطمینان ہو' وہ دوستوں میں شمار ہوتا ہو' دشمن اور بدخواہ نہ ہو۔ سچا ہو' امانت دار ہو۔ تو اول تو لفظ رسول سے حضرت جبریل کی تعریف کی گئی کہ وہ ہمارے رسول ہیں۔ رسالت خود ایک بزرگی اور برگزیدگی کی چیز ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ رسول بھی کیسے ہیں ___ ؟ کریم ہیں۔

جن کے اخلاق میں کرم داخل ہے۔ ان کی عادت میں کرم داخل ہے۔ تو رسول بھی ہیں اور کریم بھی ہیں۔ کریم النفسی ان کا جوہر ہے۔ تو دو لفظ فرمائے گئے۔ ایک رسول اور ایک کریم جس سے گویا جبریل علیہ السلام کی شان واضح کی گئی۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا تھا ایک شخص رسول بھی ہے' کریم بھی ہے' نیک نفس ہے۔ بلکہ نیک نیت ہے ___ مگر اتنا کمزور ہے کہ اگر کلام لے کر آئے تو کسی نے دباؤ ڈالا' تو ممکن ہے کہ دباؤ میں بات بدل ڈالے' دباؤ میں آکر مرعوب ہو جائے۔ نیک نیت بھی ہے' امانت دار بھی ہے مگر دل کمزور ہے۔ سچی بات کہنے لگا تھا مگر دوسرے نے تلوار دکھلائی یہ کیا کہتا ہے؟ دباؤ میں آکر اس نے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ تو بعض دفع ایک شخص نیک نیت ہے' کریم النفس بھی ہے۔ مگر بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید دب کر کلام میں تبدیلی کر دے ___ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا'

ذِیْ قُوَّۃٍ ___ رسول بھی ہے' کریم بھی ہے' طاقت ور ہے' کمزور اور ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال کر کچھ کا کچھ کہلوائے بہر حال تین باتیں ہوئیں کہ جبریل میں رسالت بھی ہے' کرامت بھی ہے اور قوت بھی ہے۔ جبریل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کے دباؤ میں آکر کچھ کا کچھ کہہ دیں۔ سنجیدگی سے کہیں گے' امانت سے کہیں گے اور جو پیغام دیا گیا ہے وہی پہنچائیں گے ___ لیکن پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نیک نیت بھی ہے' کریم النفس بھی اور باقوت بھی ہے ___ لیکن اس دور سے کلام کو سنا اور کچھ کا کچھ سن لیا۔ جب روایت کی تو پوری طرح وہ روایت نہ کر سکا جو اصل متکلم کا کلام تھا ___ اس نے میل دو میل' فرلانگ دو فرلانگ سے سنا۔ آواز آرہی تھی مگر دور کی آواز تو دور کی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غلط فہمی ہو جائے آواز پوری طرح کان میں نہ پڑے ___ یہ ایک احتمال ہو سکتا تھا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھایا:

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ

جبریل عرش والے کے پاس ہی رہتے ہیں۔ کہیں دوری اور بعد نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دور بیٹھ کر کچھ کا کچھ سن لیں ___ تو قرب بھی انتہائی ہے کہ ان کا مکان اور جگہ اور رتبہ بھی عرش والے کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جبریل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتہی ہے۔ اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے سدرۃ کے آگے پھر جنتوں کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر سمندر ہے جس کے اوپر عرش عظیم واقع ہے۔ بہر حال کائنات کا دائرہ جس کو مکلف کہا جاتا ہے وہ آسمانوں کے نیچے نیچے ہے تو آسمان کے اوپر جا کر حضرت جبریل کا مقام ہے۔ اب پرواز اگر ہوتی ہوگی تو کہیں اوپر ہی ہوگی۔ نیچے بھی آتے ہیں اوپر بھی جاتے ہیں ___ اس لئے فرمایا گیا کہ:

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ

''عرش والے ہی کے پاس مقیم ہیں''۔

لہٰذا دوری اور بعد کا کوئی سوال نہیں۔ تو ایک راوی کی یہ شان نکلی کہ اس میں رسالت بھی ہے' کرامت بھی ہے' قوت بھی ہے اور قرب خداوندی بھی ہے۔ بعد کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

مگر پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص رسول ہے' کریم ہے' طاقت ور ہے' اللہ کا مقرب بھی ہے ___ لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں ___ یعنی اس کا منصب کوئی نہیں ___ منصب والا جب بولتا ہے' اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ ایک بڑے سے بڑا آدمی ہو طاقت ور بھی ہو مگر اس کے پاس کوئی عہدہ نہ ہو' کوئی

ضابطے کی بڑائی اس کے پاس نہ ہو' تو اس کے کلام کو توجہ سے نہیں سنا جائے گا۔ اگر میں ایک جملہ بولوں اسکی کوئی وقعت نہیں ہوگی ___ لیکن اگر کسی ملک کا سربراہ وہی جملہ بولے' تو سیاست کی بساط الٹتی چلی جاتی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں۔ ملکوں میں اس سے انقلابات واقع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک صاحب منصب نے کلام کیا ___ تو آدمی نیک بھی ہے' بزرگ بھی ہے' مقرب خداوندی بھی ہے' حقانی بھی ہے۔ مگر منصب دار اور عہدہ دار نہیں' کوئی منصبی رتبہ نہیں ہے' تو اس کا کلام زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتا ___ تو جبریل علیہ السلام کے متعلق ممکن تھا کوئی یہ کہتا کہ بڑے درویش ہیں' بڑے اعلیٰ درجہ کے مقرب ہیں' عرش کے قریب رہتے ہیں' نیک بھی اور بزرگ بھی ہیں' کامل امانت دار ہیں مگر عہدہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس لئے ان کی ذمہ دارانہ شان نہیں ہے کہ ان کے کلام کو توجہ سے ہی سنا جائے اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا۔

"مُطَاعٍ"

سارے ملائکہ کے سردار بھی ہیں اور واجب الاطاعت ہیں' سارے فرشتے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں' آسمانوں میں ان کی حکومت ہے' سید الملائکہ ہیں تو ظاہر بات ہے جب متکلم' قاصد اور بولنے والا اپنی ذات سے تو بزرگ ہوا' صاحب امانت ہو' باہر سے اس کو رسالت ملی ہوئی ہو اور اوپر سے اتنا بڑا عہدہ دار کہ ساتوں آسمانوں میں اس کی حکمرانی بھی ہو۔ اس کی ذمہ داری اور اس کا منصب بھی ہو' تو اتنی بڑی شخصیت جب پیام پہنچائے گی تو اس میں کوئی دخل وفصل کا خطرہ نہیں ہو سکتا۔ کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا' اس کے بعد پھر فرمایا:

"ثَمَّ اَمِیْنٍ"

ان سارے اوصاف کے اوپر یہ ہے کہ وہ امانت دار ہیں اور اس کی شہادت کون دے رہا ہے؟

اللہ میاں شہادت دے رہے ہیں۔ یہ جبریل کو کون کہہ رہا ہے کہ وہ بزرگ بھی ہیں' مطاع بھی ہیں۔ صاحب قرآن کہہ رہے ہیں ___ تو حق تعالیٰ ان کی صفت فرما رہے ہیں۔

عظیم شہادت

اگر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کوئی چھوٹا آدمی بیان کرنے لگے تو وہ بڑائی نہیں سمجھی جاتی۔ یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعریف خود کرنا چاہتا ہے ۔

مادح خورشید مداح خود است

اگر سورج کی کوئی تعریف کرنے لگے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اپنی تعریف منظور ہے' سورج محتاج تعارف نہیں ہے۔ تو کسی بڑے آدمی کا تعارف اگر چھوٹا کرائے' وہ درحقیقت اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ بڑا تو خود ہی متعارف ہے۔ لیکن اگر بڑا تعارف کرائے یہ فی الحقیقت ایک عظیم شہادت ہے ___ تو جبریل علیہ السلام کا مثلاً میں تعارف کرانے لگوں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ میں اپنے تعارف اور اپنی عزت کا خواہاں ہوں کہ ایک بڑے آدمی کا نام لے رہا ہوں۔ ایک بڑی شخصیت کا نام لے رہا ہوں۔ جبریل علیہ السلام کا تعارف وہ کرائے جو خود جبریل کا خالق ہے جو جبریل کا معبود ہے' وہ فرماتے ہیں کہ جبریل رسول بھی ہیں' کریم بھی ہیں۔ ذی قوت بھی ہیں' امانت دار بھی ہیں' مقرب بارگاہ بھی ہیں' عہدے دار بھی ہیں یعنی سید الملائکہ بھی ہیں۔ ان کو ہم نے قاصد اور پیغمبر بنا کر بھیجا ___ تو بھیجنے والے حق تعالیٰ جن کا علم لامحدود ہے۔ ان کے علم کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ جن کو بھیجا گیا وہ صاحب امانت ہیں اور جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو نبوّت

کا عہدہ دیا گیا کہ عالم بشریت میں اس سے بڑا کوئی کمال نہیں۔

عظمت سند

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ جو نبوّت کے درجات کا منتہی ہو۔ یعنی نبوّت کے سارے مراتب ان کے اوپر آکر ختم ہو جائیں۔ کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہے کہ کسی اور شخصیت کی ضرورت پڑے کہ وہ اس درجے کو لے کر سامنے آئے۔ تو خاتم الانبیاء کا یہ مطلب ہے کہ نبوّت کے کمالات کے جتنے درجات اور جتنے مراتب ہیں وہ اس ذات میں ہیں وہ اس ذات اقدس پر ختم ہو گئے۔

نبوّت کی بنیاد دو ہی چیزوں کے اوپر ہے۔ ایک کمالات علمی اور ایک کمالات اخلاق، جن سے عمل کا سلسلہ چلتا ہے۔ تو علم کے بارے میں تو فرمایا گیا :

اوتیت علم الاولین والاٰخرین

"اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم آپ کو عطا کئے گئے"۔

اور اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا :

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

"تو اخلاق بھی خلقِ عظیم"۔

اور آپ کا علم اتنا جامع کہ اولین و آخرین کا تمام علم آپ کو دے دیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جو ذات بابرکات علم میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو، اخلاق میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو۔ تو اس کی نبوت بھی انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ مکمل ہوگی۔ اس لئے آپ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں۔ یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوّت کے مراتب ختم کر دیئے گئے ___

تو ایسی ذات کے اوپر قرآن نازل ہو جو کمالات بشریہ میں سب سے زیادہ اکمل ہو۔ اور ایسی ذات قرآن کو لے کر آئے جس کی حق تعالیٰ تعریف فرمائیں کہ ایک راوی میں جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں وہ سب ان میں موجود ہوں اور قرآن کریم کو بھیجنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہو جو سارے کمالات کا مصدر اور سرچشمہ ہے ___ تو اوپر سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن کریم کی سند اتنی مکمل ہے کہ اس میں کسی نقد و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

تواتر طبقہ

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو قرآن پڑھایا تو صحابہؓ نے طبقے کے طبقے اس کو لیا۔ یعنی اکے دکے میں حفظ نہیں کیا۔ بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور طبقات کے طبقات حافظ قرآن ہوئے۔ انہوں نے پھر بعد والے طبقات کو حافظ بنایا اور طبقہ در طبقہ حافظ بنتے چلے گئے۔ اسی طرح آج تک تواتر طبقہ کے ساتھ یہ قرآن کریم چلا آرہا ہے کہ ایک ایک اور دو دو یا بیس بیس اور چالیس چالیس نہیں سو سو اور پچاس پچاس نہیں بلکہ ہزاراں ہزار حفاظ ہر قرن میں موجود رہے۔ اوپر کے قرن سے لیتے رہے اور نیچے کے قرن کو دیتے رہے۔ تو جو کلام خداوندی اس حفاظت کے ساتھ آئے اور قیامت تک چلتا رہے اس میں کسی دغل و فصل یا تحریف کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی تحریف کرنے والا تحریف کرے گا۔ چونکہ حفاظت کے سامان کافی ہیں اس لئے اس کی تحریف کھل جائے گی چنانچہ بہت سے محرفین پیدا ہوئے جنہوں نے معنی کے لحاظ

سے بھی تحریف کرنا چاہی لیکن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا گیا۔

ہمہ گیرابدی حفاظت

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ہر صدی پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے

ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا

ہر صدی کے اوپر اللہ مجدد بھیجے گا ___ مجدد کے لئے کوئی شخص واحد ہونا ضروری نہیں۔ جماعتیں بھی مجدد بن کر آئی ہیں۔ افراد بھی مجدد بن کر آئے ہیں۔ دین کے جس گوشے میں لوگوں نے خلط واقع کیا اور تنقیص واقع کی۔ انہوں نے آکر اسی کو کھول دیا۔ تو ہر صدی پر مجددوں کا وعدہ دیا کے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

کیف تھلک امۃ انا اولھا والمسیح اخرھا والمھدی وسطھا۔

وہ امت کیسے ہلاک ہو جائے گی جس کی ابتداء میں میں ہوں اور اخیر میں مسیح ہیں اور بیچ میں مہدی ہیں۔ تو اول و آخر کی بھی حفاظت بتلائی گئی' ہر صدی کی حفاظت بتلائی گئی۔ پھر ہر صدی کے اندر اندر وعدہ دیا گیا۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال البطلین وتاویل الجاھلین۔

ہر قرن اور زمانے کے اندر اس علم کو اٹھاتے رہیں گے' اسلاف میں سے اخلاف رشید' نیک خلف' نیک سلف سے لیتے رہیں گے۔ اس علم کو امانت داری کے ساتھ سلف سے خلف قبول کرتے رہیں گے غلو کرنے والے کے غلو کو توڑ دیں گے۔ غلو کرنے والے جو تحریفیں کریں گے اور معانی کے اندر جو تحریف واقع کر دیں گے اس کو مٹائیں گے اور دروغ بافیوں اور جاہلانہ تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے ___ بہرحال اس امت میں وعدہ دیا گیا کہ قیامت تک ایک طبقہ حقانی ضرور باقی رہے گا جو بجنسہٖ قرآن کو مع اس کے لفظ و بیان اور مع اس کی شرح کے دیتا رہے گا تو سلف سے خلف تک پہنچتا رہے گا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ امت میں فرقے ہوں گے اور اختلافات رونما ہوں گے وہاں یہ بھی وعدہ دے دیا گیا کہ قیامت تک ایک فرقہ ضرور حق کے اوپر رہے گا اور اپنے ذوق' وجدان اور دلائل سے لوگ سمجھتے رہیں گے کہ یہ فرقہ حقانی ہے۔ اس کے افعال واعمال اور اس کی علامات بتلاتی رہیں گی کہ یہ حقانی ہے اور لوگ اس کی طرف رجوع کرتے رہیں گے ___ غرض ایک طبقہ ہمیشہ باقی رہے گا جو صحیح مزاج کے ساتھ دین کو باقی رکھے گا اور صحیح ذوق کے ساتھ اس کو قائم رکھے گا۔

لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امراللہ۔

نہ ان کو رسوا کرنے والا رسوا کر سکے گا نہ ذلیل کرنے والا ذلیل کر سکے گا۔ وہ ایک ہی چیز کہتے رہیں گے کہ

ماانا علیہ الیوم واصحابی

جن کے اوپر آج کے دن میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہ ہیں ___ اسی کے مطابق لفظ اور معنی اور حقائق وکیفیات دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے ___ بہرحال یہ وعدہ دیا گیا اور جہاں اختلافات کی خبر دی گئی وہیں ساتھ اس فرقہ حقانی کی بھی خبر دی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دین خاتم الانبیاء کا

دین ہے۔ قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ درجات نبوت آپؐ کی ذات بابرکات پر ختم کردئیے گئے۔ اب کوئی درجہ باقی نہیں رہا کہ کسی شخصیت کو لاکر اسے پورا کیا جائے۔

بہر حال قرآن کریم کی حفاظت خداوندی کے سلسلہ میں مجودین کے وعدے الگ ہیں۔ ائمہ ہدایت کے وعدے الگ ہیں، خلفاء کے وعدے الگ ہیں اور خلف عدول کے وعدے الگ ہیں، صلحاء کے وعدے الگ ہیں کہ برابر بھیجے جاتے رہیں گے اور دین حقانیت قائم رہے گی۔ تو یہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

میں بتلایا گیا کہ جہاں قرآن کریم کے الفاظ محفوظ کئے گئے اور جہاں اس کا رسم الخط محفوظ کیا گیا، وہیں اس کے علوم اور معانی بھی محفوظ کئے گئے، وہیں اس کے احکام بھی محفوظ کئے گئے ___ تو اول سے لے کر اخیر تک اور ظاہر سے لے کر باطن تک قرآن کریم کا ایک ایک پہلو محفوظ ہے اور محفوظ چلا جائے گا۔

بہر حال یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ دار القرآن قائم کیا گیا، بہر حال یہ بھی ایک خلافت خداوندی ہے۔ یہ الفاظ اور لب و لہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قرآء اور مجودین نے اسی لب و لہجے کے حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہوتا ہے۔

تغنی بالقرآن

اسی واسطے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ :

من لم يتغن بالقرآن فليس منا۔

"جو قرآن کریم کے ساتھ تغنی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

مگر تغنی کے معنی یہاں موسیقی کے نہیں ہیں۔ گانے بجانے کے طرز پر پڑھنے کے متعلق دھمکی دی گئی ہے۔ اگر کوئی قرآن کو مزامیر کی صورت سے پڑھے تو اسے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ تو قرآن کا غنا الگ ہے، گانے بجانے کا غنا الگ ہے۔ قرآن کریم کی تغنی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اتنے درد آمیز لہجے کے ساتھ پڑھے کہ قرآن کی کیفیات ایک قلب سے دوسرے قلب میں پہنچنے لگیں ___ تو وہ ایک خاص درد، ایک خاص لب و لہجہ ہے، قراء اور مجودین وہی اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی سینکڑوں قسم کی موسیقیاں ہیں۔ ہر ملک کی موسیقی الگ ہے۔ لیکن قرآن کا غنا وہ ہے کہ کسی موسیقی پہ منطبق نہیں اور کسی موسیقی میں وہ تاثیر نہیں جو اس میں تاثیر ہے اگر صحیح معنی میں کوئی پڑھنے والا موجود ہو اس سے دل کھنچے ہیں۔ تو فرمایا گیا :

من لم يتغن بالقرآن فليس منا۔

کہیں فرمایا گیا :

زينوا القرآن باصواتكم فان الصوت الحسن يزيد القرآن حسنا۔

قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔ اس سے قرآن کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ تو خوش آوازی میں بڑوں کی تقلید کرنی پڑے گی کہ جس انداز کی خوش آوازی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چلی آرہی ہے اور تابعین سے چلی آرہی ہے اور سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہے۔ اسی کے ساتھ تغنی کرو۔ اسی کے ساتھ حسن صوت اختیار کرو۔ تو قرآن کریم کی آواز اور لب و لہجہ اور طرز ادا تک محفوظ کیا گیا۔

تبریک

اور وہ قراء و مجودین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے یہ خلافت خداوندی سنبھالی ___ تو ایک خلافت علمی ہے' ایک خلافت اخلاقی ہے' ایک خلافت عملی ہے اور یہ خلافت صوتی ہے کہ آواز کے لحاظ سے بھی دنیا میں اللہ کے خلیفہ موجود ہیں کہ اس کے کلام کو اسی کے انداز سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس واسطے مبارک باد کے مستحق ہیں اور دارالقرآن بھی مبارکباد کا مستحق ہے جس نے قرآء اور مجودین بنانے کا ایک راستہ پیدا کیا۔ اس فن شریف کو پھیلانے کا ارادہ کیا ___ بہرحال یہ اس کی برکات میں سے ایک برکت ہے کہ آپ حضرات یہاں جمع ہیں اور قرآن سننے کے لئے جمع ہوئے۔ قرآء اور مجودین کی محفل منعقد ہوئی۔ کلام خداوندی پڑھا گیا۔ تو حقیقت میں یہ کلام اللہ کا ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں جب کفار کے اوپر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ کے بارے میں فرمایا گیا تھا :

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔

اے نبی! جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے وہ آپ نہیں پھینک رہے تھے۔ وہ تو ہم پھینک رہے تھے۔ یعنی اعضاء آپ کے تھے ہمارے کمالات کا ظہور ہو رہا تھا اور مظہر آپ بنے ہوئے تھے۔ تو زبانیں ہماری ہیں' کلام خدا کا ہے اور انسان مظہر بنا ہوا ہے ___ اس واسطے یہ ادارہ مستحق مبارکباد ہے جس نے قرآء اور مجودین جمع بھی کئے اور آئندہ پیدا کرنے کا سلسلہ بھی ڈالا۔ حق تعالیٰ شانہ کامیاب فرمائے اور اس ادارے سے بہت سے مجودین پیدا ہوں اور قرآن کریم کے پڑھنے کی اور اس فن تجوید کی اشاعت ہو اور لوگوں کے دلوں میں یہ گھر کرے اور پھر لوگ مائل ہوں اور اس کے علم و عمل کی طرف متوجہ ہوں۔

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اللھم اغفرلنا وارحمنا وعافنا واعف عنا واھدنا سبل السلام واخرجنا من الظلمت الی النور وجنبنا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن

اللھم وتوفنا مسلمین والحقنا بالصلحین غیر خزایا ولا مفتونین

وصلی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ وصحبہ اجمعین۔

برحمتک یا ارحم الراحمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جنت کی رسی کو مضبوط پکڑو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

امابعد: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ یہ اجتماع ختم قرآن کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، یہ مبارک تقریب اس لئے کی گئی ہے کہ چند بچے قرآن کریم حفظ کر رہے تھے آج وہ ختم کریں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قرآن حکیم اور اس کی تعلیم کے سلسلہ میں چند حقیقتیں پیش کروں تاکہ اس شغل مبارک کی اہمیت آپ کے سامنے آجائے۔

قرآن کریم اللہ کا ترجمان ہے

قرآن حکیم کی بہت سی صفات اور بہت سے کمالات ہیں جو خود قرآن ہی نے ذکر کئے ہیں، سب سے بڑی خصوصیت قرآن حکیم کی یہ ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے، اور کلام ہی متکلم کی تمام معنوی خصوصیات کا مخزن ہوتا ہے، کیونکہ کلام متکلم بولنے والا جو کچھ بھی بولتا ہے وہ دراصل اس کے دل کی آواز ہوتی ہے، جو اندر سے اٹھتی ہے اور زبان کے ذریعہ باہر نمایاں ہو جاتی ہے، اس لئے کلام میں دل کی اندرونی حقیقتیں بھری ہوئی ہوتی ہیں، یہی صورت قرآن کریم کی بھی ہے، کہ وہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے، اس لئے وہ حقائق الٰہیہ کا ترجمان اور ان کے انوار سے بھرپور ہے، حق تعالیٰ کے باطن سے ایک چیز چلی اور انہوں نے اپنے الفاظ میں ظاہر فرمادیا، اور وہ اس کلام کے ذرریعہ ہم تک پہنچ گئی، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کلام پاک کے ذریعہ ان برکتوں سے متبرک نہ ہوں۔ اسی واسطے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

تبرك بالقرآن فانه كلام الله وخرج منه

"قرآن سے برکت حاصل کرو کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"

تو خدا کے باطن سے ایک چیز نکلی اور ہمارے باطن تک مع اپنے برکات کے پہنچ گئی ہے، بولے ہیں وہ اور پہنچ گئی ہمارے اندر جس کا ذریعہ ان کا تکلم ہوا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے انسان کے باطن کا اللہ کے باطن سے رابطہ قائم ہوجاتا ہے اور قرآن پڑھنے والے گویا وابستہ ہوجاتے ہیں حق تعالیٰ شانہ کے باطن سے۔

اس دنیا کی ہر چیز اللہ کے ظاہر سے متعلق ہے

اس کے ظاہر سے تو کائنات کی ہر چیز وابستہ اور متعلق ہے، اور ہر شے پر اس کے پر تولے پڑے ہوئے

ہیں جس سے اس کی نمود قائم ہے، مثلاً اللہ کے کمالات میں سے چاند سورج ہیں جو اس کے ظاہر سے وابستہ ہیں، چاند سے روشنی پہنچ رہی ہے، سورج سے گرمی پہنچ رہی ہے، موسم بن رہے ہیں، جن سے ساری مخلوق فائدہ اٹھا رہی ہے، اسی طرح یہ ساری مخلوق واسطہ بلاواسطہ اللہ کے ظاہر سے وابستہ ہے۔ حق تعالیٰ نے زمین پیدا فرمائی، یہ ظہور ہے اس کے کمال کا، زمین سے ساری دنیا مستفید ہو رہی ہے، سب اسی پر گزر بسر کر رہے ہیں، غذائیں حاصل کر رہے ہیں، کوئی بھی زمین پر چلنے والا ایسا نہیں جو زمین سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو، تو اس طرح ساری کائنات اللہ کے ظاہر سے وابستہ ہے۔ آسمان کو اللہ نے چھت بنا دیا، اس کے سہارے اس کے نیچے ساری مخلوق زندگی گزار رہی ہے، اور اس سے متعلق ہے اس لئے یہاں بھی ساری مخلوق مستفید ہے اللہ کے ظاہر سے جس نے اپنے ایک کمال کو آسمان کی صورت میں ظاہر فرما دیا۔

رب العالمین سے تعلق کس کا ہوگا

لیکن اللہ کے باطن سے وہی وابستہ ہوگا جو اس کے علمی حقائق اور اخلاقی کمالات سے وابستہ ہو، جس سے اس کی حقیقت اور سیرت کھلے اور اس کا راستہ صرف کلام ہے، جو علمی اور اخلاقی کمالات سے بھرپور ہو کر اترتا ہے۔ اور اس کے باطن سے نکلتا ہے، پس حق تعالیٰ کے باطن سے صرف وہی وابستہ ہوگا جو اس کے کلام (قرآن کریم) سے وابستہ ہو اور اسے پڑھے اور پڑھائے، بنص حدیث یہ درحقیقت اس سے باتیں کرنا ہے، اور بات کرنے ہی سے بات کرنے والے کی اندرونی حقائق کھلتی ہیں۔

اس لئے قرآن پڑھنے پڑھانے والا براہ راست اللہ کے باطن سے متعلق ہوگا اور اس کی برکتوں سے متبرک ہو جائے گا، کیونکہ کلام متکلم کے اندر سے نکلتا ہے، پس کلام کے ذریعہ متکلم کے اندر سے رابطہ اور خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے شاعر شعر پڑھتا ہے تو وہ شعر درحقیقت اس کے دلی کمال کا آئینہ ہوتا ہے، جس میں اس کے دل کی کیفیات نمایاں ہو جاتی ہیں، اور یہ کمال الفاظ کلام سے وہ ظاہر کرتا ہے، اس لئے اس کلام سے جو بھی متاثر ہوگا وہ حقیقتاً شاعر کے باطن سے متعلق ہوگا اسے شاعر سے محبت ہو جائے گی، اس کیلئے شوق پیدا ہوگا، اس کی توقیر و تعظیم دل میں آئے گی، جبکہ اس سے ایک ہنر ظاہر ہوا، پس اس طرح ہم شاعر کی حقیقت سے وابستہ ہو گئے۔

علم کا مخزن قلب (دل) ہے

اسی طرح اگر ایک عالم کلام کرے تو اس کے کلام کے واسطہ سے اس عالم کے قلب سے رابطہ پیدا ہوتا ہے، اس کی حقیقت اور سیرت سے وابستگی ہوتی ہے، کیونکہ عالم کا کلام عالمانہ ہوتا ہے، اور علم نکلتا ہے قلب سے تو علم کے واسطہ سے جو تعلق پیدا ہوگا وہ عالم کے قلب اور باطن سے ہوگا، صورت شکل سے نہیں ہوگا، اگر کسی عالم کی صورت کالی کلوٹی بھی ہے پھر بھی اس سے عشق و محبت ہوتی ہے، تو وہ اس کی صورت کا عشق نہیں ہوتا، اس کی سیرت کے کمال کا عشق ہوتا ہے، ہر صاحب ہنر کے ہنرمندانہ کلام کے ذریعہ سے اس کی

حقیقت سے، اس کے قلب سے اور اس کے باطن سے وابستگی بڑھتی ہے۔

اللہ کی صفت الظاہر اور الباطن بھی ہے

بس یونہی سمجھو کہ حق تعالیٰ شانہ کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اس لئے کہ ان کا نام "الظاہر" بھی ہے اور "الباطن" بھی، هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ تو اس کے ظاہر سے تو ساری مخلوق مستفید ہے، لیکن اس کے باطن سے وہی مستفید ہے جو اس کے کلام سے وابستہ ہے۔ وجہ وہی ہے کہ کلام میں حق تعالیٰ کے کمالات چھپے ہوئے ہیں اور اتنے لامحدود کمالات ہیں کہ ان کی کوئی گنتی نہیں کر سکتا، تو کلام الٰہی حقیقت میں ترجمانی کرتا ہے اس کے باطنی کمالات کی جو اس کے اندر کے حقائق ہیں اور وہ کلام کے ذریعہ کھلے ہیں، جنہیں آپ بواسطہ کلام پہچان لیتے ہیں، اس لئے کلام سنتے ہیں کہ یہ شاعر کا کلام ہے، اور بڑا اچھا کلام ہے، یا کوئی عالم کلام کرتا ہے تو کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو کوئی عالم معلوم ہوتا ہے یا کوئی صناع اور سائنس داں کلام کرتا ہے، یا مضمون لکھتا ہے تو آپ فوراً پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کوئی سائنس داں ہے جو صنعت و حرفت کے نکتے سمجھا رہا ہے، اور اگر کلام بہت جامع اور اصولی ہو اور اس میں ہر علم و فن کی باتیں بھری ہوئی ہوں تو آپ اسی وقت کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو کسی بڑے عالم کا کلام ہے ورنہ کلام میں یہ جامعیت اور گہرائی نہ ہوتی۔

کلام ہنر اور عیب کو ظاہر کرتا ہے

تو کلام درحقیقت ترجمانی کرتا ہے متکلم کے باطن کی۔ شیخ سعدیؒ نے کہا ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جب تک آدمی کلام نہ کرے اس کا عیب و ہنر سب چھپا ہوا رہتا ہے، کلام بولتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ ناقص ہے یا کامل، جاہل ہے یا عالم، شاعر ہے یا ادیب۔

اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا کلام ان کے حقائق کا ترجمان ہے، اس لئے قرآن سنتے ہی ایک فہیم و دانا پکار اٹھے گا کہ یہ تو کسی بڑے حکیم و خبیر کا کلام ہے کہ جس کے علم و حکمت کی کہیں تہاں اور انتہا ہی نہیں ہے، اس میں جمال بھی ہے، حکمت بھی اخلاق بھی ہے، رحمت بھی ہے، شوکت بھی ہے، ہیبت بھی ہے، عظمت بھی ہے، ازلیت بھی ہے اور ابدیت بھی، غرض ساری ہی خوبیاں اس کلام میں چھپی ہوئی ہیں جس سے ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سوائے خدا کے کسی اور کا کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ ساری ہی خوبیوں اور کمالات کا سرچشمہ صرف اسی کی ذات بابرکات ہے۔

کلام الٰہی کو پڑھیں گے تو صفات الٰہی کا عکس ہم پر پڑے گا

اور ظاہر ہے کہ جب یہ کلام ہم پڑھیں اور پڑھائیں گے تو ساری خوبیاں بقدر صلاحیت ہم میں رچیں

گی اور راسخ ہوں گی، اور ہم اس کی اندرونی برکتوں سے یقیناً مستفید ہوں گے، یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے باطن سے متعلق ہونے اور اس کی برکتوں سے مستفید ہونے کا اور ظاہر ہے کہ جب ہم اس کے باطن سے وابستہ ہو گئے تو اس دنیا کی ظاہری چیزوں سے گزر کر اللہ کے باطن تک پہنچ گئے، اسی واسطے حدیث مذکور میں فرمایا گیا کہ قرآن سے برکت حاصل کرو کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آتا ہے۔

آسمان دنیا سے ساتویں زمین تک جہنم کا علاقہ ہے

یہاں سے ایک حقیقت اور سمجھئے، اور وہ یہ کہ آسمان سے نیچے ساتوں زمین کی تہہ تک جہنم کا علاقہ ہے اور ساتویں آسمان سے اوپر جنت کا علاقہ، جیسا کہ اہل حقائق کے کلام سے واضح ہے، اس لئے جنتی مخلوق بھی آسمان کے نیچے ہے وہ گویا جہنم میں ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس جہنم سے نکلو اور جنت تک پہنچو اس کی صورت یہ فرمائی کہ حق تعالیٰ نے ایک رسی آسمان سے لٹکا دی اور حکم دیا کہ اس رسی کو مضبوط پکڑو کہ جب ہم اسے کھینچیں تو تم اس کے سہارے ہمارے پاس آجاؤ، وہ رسی کیا ہے تو حدیث نے اس کی تفسیر فرمادی کہ وہ قرآن ہے، چنانچہ حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ یہ "قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین کی طرف لٹکا دی گئی"

رسی کو پکڑ کر جنت میں چلے جاؤ

پس یہ قرآن اللہ کی ایک رسی ہے جو اس نے ٹانگ دی ہے، جو آسمان سے لٹکا دی گئی ہے، جو زمین تک پہنچ گئی ہے، اسی کیلئے حکم دیا کہ اس سے لپٹ جاؤ، اس سے اعتصام کرو، تمسک کرو، اسی سے لگ جاؤ، اور اسے تھام لو، یہ رسی ایسا مضبوط رشتہ ہے کہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا، ہاں یہ تو ڈر ہے کہ وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے لیکن ٹوٹ نہیں سکتی، جو پکڑے گا وہ ادھر ادھر گر نہیں سکتا یعنی جہنم میں نہیں رہ سکتا، تو قرآن کریم کے ظاہر کے لحاظ سے تو یہ فرمایا گیا کہ اللہ کی رسی جو اس نے دنیا میں لٹکا دی ہے اسے تھام لو، جب اسے تھام لو گے اور مضبوط پکڑ لو گے تو قیامت کے دن ہم اسی رسی کو...... اوپر کھینچیں گے، جو اس سے بندھ گیا وہ اس سے کھنچ کر ہمارے پاس چلا آئے گا اور جنت رضوان تک پہنچ جائے گا ادھر ادھر نہیں جا سکے گا۔

رسی چھوڑنے یا بے التفاتی سے جہنم میں رہ جاؤ گے

لیکن جنہوں نے یہ رسی نہیں تھامی وہ یہیں رہ جائیں گے، کفار نے یہ رسی نہیں تھامی، تو وہ جنت تک نہیں پہنچ سکیں گے اور نہ انہیں اللہ کے باطن سے کوئی علاقہ (تعلق) قائم ہو گا اور وہ یہیں نیچے کے نیچے رہ جائیں گے، یعنی جہنم میں پڑے رہ جائیں گے گویا کفار کو جہنم میں داخل کرنا نہیں پڑے گا کہ وہ پہلے ہی جہنم میں تھے اور انہوں نے رسی پکڑی ہی نہ تھی جس کے ذریعہ کھنچ کر وہ جنت کے مقام بلند تک پہنچ جاتے البتہ مومن کو اس جہنم سے اسی رسی کی بدولت اوپر کھینچ کر جہنم سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائیگا اور فرمایا جائیگا کہ "جنت میں داخل ہو جاؤ امن اور سلامتی کے ساتھ"۔

آسمانِ دنیا کے نیچے سانپ اور عذاب پہنچانے حشرات الارض والے موجود ہیں

حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے لکھا ہے کہ اس آسمان اور زمین کے درمیان جہنم کا علاقہ ہے، آسمان کے نیچے سے لے کر ساتویں زمین کی تہہ تک اس کے اندر وہ آگ اور سانپ، بچھو اور ساری مصیبتیں ہیں جو جہنم میں رکھی گئی ہیں، فرمایا یہ جارہا ہے کہ تم سب کے سب اس وقت جہنم میں اور اسی کے علاقہ میں ہو، رسی لٹکا دی گئی ہے کہ جسے اس جہنم سے نکلنا ہو وہ ہماری رسی تھام لے ہم اسے کھینچ لیں گے تو جو لوگ نہیں تھامیں گے انہیں جہنم میں داخل کرنا نہیں پڑیگا، وہ پہلے ہی سے جہنم کے اندر ہیں، یہی وجہ ہے کہ کفار کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے کہ وہ تو ہیں ہی جہنم میں، جب انہوں نے نکلنے کی کوشش نہیں کی تو وہ وہیں پڑے رہ گئے جہاں پڑے تھے، وہ اب بھی جہنم میں ہیں جب بھی جہنم میں رہیں گے، البتہ مومن اس رسی کی بدولت اس سے کھینچ کر باہر نکل آئے گا اور اوپر مقام کریم میں جا پہنچے گا۔

قرآن کریم ہم کو جہنم سے نکالتا اور اللہ کے باطن سے ملاتا ہے

بس قرآن کریم کی ایک شان تو یہ ہے کہ جہنم سے لوگوں کو کھینچ کر نکالنے والا ہے، دوسری شان یہ ہے کہ آدمی جب اس کے ظاہر سے آگے بڑھ کر اس کے باطن سے متعلق ہو، یعنی اس کے معانی اور حقائق کو سمجھے، اور اس کی کیفیات سے اپنے باطن کو باکیف بنائے، تو وہ قرآن کی ان دونوں شانوں سے اللہ کے باطن سے متعلق ہو جائے گا۔

کلام الٰہی خیر ہی خیر ہے

کیونکہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے یہ ایک فطری بات ہے کہ آدمی کلام سن کر متکلم اور اس کی اندرونی کیفیات سے وابستہ ہوتا ہے اور جبکہ اللہ تعالیٰ سرچشمہ خیر و برکت اور ان کی ہر بات خیر ہی خیر ہے، اس لئے آدمی اس کے کلام سے اور کلام کے واسطہ سے خود اس سے وابستہ ہو کر سرتاپا خیر ہی خیر اور برکت ہی برکت ہو جائے گا، جس میں شر باقی نہ رہے گا...... اسی کو حدیث نبوی ﷺ میں فرمایا گیا ہے کہ "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن پڑھتا اور پڑھاتا ہے"۔ تو پوری امت میں عالم قرآن اور معلم قرآن کو خیر کا لقب دیا گیا ہے یعنی ساری امت تو دوسری اقوام کی نسبت سے خیر ہے، "امر بالمعروف کرتے ہو، اچھی باتوں کی نصیحت کرتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو"۔ اور عالم قرآن افضل ہوا غیر عالم سے اور معلم قرآن افضل ہوا محض عالم سے بھی۔

قرآن کا شغل رکھنے والا سب سے افضل ہے

جس کا حاصل یہ نکلا کہ اس پوری امت میں جو قرآن کا شغل رکھتے ہیں، پڑھتے اور پڑھاتے ہیں کوئی اس کے الفاظ کو پڑھاتا ہے کوئی اس کے معنی کو پڑھاتا ہے، کوئی اس کے حقائق کی تعلیم دیتا ہے، وہ پوری امت میں سب سے زیادہ افضل ہے جس کی بڑی وجہ وہی ہے کہ وہ قرآن کا شغل رکھ کر حق تعالیٰ سے اور بالخصوص

اس کے باطن سے وابستہ ہے، محض ظاہر سے نہیں، جس سے کائنات کی ہر چیز ہی وابستہ ہو، خواہ وہ جاندار ہوں، جمادات ونباتات، آسمان ہو یا زمین، چاند ہو یا سورج وغیرہ پس کلام خداوندی کو لینے والا مستفید ہے براہ راست اللہ کے باطن سے اس لئے اس کو حدیث نبوی علیہ السلام میں "خیر" فرمایا گیا۔

الفاظ قرآن کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے

اس سے واضح ہے کہ قرآن کے الفاظ کی بھی اگر تعلیم دی جائے تو وہ بھی اس حدیث کی رو سے اسی خیر امتہ میں داخل ہے، کیونکہ قرآن کریم مجموعہ ہے لفظ اور معنی کا، لفظ بھی اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور معنی بھی اللہ کی طرف سے آئے ہیں، بخلاف دوسری کتب سماویہ کے کہ وہاں الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں، اس لئے وہ حقیقی معنی میں کلام نہیں ہیں جن سے حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا ہو اور انہیں پڑھ کر سنایا ہو۔

قرآن کلام اللہ کیوں ہے؟

مثلاً حق تعالیٰ نے توریت کا تکلم نہیں فرمایا بلکہ اس کو لکھ کر الواح حضرت موسیٰ کے حوالے کردیں تو توریت کو کتاب خداوندی کہیں گے، کلام نہیں کہیں گے، اگر کلام کہیں گے بھی تو مجازی طور پر کہیں گے، ورنہ کتاب خداوندی کہیں گے۔

یا مثلاً انجیل ہے کہ اس کا بھی تکلم نہیں ہوا، قلب پر اللہ نے اس کا مضمون القا فرمادیا تو لفظ عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں جو اللہ کی طرف سے بطور وحی قطعی نازل نہیں ہوئے، بلکہ صرف مضمون نازل ہوا، اس لئے انجیل کو بھی حقیقی معنی میں کلام خداوندی نہیں کہا جائیگا، مضمون خداوندی کہا جائیگا، کلام اسی کو کہتے ہیں کہ بولنے والا اسے بولے، اور اس کو تکلم کرے، یہ خصوصیت اگر ہے تو صرف قرآن کی ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے بول کر اتارا ہے پڑھ کر سنایا نہ کہ محض لکھ کر بھیج دیا ہے۔ یا محض مضمون القاء کردیا ہے، پس حقیقتاً وہی کلام خداوندی ہے، اسی لئے وہ بکمال وتمام محفوظ ہے، وہ نہ ضائع ہو سکتا ہے نہ متغیر ہو سکتا ہے، ورنہ اگر کتاب اتاردی جائے۔ تو وہ ضائع بھی ہو سکتی ہے پھٹ بھی سکتی ہے، دریا میں غرق بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی جلادے تو جل بھی سکتی ہے یا زمین میں دفن کردی جائے تو دفن بھی ہو سکتی ہے ایسے ہی اگر القا کیا جائے تو لفظوں میں ذرا سے تغیر سے ادل بدل بھی ہو سکتا ہے جس سے حقیقتیں بدل جاتی ہیں وہ اصل حقیقت جو مراد تھی باقی نہیں رہتی، لیکن کلام اگر بولا جائے تو بندہ کا کلام بھی ضائع نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ خدا کا کلام، کیونکہ بندہ جب بولتا ہے تو پورے جو (منہ) کے اندر وہ خلا میں محفوظ ہو جاتا ہے، اسی پر آپ کے ریڈیو کی ایجاد بنی ہے، اگر فضا آپ کے کلام کو جذب نہ کرتی تو مشینوں کے ذریعہ آپ اسے کھینچ کر دوسروں تک کیسے پہنچاتے چنانچہ کلام مشرق میں ہو رہا ہے اور پہنچ رہا ہے مغرب میں، اس لئے کہ اس کلام کو فضا نے جذب کرلیا تھا اس فضا سے آپ نے آلات کے ذریعہ اسے کھینچ لیا، اس کا فوٹو لے لیا اور اب تو یہاں تک کہتے ہیں اور کہتے ہی نہیں بلکہ کرکے دکھلا رہے ہیں کہ فوٹو صرف صورت ہی کا نہیں بلکہ آوازوں کا بھی لے لیا جاتا ہے، چنانچہ آواز کا فوٹو

لینے کیلئے ریکارڈنگ مشین ایجاد ہو چکی ہے، جس میں آوازیں اور لب ولہجہ بھی محفوظ کر لیا جاتا ہے اور اسی آواز سے مشین بولنے لگتی ہے، بلکہ اب تو ایجادات نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ ایک مجلس میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں مجلس سے اٹھ کر بھی سب چلے گئے، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بھی گزر گیا، لیکن پھر بھی اس مجلس والوں کی ہیئتیں اور آوازیں سب مشینوں کے ذریعہ ریکارڈ کر لی جاتی ہیں اور انہیں دکھلا دیا اور سنا دیا جاتا ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ بولنے والے کا کلام اس فضا میں جذب ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے جو کبھی ضائع نہیں ہوتا اس محفوظ شدہ کو مشینوں سے ٹیپ ریکارڈ میں کھینچ لیا جاتا ہے اگر وہ فضا میں محفوظ نہ تھا تو آکر مشینوں نے اسے کیسے کھینچ لیا اور کہاں سے جذب کیا؟

اللہ کے کلام اور بندوں کے کلام میں فرق

تو جب بندوں کا ضعیف کلام بھی فضا میں پہنچ کر ضائع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی رد و بدل کیا جا سکتا ہے تو خدائے حکیم کا کلام کیسے ضائع ہو سکتا ہے جو اس نے بولا ہو اور جس کا اس نے تکلم فرمایا ہو، فرق اتنا ہے کہ ہمارے کلام کی حفاظت کرتی ہے فضا اور اللہ کا کلام وہ ہے جو خود فضا کی حفاظت کرتا ہے، یہ نہیں کہ فضا اس کو گھیرے بلکہ فضا اس کے اندر گھری ہوئی ہے، تو فضا کے اندر آنے والا کلام جب ضائع نہیں ہو سکتا، تو خود فضا پر چھایا ہوا اور اس کا محافظ کلام کیسے ضائع ہو سکتا ہے؟

حق تعالیٰ جب بولتے ہیں تو سارے جہانوں اور تمام عالموں میں اس کی گونج ہوتی ہے۔ جس سے وہ فضا پر محیط ہو جاتا ہے، جسے کوئی چیز نہیں مٹا سکتی اور اللہ کا کلام تو بجائے خود ہے وہ تو انتہائی رجعت و عظمت میں ہے، اہل اللہ جو اہل دل ہیں اور حق تعالیٰ سے وابستہ ہیں ان کے یہاں بھی ذکر کا ایک خاص مقام ہے جسے سلطانا نصیرا کہتے ہیں کہ عالم کا ذرہ ذرہ اس ذکر میں مصروف ہو جاتا ہے، اور جب وہ سالک سجدہ کرتا ہے تو پورا عالم سربہ سجود ہو جاتا ہے، جسے انکشاف اور کشف کی آنکھ سے ہم دیکھ سکتے ہیں تو ایک سالک راہ خدا جب بولتا ہے تو سارے عالم میں وہ کلام گونج جاتا ہے، تو اللہ جب بولے جو سر چشمہ ہے سارے کمالات کا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے بولنے سے فضا کا ذرہ ذرہ نہ بول اٹھے اور اس کا ہم نوا نہ ہو، جب کہ ساری فضا ہی اس کے اندر آئی ہوئی ہے، اس لئے کلام خداوندی کے ضائع ہونے کی کوئی صورت نہیں پس توریت میں تحریف ہو سکتی ہے، انجیل میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن قرآن میں تبدیلی کبھی اور کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

کلام اللہ پڑھنے والا مامون محفوظ ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اللہ کے کلام کو اپنے اندر لے لیتے ہیں وہ کلام محفوظ کی وجہ سے خود بھی محفوظ ہو جاتے ہیں وہ ضائع نہیں ہو سکتے تو کلام خداوندی کا پڑھنے والا پڑھانے والا اللہ کے حفظ و امن میں ہے، نہ وہ خود ضائع ہو سکتا ہے، نہ اس کا عمل ضائع ہو سکتا ہے، نہ اس کے اخلاق ضائع ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی اس کے احوال ضائع ہو سکتے ہیں بلکہ بڑھتے ہی رہیں گے، اور ان میں ترقی ہی ہوتی رہے گی، ان ہی ترقیات کی

بناء پر حق تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ ﷺ کی زبان سے فرمایا کہ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ تو اس امت میں سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن کو پڑھتا اور پڑھاتا ہے۔ اب قرآن کا پڑھنا پڑھانا اگر محض الفاظ کا ہو وہ بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ الفاظ بھی اللہ کی طرف سے آئے ہوئے ہیں اور اگر اس کے معنی کو آدمی سمجھے اور سمجھائے تو وہ بھی خیرکم میں داخل ہے، کہ اس کے معانی بھی اللہ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں اور مقصود اصلی ہیں پھر اس کے حقائق اور کیفیات کو جو بیان کرے وہ بھی خیرکم میں داخل ہے، اس لئے کہ کیفیات بھی اس کلام میں اسی کی طرف سے ہو کر لپٹی ہوئی ہیں۔

درس و تدریس امتِ محمدیہ کا امتیاز ہے

غرض کہ تعلیم اور تعلّم ہی اس امت کے اندر سب سے اونچا مقام ہے کیونکہ وہ علم کے پہنچانے والے ہیں، خواہ لفظوں کا علم ہو یا معنی کا، اور علم افضل ہے عمل سے، کیونکہ عمل فرع ہوتی ہے علم کی، پس جو اصل کو تھامے ہوئے ہے وہ یقیناً اونچا اور افضل ہوگا فرع کے تھامنے والے سے پھر یہ اصل کی اور افضلیت بھی فقط دنیا میں ہی نہیں ہے اس سے زیادہ نمایاں ہوگی آخرت میں۔

حافظ قرآن کے ماں باپ کی تاج پوشی

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حافظ قرآن کے ماں باپ کو میدانِ حشر میں تاج پہنایا جائے گا اولین و آخرین کے مجمع میں اس تاج کی روشنی سے پورا عالم محشر منور ہو جائیگا، ساری دنیا کہے گی یہ کون لوگ ہیں جنہیں یہ تاج کرامت پہنچایا گیا؟ کہا جائیگا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو ہمارا کلام حفظ کرایا، ہمارا کلام پڑھوایا تھا۔

غور کیجئے کہ دنیا میں کسی بادشاہ کی تاج پوشی کا دربار ہوتا ہے تو ملک کے تمام عمائد جمع ہوتے ہیں، فقط ایک دارالسلطنت ہی کے نہیں بلکہ صوبوں تک کے تمام وزراء، امراء اور تمام بڑی بڑی شخصیتیں دربار میں سب جمع ہوتی ہیں اور تاج پوشی کا جشن ہمہ گیر طریقہ سے منایا جاتا ہے، لیکن حافظ قرآن کی تاجپوشی جس دربار میں ہوگی، اس میں نہ صرف ایک عالم بلکہ تمام جہانوں کے اولین اور آخرین مل کر اس جشن میں شرکت کریں گے اور اس حافظِ قرآن کی تاج پوشی کا منظر دیکھیں گے، پھر تاج پوشی کے وقت سب حاضرین، دربار تاج کے سامنے جھکتے بھی ہیں اور اسے اسلامی بھی دیتے ہیں، کیونکہ وہ علامت ہے قیام سلطنت و شوکت کی، ظاہر ہے کہ حافظ قرآن کرانے والے کی اس تاج پوشی کے جلسہ میں جبکہ نہ صرف ایک ملک یا ایک اقلیم یا ایک قرن ہی کے لوگ جمع ہوں گے، بلکہ آدم کی ساری ہی اولاد جمع ہوگی، مسلم و کافر سب ہی وہاں کھڑے ہو کر اس حفظ کرانے والے ماں باپ کی تعظیم و توقیر بجالائیں گے، گویا اس کی شاہیت کو سب تسلیم کریں گے، تو یہ کتنی غیر معمولی اور اعلیٰ ترین عظمت ہوگی جو ایک حافظ قرآن کیلئے نمایاں کی جائیگی، پھر دنیا میں بادشاہوں کو تاج پہنانے والے ہم تم ہی جیسے انسان ہوتے ہیں، خواہ چیف جسٹس تاج پہنائے یا اگر عیسائی

ملک ہو تو پادری اور اگر اسلامی حکومت ہے تو اہل علم و فضل اور دانشور، بہر حال انسان ہی انسان کے سر پر تاج رکھتا ہے، وہ انسانیت میں اس کی برابر ہی ہوتا ہے، لیکن معلم قرآن ماں باپ کے سروں پر تاج رکھنے والے اللہ تعالیٰ ہوں گے، جو بادشاہوں کے بادشاہ اور اَحۡكَمُ الۡحَاكِمِيۡن ہیں، کوئی انسان بیچ میں نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جب اولین و آخرین کے مجمع میں تاج پوشی ہو اور تاج پہنانیوالے حق تعالیٰ ہوں تو اس عظمت و شہرت اور مقبولیت کی کیا حد وانتہا ہو گی، جو حافظ قرآن کو وہاں نصیب ہو گی، اسے بین الاقوامی نہیں بلکہ بین العالمینی شہرت و مقبولیت کہنا چاہئے اور یہ جہان اور عالم تو پھر مخلوق ہیں، اس جلسہ کے صدر تو حق تعالیٰ ہوں گے، جو خالق ارض و سماء ہیں، تو اس جلسہ کی ہمہ گیری کو آخر کن لفظوں سے تعبیر کیا جائے؟

بس اسی کو حدیث نبوی ﷺ میں "خیر کم" کے لفظ سے واضح فرمایا گیا ہے، جس سے حفظ کرنے والے اور حافظ کرانے والے کی عظمت ظاہر کی گئی ہے، کہ وہ عنداللہ خیر محض ہے، اور جو خدا کے نزدیک خیر ہو تو شر اس کے پاس کیا پھٹک سکتا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ بنص حدیث سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ خدا کے کلام کو اونچا اور نمایاں کرتے ہیں، رہنمائی بھی کرتے ہیں، ہدایت کا کارخانہ بھی کھولتے ہیں اور عالم کیلئے نزول رحمت کا ذریعہ بھی ثابت ہوتے ہیں، بہر حال قرآن کریم کی مختلف صفات بیان کی گئی ہیں، جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے اعلیٰ ترین صفت یہ ہے کہ وہ "کلام اللہ" اللہ کا کلام ہے۔

تمام امتوں میں امت محمدیہ کا مقام

پھر یہ کلام جب کہ اللہ کے باطن سے نکلا تو اس امت کی ایک بڑی خصوصیت اور ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ اس عالم میں یہی ایک امت ہے جو باطن حق کو اپنے باطن پر لئے ہوئے ہے اور حق تعالیٰ کا وہ تبرک جو براہ راست اس کے اندر سے آیا ہے اس امت کے ہاتھ میں ہے، آج دنیا کی کوئی امت ایسی نہیں کہ اللہ کا براہ راست تحفہ اس کے ہاتھ میں ہو، کیونکہ اور تمام اشیاء مخلوق ہیں، ان سے قومیں استفادہ کر رہی ہیں، لیکن غیر مخلوق چیز یعنی صفت خداوندی جسے کلام کہتے ہیں، وہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس طرح اللہ کا باطن ہمارے باطن میں سمایا ہوا ہے۔

قرآن کی جتنی آیات ہیں اتنے ہی جنت کے مراتب ہیں

اسی کے ساتھ اس سے ایک دوسری بات یہ بھی نکلتی ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے قرآن کی جتنی آیتیں ہیں اتنے ہی جنت کے درجات ہیں، حافظ سے کہا جائیگا (تلاوت کرتا جا ترقی کرتا جا) جہاں تک تیری قوت ہے، درجات کماتا جا، اور ایک دوسری روایت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں خود درجات جنت ہیں، وہ پڑھتا جائیگا اور درجات و مراتب حاصل کرتا جائیگا اور اس کو ابدالاباد تک اونچا بڑھاتا چلا جائیگا۔

مسلمان نے جنت کو اپنے اندر داخل کر لیا

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اور قومیں تو محنت کر کے جنت میں داخل ہوتی ہیں، مسلمان وہ ہے جس

نے جنت کو اپنے اندر داخل کر رکھا ہے، اور دنیا میں رہ کر وہ جنت بداماں ہے، پس اور امتیں جنت میں داخل ہوں گی اور اس امت میں جنت خود سائی ہوئی ہے۔

دنیا میں جنت کی شکل آیات قرآنیہ ہیں

جبکہ جنت اسی کلام کا مجموعہ ہے اور انہی آیات قرآنیہ کو جنت کہا گیا ہے، فرق یہ ہے کہ یہاں اس جنت کی شکل آیتوں کی ہے اور وہاں جا کر باغ و بہار ہو جائیگی، تو چیز ایک ہوئی لیکن جہانوں کے بدلنے سے ہیئت بدل جائیگی، تو چیز ایک ہوئی لیکن جہانوں کے بدلنے سے ہیئت بدل جائیگی اس دنیا میں وہ الفاظ و معنی ہیں اس دنیا میں جا کر وہ بہترین صورتیں اور بہترین نعمتیں اور بہتریں لذتیں بن جائیں گی اور باغ و بہار ہو جائیں گی، اور یہ کوئی مستبعد بات نہیں کہ ایک چیز ایک عالم میں ایک لباس پہنے ہوئے ہو اور دوسرے عالم میں دوسرا لباس پہن لے، وطن کی خصوصیت سے صورتیں شکلیں بدل جاتی ہیں جیسے ایک انجینئر کوٹھی کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں بناتا ہے جو اس کے تصور میں ہوتا ہے، پھر اسی نقشہ کو وہ کاغذ پر اتارتا ہے، اور پھر اسی کاغذی نقشہ کے مطابق وہ کوٹھی کی تعمیر زمین پر کرتا ہے، پس اصل کوٹھی وہی ہے جو اس کے ذہن میں تھی، وہی کوٹھی کاغذ پر آئی اور پھر وہی ذہنی کوٹھی آخر کار زمین پر کھڑی ہوئی چیز ایک ہی ہے، مگر ہر وطن میں پہنچ کر اس نے اس وطن کا لباس اختیار کر لیا، ذہن میں تھی تو اس نے تصور کا لباس اختیار کیا، کاغذ پر آئی تو اس نے روشنائی کا لباس اختیار کیا اور زمین پر آئی تو اس نے گارے پانی اور چونے لکڑی کا لباس اختیار کیا، چیز ایک ہی ہے، مگر وطنوں کے بدلنے سے لباس بدلتا رہا، ذہن میں تھی تو وہاں نہ روشنائی تھی نہ کاغذ تھا، کاغذ پر آئی تو وہاں نہ اینٹ تھی نہ پتھر تھا، زمین پر آئی تو وہاں مادی چیز تھی، غرض ہر جگہ اس وطن کے مناسب یہ کوٹھی لباس اختیار کرتی رہی۔

آیات قرآنیہ دل کے اندر علم اور ظاہر میں عمل کی شکل ہے

ٹھیک اسی طرح یہ آیات الٰہیہ یا قرآنی آیتیں جب تک ہمارے دل کے اندر ہیں ان کی شکل علم کی ہے جب وہ ہمارے ظاہر پر آتی ہیں تو عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، اور جب ہماری روح پر آتی ہیں تو عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، اور جب ہماری روح پر آتی ہیں تو احوال و کیفیات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور وہی آیتیں جب آخرت کے عالم میں پہنچیں گی تو باغ و بہار اور نعمہائے بہشت کی صورت اختیار کر لیں گی، اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اگر قرآنی آیات کو حدیث شریف میں درجات جنت سے تعبیر کیا گیا کہ یہاں وہ علم ہوں اور وہاں وہ باغ و بہار ہوں۔

ہمارے بچپن میں یورپ سے ایک کھلونا آیا کرتا تھا، ایک پیکٹ میں بارہ گولیاں ہوتی تھیں، چار آنہ میں پیکٹ ملتا تھا، بچے بیٹھ جاتے تھے اور پیالہ بھر کر رکھ لیتے تھے، ایک گولی ڈال دی، اور پانی لگ کر وہ گولی پھٹی تو کوئی گولی پھول بن گئی، کسی گولی سے انجن نکل آیا، کسی سے بنگلہ نکل پڑا، بچے بہت خوش ہوتے تھے کہ گولی کا بنگلہ بن گیا، گولی کا پھول بن گیا، یہ کاریگر کی صناعی تھی کہ گولیاں ایسی ساخت سے بنائی گئی تھیں اور ان کے

مسالہ کو ایسے ترتیب سے گوندھا گیا تھا کہ وہ گولی خشک رہے تو گولی ہو اور تری لگ کر پھٹے اور کھلے تو انجن اور بنگلہ بن جائے، تو پھر آپ کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ نے آیات قرآنیہ کو ایسے انداز سے مرتب فرمایا ہے کہ وہ بند رہیں تو علمی آیتیں ہیں اور آخرت کی تری لگ کر کھلیں تو باغ و بہار ہو جائیں۔

یہ ساری خوشیاں قرآن پر عمل کرنے میں ہیں

مگر یہ جب ہے کہ آدمی قرآن کو پڑھے اور عمل کرے تو یہ آیتیں اس کے عمل میں آکر یہ شکلیں اختیار کریں گی نہ کہ خود کلام الٰہی کہ وہ ہر تغیر سے بالاتر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں جو کچھ بھی عمل کرتا ہے اس کی ایک صورت ہوتی ہے جو عالم مثال میں جا کر چھپ جاتی ہیں اور جب وہ حقائق کے عالم میں آئیں گی تو وہ شکلیں نمایاں ہوں گی اور آدمی ان سے راحت اور لذت اٹھائے گا اور اس وقت یہ حافظ کہے گا کہ اللہ اکبر! تلاوت اور حفظ قرآن کا جو عمل میں نے کیا تھا میں تو اسے معمولی سمجھ رہا تھا، اب معلوم ہوا یہ تو بڑی عظیم چیز تھی، یہ تو جہان کے جہان ہیں، جو اس قرآن کریم میں کھپے ہوئے تھے۔

قرآن میں جس طرح علم وحقائق ہیں اسی طرح آخرت کی لذتیں بھی ہیں

جیسے دنیا میں حافظ کے سامنے تو آیت کے محض الفاظ آتے ہیں عالم کے سامنے اس کے علوم کھلتے ہیں، عارف کے سامنے اس کے اسرار و حقائق اور سب ان ہی آیتوں سے یہ علمی عجائبات نکل نکل کر سامنے آتے ہیں تو آدمی حیران ہوتا ہے کہ ان مختصر لفظوں میں علم کے کس قدر جہان کھپے ہوئے تھے، جو رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہیں، پس جیسے اس قرآن کے الفاظ میں معنی اور معنی میں حقائق اور حقائق میں صفات کمال چھپی ہوئی ہیں ایسے ہی ان میں وہ لذتیں بھی کھپی ہوئی ہیں جو جنت میں نعمتوں کی شکل میں سامنے آئیں گی، مگر جبکہ یہ سب علمی، عملی اور حالی لذتیں قرآن کے علم و تعلیم اور حفظ و ذکر ہی سے سامنے آسکتی تھیں، اس لئے اس کی تعلیم ہی خیر کثیر ہے اس لئے فرمایا گیا کہ:

"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ"

تم میں بہترین طبقہ اور بہترین شخص وہ ہے کہ جو قرآن کو پڑھتا اور پڑھاتا ہے، خواہ لفظوں کو پڑھائے خواہ معنی کو سمجھائے خواہ اس کی حکمتوں کو سمجھائے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور ہزاروں خیرات اور برکات کا سر چشمہ ہے جو تعلیم سے کھلتا ہے۔

اجتماع خیر

یہ جلسہ جس میں اس وقت ہم اور آپ سب جمع ہیں اس کی غرض و غایت کیونکہ قرآن کا ختم کیا جانا ہے، اس لئے یہ جلسہ اور جلسوں سے زیادہ خیر و بہتر ہونا چاہئے کہ جب قرآن خیر، اس کی تعلیم خیر، تو اس کے ختم کی تقریب کا جلسہ بھی بلاشبہ خیر ہے، اور یقیناً خیر ہے، اس لئے اس جلسہ میں آنے والے، بیٹھنے والے بھی سب کے سب اس خیر کثیر سے حصہ پائیں گے۔ جو اس قرآن کریم سے پھوٹ نکلے گی، اس سے یقیناً درجہ

بدرجہ سب مستفید ہوں گے، اور سب ہی وہ خیر لے کر جائیں گے جو اس جلسہ میں انہیں مل رہی ہے، اس لئے یہ جلسہ ایک بہترین جلسہ ہے، خیر کثیر کا جلسہ ہے اور ہر شخص کو اس سے حصہ ملنے والا ہے اور مل چکا، جو آ گیا اور شریک جلسہ ہو گیا تو اسے وہ خیر مل گئی، اور وہ ان شاء اللہ خیر میں داخل ہو چکا جو اس کے آگے آنے والی ہے، اس دنیا میں بھی آئے گی اور آخرت میں بھی آئے گی، اور ہر گز رائیگاں نہیں جائیگی۔

مبارکباد اور خوش نصیبی

ان الفاظ کے ساتھ میں ان بچوں کو بھی، ان بچوں کے اولیاء کو بھی اور ان بچوں کے پڑھانے والوں کو اور ان لوگوں کو بھی جو اس مکتب اور مدرسہ کی اعانت کر رہے ہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کی محنت کے شیریں ثمرات آج ان کے سامنے آ رہے ہیں، ہمارے محترم بزرگ قاری شریف احمد صاحب نے اگر دو تین برس محنت کر کے بچوں کو پڑھایا تو آج ان کی محنت کا صلہ آنکھوں کے سامنے ہے کہ قرآن ان کے سینوں میں اتر چکا ہے، اور یہ تکمیل حفظ قرآن کا جلسہ ہو رہا ہے، کل ایک کارِ خیر شروع ہوا تھا، اور آج الحمد للہ اختتام کو پہنچ رہا ہے۔

خوشی کے دو مواقع

دنیا میں خوشی کے قابل دو ہی چیزیں ہوتی ہیں ایک کسی چیز کا آغاز و افتتاح اور دوسرے تکمیل و اختتام، یہ دونوں ہی خوشی کی چیزیں ہوتی ہیں، بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں، اس لئے کہ افتتاح ہو رہا ہے، اور انسان کی انسانیت کا آج آغاز ہے، کوئی باغ لگاتا ہے، تو جلسہ کرتا ہے یا مٹھائی تقسیم کرتا ہے اس لئے کہ باغ کی ابتداء ہو رہی ہے، توقع باندھی جاتی ہے کہ کل کو اس سے پھل نکلیں گے اور ہم سب اس سے منتفع ہوں گے، کسی مدرسے کو شروع کرتے ہیں تو مٹھائی بانٹتے ہیں، کیونکہ افتتاح ہوتا ہے اور امید باندھتے ہیں کہ کل کو اس سے عالم و حافظ بن کر نکلیں گے اور قوم ان سے نفع اٹھائیگی۔

تو کسی چیز کا شروع ہونا مسرت اور خوشی کی چیز ہوتی ہے، اسی طرح سے کسی چیز کی تکمیل و اتمام بھی مسرت کی چیز ہوتی ہے، کہ وہ نتیجہ و ثمرہ کا وقت ہوتا ہے، پس ابتداء میں تو توقع پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ جس چیز کو شروع کیا جا رہا ہے امید ہے کہ اس سے کل نفع پہنچے گا اور تکمیل کے وقت وہ ساری امیدیں اور آرزوئیں سامنے آسکتی ہیں جن کا افتتاح کیا گیا تھا، تو تکمیل آغاز سے بھی زیادہ خوشی کی چیز ہوتی ہے۔

موت پر بھی خوشی ہوتی ہے

آپ شاید اس میں یہ سوال کریں کہ مرنے والا جب مرتا ہے تو لوگ تو روتے ہیں بیٹھ کر کوئی بھی خوشی نہیں مناتا، میں کہتا ہوں کہ نہیں! موت پر بھی لوگ خوش ہوتے ہیں کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا رنج و غم جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ ایک عزیز و محبوب کی جدائی کا ہوتا ہے نہ کہ اس کے آخرت میں چلے جانے کا، یا اللہ سے مل جانے کا یہی وجہ ہے کہ کہا کرتے ہیں کہ بڑی مبارک موت ہوئی، خدا ہر ایک کو ایسی موت نصیب کرے

کوئی شہید ہو گیا اور خاتمہ بالخیر ہونے کی علامات ظاہر ہوئیں تو کہتے ہیں کہ میاں مرنا تو تھا ہی ایک دن خوشی کی بات یہ ہے کہ شہید ہو کے مرا، خاتمہ اچھا ہوا۔

موت پر جشن نہیں منا سکتے

پس موت پر لوگ نہیں روتے، جدائی پر روتے ہیں، ہاں موت پر جشن بھی نہیں مناتے، اگر ایسا کرتے تو تہمت آتی کہ ان کو اپنے عزیز کے جدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اس کے چلے جانے پر خوشیاں منا رہے ہیں۔

بہر حال حاصل یہ ہے کہ جیسے کسی چیز کا آغاز و افتتاح خوشی کی چیز ہے ایسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر اختتام اور تکمیل بھی خوشی کی چیز ہے، بس اس مکتب و مدرسہ میں آج چند بچوں کے قرآن کریم کے اختتام کا دن ہے، اس لئے یہ انتہائی خوشی کا دن ہے اور اس دن سے بھی زیادہ جس دن ان کے قرآن پڑھنے کا آغاز ہوا تھا، اور انہیں مکتب میں بٹھلایا گیا تھا۔ اس وقت جو خوشی ہوئی تھی وہ بھی درحقیقت آج ہی کے دن کی تھی اور امید اختتام پر تھی، آج وہ پوری ہو کر سامنے آگئی، تو ابتداء اور انتہا دونوں کی خوشیاں جمع ہو گئیں۔

پس آج کے دن سے زیادہ خوشی کا دن کونسا ہو سکتا ہے کہ امیدیں بر آنے کا دن ہے۔

یہ خوشی سب کیلئے ہے

الحمد للہ! آج ہم بھی خوش ہیں کہ دو بچے کلام خداوندی کو لے کر ختم کرنے کے لئے سامنے آئے، جو ہمارے لئے خیر کی بات ہے، اور معلم کے لئے یوں خوشی کا دن ہے کہ اس کی محنت کا ثمرہ سامنے آیا، بچوں کے ماں باپ اور اولیا کے لئے یوں خوشی کا دن ہے کہ انہوں نے جو باغ لگایا تھا اور دو درخت نصب کئے تھے ان پر پھل آگیا، منتظمین اور معاونین کیلئے یوں خوشی کا دن ہے کہ ان کے تعاون اور نظم کا ثمرہ سامنے آیا، غرض بلا استثناء سب کیلئے یہ دن مبارک اور انتہائی خوشی کا مقام ہے، اور اس پر جتنی بھی خوشی کی جائے کم ہے، اور جتنی بھی اس کی تقریب منعقد کی جائے تھوڑی ہے۔

میں ان الفاظ کے ساتھ آپ سب حضرات کو، بالخصوص قاری صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں، شکر ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے اجر و ثواب کی آج انتہائی تکمیل کر دی اور نہ جانے اور کتنے اجر و ثواب انہیں اب تک مل چکے ہوں گے اور ان دو بچوں کے سوا کتنوں کو انہوں نے پڑھا کر تکمیل تک پہنچایا ہو گا۔

ابھی ہمارے قاری صاحب فرما رہے تھے کہ آپ کے ذریعے جن بچوں نے قرآن حفظ کیا ان کی تعداد اٹھانوے (۹۸) تک پہنچ چکی ہے، جو ہندو پاکستان میں تیار ہوئے، اور خدا ہی جانتا ہے کہ آگے اور کتنا عدد بڑھنا ہے، اور کتنے اجر و ثواب انہیں حاصل فرمانے ہیں۔

ثواب کی حرص

کوئی شبہ نہیں، قاری صاحب قابل رشک ہیں، گو فکر ان کی یہی ہے کہ ساری جنت پر وہ تنہا قبضہ کرنا

چاہتے ہیں، بخل اور حرص کی کوئی حد ہونی چاہئے، نہ یہ کہ ساری جنت گھیر لیں اور دوسروں کو جگہ نہ دیں، مگر بہر حال جنت میں جب ان جیسے لوگ جائیں گے تو ان کے دامن سے لگ کر بہت سے ہم جیسے بھی چلے جائیں گے، اس لئے فکر رفع ہو جاتی ہے، جب ایک مقبول ہوتا ہے تو ہزاروں کو مقبول بنا دیتا ہے۔

بہر حال یہ جلسہ ہر لحاظ سے خوشی اور مسرت کا جلسہ ہے، اور ایک مبارک تقریب ہے، جو دنیاوی تقریبات سے لاکھوں گنا بڑھ کر ہے، دنیوی جلسوں میں فرحت ہوتی ہے نفسانی، اور اس جلسہ کی فرحت ہے روحانی، اس واسطے اس کی عظمت و بلندی کی کوئی حد نہیں۔

دعا

اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے توفیق کو رفیق فرمائے اور ہم سب کا انجام بخیر فرمادے، اور یہ ملک پائندہ اور تابندہ رہے، جس سے حفاظ، علماء اور اہل دین برابر ابھرتے رہیں، اور اس کی حدود وسیع تر ہوتی رہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

تفسیر سورۂ ملک

(بعد از خطبۂ مسنونہ)

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.
تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ز وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ○ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ○ صدق اللہ العظیم.

بڑی برکت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے جس نے بنایا مرنا جینا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام اور وہ زبردست ہے بخشنے والا۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا ظہور ہے

پہلے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کارگزاری ہے وہ حق تعالیٰ شانہ کی صفاتِ کمال ہیں۔ ہر صفتِ کمال سے وہ جلوہ گر ہیں اور ہر صفت اپنا کام کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک صفت حق تعالیٰ کی ہے "مَلِكٌ" ہونا کہ وہ بادشاہ ہیں، جیسے وہ معبود ہیں، جیسے رحمٰن اور رحیم ہیں۔ اور جیسا کہ قدوس اور سلام اور مؤمن اور مُهَیمِن ہیں اسی طرح وہ ملک بھی ہیں بادشاہ بھی ہیں ساری کائنات کے۔ انکی جیسے اور صفات اس عالم میں جلوہ گر ہیں اپنی اپنی کارگزاری دکھلا رہی ہیں، اسی طرح سے صفتِ ملوکیت، بادشاہت کی صفت (ہے) جو کہ جلوہ گر ہے اس عالم میں، اور ذرہ ذرہ میں اللہ کی حکومت، حکمرانی اور بادشاہی نمایاں ہے اور اس سے ایک نظام قائم ہے، یہ نظام اجتماعی فطرتُ اللہ ہے۔ یعنی کائنات حق تعالیٰ نے جو بنائی اور اس کو چلایا یہ عیاذاً باللہ کوئی بدنظمی سے نہیں چل رہا بلکہ ایک نہایت ہی محکم نظام ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اس نظام کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے ایک چیز بھی اپنے نظم سے نہیں ہٹ سکتی۔ فرق اتنا ہے کہ ایک نظام تکوینی جس کا تعلق اللہ کے افعال سے ہے۔ یہ نظام اس قدر مستحکم ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں۔ مثلاً اس کائنات میں اللہ نے سورج پیدا فرمایا روشنی کے لئے اس کی ایک حرکت قائم رکھی اس حرکت سے رات اور دن بنتے ہیں اور پھر رات اور دن کے مجموعے سے مہینے بنتے ہیں اور مہینوں کی ایک خاص تعداد سے سال بنتے ہیں جس سے ہم سن اور مہینے اور دن اور گھنٹے متعین کرتے ہیں تاکہ ہمارے جتنے کاروبار ہیں یہ اس نظم کے اندر بندے رہیں اور ضبط وانتظام کے ساتھ ہماری زندگی گزرے۔ اس سورج کی حرکت میں اور دن اور رات بنانے میں کبھی کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا۔ یہ اللہ نے ایسی گھڑی بنائی ہے کہ جب سے اسے چابی دی ہے دوبارہ کبھی چابی دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی، نہ اس گھڑی کی بال کمانی کبھی بگڑتی ہے نہ کبھی اس میں

مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ گھٹاور بڑھادیں ایک سلسلے کے ساتھ نظام عالم چل رہا ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ط وَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ

"نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ کوئی جلدی کر بیٹھے چاند کو جاپکڑے۔نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ ذرا آگے تو بڑھ کر دن پہ قبضہ کرلے۔

دن اپنے وقت پہ آرہا ہے رات اپنے وقت پہ۔ پھران رات اور دن سے یہ زمانہ بن رہا ہے موسم بن رہے ہیں یہ موسم اپنی اپنی جگہ سب محکم اور استوار ہیں، گرمی اپنے وقت پہ آئے گی سردی اپنے وقت پہ۔ برسات اپنے وقت پہ، پھر ہر موسم سے متعلق جو پھل اور پھول اور دانے ہیں وہ اپنے ہی وقت پہ نکل رہے ہیں۔ بہت سے پھل ہیں جو کہ برسات کے ہیں، بہت سے ہیں جو سردیوں میں پیدا ہوتے ہیں، بہت سے ہیں جو گرمیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اپنے وقت پر اگ رہے ہیں اور نکل رہے ہیں۔ لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

اسی طرح سے دن بنایا تاکہ ہمارے کاروبار چلیں، تو دن کی روشنی میں ہم اپنے کاروبار چلا رہے ہیں، تجارت کے، زراعت کے، کارخانے داری کے اور چونکہ انسان کی قوت محدود ہے اور وہ خرچ ہونے سے گھٹتی اور بڑھتی ہے اس لئے تعب اور تکان بھی پیدا ہوتا ہے کہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو رات کا وقت رکھا اور اس کو فرمایا: وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا "رات کو ہم نے سکون کا ذریعہ بنایا" کہ اس میں تھکے ماندے آرام کریں اور جو سو رہے ہیں وہ پھر اگلے دن کے لئے تازہ دم ہو کر کھڑے ہو جائیں اور اپنے کاروبار میں لگیں، تو رات کو سکون کے لئے رکھا۔ دن میں بھی پانچ چھ گھنٹے کام کر کے طبعاً آدمی تھک جاتا ہے تو وقتِ نہار، دن کا بیچ کا حصہ قیلولہ کے لئے رکھا اور اسے سنت قرار دیا گیا۔

دوپہر بارہ بجے سونے سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے:

بلکہ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ دن کے بارہ بجے جب آدمی سوتا ہے تو اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے آج تمدن میں بارہ بجے کا قیلولہ ہی باقی نہیں۔ آج ٹھیک بارہ اور ایک بجے کھانا کھاتے ہیں ظہر کے وقت، پھر قیلولہ کا وقت تو گزر جاتا ہے کھانے کے انتظار میں اور کھانے کا وقت آتا ہے تو اس کا اثر کام پر پڑتا ہے۔ ظہر اور عصر کے درمیان جو کام کر سکتے ہیں اس میں فرق پڑے گا۔ تو غرض جو کھانے کا وقت تھا وہ انتظار میں گزرا جو کام کا وقت تھا وہ کھانے میں گزرا اور اس کے بعد جو آگے کام کا وقت تھا یا بے کاری میں گزرا یا تعب اور تکان میں گزرا، اس واسطے روایت میں فرمادیا کہ بارہ بجے کا وقت ہے سکون کا، اور اس میں آدمی دس بیس منٹ آدھ گھنٹہ بھی اگر قیلولہ کرلے تو نشاط پیدا ہو جاتا ہے طبیعت میں۔ اور وہ جو ایک پسماندگی سی پیدا ہو جاتی ہے تھکن و تعب وہ نکل جاتا ہے۔ پھر آدمی بقیہ آدھے دن کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو گویا رات رکھی سکون کے

لئے اور دن میں بارہ بجے کا وقت رکھا سکون کے لئے۔

دن ورات کی تقسیم:

پھر تین حصوں پر منقسم کر دیا کہ دو حصے دن کے ہیں وہ کاروبار کے لئے، بیچ کا حصہ سکون کے لئے اور رات پوری سکون کے لئے اس رات میں پھر واجب نہیں فرمایا، مگر افضلیت اس کی بیان کی، استحباب بیان کیا کہ تہجد پڑھے آدمی تاکہ رات بھی دو حصوں میں منقسم ہو جائے۔ ایک حصہ سکون و آرام کا، ایک حصہ طاعت و عبادت کا اور وہ طاعت وعبادت کا جو رات میں وقت رکھا گیا وہ سب سے زیادہ مقبول وقت ہے۔

آخری تہائی رات میں اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر اترتے ہیں، انکا اترنا کیسا ہوتا ہے؟

حدیث میں فرمادیا ہے کہ آخری تہائی رات میں حق تعالیٰ شانہٗ اترتے ہیں آسمانِ دنیا پر، جیسا اترنا ان کی شان کے لائق ہے۔ وہ اترنا اس طرح کا نہیں ہے کہ جیسے ہم اوپر کے مالے سے نیچے کے مالے میں آ جائیں۔ درجہ بہ درجہ سیڑھی بہ سیڑھی اترتے ہیں۔ یہ اجسام کے متعلق ہے حق تعالیٰ شانہٗ پاک ہیں جسم سے وہ بری وبالا ہیں اس لئے ان کا اترنا انہی کی شان کے مطابق ہے۔ اترنے کا لفظ حقیقت پر محمول ہوگا، لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس کیفیت سے اترتے ہیں، جیسی ان کی جنابِ قدوس ہے اسی انداز کا ان کا اترنا بھی ثابت رہا ہے ہم کیفیت نہیں بیان کر سکتے۔ اتنا ہم جانتے ہیں دنیا میں کہ بہت سی چیزوں کی طرف اترنے کی نسبت کی جاتی ہے، مگر ہر ایک کا اترنا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے اگر آپ یوں کہیں کہ میں پانچویں مالے سے اترا اور نچلے مالے پہ آیا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک سیڑھی جس پر درجہ بہ درجہ آپ اترتے ہیں، لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ میرے دل میں ایک مضمون اتر آیا تو کیا وہاں مضمون کے لئے بھی سیڑھی لگائی گئی؟ مضمون ایک لطیف چیز ہے۔ معنوی چیز ہے اس معنوی چیز کے اترنے کا طریقہ بھی معنوی ہے، وہ جسمانی نہیں ہو سکتا، جسم اترتے ہیں جسمانی سیڑھیوں سے اور معنویات اترتی ہیں معنوی انداز سے۔ آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی، اتر آئی تو وہ کوئی کسی سیڑھی سے نہیں اتری وہ اپنی شان کے مطابق اتری ہے، جیسے محبت ایک معنوی چیز ہے۔ ویسے ہی اس کا زینہ بھی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وہ ہے کہ جسم سے بھی بری اور پاک اور جس کو آپ روح کہتے ہیں اس سے بھی بری اور پاک۔ روح بھی ان کی پیدا کی ہوئی ہے اور جسم بھی ان کا پیدا کیا ہوا ہے کہ روح اور جسم دونوں محدود چیزیں ہیں اور ہر محدود چیز کچھ نہ کچھ مرکب ہوتی ہے اور مرکب چیز حادث ہوتی ہے، اور حق تعالیٰ شانہٗ ترکیب سے بھی بری ہیں۔ مرکب ہونے سے بھی بری، مجرد ہونے سے بھی بری

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○

ان کی کوئی مثال نہیں کہ بیان کی جا سکے اس لئے کہ مثال جو بھی دے گا ان کے سوا وہ مخلوق ہوگی اور خالق اور مخلوق میں زمین اور آسمان سے بھی لاکھوں گنا زیادہ فرق ہے تو ان کی مثل تو کوئی نہیں ہو سکتا، مثال

البتہ ہو سکتی ہے، لیکن اگر کچھ سمجھا جائے مگر وہ مثال بھی محض فہم کے قریب لانے کے لئے بولی جاتی ہے، مثال پوری طرح ان پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر مثل سے ہر مثال سے بری ہیں۔ تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات مُنَزَّہ اور مُقَدَّس ہے، ان کا اترنا آسمانِ دنیا پر ان ہی کی شان کے مطابق ہے جس کو ہم نہیں جانتے، نہ ہم اس کیفیت کو بیان کر سکتے ہیں، لیکن حاصل یہ کہ اترتے ہیں اور پھر یہی نہیں کہ اتر آتے ہیں آسمانِ دنیا پر بلکہ انتہائی رحمت اور شفقت سے۔

اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر اتر کر سوال کرتے ہیں:

حدیث میں ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلانا بھی انہی کی شان کے لائق ہے جیسا ان کی جناب کے مناسب ہے اور فرمایا کہ دونوں ہاتھ کھول کر پھیلا کر فرماتے ہیں کہ

اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَالَّذِیْ یَطْلُبُ مِنْهُ "میں بادشاہ ہوں کوئی ہے مانگنے والا مجھ سے" اَنَا الرَّازِقُ مَنْ ذَالَّذِیْ یَسْتَرْزِقُ مِنْهُ "رزق دینے والا ہوں کوئی ہے رزق کا طلب گار" اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَغْفِرُ مِنْهُ "میں بخشنے والا ہوں، کوئی ہے بخشش مانگنے والا۔

پھر خود فرمایا کرتے ہیں کہ مانگو مجھ سے اور گویا جھنجھوڑتے ہیں سونے والوں کو کہ کوئی ہے مانگنے والا کوئی ہے پکارنے والا۔ پھر ایک تو یہ کہ بادشاہ کی ڈیوڑھی پر آپ خود حاضر ہوں اور جا کر اطلاع کرائیں کہ حاضر ہونا چاہتے ہیں ممکن ہے اجازت ملے، ممکن ہے نہ ملے۔ محروم واپس آنا پڑے لیکن بادشاہ عالمین خود آتے ہیں اتر کر آپ کی طرف عرش عظیم سے اتر کر آسمان دنیا پر، اور یہ آسمانِ دنیا آپ کی چھت ہے یعنی اس دنیا کی اس کے اوپر اور آسمان ہیں، سب سے نیچے آسمان ہے آسمانِ دنیا، آسمانِ دنیا اس لئے کہلاتا ہے کہ دنیا کی چھت ہے تو گویا آپ کے مکان کی چھت پر آ کر آواز دیتے ہیں کہ سونے والو کوئی ہے مانگنے والا

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں

تو ایک تو یہ کہ ہم سوال کریں تو کچھ عطا فرمائیں وہ خود سوال فرماتے ہیں کہ کوئی مانگنے والا ہو تو مانگے، ہم دینے کے لئے آگئے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اگر کوئی مانگے گا تو وہ سوال اور دعا خالی نہیں جا سکتی، رائیگاں نہیں جائیگی، کیونکہ بادشاہ کہہ کر دعا منگوا رہے ہیں آپ سے، سوال کرا رہے ہیں آپ سے، خود سوال کرائیں پھر محروم کر دیں اسے عقل قبول نہیں کرتی اس واسطے یہ وقت خاص مقبولیت کا ہوتا ہے۔ اس وقت جو مانگا جائے ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حکیم ہیں حکمت کے مطابق عطا فرماتے ہیں:

باقی کوئی آدمی امتحان لینے کے لئے جائے اللہ میاں کا کہ اچھا میں مانگ رہا ہوں تو کل کو آٹھ بج کر پانچ منٹ پر مجھے مل جانا چاہئے تو وہ آپ کے پابند نہیں ہیں۔ وہ جیسے دینے والے ہیں ویسے ہی حکیم بھی ہیں

حکمت کے تحت دیتے ہیں۔ اگر حکمت کا تقاضا ہے کہ فوراً دیدیا جائے فوراً منہ مانگی مراد مل جائے گی۔ اگر حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ وقفہ کیا جائے تو وقفہ لگتا ہے۔ اس میں اور اگر حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ چیز نہ دی جائے جو آپ مانگ رہے ہیں اسے کوئی بڑی چیز دے دی جائے تو پھر وہ دے دیتے ہیں اور بعد میں آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا، کیسی قبولیت کا وقت تھا میں تو یہی مانگ رہا تھا مجھے تو اس سے زیادہ مل گئی۔ میں تو پھول مانگنے گیا تھا مجھے پورا باغ ہی مل گیا۔ میں ایک ٹکڑا مانگتا تھا وہاں پوری روٹیوں کا دستر خوان ہی مل گیا۔ تو کبھی فوراً منہ مانگی مراد ملتی ہے کبھی دیر لگتی ہے اور دیر سے ملتی ہے کبھی دیر لگتی ہے وہ چیز نہیں ملتی جو مانگی گئی تھی اس سے بڑھ کر ملتی ہے۔ یہ حکمت کے تحت ہوتا ہے آپ اپنے نفع نقصان کو نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے آپ کے نفع نقصان کو، وہ دیتا ہے مگر آپ کی مصلحت دیکھ کر۔

اب یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک باپ لکھ پتی ہو اور بیٹا اس سے یوں کہے کہ مجھے سو روپے روزانہ جیب خرچ کے لئے آپ دیا کرو تو کبھی تو ایسا ہے کہ باپ نے محبت میں عنایت میں آکر فوراً مقرر کر دیا، روزانہ سو روپے ملنے لگے لڑکے کو، کبھی ایسا ہے کہ وہ مانگ رہا ہے مانگتے مانگتے دو مہینے گزر گئے، لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ بس جی باپ کے دل میں کوئی شفقت نہیں رہی میری طرف سے، نہ وہ محبت باقی رہ، مانگ رہا ہوں دو مہینے ہو گئے کچھ بھی نہیں ملتا۔ لیکن دو مہینے بعد اچانک باپ نے جاری کیا وہ سو روپے ماہوار وظیفہ، تو بیٹے نے کہا کہ میں تو دو مہینے سے مانگ رہا تھا دیا اب آپ نے۔ باپ کہتا ہے کہ بیوقوف تو جگر کی بیماری میں مبتلا تھا جگر بڑھا ہوا تھا، معدہ خراب تھا اگر میں سو روپے روز دیتا تو کھانے اڑانے میں لگتا اور بیماری بڑھ جاتی اس لئے میں نے روک لیا اور علاج کیا تیرا۔ بجائے اس کے کہ سو روپے میں اعلیٰ اعلیٰ چیزیں لے کر کھاتا میں نے کڑوی دوائیں پلانی شروع کیں۔ اب دو مہینے میں تیری صحت قابلِ اعتماد ہو گئی سو روپے چھوڑ کر تو دو سو روپے روز لیا کر تیرے ہی واسطے کما رہا ہوں میں، تو بیٹا ممنون ہو گا کہ واقعی میں اپنی نا تجربہ کاری سے نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہ نہ ملنا چاہئے مگر باپ جانتا تھا۔ اگر اس وقت دے دیتا تو میں ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا اب جبکہ مجھے صحت نصیب ہو گئی، اب اس نے دیا تو اب میں بھی اطمینان سے سو روپے خرچ کروں گا اور باپ کی خوشی کا باعث بھی ہو گا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے اور مانتے مانگتے ایک دو مہینے نہیں، چار پانچ نہیں، دس برس گزر گئے اور بیٹے کے دل میں یقین ہو گیا کہ باپ کے دل میں کوئی شفقت باقی نہیں ہے، کروڑ پتی ہے اگر دو سو روپے روزانہ بھی دے تب بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر نہیں دیتا، معلوم ہوا بخیل ہو گیا۔ لیکن دس برس کے بعد باپ نے پچاس ہزار روپے کی تھیلی بھر کر رکھ دی اور یہ کہا کہ تو جا کر جیب میں ڈال۔ اگر میں تجھے سو روپے دو سو روپے روز دیتا تو کھانے اڑانے میں خرچ کر دیتا، مال ضائع ہوتا اور تیری عادتیں بگڑ جاتیں پھر فضول خرچی کا عادی ہو جاتا تو عمر بھر یہ لت نہ چھوٹتی۔ اب اس دس برس کے اندر تجھے تجربہ پیدا ہو گیا، نفع نقصان کی خبر ہو گئی۔ اس واسطے پچاس ہزار دیتا ہوں، تجارت کر لے سو چھوڑ تو

تو پانچ سو روپے کمالے گا۔ تیرا اصل مال بھی باقی رہے گا اور نفع میں روزانہ سینکڑوں روپیہ تجھے ملے گا۔ یہ بہتر ہے یہ وہ بہتر ہے کہ سو روپے دو سو روپے روز دیتا اور تو ضایع کر دیتا تو بیٹا ممنون ہو گا کہ میں اپنی غلط فہمی سے سمجھ رہا تھا کہ باپ بخیل ہو گیا، مگر وہ تو انتہا سے زیادہ سخی ہے۔ میں اس برس دس برس میں اگر سو روپے روز لیتا تو اتنے بیٹھتے اور اب مجھے ایک لاکھ روپیہ مل گیا جو سو روپے روز میں نہ پڑتا یہ میرے نفع کے لئے ایسا کیا ہے، حق تعالیٰ شانہٗ بھی اسی طرح دیکھتے ہیں کہ اگر بندہ میں بُری عادتیں ہیں، گنہگاریاں ہیں، بدکاری کی عادت پڑی ہوئی ہے تو بعض دفعہ دولت دینے کے بجائے جو دی ہوئی ہے وہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ عیاشی میں مبتلا ہے تو مفلس ہو گیا اور مانگتا ہے باپ سے باپ نہیں دیتا، لیکن دو چار برس میں دھکے کھا کر عیاشیوں کے بُرے نتیجے سامنے آنے کے بعد اب اس پر منکشف ہوا کہ میں بُری زندگی گزار رہا تھا اس نے توبہ تلا کی، رستہ درست ہو گیا، اب باپ نے دینا شروع کر دیا کہ اب تیرے ہی لئے ہے جو کچھ ہے۔ مگر اس حالت میں تیرے لئے مضر تھا تو میرا مطلب یہ ہے کہ مانگنے کے بعد کبھی وہ فوراً مل جاتا ہے کبھی دیر لگتی ہے اور کبھی دیر کے باوجود وہ چیز نہیں ملتی اس سے بڑی مل جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمر بھر نہ ملی، مانگتا رہے آدمی عمر گزر گئی، لیکن جب انتقال کریگا تو حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اجر و ثواب کے عظیم ڈھیر اس کے سامنے لگے ہوئے ہوں گے۔ بیان کرے گا کہ اے اللہ! میں نے تو کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کا یہ نتیجہ ہوتا، فرمائیں گے کہ تو مانگتا تھا تو دعائیں کرتا تھا۔ تیری دعائیں ہم نے ذخیرہ کر رکھی تھیں تا کہ ہم اس وقت دیں تا کہ ابد الآباد تک تیرے لئے نفع کا باعث بنے، دنیا تو گزرنی تھی گزر گئی عیش سے گزارتا جب ختم ہو جاتی مصیبت سے گزاری جب ختم ہوئی، لیکن زندگی اصل یہ ہے ہم نے تیرا سرمایا اس زندگی کے لئے جمع رکھا تو اس وقت یہ کہے گا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے تو نے میری دعا اس وقت قبول نہ کی اب جا کر کی۔ وہاں میں ضائع کر دیتا اپنی عمر کو بھی اپنی دولت کو بھی اور یہاں میری عمر بھی دوامی بن گئی اور میری دولت بھی دوامی بن گئی۔

بلکہ حدیث میں ہے کہ بعض اہلِ مصیبت حسرت میں ہوں گے اس دن، اور جب ان کے سامنے اجر و ثواب کے ڈھیر آئیں گے مصیبتوں کے ثمرہ میں تو وہ کہیں گے کہ اے اللہ! اس سے بڑی بڑی مصیبتیں ہم پر کیوں نہیں نازل کیں آپ نے، اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ قینچیوں سے ہماری کھالیں کاٹی جاتیں جب تھوڑی مصیبتوں پر یہ اجر و ثواب مل رہا ہے تو بڑی مصیبتوں پر معلوم نہیں کیا ملتا، تو بعضوں کو حسرت ہو گی کہ مصیبت کم کیوں پڑی ہمارے اوپر، زیادہ کیوں نہ آئی۔ اس وقت قدر آئے گی کہ یہ مصائب بھی بڑی نعمتیں تھیں، یہ ذریعہ بنادی گئیں ہمارے لئے ترقی درجات کا، آخرت کے درست ہونے کا، تو غرض آدمی جب بھی مانگے مانگنے میں کسر نہ چھوڑے مگر امتحان نہ لے قدرت کا کہ دیکھوں مانگ رہا ہوں ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ امتحان لینا گستاخی اور بے ادبی ہے اس میں ایسا نہ ہو کہ سرے سے دعا ہی رائیگاں کر دی جائے کہ ہم

سنتے ہی نہیں ایسے لاأبالی شخص کی دعا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ

"جو لہو ولعب میں پڑے ہیں ان کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی، نہ سنی جاتی ہے، جو مانگ رہا ہے اللہ سے، تخیلات میں مبتلا ہے، نہ اخلاص ہے نہ صدق ہے نہ تضرع اور زاری اور ابتہال ہے کہ متوجہ ہوں، اسکی دعا قبول نہیں کی جاتی۔

دعا میں قیدیں نہیں لگانی چاہئیں:

اسی طرح سے وہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی جس میں قیدیں اور شرطیں لگائی جائیں کہ اسی وقت ملے، فلاں ہی دن ملے، فلاں موقع پر ملے، فلاں چیز ملے۔ سائل کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیٹھ کر متعین کرے کہ یہ چیز دیجیو یہ نہ دیجیو۔ یہ دعا مانگنا نہیں یہ تو مشورے دینا ہے اللہ میاں کو کہ جب آپ دیں تو فلاں چیز دیں جیسے حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے دعا مانگی کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ فِی الْجَنَّةِ

"یااللہ مجھے جنت میں سفید رنگ کا محل دیجیو، وائٹ ہال دیجیو جو بالکل سفید انڈا سا ہو۔

آپ نے فرمایا یہ کیا دعا ہے کہ اپنی طرف سے قیدیں لگا رہے ہو، سفید اور سرخ اور سبز۔ تم بنانے والے ہو جنت کے؟ تم بنانے والے ہو درجات کے؟ تمہارا مشورہ چلے گا وہاں؟ وہاں تو اگر ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو دنیا ومافیہا سے بہتر ہے تم قیدیں لگا رہے ہو تو وقت کی قید لگانا یہ کسی نوعیت کی قید لگانا یہ بے ادبی اور گستاخی ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت مانگے آدمی اور خوب الحاح سے مانگے۔ نیچا بن کے مانگے۔ اس اسطے کہ اگر یوں مانگنے لگے کہ

اللھم اغفرلی ان شئت اللھم اعطنی ان شئت

"یااللہ مجھے دے دیجئے اگر آپ چاہیں۔ میری مغفرت کر دیجئے اگر آپ چاہیں۔

تو یہ دعا مانگنا نہیں تو استغناء کا اظہار کرنا ہے سائل تو محتاج ہوتا ہے نہ کہ غنی آپ جب یوں کہہ رہے ں

اللھم اغفرلی ان شئت

"بخش دیں اگر آپ چاہیں"

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دل چاہے تو بخش دیں نہیں تو مجھے تو ضرورت ہی نہیں آپ کی مغفرت کی۔ اس میں استغناء نکلتا ہے کہ سائل بھی ہو آدمی اور مستغنی بھی بنے یہ تو اجتماع ضدین ہے۔ اس سطے دعا مانگنے میں سوائے عجز وانکسار کے، سوائے بندگی کے، ابتہال کے اور انتہائی زاری اور تضرع کے، نہ ئی قید ہو نہ کوئی شرط ہو بس مانگے آدمی، اور میں کہتا ہوں کچھ بھی نہ ملے، دعا مانگنے کی توفیق ملی۔ دعا بھی تو دت ہے۔ یہ تھوڑی چیز ملی کہ دعا منگوا دی گئی آدمی سے۔

دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا:

الدعاء مخ العبادة "دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا"

خیر بہر حال بات دور جا پڑے گی میں عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ آسمانِ دنیا پر اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا ہم دینے کے لئے تیار ہیں جو خوش قسمت ہیں اور اس وقت جاگتے ہوئے ہوتے ہیں، وہ مانگتے ہیں اور منہ مانگی مراد ملتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا

"اے لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً قبولیت کی ہوائیں چلتی ہیں تم سب ڈھونڈتے رہو، ایسا نہ کہ کہ وہ ہوا چلے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے سوتے رہو۔ ان اوقات کو ضائع نہ کرو، اور ضائع نہ جانے دو، بلکہ ٹوہ میں لگے رہو کونسا وقت مقبولیت کا ہے۔ تو کچھ ساعتیں ہوتی ہیں مقبولیت کی، کچھ اوقات ہوتے ہیں قبولیت کے، اس میں جب آدمی مانگتا ہے تو مانگنا بھی خود عبادت ہے، عظیم عبادت بنتا ہے اور ملتی بھی ہے منہ مانگی مراد، تو یہ کہہ کر وہاں آسمانِ دنیا پر اترتے ہیں کہ اَنَا الْمَلِكُ میں بادشاہ ہوں۔ یعنی آپ کسی رئیس سے مانگ لیں دو چار روپے دے دے گا۔ کسی بڑے جاگیر دار سے مانگ لیں۔ ممکن ہے سو پچاس ہزار دے دے لیکن بادشاہ وقت جو پورے ملک کا حاکم ہے اس سے اگر مانگیں اور وہ خود یوں کہے کہ بھلا مانگو مجھ سے تو اندازہ کیجئے کیا کچھ نہیں دے گا بادشاہ، اور بادشاہ بھی وہ جو عالموں کا بادشاہ ہو، بادشاہوں کا بادشاہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی کی کنجیاں ہوں وہ اگر یوں کہے کہ مانگو مجھ سے میں دوں گا تو پھر کیا کچھ نہیں ملے گا۔

روزہ کی ایک عظیم برکت اور فضیلت:

یہی وجہ ہے کہ یہ روزہ جو ہے اس کے جہاں اور ہزاروں فضائل اور برکات ہیں۔ من جملہ ان کے بڑی عظیم برکت اور فضیلت یہ بھی ہے روزے کی کہ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ:

الصوم لی وانا اجزی به

"روزہ میری چیز ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا"

یعنی اور اطاعتوں اور عبادتوں کا بدلہ تو ضابطہ کا ہے کہ ملائکہ کو حکم دیں گے تقسیم کردو ضابطہ کی اجرت۔ ایک عمل کے دس عمل ہوں تو دس گنا دے دی۔ لیکن روزے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ روزہ میرا اور میں خود ہی اس کا بدلہ دونگا۔ یعنی ملائکہ بیچ میں نہیں میں خود ہی عطا کروں گا۔ روزہ دار کو اس کا اجر اور اس کا ثواب، تو روزہ فرمایا کہ میرا ہے یہ اس واسطے فرمایا کہ اور عبادتوں میں امکان ہوتا ہے کہ آدمی دکھلاوے کے لئے کرے۔ نماز پڑھے یہ دکھلانے کو بڑا عابد زاہد آدمی ہے، زکوٰۃ دے یہ دکھلانے کے لئے بڑا سخی داتا ہے۔ لیکن روزے کی کوئی شکل ہی نہیں کہ دکھلائے وہ تو اللہ ہی کے لئے ہو سکتا ہے اور اگر روزہ رکھ کر کہتا پھرے آدمی کہ جناب میں روزہ دار ہوں تو بجائے عزت کے اور تذلیل ہو گی لوگ کہیں گے کہ بھئی کسی پر احسان کیا ہے جو روزہ رکھا جو ڈھول بھی پیٹتا پھر رہا ہے کہ میں نے روزہ رکھا تو جب تک آدمی زبان سے نہ

کہے روزے کا روزہ ہونا معلوم نہیں، زبان سے نہ کہے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا اور کہے گا تو اور رسوائی ہوگی اس لئے خواہ مخواہ دم بخود رہے گا۔ لیکن یہ ہے کہ روزہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا اور جب روزہ ظاہر نہیں ہو سکتا کسی کے آگے تو اس میں نہ ریاکاری کا دخل ہے نہ سناوے کا نہ دکھلاوے کا نہ شہرت کا۔ یہ تو خاص اللہ ہی کے لئے ہو سکتا ہے، تو چونکہ یہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے اس واسطے فرماتے ہیں کہ جب اس میں ریا کا دخل نہیں دکھلاوے کا دخل نہیں خالص میرے لئے ہے تو میں ہی اس کا اجر بھی دوں گا یہ ضابطہ کا اجر نہیں ہوگا۔ بادشاہ جب خود بانٹنے کے لئے بیٹھے وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے۔ آپ کی حیثیت کے مطابق نہیں اور اللہ کی جو شان ہے وہ لا محدود ہے تو پھر دے گا بھی اتنا کہ کوئی حد نہایت نہیں ہوگی اس کی۔ تو بانٹنا جب خود چاہیں اور فرمائیں کہ میری چیز ہے میں بانٹوں گا تو وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے۔ تو جب یہاں یہ فرمایا اخیر رات میں اتر کر کہ اَنَا الْمَلِكُ میں بادشاہ ہوں

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَدْعُنِیْ؟ ”کوئی ہے مانگنے والا؟“

تو مانگنے والا جب مانگے گا تو اپنی شان کے مطابق اسے دیں گے، آپ کی شان کے مطابق نہیں، آپ کتنا بھی مانگیں وہ محدود چیزیں ہونگی، وہ جو دیں گے وہ اپنی شان کے مطابق وہ لا محدود ہوں گی تو برکات کی کوئی انتہا نہیں رہے گی تو بہر حال بادشاہت کا تقاضا یہ ہے کہ سائل کو دیں ہر فریادی کی فریاد سنیں اور جب خود کہیں کہ میں سننے کے لئے موجود ہوں۔ کہو، تو پھر ظاہر بات ہے کہ کیا کچھ نہیں ملے گا۔

مظلوم کی بددُعا سے بچنا چاہیئے:

لیکن مظلوم کے بارے میں فرمادیا کہ

اتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب

”مظلوم کی بددُعا سے بچو، اس لئے کہ اس کی دعا میں اور اللہ میں کوئی بیچ میں فاصلہ نہیں ہوتا، کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی“۔

دعا سیدھی جاکر عرش سے ٹکراتی ہے، اور پھر اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں جب مظلوم جس پر ظلم ہو رہا ہے وہ ہاتھ اٹھا کر فریاد کرتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ

اَنْصُرُكَ وَلَوْ بَعْدَ حِیْنٍ

میں تیری مدد کروں گا، گھبرانا مت، مگر تھوڑا سا وقفہ لگے گا۔

حکمت کے تحت، مایوس مت ہو جانا کہ دیر لگ گئی۔ تھوڑی سی اور مظلومیت چلے گی، مگر پریشان مت ہونا میں تیری مدد کے لئے پہنچا۔ تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ مَلِكٌ ہیں۔

اس سورت میں ملوکیت کے تمام لوازمات ظاہر کئے گئے ہیں:

اور ملوکیت کے بہت سے لوازم ہیں۔ اس سورہ مبارکہ میں اللہ کی شہنشاہی بیان فرمائی گئی ہے۔ اس

شہنشاہی کے لوازم اور اس کے آثار اور اس کے طور اور طریقے یہ اس پوری سورت میں ظاہر فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں جب ہم نظام قائم کریں کوئی تو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق اس نظام کو چلائیں۔ اسلئے کہ حقیقی معنی میں حکمرانی اور شہنشاہت صرف اللہ کا حق انسان کو بادشاہت کرنے کا حق حاصل نہیں۔

اسلام میں ملوکیت کے بجائے خلافت رکھی گئی ہے:

اسی واسطے اسلام میں ملوکیت نہیں رکھی گئی خلافت رکھی گئی ہے خلافت کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اللہ تعالیٰ ہیں ان کا نائب بن کر ان کے قانون کو ہم چلا رہے ہیں۔ نظام ان کا ہے ان کے نظم کو ہم چلا رہے ہیں۔ بادشاہی ان کی ہے ہم اس کی ڈوڈی پیٹ رہے ہیں۔ دنیا میں راج کر رہے ہیں تو ہم خود بادشاہ نہیں ہیں۔ ہم خود صاحب اقتدار نہیں ہیں، اقتدار اللہ کا ہے اس کو چلانے کے لئے دنیا میں انسان بھیجا گیا ہے خلیفہ بنا کر ۔۔۔ سب سے زیادہ بغض اور عداوت اللہ کو جس نام سے ہے وہ ملک الاملاک ہے یعنی شہنشاہ کا کوئی لقب اپنے لئے رکھے۔ کنگ رکھے۔

یہ سب سے زیادہ مبغوض ہے اللہ کو اس لئے کہ یہ لقب تو اس کا ہے وہ ہے شہنشاہ، وہ ہے جہانوں کا بادشاہ، تو انسان کے لئے شہنشاہی اور بادشاہت نہیں رکھی گئی، عبادت اور بندگی رکھی گئی ہے اور بندگی یہ ہے کہ اس کے نظام کو چلائے اس کا آلہ کار بن کر، اس کا خادم بن کر، اسے خلیفہ کہیں گے۔ اسے نائب کہیں گے تو اس سورت میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی بادشاہی کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ اللہ کی شاہی کا نظام ارشاد فرمایا:

نظامِ بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف:

تو نظام بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف کہ بادشاہ کیسا ہونا چاہئے اور حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہیں تو ان کی شان کیا ہے بادشاہی کی، تو بادشاہی کے مناسب کون سی شان ہے۔ حق تعالیٰ کی کہ جس سے بادشاہت انہی کے لئے سزاوار ہے۔ دوسرے کے لئے نہیں۔ تو پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف اور کمالات کہ کس کمال کا ہونا چاہئے بادشاہ،

دوسری چیز ہے بادشاہت کے لوازمات:

دوسرے یہ کہ وہ بادشاہ جب ہے تو اس کی بادشاہت کے لوازم کیا ہیں؟ کون کون سی چیزیں لازم ہیں بادشاہت کے لئے کہ اس کے بغیر بادشاہت عالم اسباب میں نہیں چلتی۔

تیسری چیز ہے ان لوازم کے آثار:

تیسرے یہ ہوگا کہ ان لوازم کے آثار کیا ہیں بادشاہت کے۔ جس ملک میں بادشاہ بادشاہی کر رہا ہے تو اس کی بادشاہی کے آثار کیا پڑ رہے ہیں اچھے پڑ رہے ہیں یا بُرے پڑ رہے ہیں۔ مخلوق سکون و اطمینان سے ہے یا پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہے، کیا آثار پڑ رہے ہیں؟ ان آثار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ بادشاہت بہت اونچی ہے اس لئے کہ سکون اور اطمینان ہے ملک کے اندر، یا معاذ اللہ بادشاہت بہت خراب ہے اس لئے کہ

ملک میں تو بد نظمی پھیلی ہوئی ہے۔

بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تکمیلی ہے دوسرا تکوینی:

تو حق تعالیٰ شانہ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں وہ ایسا منتظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت کسی آن فرق نہیں۔ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں۔ پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ مرنے والے مر رہے ہیں تمام موسم اپنے وقت پر آرہے ہیں۔ سورج اپنے وقت پر نکل رہا ہے، چاند اپنے وقت پر، ہر ایک کا ایک وقت مقرر ہے، ذرہ برابر اس میں فرق نہیں، لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرابی پیدا کرتا ہے۔ اپنی بدکرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے، اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے، دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی تو فطرتِ انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی۔ جب ایک شخص یوں چاہے گا کہ میں بڑا بنوں اور دوسرے چھوٹے رہیں تو دباؤ میں آ کے قہر میں ممکن ہے بن جائیں چھوٹے لیکن دلوں میں نفرت ہوگی اسے حق کیا ہے ہمارے اوپر حکمرانی کرنے کا؟ جیسے ہم ویسا یہ ہمارے برابر کا ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ مجھے بادشاہ مانو تو گوارہ نہیں کرے گی مخلوق، کرے گی تو دباؤ میں، اور اگر یوں کہے کہ بھئی نہ میں بادشاہ نہ تو بادشاہ ہم سب کا بادشاہ اللہ ہے، قانون اس کا ہے میں تو چلانے والا ہوں۔ سب کے دلوں میں عظمت بیٹھ جائے گی تو اپنی جاہ پسندی اپنے اقتدار دوسری مخلوق پر لاد نہیں سکتے، لیکن زور دباؤ میں آ کے اپنا اقتدار چلاتے ہیں تو مخلوق فکر میں رہتی ہے کہ کوئی موقع پڑے تو اس کے اقتدار کو ختم کر دو پلٹ دو۔ اس نے پارٹیاں بنا لیں اس نے ایجی ٹیشن شروع کیا اس نے پبلک کو ہموار کیا، بغاوت پھیلائی تو یہ جو بد نظمی ملک میں ہوتی ہے اس کا سبب ہم ہیں، اللہ کی حکومت سبب نہیں جہاں بلا واسطہ اسکی حکومت ہے اس میں تل برابر فرق نہیں۔ جہاں حکومت تمہارے واسطے سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ تمہاری عزت قائم ہو اور وہاں ہم اپنی ذاتی عزت سمجھ کر اس نظام کو بگاڑتے ہیں۔ وہیں سے بد نظمی پیدا ہوتی ہے تو بد نظمی کا ذمہ دار دنیا میں انسان ہے حق تعالیٰ شانہ نہیں۔ ان کی بلا واسطہ بادشاہت میں ذرہ برابر فرق نہیں جہاں تمہیں واسطہ بنایا وہیں تم نے اپنی کدورتوں کو داخل کر دیا تو نظام بگڑ جاتا ہے اس لئے اس سورت میں اصول بیان فرمائے گئے ہیں کہ نظام عالم کن اصول پر چلنا چاہئے وہی اصول ہیں جو اللہ کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ انہی پر چلو گے تو تمہارا نظام درست رہے گا۔ ان سے ہٹو گے درست نہیں ہوگا۔ اس لئے پہلی چیز تو آتی ہے بادشاہ کے اوصاف۔

بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز لیاقت اور قابلیت کا ہونا ہے:

بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قابلیت اور لیاقت ہونی چاہئے کسی جاہل کو آپ بادشاہ بنا کر بٹھا دیں تو جاہل کی بادشاہت جاہلانہ ہی ہوگی اور ان جاہلانہ چیزوں کا اثر برا پڑے گا تو نظم کی بجائے بد نظمی

پھیل جائے گی تو بادشاہ کے اندر خود قابلیت اور کوئی کمال ہونا چاہئے کہ جس کی وجہ سے لوگ بھی جھکیں اس کے آگے اور اس کا کام بھی چلے۔

بادشاہ کی قابلیت اور کمال یہ ہے کہ وہ مجسم خیر ہونا چاہئے:

اور وہ یہ کہ "خیر" جو چیز ہے وہ بادشاہ کے اندر ہونی چاہئیے، اگر معاذ اللہ وہ شرور کا مجموعہ ہوا برائیوں کا، تو برائی پھیلے گی اس واسطے کہ مثل مشہور ہے کہ:

الناس علی دین ملوکھم

"جیسا راجہ ویسی پرجہ"

یعنی جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔ اگر بادشاہ ناہنجار ہے تو رعایا میں بھی ناہنجاری پیدا ہوگی۔ اگر بادشاہ کے اندر بھلائیاں ہیں تو رعایا میں بھی بھلائیاں پیدا ہوں گی۔ رعایا تو کوشش کرتی ہے کہ بادشاہ کے قریب تر چلے۔ "الناس علی دین ملوکھم"

قیصر جرمنی کی تقریر کے چند جملے:

جب یہ جنگِ عظیم جاری تھی تو قیصر جرمنی نے تقریر کی اور اس نے تقریر میں چند جملے کہے تھے۔ اس میں کہا تھا کہ "اگر دنیا سے تُرک مٹ جائیں تو شجاعت اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جہاں بھی بہادری پھیلی ہوئی ہے وہ ترکوں کی بہادری کا اثر ہے تو اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ، اور اگر جرمنی مٹ جائے تو سائنس کا خاتمہ ہو جائے گا۔" (اس زمانے میں اول نمبر پر جرمنی کا ملک تھا سائنسی ایجادات میں، امریکہ اب بنا ہے بعد میں، تو اس نے کہا کہ اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ اور اگر جرمنی مٹ جائے تو سائنس کا خاتمہ) اور اگر فرانس مٹ جائے تو عیاشی اور بے حیائی کا خاتمہ ہو جائے گا اور اگر انگریز دنیا سے مٹ جائیں تو ڈپلومیسی، مکاری، فریب بازی ان چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا" تو ہر حکمران قوم کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں اور جب وہ قوم حکومت کرتی ہے تو پبلک میں وہ خصوصیات پھیلتی ہیں اگر مکار بادشاہ ہے تو پوری قوم کے اندر مکر اور فریب اور چالاکی اور بے ایمانی اور دغل فسل یہ چیزیں پھیل جائیں گی اور اگر بادشاہ دیانتدار ہے۔ مُتدیّن ہے تو پوری رعایا نے اندر دیانتداری کا اثر ہوگا۔

سلیمان بن عبد الملک اُموی بادشاہ کا شوق:

خلفاء بنی امیہ میں سلیمان بن عبد الملک بہت بڑا اونچے درجے کا خلیفہ ہے اسے نکاح کرنے کا بہت شوق تھا، بہت جوان اور بڑا مضبوط تھا تو شرعی حدود میں رہتا نہیں (اگر چار سے زیادہ بیک وقت کرتا (لہذا) چار سے زیادہ تو کرتا نہیں تھا بیویاں، مگر چھ مہینے میں طلاق دی، مہر ادا کیا ایک اور سے کر لیا پھر پانچ مہینے اسے رکھا طلاق دی، پھر تیسری سے تو چھ سو نکاح کئے۔

گویا جائز عیاشی کہنا چاہئے۔ جو ایک مثل برابر ہے۔ قانون کے دائرے سے باہر نہیں سینکڑوں

ہزاروں نکاح کرڈالے تو اس زمانے میں امراء جب جمع ہوتے تھے کسی مجلس میں تو پوچھتا کہ آپ کتنے نکاح کر چکے ہیں؟اس نے کہا بیس؟ آپ نے کتنے کیے؟ میں پچاس کر چکا ہوں، تیسرے کہتے ہیں میں جناب ساٹھ نکاح کر چکا ہوں۔ایک صاحب کہتے ہیں میں نے سو نکاح کیے ہیں اب تک، تو اس زمانہ میں مابہ الفخر یہی چیز بن گئی تھی کہ کتنے نکاح کئے اس لئے بادشاہ کا طریقہ یہی تھا کہ دے نکاح پہ نکاح، دے نکاح پہ نکاح، تو رعیت کے اندر بھی یہی جذبہ پھیل گیا کہ یہ ہی کوئی بڑی شان و شوکت کی چیز ہے۔

خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مشغلہ:

عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ عادل ہیں۔اور تین سو نفلیں رات میں ثابت ہیں روزانہ ان کی، باقی ان حضرات کے اوقات میں اللہ برکت دیتا ہے۔دن بھر تو پبلک کی خدمت میں، مقدمات فیصل کرنے میں، ملک کی تحفظ میں، بقامیں اور رات کو تین سو نفلیں بھی تو کس وقت سوتے ہوں گے، معلوم ہوتا ہے چوبیس گھنٹے عبادت میں ہی گزارتے ہیں تو تین سو نفلیں رات میں ثابت ہیں اس زمانے میں امرا میں فخر کی بات کیا تھی جب کسی مجلس میں جمع ہوئے، آپ رات کتنی نفلیں پڑھتے ہیں۔انہوں نے کہا بیس، آپ کے پڑھتے ہیں، میں تو چالیس پڑھتا ہوں، تیسرا کہتا ہے میں پچاس نفلیں پڑھتا ہوں، میں سو نفلیں پڑھتا ہوں تو فخر کی بات یہ ہوگئی تھی کہ نفلیں زیادہ پڑھی جائیں تو ایک اصول ہے۔ جیسا راجہ ویسی پرجہ جیسا بادشاہ ویسی رعیت

"الناس علیٰ دین ملو کھم"

ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہوں گے تو وہاں تو شر اور برائی کا نشان بھی نہیں

الخير كله منك واليك والشر ليس اليك

"ساری خیر و برکت تو اس کی ہے جہاں بھی خیر ہے وہ اس کی ہے، شر اس کے پاس پھٹک نہیں سکتی"۔

نہ اس کی ذات میں ہے نہ باہر کی شر وہاں تک جاسکتی ہے۔وہ بُری ہے ہر شر سے تو جب خیر مطلق بادشاہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ عالم میں خیر پھیلے گی تو پہلی چیز یہ ہے کہ بادشاہ کے اندر خیر کا غلبہ ہونا چاہئے اور جب اللہ بادشاہ ہے تو وہاں خیر ہی خیر ہے۔وہاں شر کا نشان ہی کوئی نہیں، پھر وہ خیر ایسی ہونی چاہئے کہ اپنی ذات ہی تک محدود نہ رہے بلکہ وہ نکل کر دوسروں تک بھی پہنچے اپنی ذات ہی تک محدود نہ رہے۔ بلکہ وہ نکل کر دوسروں تک بھی پہنچے اگر اپنی ذات سے بہت باخیر ہے ایک شخص، مگر دوسروں کو اس کی خیر سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو دوسروں کے حق میں ہونا نہ ہونا برابر ہوا، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی خیر یہ ہے کہ پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے، ذرے ذرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے اس لئے کہ بنانے والے تو وہ ہیں، وجود دیا اس میں خیر پھیلی ہوئی ہے اس لئے کہ بنانے والے تو وہ ہیں، وجود انہوں نے دیا اور وجود ہی سرچشمہ ہے ساری خیر و برکت کا تو جس کو وجود دیا اس میں خیر پھیلی ہوئی ہے تو اللہ کی خیر ایسی ہے کہ خود اس کی ذات بھرپور ہے خیر

ہے، اور ذرے ذرے پر خیر اسکی پھیل رہی ہے، اسی کا نام ہے شریعت کی اصلاح میں "برکت"

برکت کسے کہتے ہیں؟:

برکت کہتے ہیں کہ کسی چیز کی خاصیت بھلائی تو اس میں ہو اور وہ پھیل کر دوسروں تک پہنچے تو کہیں گے وہ شے مبارک ہے اگر اس میں خیر نہ ہو یا اس میں کوئی اچھا خاصہ نہ ہو اور وہ دوسروں تک نہ جائے تو کہیں گے خیر و برکت کی بات نہیں۔ پانی ہے مثلاً اس کی خاصیت ہے ٹھنڈک اس لئے کہ ٹھنڈا خود بھی ہے، دوسروں کے دلوں میں بھی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، اگر پانی پئیں اور ٹھنڈک نہ پہنچے تو کہیں گے کہ منحوس پانی ہے، برکت والا پانی وہ ہے کہ خود بھی ٹھنڈک ہے اس میں اور دوسروں کو بھی پہنچ رہی ہے۔ ہوا کے اندر خیر یہ ہے کہ اس میں رطوبت ہے اور خیر یہ ہے کہ جہاں جہاں ہوا پہنچتی ہے رطوبت پہنچتی ہے۔ اگر ہوا چلے اور رطوبت کے بجائے خشکی پھیل جائے، خشک سالی پھیل جائے کہیں گے بڑی منحوس ہوا چلی اپنی خاصیت نہ دکھلائی اس نے، تو جس شے میں خیر چھپی ہوئی ہو اور وہ خیر دوسروں تک پہنچ رہی ہو اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو اس کو کہتے ہیں "برکت" اس کو ظاہر فرمایا گیا کہ:

تبارك الذی بیده الملك

"برکت والی ذات ہے اللہ کی۔

یعنی وہ وہ ذات ہے کہ ہر خیر اس ہی میں ہے اور اس کی ہر خیر اس کی مخلوق کو پہنچ رہی ہے تو معلوم ہوا کہ برکت کی ذات ہے، اگر ساری خیر اس میں ہوتی اور مخلوق کو نہ ملتی خیر تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ برکت والی ذات، جو خود بھی خیر سے بھرپور اور دوسروں کو خیر پہنچ رہی ہو مبارک ذات، خیر میں مثلاً علم میں بہت بڑا کمال تو حق تعالیٰ شانہٗ سرچشمہ ہیں علوم کا اور اس نے ذرے ذرے کے اندر علم دیا ہے اپنی اپنی بساط کے مطابق، تو برکت والی ذات ہے جو خود بھی علم سے بھرپور اور عالم کے ذرے ذرے میں اس کی شان کے مطابق علم بھیج دیا۔ عمل ہے تو خود بھی اس کی صناعی بے غبار اور بے داغ۔

صنع الله الذی اتقن كل شیٔ

"اللہ کی صفت اتنی مضبوط ہے کہ اس میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی عیب نکال دے۔"

آسمان کو جیسا بنایا بس ویسا ہی بننا چاہئے نہ کمی ہے نہ زیادتی، زمین کو جتنا بنایا ویسی ہی بننی چاہئے تھی نہ کمی نہ زیادتی۔ زمین اور آسمان کے اندر جتنا فصل ہے اتنا ہی رہنا چاہئے تھا اس سے کم ہو تب بھی مضر تھا زیادہ ہو تب بھی مضر۔ تو ہر چیز اپنے اپنے موقع پر فٹ اور اپنی اپنی مقدار پہ جسکو فرماتے ہیں کہ:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ

"ہر چیز کے خزانے ہمارے ہاں بے انتہا ہیں، مگر ہم اتارتے ہیں علم میں ایک مقدار و اندازے کے مطابق، جس کا تحمل کر سکے کائنات اتنا ہی دیتے ہیں۔

تو روشنی لا محدود ہے مگر سورج کو اتنی دی جتنا وہ برداشت کر سکے، اس کے ذریعے سے ہم تک اتنی پہنچائی کہ ہم تحمل کر سکیں۔ اگر اتنی تیز روشنی دیتے کہ ہر وقت چندھیائے رہتے لوگ اور بینائیاں زائل ہو جاتیں تو کہتے کہ سورج برکت والا نہیں یہ تو نحوست ہے، بینائیاں چھن گئیں تو اتنی روشنی دی کہ جس کو وہ تحمل کرے اور جس کو ہم برداشت کریں۔ چاند میں اتنی ٹھنڈک دی کہ جتنی اس کے مناسب تھی اور اتنی ہم تک پہنچائی کہ جس کو ہم برداشت کریں تو خیر بھی ہے اور خیر پھیل بھی رہی ہے اور اس خیر میں اضافہ بھی ہے۔ مخلوق آ رہی ہے اور جا رہی ہے، مگر خیر میں کمی نہیں ہے ایک دوسرے کو دوسرے سے تیسرے کو، تو علم کی خیر، صنعت کی خیر، عمل کی خیر، اخلاق کی خیر یہ ساری چیزیں پھیل رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہی ذات بادشاہت کے لئے مناسب اور موزوں ہو سکتی ہے جو ہر خیر سے بھرپور ہو۔ علم ہے تو لا محدود، صنعت ہے تو لا محدود، اخلاقی کمالات ہیں تو لا محدود، برکات ہیں تو لا محدود تو مُبارک حقیقت میں اللہ کی ذات ہے جس میں اس کا کچھ اثر آ جائے گا اسے کہیں گے برکت والا ہو گیا مبارک ہو گیا۔ دن میں ایک چیز اچھی ڈال دی تو کہا جاتا ہے بڑا مبارک دن ہے آج، اس میں تو بڑی بھلائیاں پہنچیں مخلوق کو، رات میں جو کوئی بھلائی نکل آئے، کوئی اچھا واقعہ پیش آئے تو کہا کرتے ہیں بھئی بڑی مبارک رات تھی آج کی دیکھو کیسا واقعہ پیش آیا، تو مبارک وہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے اندر خود بھی خیر ہو اور وہ خیر دوسروں کو پہنچے اور اس میں گھٹنا نہ ہو بلکہ بڑھنا ہو، اضافہ ہی اضافہ ہو، اس کو "برکت" کہتے ہیں۔

اللہ کی ذات چونکہ برکتوں سے بھرپور ہے اس لئے بادشاہت کے لائق وہی ہے:

تو جب اللہ کی ذات برکتوں سے بھرپور ہے تو بادشاہت کے لائق بھی وہی ہے اور کوئی بادشاہت کے لائق نہیں اگر ہو سکتا ہے تو اس کا نائب بننے کے لائق۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کو مبارک بنایا۔ ان کے علم میں برکت، ان کے اخلاق میں برکت، ان کے افعال میں برکت، وہ کھانا سامنے رکھ دیں اس میں برکت کہ ایک کا دو کو، دو کا دس کو کافی ہو جائے۔ برکت ہی برکت ہے وہ نائب بننے کے لائق ہیں بادشاہ انہیں بھی نہیں بنایا۔ یوں فرمایا کہ بادشاہت ہماری ہے ہماری نیابت میں یہ حکمرانی کریں گے تو بادشاہ کے لئے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ خیر سے بھرپور ہو، ارادے بھی اس کے نیک ہوں، نیت بد نہ ہو، علم بھی اس کا صحیح ہو غلط نہ ہو، اخلاق بھی اس کے اونچے ہوں گھٹیلوے نہ ہوں، افعال بھی اس کے صحیح ہوں بے قاعدہ اور بد نظمی لئے ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہا جائے گا کہ وہ بابرکت ہے تو فرماتے ہیں تبارك مبارک اللہ کی ذات چونکہ ساری خیر اس میں ہے۔ ساری خیر پہنچ رہی ہے اور خیر میں اضافہ ہے، کوئی کمی نہیں ہے تو پہلی چیز تو گئی کہ بادشاہ کے لئے شرط تھی کہ اس کی ذات بھرپور ہو خیر سے، اس میں برائی کا نشان نہ ہو تو تبارک کے لفظ سے تو اپنی ذات کی نوعیت بیان فرمائی کہ برکت والی ہے اور برکت کہتے اسے ہیں کہ ہر خیر جمع ہو اور دوسروں تک پہنچے۔

بادشاہ کے لئے دوسری ضروری چیز ملک پر اس کا قبضہ ہونا ہے:

دوسری چیز بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ جس ملک میں حکمرانی کرے وہ قبضہ میں ہو اور جو قبضہ ہی سے باہر نکلا ہوا ہو یعنی حکام کے ہاتھ میں نہیں بد نظمی پھیل رہی ہے۔ بھاؤ غلط ہو رہے ہیں دغل فسل ہو رہا ہے تجارت میں، رشوتیں لی جا رہی ہیں اور حکومت کو قابو حاصل نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ اس کے قبضہ میں نہیں ہے۔ زبردستی لیا قبضہ میں مگر چلا نہیں سکی حکومت اپنے قبضے کو، ہاتھ پلے کچھ پڑا نہیں، نہ پبلک کے ہاتھ پلے پڑا نہ بادشاہ کے ہاتھ پلے پڑا اور یوں ڈگر اپنا چل رہا ہے تو چلتا رہا، لیکن حقیقتاً جسے قابو میں آنا کہتے ہیں وہ وہ ہے کہ حکام کی گرفت ہو اس پر ذرا ادھر ادھر نہ ہٹ سکے اور تھوڑا ہٹے تو بادشاہ کا علم وسیع ہے تو وہ فوراً دارو گیر کرتا ہے۔ اور سب سنبھل جاتے ہیں تو بادشاہ کے لئے علم کی وسعت اور قبضے اور اقتدار کی وسعت ہونی چاہئے۔ اگر ملک قابو میں نہ آئے تو ظاہر بات ہے کہ حکومت نہیں چل سکتی اور چلے گی تو ظلم اور امور کی حکومت ہوگی بد نظمی کی حکومت ہوگی تو پہلی شرط یہ ہے کہ بادشاہ باخبر ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا قبضہ صحیح ہو، قابو سے نکلی ہوئی نہ ہو بات۔

شاہجہان کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ:

کہتے ہیں کہ جب شاہجہاں بادشاہ نے ولیعہد بنانا چاہا تو دو بیٹے تھے ایک اورنگ زیب اور ایک دار اشکوہ تو دار اشکوہ کے لئے شاہ جہان کا خیال تھا کہ وہ بڑا بھی ہے اورنگ زیب سے اور باوجاہت بھی اور ملکہ بھی یہی چاہتی تھی کہ دار اشکوہ بادشاہ بنے ہندوستان کا اور عام پبلک کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے کہ یہی ولیعہد ہونا چاہئے لیکن وزیر اعظم کی رائے یہ تھی کہ اورنگ زیب ہے بادشاہت کے لائق، دار اشکوہ بادشاہت کے لائق نہیں ہے، سنبھال نہیں سکے گا ملک کو اس کے قلب میں اتنی جان نہیں۔ بہر حال یہ چل رہا تھا قصہ تو وزیر اعظم نے امتحان لیا کہ دونوں کا امتحان کراؤں اور ساتھ میں ایک پارٹی کو لیا تا کہ جو امتحان ہو سب کے سامنے آجائے تو اس نے سب سے پہلے دار اشکوہ کے یہاں اطلاع کرائی کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ دار اشکوہ نے استقبال کا سامان کیا، ملک کا وزیر اعظم آرہا ہے تو بڑے حشم خدم کے ساتھ اور بڑی آؤ بھگت کے ساتھ وزیر اعظم کو بلایا اور اس کی شان کے مطابق عالی شان اس کا استقبال کیا اور مسند بچھائی اور اپنے برابر اس کو بٹھایا قریب کیا، خیر وزیر اعظم بیٹھ گیا۔ اب وزیر اعظم نے کچھ سوالات کرنے شروع کئے کہ دکن میں چاولوں کا کیا بھاؤ ہے؟ تو دار اشکوہ جواب نہ دے سکا، بنگال میں کیا بھاؤ ہے؟ پتہ نہیں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ کچھ پتہ نہیں مگر تعظیم و تکریم بہت کی۔ خیر وزیر اعظم وہاں سے واپس آیا۔ اس کے بعد اطلاع کرائی اورنگ زیب کے یہاں کہ میں آنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا آجاؤ۔ اورنگ زیب نے کوئی استقبال کا سامان نہ کیا جیسا اس کا مکان تھا ویسے ہی بیٹھے رہے بلکہ اور ذرا لاابالی پن میں سر در پھیلا کر بیٹھ گئے۔ وزیر اعظم آئے تو بہت استغناء تھا، کوئی تعظیم تکریم خاص نہیں اس واسطے کہ جانتے تھے اورنگ زیب امتحان لینے آرہا ہے تو ممتحن

کی آؤ بھگت کے معنی تملق اور خوشامد کے ہوتے کہ میں ہوں تو نہیں اس قابل مگر پاس کر دینا نمبر دے دینا۔ اورنگ زیب چونکہ خود علم رکھتا تھا ملک کے تمام اطراف و جوانب کا اس لئے اس میں استغنا تھا اور استغناء کے ہوتے ہوئے ضرورت نہیں کہ تملق اور خوشامد کرے تو بہت استغناء سے بیٹھا۔ وزیر اعظم آئے تو خاص تکریم نہیں کی کہا السلام علیکم! وعلیکم السلام! بیٹھ جاؤ، اب اس نے پوچھنا شروع کیا۔ تو اس نے چار ہی سوال کئے اور نگ زیب نے پورے ملک کی حقیقت بتلادی کہ فلاں جگہ یہ بھاؤ ہے۔ فلاں جگہ حکام بد نظمی میں مبتلا ہیں اور فلاں جگہ عدل و انصاف ہو رہا ہے۔ فلاں حاکم کی ذہنیت ایسی اور وہ ذرا سی ذہنیت کا، الغرض پورے ملک کا ایک نقشہ کھینچ دیا اب یہ بیچارا وزیر اعظم جسے خود اتنی معلومات نہیں تھیں جتنا اس شہزادہ کو معلومات تھیں آیا شاہ جہان کے پاس، شاہ جہان نے پوچھا کیا اثر لے کر آئے اس نے کہا اورنگ زیب ہو بادشاہ اور اللہ ہی کا چاہا پورا ہوگا اس کے بعد حالات سنائے، تو بات وہی تھی کہ جو قابو پا سکے ملک پر وہی بادشاہ بنانے کے لائق ہے اور قابو وہ پائے گا جس کا علم صحیح ہو۔ علم کے وسائل صحیح ہوں کہ کہاں کیا چیز گزر رہی ہے؟ رعایا میں بے چینی ہے، بد نظمی ہے، سکون ہے امن ہے بدامنی ہے ظلم تو نہیں کر رہے حکام، تاجروں کو دیکھا جائے کہ بلیک میں تو مبتلا نہیں ہیں، نفع خوری میں تو مبتلا نہیں ہیں، حکام رشوت ستانی میں تو مبتلا نہیں۔ تمام چیزوں کی اطلاع ہو اور علم ہونے کے بعد قدرت اور قوت بھی حاصل ہو کہ طاقت سے ان کو ہٹایا جا سکے برائی سے۔ اگر قبضے میں ہی نہیں ملک تو حکومت نہیں چل سکتی اس لئے حق تعالیٰ نے پہلی تو اپنی ذات کی شان فرمائی تبارک مبارک ذات ہے جس میں ہر خیر جمع ہے ہر خیر کا سرچشمہ ہے اور اس سے خیر پھیل رہی ہے اور دوسری شان یہ ہے کہ: الذی بیده الملك "اس کے ہاتھ میں ہے ملک"

ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں چل سکتا۔ ممکن نہیں کہ اس کی منشاء کے خلاف کوئی چل جائے۔ ٹھیک ٹھیک اس کی منشاء پر چلے گا۔ جو قضاء و قدر اس نے کر دی ہے دنیا پابند ہے اس کی، کائنات پابند ہے سارے جان مل کر اسی کے ارد گرد گھومیں۔

بادشاہ کے لئے تیسری چیز اقتدار حاصل ہونا ہے:

اور تیسری چیز فرمائی کہ:

وهو علی کل شیئ قدیر

ہر چیز پر وہ قادر ہے اور جب قدرت اسے ہر چیز پر حاصل ہے

اقتدار ہر چیز پر حاصل ہے تو با اقتدار کے آگے چوں نہیں کر سکتا کوئی اسے تو ڈر ہوگا کہ کہیں مجھے معزول نہ کر دے تو تین وصف بیان فرمائے ایک برکت اور ایک قبضہ اور ایک چیز اقتدار تو یہ تین چیزیں انتہائی ضروری ہوتی ہیں حکومت کے لئے۔ یہ لامحدود طریق پر اسی کی ذات میں موجود ہیں تو بادشاہت کے لائق بھی اسی کی ذات ہے۔

سورہ ملک کا نام مانعہ اور منجیہ بھی ہے:

میں نے کل عرض کیا تھا کہ یہ سورہ ملک جس کی تفسیر شروع کی گئی ہے۔ اس سورۃ کا نام سورۃ مانعہ اور سورۂ منجیہ بھی ہے۔ مانعہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ منع کرتی ہے عذاب قبر سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قبر بیت ظلمت ہے اندھیریوں کا گھرانہ ہے۔ یہاں تاریکی کے سوا کسی اور چیز کا نشان نہیں اور سورۂ تبارک الذی یہ روشنی ہے قبر کی، یا اس کا پڑھنے والا قبر کی روشنی مہیا کرتا ہے۔ اسی واسطے حضور ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ سوتے وقت آپ تبارک الذی اور الم سجدۃ یہ دونوں سورتیں پابندی کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں سورتیں روشنی ہیں قبر کی۔ اس لئے اس سورہ کا نام رکھا گیا "مانعہ" یعنی مانعت ظلمت، تاریکیوں کو دفع کرنے والی اور قبر میں اندھیری کوٹھڑی کو ایک روشن میدان بنا دینے والی۔ اس وجہ سے بھی کہ اس کی تلاوت کا خاصہ ہے نورانی طبع تو گویا تاریک قبر روشن ہو جائے گی اس کی تاثیر سے، اس کا نام سورۂ ملک بھی ہے جس میں اللہ کی حکومت کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں اور اللہ کی حکومت لامحدود ہے، سارے جہانوں میں اسی کی حکومت ہے۔

حکومت کے اندر پھیلاؤ اور وسعت داخل ہے:

تو ملک کی اندر وسعت داخل ہے ملک کہتے ہی اس کو ہیں کہ پھیلا ہوا ہو، پھیلا ہوا نہیں ہوگا تو اسے صوبے کی حکمرانی اور ریاست کہیں گے اور تنگ ہو جائے گی تو اسے ضلع کی حکومت کہیں گے اور تنگ ہو جائے گی اسے قصبے کی حکومت کہیں گے اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قبیلے کی حکومت کہیں گے اور زیادہ تنگ ہو جائے گی تو اسے گھر کی حکومت کہیں گے تو حکمرانیوں میں ملک کی حکومت سب سے زیادہ وسیع ہے اور اللہ کا ملک ہی ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے جہاں غیر اللہ کی حکمرانی ہے، وہ (بھی) سب اسی کا ملک ہے اس لئے اسکی وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں اس ملک میں عالم دنیا بھی داخل ہے۔

دنیا کسے کہتے ہیں:

اور دنیا کہتے ہیں دنی کو یعنی خسیس اور ذلیل کو۔ تو سب سے زیادہ ذلیل عالم یہ ہے۔ اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

ان الدنیا لا تزن عند اللہ جناح بعوضۃ

پوری دنیا مل کر اللہ کے یہاں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتی جیسے مچھر کی ایک ٹانگ ہوتی ہے، تو یہ بے وقعت عالم ہے۔

اللہ کی قدرت کا کمال:

یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس بے وقعت عالم میں ایسے افراد پیدا کئے کہ وہ سارے جہانوں پر بڑھ جائیں گے اپنے کمالات کے سبب سے، تو اللہ نے اپنی قدرت کے لئے اس دنیا کو بنایا، اظہارِ قدرت کے لئے اگر انسان کو پیدا کرتے اور وہ فرشتوں میں رہتا تو وہاں اگر نورانیت ہوتی تو زیادہ عزیز بات نہ سمجھی جاتی۔ اس لئے

کہ فرشتے بھی نورانی ہیں، ان کا ملک بھی نورانی، وہ خود ایمانی ملک ہے، وہاں کفر کی کھپت ہی نہیں، وہاں غلاظت نہیں، نجاست نہیں، صاف ستھرا ملک ہے، پاک صاف، تو اس میں رہ کر اگر انسان ترقی کرتا تو قدرت کا پوری طرح سے نمونہ ظاہر نہ ہوتا، لیکن لاکر رکھا انسان کو اس جہان میں کہ یہ گندگیوں کا عالم ہے۔ ہر طرف نجاست حتی کہ انسان کی پیدائش بھی نجاست سے، اسی گندے قطرے سے پھر اس گندے قطرے کو پرورش دیتے ہیں نو مہینے تک ایک گندے عالم میں جسے رحم مادر کہتے ہیں جو ماسوائے حیض اور گندے پانی کے اور کچھ نہیں، غذا انسان کی وہ گندی، حیض کا خون بند ہو جاتا ہے وہ غذا بنتا ہے یا اس کے اجزاء بنتے ہیں بنی آدم کے، نہایت ہی ظلمانی عالم ہے نہ اس میں روشنی ہے نہ چمک سوائے اندھیروں کے اور پھر اندھیریوں میں بھی تین اندھیریاں فرمائی گئیں۔

يَخْلُقُكُمْ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِىْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ

انسان کی تخلیق مرحلہ وار اور تین اندھیریوں میں ہوئی ہے:

تمہیں ہم نے پیدا کیا ہے ماں کے پیٹ میں دور بہ دور یعنی مختلف دور آئے ہیں تمہاری خلقت میں۔ کبھی انسان قطرہ ہے، بنص حدیث چالیس دن کے بعد خون کی بوند بن گیا پھر چالیس دن گزرے تو مضغہ گوشت بن گیا پھر چالیس دن گزرے تو اس میں ہڈیاں پہنادی گئیں، پھر چالیس دن گزرے تو کھال پہنادی گئی اس کے بعد روح ڈالی جاتی ہے تو پیدائش بھی گندے قطرے سے، غذا بھی گندی مکان بھی گندا اور وہ مکان بھی اندھیرا اور اندھیریاں بھی تین، ایک اندھیری کوٹھڑی کہ ماں کا پیٹ ہے اس میں کوئی چمک نہیں، کوئی نورانیت نہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے جس کو رحم مادر کہتے ہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ تنگ اور تاریک، اور اس میں پھر ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے وہ ہے مشیمہ وہ جھلی جس میں لگتا ہوا بچہ پیدا ہوتا ہے اور دایہ اس کو کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے تو ماں کا پیٹ اس میں رحم مادر، رحم مادر میں وہ مشیمہ جھلی، تو تین اندھیری کوٹھڑیوں میں انسان کو بنایا اور گندے قطرے سے بنایا اور گندی غذا سے بنایا۔ اس گندے انسان کو جب پاک بنایا تو اتنا پاک بنایا کہ فرشتوں سے بھی بازی لے گیا تو اس میں اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انسان کو جنت ہی میں رکھتے اور وہیں ترقی دیتے تو کوئی زیادہ کمال نہ سمجھا جاتا۔ ایک پاک عالم، نورانی عالم اس میں اگر نورانی مخلوق بن گئی تو بننا کوئی تعجب انگیز نہیں۔ عجیب چیز یہ ہے کہ ظلمتوں میں گندگیوں میں سے پاکباز انسان نکالا، تو اس سے خدا کی قدرت کا نمود ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کو لاکر رکھا دنیا میں کہ دنیا میں خود گندگی، کھانا پینا اور بول اور براز اور نجاسات اور گندگی اس سب کے اندر رہ کر پھر انسان بنتا ہے پاکباز تو اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے تو ملک حق تعالیٰ کا یہ ساری کائنات ہے۔

کائنات میں دنیا سب سے کم تر عالم ہے اس سے اوپر بڑے بڑے عالم ہیں:

اس میں کم تر عالم یہ دنیا ہے۔ اس سے بڑے بڑے عالم ہیں۔ ع

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

ایک ایک ستارے کو دیکھو سورج کو دیکھو آج کل کی تحقیق کے مطابق چار کروڑ گنا بڑا ہے زمین سے یعنی چار کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں اس میں اور یہ چھوٹا ستارہ ہے اور بڑے بڑے ستارے تو ان گنت ہیں۔ان کی بڑائیوں کی کوئی انتہا نہیں پھر ان کے اوپر آسمان ہیں سات، ان کے اوپر جنتیں ہیں ۱۰۰، ان کے اوپر پھر عظیم الشان دریا ہے کہ جس کی ایک ایک موج پورے آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہوتی ہے اس کے اوپر عرش عظیم ہے اور کرسی ہے تو حق تعالیٰ بادشاہ ہیں اور شہنشاہ ہیں، فقط ایک ملک کے نہیں ہفت اقلیم کے نہیں صرف دنیا جہاں کے نہیں بلکہ کروڑوں جہانوں کے بادشاہ ہیں اور اتنی بڑی بادشاہت کہ کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا بغیر ان کی مشیت کے اور ان کے حکم کے اور اذن کے، تو ملک کے اندر وسعت داخل ہے اللہ کے ملک میں تو کوئی حد نہیں وسعت کی، تو اس سورۂ ملک میں کیونکہ اللہ کے ملک کی وسعت بیان کی گئی ہے اس واسطے اس میں خاصیت یہ ہے کہ یہ وسیع بھی کر دیتی ہے قبر کو، یہ قبر کو اتنا وسیع بنا دیتی ہے کہ حدیث میں فرمایا کہ:

"مومن جب سوال و جواب میں پورا اترتا ہے تو اس کی قبر وسیع کی جاتی ہے۔ اتنی وسیع کہ تاحد نظر وہ میدان ہی میدان نظر آتا ہے۔ باغ و بہار"۔

تو تنگ جگہ کو اتنا وسیع بنا دیا کہ حد نظر تک وہ وسعت محسوس ہوتی ہے اور حد نظر حسی تو یہ ہے کہ آدمی جب لیٹتا ہے تو ایک دم اس کی نگاہ آسمان تک پہنچ جاتی ہے یہ آسمان ہو نہ ہو اس کے اوپر ہو آسمان بہر حال وسعت نظر اتنی ہے کہ وہاں تک پہنچتی ہے۔ یہ حسی نظر ہے اور وہاں کی نظر ہوتی ہے روحانی جو اس سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی ہوگی تو قبر کو اتنا بڑا عالم بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے تو گویا اس سورت کو "مانعہ" کہا گیا ہے کہ وہ روکتی ہے ظلمت کو اور اتنی نور اتنی نورانیت پیدا کرتی ہے کہ تاحد نظر نور ہی نور نظر آتا ہے تو "مانعہ" اس بناء پر فرمایا گیا ہے اور اس سورۃ کا دوسرا نام "منجیہ" یعنی نجات دینے والی تو عذاب قبر سے بھی نجات دیتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ بائیں طرف سے عذاب آتا ہے تو روکتی ہے۔ دائیں طرف سے آتا ہے تو روکتی ہے اور اوپر سے نیچے سے غرض چہار طرف سے یہ روکتی ہے، تو نجات دے دیتی ہے بندے کو عذاب قبر سے، تنگی سے نجات دی، ظلمت سے نجات دی، عذاب سے نجات دی، اس واسطے اس کا نام منجیہ بھی ہے۔

اس سورۃ کا نام ملک کیوں رکھا گیا:

اور ملک اس واسطے اس کا نام ہے کہ اللہ کی شہنشاہی کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں اسی انداز سے ہم نظام قائم کریں اور خلیفۃ اللہ بن کر اللہ کی حکومت کو دنیا میں پھیلائیں اس واسطے اس کا نام ملک ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ملک میں سب سے پہلی چیز جو آتی ہے وہ ہے بادشاہ کی ذات، اس کے بعد آتی

ہیں بادشاہ کی صفات، اس کے بعد آتے ہیں بادشاہ کے افعال اور اسکے بعد آتے ہیں افعال کے اثرات کہ اس سے ملک میں کیا اثرات پھیلے اس کی حکومت کے، اس میں سب سے پہلے تو اللہ کی ذات کو بیان کیا گیا۔ "تبارک" کے لفظ سے کہ بڑی مبارک ذات ہے، برکت والی ذات ہے برکت کے معنی میں نے یہ عرض کیے تھے کہ ساری خیر کا مجموعہ اور پھیلنے والی خیر، تو خود ذات بادشاہ ہے خیر کا منبع اور سر چشمہ اور اس سے خیر پھیلتی ہے تو جہانوں میں پھیل رہی ہے، ولادتیں ہو رہی ہیں۔ حیات ہو رہی ہے زندگی ہو رہی ہے۔ زندوں میں سے زندہ پیدا ہو رہے ہیں۔ انسان میں سے انسان۔ پھر انسان کی ضرورت کے لئے جانور بنائے تو جانور میں سے ایک جانور اس میں سے دوسرا اس میں سے تیسرا تیسرے سے چوتھا، لاکھوں کروڑوں، اربوں، کھربوں درخت بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جمادات کو دیکھو کہ پہاڑ ہیں۔ پہاڑوں میں پتھر ہیں۔ پتھر بڑھ بڑھ کر پہاڑ بن گئے ہیں۔ ریتہ جمع ہوا وہ پہاڑ ہو گیا۔ پہاڑوں میں سے پہاڑ نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ تو برکت والے ہونے کا یہ مطلب کہ بادشاہ عالمین کی ذات بھی بابرکت کہ ہر خیر کا مجموعہ اور سر چشمہ اور اس برکت کے آثار اتنے کہ برکت در برکت در برکت پھیلتی چلی آ رہی ہے ملک بھر میں برکات کا ظہور ہے تو اللہ کی ذات یعنی بادشاہ بحیثیت ملک اور بادشاہ ہونے کے اس کی شان یہ ہے کہ وہ خیر کا سر چشمہ اور پھیلنے والی خیر ہے اسی کو کہتے ہیں "برکت" کہ خود ذات میں بھی خیر ہو اور وہ پھیلے اتنی کہ کوئی انتہا نہ ہو تو اللہ سے زیادہ مبارک کس کی ذات ہے؟ برکت والی کس کی ذات ہے؟ تو فرمایا تبارک بڑی برکت والی ذات ہے جدھر دیکھو برکت پھیل رہی ہے پھر فرمایا کہ الذی بیدہ الملک اس کی ذات وہ ہے جس کے قبضے میں ہے ملک اور ملک چھوٹا موٹا نہیں کروڑوں اربوں کھربوں جہان ہیں اور ان کی یہ شاخ در شاخ برکات سب اس کے قبضے میں ہیں کہ کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا کہ جب تک اس کی مشیت نہ ہو تو قبضے کا یہ عالم ہے ملک کے اوپر، پھر نظامِ حکومت بھی ہے کہ جو چیز جس طرح بنادی وہ اسی محور پر گھوم رہی ہے، سورج ہے چاند ہے، زمین ہے اپنے ایک مرکز کے اردگرد سارے اس کے افعال چکر کھا رہے ہیں، حرکت کر رہے ہیں تو بیدہ الملک۔ ساری چیزیں اس کے قبضے میں ہیں۔ نظام اس کے قبضے میں ہے ظاہر بات ہے کہ جب نظام پر قابو ہے بادشاہ کا تو ذرہ نہیں ہل سکتا اس کی مملکت کتنی پر امن ہوگی۔ کتنی بابرکت ہوگی۔

نظامِ عالم میں بے برکتی کیوں ہوتی ہے؟:

اب جو بے برکتی پیدا ہوتی ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ جہاں انسان کا دخل آ گیا ہے (اسے حکم تو دیا گیا تھا) کہ ہمارے نمونہ پر چل، وہ اپنی حرص و ہوا سے کہیں اپنا ذاتی اقتدار چاہتا ہے تو اللہ کے اقتدار کو بھول کر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرتا ہے۔ اس کی طاقت کو فراموش کر کے اپنی طاقت پر غرہ کرتا ہے جب وہ اپنی طاقت پر غرہ کرے گا، دعویٰ کرے گا دوسرے اس کے مخالف بنیں گے تو ملک میں بد نظمی پھیلے گی۔ اگر وہ اپنی جاہ چاہے گا تو ہر انسان جاہ پرست ہے، وہ بھی جاہ کی طرف چلے گا اگر دو نگاہیں...... جمع ہوں گی تو ہو ٹکرائیں گی۔ ایک

دوسرے کو گرانا چاہے گا وہیں سے فتنہ وفساد پھیلے گا، تو جہاں پر حق تعالیٰ کی تکوینی حکومت ہے اس میں کوئی بد نظمی نہیں، ہر چیز اپنے محور پر چل رہی ہے اور جہاں تکمیلی چیز آئی جس میں انسان کو واسطہ بنایا تو اگر اسنا درست ہے، پاکیزہ، تب تو اللہ کے نظام کو چلائیں گے۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام (ہیں) کہ ذرہ برابر ان کے دلوں میں اپنی ذات کا اقتدار نہیں ہوتا، حالانکہ اللہ نے انہیں سب سے زیادہ بااقتدر بنایا ہے، اپنی ذات کے بارے میں انبیاء کو جاہ پسندی کا خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے جو انبیاء کے بلاواسطہ متبعین ہیں صحابہ کرامؓ وہ بھی اس انداز پر اللہ کی حکومت کو چلاتے ہیں کہ ان میں نہ جاہ پسندی ہے، نہ مال پسندی ہے نہ محبت مال کی، نہ محبت جاہ کی فقط جاہ ہے تو اللہ کی سامنے ہے، ملک ہے تو اللہ کے سامنے ہے، اپنے کو خدم کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ انکے دل میں قطعاً نفسانیت کے وسوسے نہیں ہوتے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔

حضرت عمرؓ کا تنہائی میں اپنے آپ کو خطاب کرنا:

حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے کہ تنہائی میں ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی سامنے ہو کہ دکھلانے کو کہہ رہے ہوں، تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ حیرت سے بیٹھے ہوئے ہیں اپنے کو خطاب کر کے

بَخٍ بَخٍ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ اَصْبَحْتَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ

"حیرت ہے اے عمر تو امیر المومنین، تیری بھی یہ قابلیت ہے کہ تو خلیفہ بنایا جائے (امیر المومنین بنایا جائے)۔

اس درجہ بے نفسی ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر حیرت میں ہیں کہ مجھے کس طرح خلیفہ بنادیا۔ مجھ میں تو یہ لیاقت نہیں تھی، تو ان لوگوں کے قلوب اتنے پاک اور صاف ہیں کہ سلطنت اتنی بڑی کہ سلاطین عالم کانپتے ہیں حضرت عمر کا نام لے کر اور خود حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھو تو ان کے دل میں خطرہ بھی نہیں کہ میں کوئی چیز ہوں۔ حیرت سے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ تو امیر المومنین؟

حضرت ابو بکرؓ کے تزکیہ قلب کا عالم:

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر المومنین ہیں اور خلیفہ رسول ہیں بلاواسطہ، لیکن قلب کی صفائی اور تزکیہ کا یہ عالم ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی زبان باہر نکالکر ایک ہاتھ سے پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے اسے لکڑیاں مارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں:

هٰذِهٖ اَوْرَدَنِی الْمَوَارِدْ

یہ زبان ہے جس نے مجھے مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے۔

مصائب میں پھینکا، اور ہلاکتوں میں ڈالا خدا جانے میری زبان کیا بکواس کرتی ہو۔ کیا چیزیں کہتی ہو، میرے عمل نہ کہیں ضائع ہو جائیں۔ اس درجہ بے نفسی کا عالم ہے کہ زبان پر اعتماد نہیں کہ کوئی کلمہ خلاف شرع نہ نکل جائے، کوئی جھوٹ نہ نکل جائے تو زبان کو لکڑیاں مار رہے ہیں۔

حضرت علیؓ کا اپنی قمیص کاٹنا:

حضرت علیؓ ایک دن مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس دن کچھ ذرا سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، کپڑا کوئی کمخواب کا نہیں تھا، کوئی اعلیٰ نہیں تھا، یہی معمولی زمینداروں کے کپڑے، بیٹھے بیٹھے ایک دم گھبرا کر فرمایا کہ قینچی لے کر آؤ۔ قینچی لائی گئی تو ایک آستین یہاں سے کاٹ دی، اور ایک یہاں سے کاٹ دی بدہئیت بنادیا کرتے کو، لوگوں کو حیرت ہوئی عرض کیا کہ امیر المومنین ایک اچھے خاصے کرتے کو آپ نے خراب کر دیا؟ بدہئیت بنادیا۔ اگر آستین برابر برابر کاٹ دیتے تو چلو نیم آستین ہی کا کرتا ہو جاتا ایک ہئیت تو رہتی۔ ایک کو تو مونڈھے پہ سے کاٹ دیا، ایک کو آدھے سے کاٹ دیا، فائدہ کیا ہوا؟ فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی کپڑا پہن کر اترانے لگتا ہے تو غضب خداوندی اس پر اترتا ہے اور منڈلانے لگتا ہے۔ اگر تو بہ نہ کی تو غضب آپڑتا ہے توبہ کی تو غضب واپس ہو جاتا ہے تو یہ کپڑا پہن کر میرے دل میں وسوسہ گزرا اتراہٹ کا کہ میں بھی کوئی چیز ہوں۔ میں نے دیکھا کہ غضب الٰہی آرہا ہے اوپر اس لئے میں نے گھبرا کر قینچی منگوائی بدہئیت بنایا جس سے میرے قلب کا وسوسہ دور ہو گیا اور غضب خداوندی اوپر واپس ہو گیا تو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے نفس کے بارے میں انہیں خطرہ بھی نہ گزرے کہ ہم کوئی چیز ہیں وہ تو اللہ ہی کی حکومت چلائیں گے، اپنی حکومت نہیں چلائیں گے۔ نہ جاہ کے خطرات ہوں نہ مال کی محبت ہو۔

حضرت علیؓ نے ایک دفعہ مال و دولت کو دیکھ کر فرمایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن خزانے میں تشریف لے گئے تو ڈھیر لگے ہوئے تھے سونے اور چاندی کے، خراج کی رقمیں اور جزیہ کی رقمیں بھری ہوئی تھیں تو دیکھ کر فرمایا:

یا دنیا غُرّی غیری

دھوکا کسی اور دینا اے دنیا تم ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں۔

ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں نہ ہم اتراہٹ میں آنے والے ہیں نہ کبر و رعونت میں تو جن لوگوں کے قلوب اتنے صاف تھے کہ نہ محبت مال کا نشان، نہ محبت جاہ کا نشان، وہی اہل اور احق تھے کہ اللہ کے نائب بنیں اور اس کی حکومت کو چلائیں۔ تو جہاں تکمیلی حکومت یعنی انسانوں کے واسطے سے حکومت ہے۔ اگر ایسے انسان ہوں تو وہ حکومت پاکباز ہے۔ اس حکومت میں امن ہے، امان ہے، برکات ہیں، خیر ہے، ساری چیزیں ہیں، لیکن اگر دوسری قسم کے انسان آجائیں جو اللہ کے اقتدار کو چھوڑ کر اپنا ذاتی اقتدار چاہیں۔ بجائے بندگی کرنے کے خدائی شروع کر دیں، مال کی محبت میں غرق ہوں اور خود غرضی کی وجہ سے مال جمع کرنے کی فکر میں ہوں تو رعایا کا ناس ہوگا۔ ظاہر ہے ملک کے اندر بد نظمی پیدا ہوگی، تو یہ بد نظمی اللہ کی حکومت میں نہیں ہے۔ اس نے اپنی حکومت میں جب واسطہ بنایا انسان کو تو اس انسان نے بد نظمی پھیلائی۔ جب تک کہ وہ انسان رہے کہ جو غیر محب جاہ اور غیر محبّ مال تھے جنہوں نے خالص اللہ کی حکومت پر کاٹی

دنیا میں، اور جب ایسے آ گئے جن کے قلوب صاف نہیں تھے، نہ مال کی محبت سے بری تھے، نہ جاہ کی محبت سے، وہیں آ کر خرابی واقع ہوئی تو بتلا دیا اللہ نے کہ حکومت تو ہماری ہے، مگر کوئی اس کو ڈھنگ سے چلاتا ہے اور کوئی بے ڈھنگے پن سے چلاتا ہے، مگر چلوائیں گے تمہارے ہاتھ سے تاکہ نظام تمہارے ہاتھوں قائم ہو۔ اگر ہمارے ہاتھ سے نظام رہے تمہارا واسطہ نہ ہو تو انسان مجبور محض ظاہر ہوگا۔ کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اگر مجھے اپنی خلافت ونیابت دیتے تو میں یوں چلا کے دکھلاتا، مگر اب نہیں کہہ سکتا، ہم بتلائیں گے کہ جنہوں نے چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں اور جنہوں نے نہیں چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں۔ یہ مستحق ہیں ہماری رحمت کے اور یہ مستحق ہیں ہمارے عذاب کے تو ایک بلاواسطہ حکومت الٰہی ہے وہ اعلیٰ ترین نظم رکھتی ہے۔ ایک بالواسطہ ہے تو واسطے جیسے ہوں گے ویسی حکومت بنے گی، مگر اصول اختیار کرنے پڑیں گے انہیں وہی جو اللہ کی حکومت کے ہیں، اس لئے اس سورۂ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کے اصول بیان فرمائے ہیں کہ شہنشاہی کس طرح چلتی ہے۔

بادشاہ کون ہونا چاہئے ؟:

تو پہلے ذات کو بیان کیا کہ بادشاہ وہ ہونا چاہئے کہ جو خیر کا سرچشمہ ہو۔ نیت بھی پاک ہو، علم بھی اعلیٰ ہو، عمل بھی صاف ہو، اخلاق بھی بلند ہوں، اس کے اندر سخاوت بھی ہو اور عدل بھی ہو، سخاوت میں آ کر فضول خرچی میں نہ آئے۔ عدل اس کی روک تھام کرے۔ اور عدل میں آ کر بخل نہ داخل ہو، ہر چیز اپنے محل پر ہو تو بادشاہ کے اوصاف میں یہ ہے کہ بخیل نہ ہو، اگر بخیل ہوگا تو رعایا تنگ ہو جائے گی، سخی ہوگا تو رعایا کے اندر مُرَفَّهُ الْحالی پیدا ہوگی، مگر اس کے ساتھ عدل ہو، کیونکہ اگر ظلم کیساتھ سخاوت ہو تو جانبداری کرے گا بادشاہ، ایک طبقے کو دے گا اور ایک کو محروم کرے گا، ملک میں بدنظمی پیدا ہوگی، لیکن اگر عدل ہے سخاوت کے سات تو سب کو برابر برابر ملے گا۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔

اولاد کے بارے میں عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے ماں باپ کے لئے:

"اولاد کے اندر سخاوت کرو، مگر عدل کے ساتھ، سب کو برابر برابر دو، ایک نظر سے دیکھو۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ محبت تو ساری اولاد سے طبعاً ہوتی ہے انسان کو، مگر ایک سے کچھ زیادہ پیار ہوتا ہے دوسرے سے نہیں، غیر اختیاری طور پر، لیکن معاملہ کرنے میں چاہئے مساوات کہ جتنا ایک کو دے اتنا ہی دوسرے کو۔ اگر برابری نہ رکھی تو ان میں باہم لڑائی اور منافقت پیدا ہوگی اور پھر دونوں مل کر باپ کے مدمقابل آئیں گے تو گھر کی حکومت میں بدامنی پیدا ہو جائے گی، بدنظمی پیدا ہوگی اس لئے بادشاہ کو چاہئے کہ سخی بھی ہو اعلیٰ درجے کا اور ساتھ ہی عادل بھی ہو اعلیٰ درجے کا۔

بادشاہ میں سخاوت وعدل کے ساتھ تدبر وشجاعت بھی ہونی چاہئے:

سخاوت میں اسراف سے عدل روکتا ہے اور عدل کی برکت سے سخاوت اپنے اصل محور پر چلتی ہے۔

اسی کے ساتھ بادشاہ میں دو چیزیں اور ضروری ہیں ایک تدبر اور ایک شجاعت، بہادر بھی ہو، قلب کا جری بھی ہو، اگر بادشاہ بزدل ہو گیا تو پھر وہ غالب نہیں آسکتا کسی پر۔ اس میں وہ عناصر ابھر جائیں گے کہ جو ظلم ہیں اور فسادی ہیں۔ انہی کا غلبہ ہو گا، اور حیادار بچارے پیچھے رہ جائیں گے، لیکن اگر بادشاہ کے اندر تدبر ہے تو وہ اپنی تدبیر سے سب کو یکساں قائم رکھے گا اپنی جگہ، ساتھ میں شجاعت اور بہادری بھی ہو، بزدل نہ ہو، اگر بزدل ہو گا تو دشمن راستہ دیکھ لے گا ملک کا اور مدافعت کی قوت نہیں ہو گی تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا، تو چار چیزیں لازمی ہیں بادشاہ کے لئے ایک تو سخاوت اور ایک عدل اور ایک شجاعت اور ایک تدبر۔ یہ چار چیزیں جمع ہوں گی تب بادشاہی صحیح اصول پر چلے گی تو ان چاروں کے مجموعہ کو کہا گیا ہے برکت اور خیر تو تبارك الذی الله برکت والی چیز ہے کہ ہر چیز حد کمال پر ہے اور نہ صرف حد کمال پر بلکہ وہی سر چشمہ تمام خیر و برکت کا۔ دوسروں کو ملتی ہے تو اسی سے ملتی ہے اور بیده الملك قبضے میں ہے ملک اسکے، ہاتھ کے نیچے ہے کہ ایک ذرہ بھی ادھر ادھر نہیں ہل سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرت بھی ہے کہ

وھو علی کل شئ قدیر

اس کی قدرت بھی بڑی وسیع ہے، قابو ہی میں نہیں بلکہ قادر بھی ہے ہر چیز پر، اور قدرت عام بادشاہوں میں تو یہ ہوتی ہے کہ جب جیل بھیجنے کو لایا تو جیل بھیج دیا۔ کسی کو سزا دے دی، کسی کو انعام دے دیا، قدرت ہے۔

اللہ کی قدرت کا عالم:

لیکن اس کی قدرت کا یہ علام ہے کہ

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ

موت اور زندگی کی باگیں بھی اس کے ہاتھ میں ہیں۔

کسی انسان یا کسی بھی مخلوق کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ڈور نہیں ہے کہ جس کو چاہے زندہ کر دے جس کو چاہے موت دے دے۔

زندگی اور موت کا مطلب:

اور زندگی اور موت دینے کے یہ معنی نہیں جو نمرود نے سمجھے کہ یہ مر گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اس کے دربار میں آ کر کہا کہ خدائی کا دعویٰ مت کر، وہ مدعی تھا خدائی کا (اس سے کہا کہ) خدائی کا دعویٰ مت کر، خدا کو مان اور اپنے مالک کو پہچان۔ کہتا ہے کون مالک ہے میرے سوا؟ فرمایا:

اَلَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ

وہ ہے مالک جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔

اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اسی وقت دو قیدی نکلوائے جیل خانے سے، ایک کے قتل کا حکم دیا اور ایک کو چھوڑ دیا کہنے لگا دیکھو ایک کو مار دیا، ایک کو زندہ کر دیا۔ اس کوڑھ مغز نے یہ نہ سمجھا کہ جو زندگی تھی جس کو تو نے قتل کیا۔ وہ تیری دی ہوئی تھی؟ پھر قتل ہی تو کیا، قتل سبب بنتا ہے موت کا،

لیکن موت نہیں دے سکتا کوئی۔

موت کسے کہتے ہیں؟

موت کہتے ہیں جان نکالنا اپنے قبضے سے اور قدرت سے رگ رگ کے اندر سے حیوۃ کو نکال دینا یہ تھوڑا ہی کر سکتا تھا۔ اس نے قتل کر دیا۔ قتل پر موت مرتب ہوئی مگر دینے والے موت کے حق تعالیٰ ہی تھے اگر یہ قتل کر دیتا، گردن کاٹ دیتا اور وہ یہ چاہے کہ زندگی نہ نکلے نہیں نکل سکتی۔ واقعات ہیں ایسے شہداء کے بہت سے کہ ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا انہوں نے دوسرے ہاتھ میں لے لیا دوسرا ہاتھ کٹ گیا جھنڈا انہوں نے منہ میں لے لیا اور اس کے بعد جھنڈا منہ سے گر گیا تو انہوں نے لیٹے ہی لیٹے لڑھک کر کئی ایک کو مار ڈالا۔ اس کے بعد کہیں جا کر جان نکلی، تو محض قتل ہونے سے جان نکلنا ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہے تو جان جاتی ہے، ورنہ مقتول کے اندر بھی جان رہتی ہے۔ تو بہر حال قدرت کا اس کی یہ عالم ہے کہ

خلق الْموْتَ والْحیٰوۃ

موت بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، حیات بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔

جسکو چاہے زندگی دے جس کو چاہے موت دے۔

زندگی کسے کہتے ہیں؟:

زندگی دینے کے معنی ہیں "عطائے وجود" وجود دے دینا دوسرے کو، تو ظاہر بات ہے کہ انسان میں قدرت نہیں ہے کہ وجود دے دوسرے کو اس لئے کہ خود اس کا وجود ہی اس کے قبضے میں نہیں۔ اگر بالفرض اس نے اسکو اولاد دی تو وجود دینے والا باپ ماں نہیں وہ سبب بنا ہے زندگی دینے کا، وجود دینے کا، لیکن دینے والا دوسرا ہے، اگر اس کے ہاتھ میں، قبضے میں وجود ہوتا تو یہ خود کبھی نہ مرتا، کون موت کو پسند کرتا ہے، اگر قبضے میں ہو حیات تو روک لیا کرتا آدمی۔

اگر قبضے میں ہو زندگی تو جن کے اولاد نہیں ہوتی وہ ضرور پیدا کر لیا کرتے اولاد۔ اولاد پیدا ہونے کے اسباب سارے مہیا کرتے ہیں اور برس گزر جاتے ہیں نہیں ہوتی اولاد۔ کوئی دعائیں کراتے ہیں کوئی تعویذ کراتے ہی، کوئی طبیبوں کو جاتے ہیں، اگر قبضے میں تھی زندگی تو کیوں نہ دے دی اور پیدا کر لیا بچے کو۔ پھر اگر کوئی مر رہا ہو تو کسی کے قبضے میں نہیں کہ پل بھر کے لئے روک لے زندگی کو۔ ساری دنیا کے خزانے جمع کر لو اور یہ چاہو کہ ایک منٹ لے لئے اس میت کو روک لو جان نہ نکلے تو یہ قبضہ قدرت میں نہیں سب عاجز بنے ہوئے دیکھتے ہیں۔

نزع ہو رہا ہے، سانس چل رہا ہے۔ ماں باپ بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور حیات ان کے قبضے میں نہیں ہے۔ اسباب زندگی کسی حد تک دیئے گئے ہیں قبضہ میں، اسباب موت کسی حد تک دیئے گئے ہیں قبضے میں، لیکن خود موت وحیات ان کے ہاتھ میں نہیں، تو اللہ کی قدرت کا

یہ عالم ہے کہ موت اور حیات اس کے قبضے میں ہے جسے چاہے وجود دے دے جس سے چاہے وجود چھین لے، توجو ایسا قادرِ مطلق ہوگا حکومت اس کے لئے سزاوار ہے، حکمرانی اسی کا حصہ ہے۔اسی واسطے اسلام میں حکومت اس کی ہوگی، چلانے والے تم ہوگے تاکہ تمہیں اجر ملے، ثواب ملے۔تم خود حاکم نہیں اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکم دینا صرف اللہ کا کام ہے اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ملک صرف اسی کا ہے تو ملک کا مالک کوئی نہیں قدرت کا مالک کوئی نہیں زندگی اور موت کا مالک کوئی نہیں، یہ صرف اللہ رب العزت ہے کہ وجود اور عدم موت اور حیات دونوں اس کے قبضے میں ہیں تو فرمایا کہ اس سے زیادہ اقتدار والا کون ہے کہ موت وحیات بھی قبضے میں ہے تو خود ذات مبارک تبارک اور الذی بیدہ الملک قبضہ پورے ملک کے اوپر ہے، اور وھو علی کل شیٔ قدیر۔ہر چیز پر قادر ہے حتی کہ موت اور حیات پر قادر۔

موت وحیات کیوں پیدا کی گئیں؟:

اور یہ موت وحیات کیوں دی، کیا ضرورت تھی اس سلسلے کی کہ کوئی مر رہا ہے کوئی جی رہا ہے، کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے، کسی کو غم ہے، کسی کو خوشی ہے۔یہ کیوں کیا،

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً

تاکہ اللہ جان لے کہ تم میں کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا برا

اس واسطے کہ انسان سب سے پہلے تو میت ہی تھا، کوئی تھا ہی نہیں وجود اس کا، اس کے بعد حق تعالی نے اسکو وجود دیا۔ تو وہ عدم سے وجود میں آیا، اس کے بعد پھر موت دی تو قبر میں چلا گیا۔اس کے بعد پھر حیات دیں گے تو حشر میں پہنچ جائے گا تو دو دو موتیں اور دو دو حیاتیں واقع ہوتی ہیں۔ظاہر ہے کہ اگر بالکل عدم میں رہتا جس میں تھا اور آتا نہ دنیا میں تو عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، زندگی دی تاکہ عمل کرے، عمل کا انجام نہیں نکل سکتا، جب تک موت نہ واقع ہو، موت کے بعد ہی تو زندگی مکمل ہوگی اور مکمل زندگی پر دیں گے اجر، تو موت لازمی چیز ہے تاکہ عدل جہان میں بھگتے آدمی۔اچھائی اور برائی کے ثمرات بھگتے تو زندگی دی اس لئے تاکہ عمل کرے اور موت دی اس لئے تاکہ ثمرات اس پر مرتب ہوں اور اچھے برے بدلے اس کے سامنے آئیں۔اس لئے فرمایا کہ موت اور حیات کا سلسلہ اس لئے رکھا۔

لیبلو کم ایکم احسن عملاً

تاکہ یہ دیکھیں کہ تم میں اچھا عمل کس کا ہے، تو عمل ہو نہیں تھا۔

جب تک زندہ نہ کریں اور عمل کا ثمرہ مرتب نہیں ہو سکتا تھا جب تک موت نہ دیں اور موت کے بعد پھر حیات نہ دیں تو پہلے موت اس کے بعد حیات اس کے بعد موت اس کے بعد پھر حیات تو پہلی حیات میں تو عمل اور دوسری حیات کے اندر ثمرات، اس لئے ہم نے رکھا موت وحیات کا سلسلہ تاکہ تمہارے

اچھے اعمال جانچ لیا جائے۔

تمام انسانوں کو ایک دم ہی زندگی اور موت کیوں نہیں دے دی جاتی؟:

اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب، حیات بھی مسلّم اور موت بھی مسلّم، مگر یہ سارے انسان ایک دم پیدا ہو جاتے، ایک دم ایک دن میں سب کا انتقال ہو جاتا، روز روز کی جھک جھک نہ رہتی، کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، تو ایک ہی دفعہ موت دے دیتے، ایک ہی دفعہ زندگی (آخر ایسا کیوں نہیں کیا؟) اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر ایک ہی دن سب مرتے، عبرت پکڑنے والا کوئی نہ رہتا تو موت کو جہاں ذریعہ بنایا ثمرات ظاہر ہونے کا وہاں عبرت کا بھی تو ذریعہ ہے کہ دوسرے کی موت دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے کہ مجھے بھی اس راستے جانا ہے تو میں کوئی اچھا عمل کر لوں تو عمل پر ابھارنے کے لئے ضرورت تھی کہ موت اور حیات کا سلسلہ مسلسل رہے (ایسا نہ ہو کہ) ایک ہی دن میں سب پیدا ہوں اور ایک ہی دن میں سب مریں (بلکہ) کوئی مرے کوئی جئے، کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے، تو آنے پر خوشی، جانے پر رنج۔ آنے پر توقع کہ کچھ اعمال کا ظہور ہوگا، جانے پر عبرت کہ جب یہ جارہا ہے اور اب یہ بھگتے گا تو ایسا نہ ہو کہ ہم جانے لگیں اور کوئی ایسی بُری حرکت کر کے جائیں کہ ہمیں بھگتنا پڑے تو عبرت کا مقام نہ ہوتا اگر موت وحیات کا مسلسل سلسلہ نہ رہتا، تو موت پر بھی قادر، حیات پر بھی قادر اور موت اور حیات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا یک دم نہ موت رکھی نہ یک دم حیات رکھی، تاکہ عبرت و موعظت، ترقی درجات مدارج، یہ انسانوں کو حاصل ہوں اور یہ جب ہی ہوں گے کہ میت کو دیکھے اور عبرت پکڑے کہ کل کو ہمارے لئے بھی یہ دن آنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ موت وحیات پر کیوں قادر ہیں؟:

اور فرمایا کہ یہ ہم کیوں قادر ہیں؟ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ اس لئے کہ ہم عزت والے ہیں۔ عزت کی ہمارے یہاں کوئی انتہا نہیں، تو جس کی عزت اور جس کا اقتدار ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جو بے عزت ہو اسکی وقعت ہی نہیں ہوگی کوئی ان میں تو وہ حکمرانی کیا کرے گا۔ ان کے اوپر؟ عزت والا ہی تو حکمرانی کرتا ہے۔ اگر بادشاہ کی نسبت توہین بیٹھ جائے کہ یہ تو بڑا ذلیل آدمی ہے، اس کے تو بڑے بُرے افعال ہیں تو وقعت نہیں بیٹھے گی تو حکم ماننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا، چنانچہ جو سلاطین بداخلاق گزرے ہیں یا سیہ کار گزرے ہیں، مخلوق لعنتیں بھیجتی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے یہ ختم ہو جائیں، تو ظاہر بات ہے کہ ایسے کا حکم ماننا زبان سے تو ممکن ہے، مگر سور غبت سے کوئی ماننے والا نہیں اور حق تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ انسان جب ہمارا نائب بن کر حکومت کرے تو وہ اتنا محبوب القلوب ہو کہ رعایا دعا مانگے اس کے لئے، یوں کہے کہ اس بادشاہ کی عمر دراز ہو۔ برکتوں کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، پورے ملک کے اندر برکات پھیل رہی ہیں۔

بادشاہ کے لئے محبوب القلوب ہونا ضروری ہے

تو بادشاہ کے لئے محبوب القلوب ہونا ضروری ہے۔ جب تک محبت نہیں ہوگی بادشاہ کا کام نہیں چلے گا، اور محبت جب ہوگی جب سرچشمہ خیر و برکت ہوگا ورنہ عداوت ہوگی۔ تو محبت ہونی چاہئے نیز محبت جب ہوگی جب عزت والا ہو، اور عزت والا وہی ہے جو خیر و برکت کا حامل ہے۔ خیر نہ ہوئی شر ہوئی تو عزت کے بجائے ذلت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے فرمایا کہ **وھو العزیز** وہ عزت والا بھی ہے اور اقتدار اور جلال والا بھی ہے کہ سب ہیبت زدہ بھی ہیں، محبت والے بھی ہیں، مگر اس کے بعد فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ جلال محض نہیں ہیں

جلال محض نہیں **وھو العزیز الغفور** بخشنے والا بھی بہت ہے سخی بھی بہت ہے، داتا بھی بہت ہے (چاہے) اس کا نام لینے کو برا کہیں ہیں۔ اسکے مقابلے پر آگئے لوگ لیکن نہ سورج نکلنا بند ہوتا ہے نہ سبزیاں اگنی بند ہوتی ہیں نہ بارشیں برسنی بند ہوتی ہیں۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
چہ دشمن بریں خوانِ یغما چہ دوست

اس کا دستر خوان پھیلا ہوا ہے، دوست اور دشمن سب کھا رہے ہیں، یہ نہیں ہے کہ سورج نکلے تو دوستوں کے گھر پر تو دھوپ ڈالے اور جو دشمن ہیں اللہ کے، ان کے گھر میں اندھیرا رہے، وہاں بھی سورج پہنچ رہا ہے۔ بارش میں یہ نہیں رکھا گیا کہ دوستوں کے گھر پر تو بارش ہو اور ان کے کھیتوں پر، اور دشمنوں کے کھیت خشک ہو جائیں، جب آتی ہے بارش تو سب کے کھیتوں پر جاتی ہے تو ایسا عام دستر خوان ہے کہ دوست دشمن سب یکساں پل رہے ہیں تو مغفرت والا بھی ہے، بخشش والا بھی ہے۔ رحم و کرم والا بھی ہے۔ اپنی مخلوق کے اوپر بے انتہا شفیق بھی ہے۔

اللہ کی محبت کی مثال

جیسے حدیث میں ارشاد فرمایا نبی کریم ﷺ نے ایک مثال سے بیان فرمایا:

"ایک شخص ایک چڑیا کے بچے کو پکڑ لایا۔ وہ بچوں کو لے کر آیا تو اس کی ماں چڑیا، وہ منڈلا رہی ہے اس کے سر پر اور پھڑ پھڑاتی ہوئی پھر رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا اسے محبت ہے بچوں کی؟ عرض کیا۔ یا رسول اللہ اتنی بڑی محبت ہے دل میں پھڑ پھڑا رہی ہے اور اپنی جان دینا گوارا کرے گی بچوں پر آنچ آنا گوارا نہیں کرے گی۔ فرمایا! بے حد محبت میں یہ پھڑ پھڑا رہی ہے اس کو سامنے رکھ کر فرمایا سمجھ لو کہ جب ایک جانور اور ماں بنا جانور اور یہ محبت ہے تو اللہ جو سرچشمہ ہے سب کے وجود کا جس نے بنایا اسے کیسے محبت نہ ہوگی اپنی مخلوق سے، اسے کہیں زیادہ محبت ہے اپنی مخلوق سے جتنا کہ جانور کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جب محبت والا ہے، جبھی تو بخشش عام ہے۔ مسلم ہو یا کافر ہو، دھوپ اور بارش اور غلہ اور کھانا پینا اور پھل سب کے لئے عام ہے۔ ورنہ دوستوں کے لئے کرتے، دشمنوں کے لئے نہ رکھتے، وہ

بحیثیت مخلوق کے ان پر بے حد شفیق ہے۔ تو العزیز الغفور۔ عزت والا بھی ہے اور چشم پوشی کرنے والا بھی ہے۔ اخیر میں جب کوئی نہیں مانے گا تو سزا دیں گے فطرت کے مطابق، لیکن عین گناہ کی حالت میں فوراً سزا نہیں دیتے کہ شاید اب بھی سنبھل جائے، اب بھی سنبھل جائے بخشش کا دروازہ عام ہے تو یہاں تین چار وصف ہو گئے، ایک تو یہ کہ ذاتِ بادشاہ، اللہ کی ذات مبارک ہے، برکت والی ہے، دوسرے یہ کہ قادر ہے بیدہ الملك اس کے قبضے میں ہے۔ تیسرے یہ ہے کہ علی کل شئ قدیر قدرت اور اقتدار اس کا انتہائی ہے۔ اور ساتھ میں یہ کہ عزیز بھی ہے عزت والا بھی ہے جس کی وجہ سے سب مغلوب ہیں اور ساتھ میں غفور بھی ہے کہ محبت بھی کرتے ہیں تو محسن بھی ہے، صاحب جلال بھی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں کہ:

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ

اے پیغمبر مطلع فرمادیجئے مخلوق کو اور اپنی امت کو کہ میں کون ہوں؟

انی انا الغفور

میں بہت ہی بخشش کرنے والا ہوں۔

تو بادشاہ اگر محض جابر و قاہر ہی ہو کہ جبر و قہر ہی کرے تو رعایا کا ناس مارا جائے، اگر محض جمیل ہی جمیل ہو کہ رحم و کرم ہی کرتا رہے غصہ نہ کرے تب بھی ناس مارا جائے گا۔ اس لئے کہ بہت سی حرکات غصہ اور قہر سے بنتی ہیں، محض انعام و اکرام سے نہیں بنتیں، تو دونوں شانیں ہونی چاہئیں بادشاہ میں کہ جلال بھی ہو اور مغفرت بھی ہو اور بخشش اور تدبر بھی ہو۔ وهو العزيز الغفور یہ پانچ اوصاف بیان کئے گئے۔ یہ تھے ذاتِ بادشاہ کے اوصاف، اور یہ کہ اس کے افعال کیا ہیں وہ افعال پھر شروع ہوئے اگلی آیت سے وہ انشاء اللہ پھر کل بیان ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ۝ وَلِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ اِذَآ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّهِیَ تَفُوْرُ ۝ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِؕ كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ۝ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ

خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ٥

جس نے بنائے سات آسمان تہہ بر تہہ کیا دیکھتا ہے تو رحمٰن کے بنانے میں کچھ فرق پھر دوبارہ نگاہ کر کہیں نظر آتی ہے تجھ کو دراڑ پھر لوٹا کر نگاہ کر دو دو بار لوٹ آئے گی تیرے پاس تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر، اور ہم نے رونق دی سب سے ورلے آسمان کو چراغوں سے اور ان سے کر رکھی ہے ہم نے پھینک مار شیطانوں کے واسطے اور رکھا ہے ان کے واسطے عذاب دہکتی آگ کا اور جو لوگ منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے واسطے ہے عذاب دوزخ کا اور بری جگہ جا پہنچے جب اس میں ڈالے جائیں گے سنیں گے اس کا دھاڑنا اور وہ اچھل رہی ہو گی ایسا لگتا ہے کہ پھٹ پڑے گی جوش سے جس وقت پڑے اس میں ایک گروہ پوچھیں ان سے دوزخ کے داروغہ کیا نہ پہنچا تھا تمہارے پاس کوئی ڈر سنانے والا وہ بولیں کیوں نہیں ہمارے پاس پہنچا تھا ڈر سنانے والا وہ بولیں کیوں نہیں ہمارے پاس پہنچا تھا ڈر سنانے والا پھر ہم نے جھٹلایا اور کہا نہیں اتاری اللہ نے کوئی چیز تم تو پڑے ہوئے ہو بڑے بہکاوے میں اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے دوزخ والوں میں سو قائل ہو گئے اپنے گناہ کے اب دفع ہو جائیں دوزخ والے، جو لوگ ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے ان کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا اور تم چھپا کر کہو اپنی بات یا کھول کر وہ خوب جانتا ہے جیوں کے بھید، بھلا وہ نہ جانے جس نے بنایا اور وہی ہے بھید جاننے والا خبر دار،

میں نے کل عرض کیا تھا کہ یہ سورۃ شہنشاہی خداوندی کے اصول پر مشتمل ہے اور حکمرانی کے اصول ور لوازم ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ سب سے اول بادشاہ عالمین کی ذات کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ مبارک ہے، پھر اس ی صفات کمال کا تذکرہ کیا گیا جو حکومت کے لئے ضروری ہیں۔ ان کی کل تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ آج ں آیتوں کی تفسیر کا حاصل ہو گا لوازم بادشاہت۔

لوازم بادشاہت

یہ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ جب کوئی حکومت قائم کی جاتی ہے تو سب سے اول دار الحکومت کی یاد ڈالتے ہیں۔ دار السلطنت یا دار الخلافہ کہ جس کو باب عالی یا باب حکومت کہا جاتا ہے وہ قائم کرتے ہیں، اور ں کو نہایت مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں۔

دشمنوں کا حملہ سب سے پہلے دار السلطنت پر ہوتا ہے، وہ اگر قبضہ میں آجاتا ہے تو پورا ملک فتح سمجھا ا تا ہے۔ اس لئے دار الحکومت کو بہت ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم بنایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے اتے ہیں اور اگر کوئی بڑی سلطنت ہے تو ساتھ ساتھ شہر پناہیں قائم کی جاتی ہیں اور ہر شہر پناہ کے اندر بڑی ی فوجیں رکھی جاتی ہیں جن کے ساتھ میں سامانِ جنگ ہوتا ہے۔ جس زمانے کے مناسب جو کچھ سامان دیا جس ملک کے مناسب جو سامان ہو وہ فراہم کیا جاتا ہے۔ گولہ اور بارود اور آج کے دور میں مثلاً بم اور بڑی ی دور مار توپیں اور مشین گنیں اور جیٹ طیارے۔ یہ زیادہ سے زیادہ مہیا کیے جاتے ہیں دار السلطنت کے ئے، اور ضرورت کے مطابق اطراف ملک میں بھی یہ قوتیں قائم کی جاتی ہیں مختلف چھاؤنیاں بناتے ہیں۔

مگر دارالسلطنت کو مضبوط رکھتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ غنی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لئے کوئی دارالسلطنت بنے یا ان کے لئے قلعے بنائے جائیں وہ تو خود حافظ و حفیظ ہیں، وہ خود حفاظت کرنے والے ہیں جہانوں کی، ان کی حفاظت کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ ملک کے اظہار کیلئے تمام لوازم سلطنت قائم کئے

لیکن چونکہ ان کی صفت ہے "مَلِکٌ اور بادشاہ ہونا"۔

اس صفت کے اظہار کے لئے تمام لوازم سلطنت قائم کئے جاتے ہیں، تو سب سے پہلے شاہی قلعہ تعمیر کیا گیا۔

سات آسمان بمنزل سات شہر پناہوں کے ہیں

اور وہ بھی سات شہر پناہوں کا جن کو سات آسمان کہتے ہیں۔ تو آسمان زمین سے زیادہ مضبوط ہے۔ زمین کمزور ہے لیکن آسمان مضبوط ہے۔ زمین میں آپ روزانہ تصرف کرتے ہیں۔ کہیں کھود کر کنوئیں بنا رہے ہیں، کہیں سڑکیں نکالی جارہی ہیں، روزانہ تغیر و تبدل زمین میں ہوتا ہے، لیکن آسمان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں جب سے آسمان بنائے گئے ہیں، ہزاروں برس سے اس وقت سے یکساں حالت پر قائم ہیں۔

آسمان کہاں ہے؟

اب یہ کہ وہ آسمان کہاں ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ جو نیلگوں اور چھت سی نظر آتی ہے یہی آسمان ہو، لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ آسمان نہیں، تو ہمیں بھی کوئی اصرار نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ نیلگوں چھت جو ہے اس کے اوپر آسمان ہو اور یہ نیلگوں چھت ایسی ہو جیسے ایک بڑی چھت کے نیچے شہتیری لگا دیتے ہیں اور شامیانہ تان دیتے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ یہ نیلگوں آسمان نہ ہو۔ آسمان اس سے بالاتر ہو۔

زمین سے آسمان تک کی مسافت پانچ سو برس ہے

اس لئے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو برس کی مسافت ہے۔

اور چونکہ مبالغہ اور استحسان ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس واسطے وہ پانچ سو برس کی مسافت تیز سے تیز سواری پر طے ہونی چاہئے زیادہ سے زیادہ تیز سواری ہو، وہ پانچ سو برس میں پہنچ سکتی ہے وہاں تک، آج بڑی سے بڑی تیز سواری اگر ہو سکتی ہے تو راکٹ ہو سکتا ہے۔ جو ایک گھنٹے میں پچیس سو میل یا پچیس ہزار میل جانے والی سواری ہے۔ اور ممکن ہے کہ کل کو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سواری بن جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پانچ سو کے بجائے پانچ ہزار یا پچیس ہزار کے بجائے پچاس ہزار میل طے کرلے۔ ایک لاکھ میل طے کرلے۔ پل بھر میں پہنچ جائے تو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سواری پر اگر سوار ہو کر جایا جائے تو پانچ سو برس میں آسمان پر پہنچ سکتا ہے آدمی۔ اور ظاہر ہے کہ نہ اتنی عمر ہے کسی کی کہ وہ اس سواری پر سوار ہو اور پانچ سو برس طے کرے۔ آج بڑی سے بڑی عمر ہے تو وہ ساٹھ ستر برس کی ہے، سو برس کی ہو جائے گی تو اس عمر پر انسان طے

نہیں کر سکتا جب تک کہ مددِ خداوندی شاملِ حال نہ ہو۔ اسی واسطے ایک موقع پر قرآن کریم میں فرمایا گیا:
يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ.

"اے جنوں اور انسانوں! اگر تم یہ کوشش کرنا چاہتے ہو کہ زمین اور آسمانوں کے فاصلے طے کر لو اور ان کی اقطار سے گزر جاؤ۔ قُطر کہتے ہیں اس خط کو جو دائرے کے بیچ میں ہوتا ہے۔ اس سے پار ہو جاؤ تو ہو سکتے ہو، محال نہیں، لیکن ہو نہیں سکتے الا بسلطان۔ جب تک کہ اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہ دی جائے تمہیں، کوئی حجت تمہارے ہاتھ میں نہ ہو اس وقت تک تم آسمانوں تک نہیں جا سکتے۔ آسمان سے نیچے جہاں تک تمہارا جی چاہے چلے جاؤ، جہاں تک طاقت ہو۔

انسان چاند پر جا سکتا ہے

آج اگر کوئی چاند پر پہنچنا چاہے تو وہ پہنچ سکتا ہے۔ شریعت کے اصول سے کوئی بعید بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ نظامِ کواکب ستاروں کا نظام سب آسمانوں سے نیچے نیچے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی صریح روایت موجود ہے اس میں کہ یہ تمام ستارے آسمان کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں اور ان میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں سونے اور چاندی کی اور ملائکہ کے ہاتھ میں ہیں جو تھامے ہوئے ہیں انہیں۔ قیامت کے دن جب آسمان ٹوٹیں گے اور ملائکہ علیہم السلام کو بھی وفات دے دی جائے گی، زنجیریں چھوٹ جائیں گی وہ سارے ستارے ٹکڑے ہو کر نیچے آ پڑیں گے۔ قیامت قائم ہو جائے گی۔

ستارے اپنی کشش سے قائم نہیں بلکہ انہیں ملائکہ نے تھام رکھا ہے

آج کی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ ستارے باہمی کشش سے قائم ہیں۔ ایک دوسرے ستارے کو کھینچ رہا ہے اس لئے وہ معلق ہیں، تو انہوں نے اس کشش سے تعبیر کر دیا، شریعت نے اس کشش کی حقیقت بتلا دی کہ وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے اپنی طاقت سے تھام رکھا ہے ستاروں کو، تو ہمیں کشش سے انکار کی بھی ضرورت نہیں لیکن وہ پھر حسیات پر پہنچے، کشش ہوتی ہے حسی چیزوں میں۔ شریعت اس کا انکار کئے بغیر اس کی حقیقت بتلاتی ہے کہ اس پر کشش کو تھام رکھا ہے فی الحقیقت ملائکہ علیہم السلام نے ان کی معنوی قوت نے ستاروں کو لٹکا دیا تو یہ سارا نظامِ کواکب آسمانوں سے نیچے نیچے ہے۔ آسمان اس سے بالاتر ہے، تو سات آسمان تعمیر کئے گئے، گویا سات شہر پناہیں بنائی گئیں۔ اس لئے کہ جب بڑی حکومت ہوتی ہے تو چھوٹا موٹا قلعہ کام نہیں دیتا۔ جب تک کہ ساتھ ساتھ شہر پناہیں نہ ہوں، تو سات شہر پناہ کا ایک دار السلطنت بنایا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آخری حصہ میں تختِ شاہی رکھا جاتا ہے تو ساتوں آسمانوں کے اوپر جا کر عرشِ عظیم قائم کیا گیا۔

ساتوں آسمانوں کے اوپر بطور حفاظتی خندق کے ایک عظیم الشان سمندر رہے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے قلعے جب تعمیر ہوتے ہیں تو دشمنوں سے حفاظت کے لئے ان کے

اردگرد خندقیں کھودی جاتی ہیں۔ پانی بھرا جاتا ہے ان میں کہ اگر کوئی قریب بھی پہنچے تو دیوار تک نہ پہنچ سکے قلعے کی۔ سب سے زیادہ گہری خندق ڈالتے ہیں اور اس میں بہت گہرا پانی ہوتا ہے۔ اب اس میں کوئی کشتیاں بنائے۔ اتنے بنائے گا قلعے والے اس کا استیصال بھی کر دیں گے اوپر سے گولیاں برسا کر، تو دشمنوں سے حفاظت کے لئے اول تو سات قلعے بنائے گئے اور پھر اس کے باہر جا کر ایک بڑی خندق بناتے ہیں جس میں پانی بھرتے ہیں تو پانی کے اوپر نرم مخلوق ہے۔ اس پر چلنا آسان نہیں ہے اس واسطے پانی پر آ کر دشمن رک جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے سات آسمان بنائے گویا سات قلعے تعمیر کئے اور اس کے بعد ایک عظیم الشان سمندر بنایا۔ اس سمندر کی بڑائی حدیث میں آتی ہے کہ:

"آسمانوں اور زمینوں کے برابر ایک ایک موج ہے اس دریا کی"

اس سے اوپر عرشِ عظیم قائم کیا تو سات قلعے ہیں اس کے بعد خندق بنائی گئی، اور وہ خندق بھی جیسا قلعہ ہے ویسی خندق جیسا بادشاہ ہے ایسا ہی اس کے لئے سامان، تو وہ خندق ایسی ہے کہ ایک عظیم سمندر ہے اور اس سمندر کی ایک ایک موج آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔

عرشِ الٰہی سمندر کے اوپر ہے

اس کے اوپر عرشِ عظیم قائم کیا گیا تو گویا دارالسلطنت قائم کرنے میں پہلے قلعے بناتے ہیں۔ قلعے کے بعد خندق بناتے ہیں اور ساتوں قلعے میں پھر تختِ شاہی رکھا جاتا ہے جو علامت ہوتی ہے بادشاہ کی۔ اسی تخت سے احکام جاری ہوتے ہیں، تو وہ تختِ شاہی ہے عرشِ عظیم، ساتویں آسمان کے اوپر سمندر ہے ان پر عرشِ عظیم قائم کیا گیا ہے، تو عرش کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے یہ سات آسمان قبوں کی طرح سے ہیں۔ ایک دوسرے کے اوپر اور عرش نے سب کو گھیر رکھا ہے۔ سارے آسمان، ساری زمینیں، سارے سیارات اس عرش کے نیچے ہیں تو ترتیب معین ہو گئی کہ نیچے زمین، اوپر آسمان اوپر سمندر اس سے اوپر پھر عرشِ عظیم ہے، تو ایک شاہی قلعہ بنا اور تختِ شاہی رکھا گیا۔

اللہ کے مہمانوں کے لئے جو گیسٹ ہاؤس ہے اس کا نام جنت ہے

تو یہ بھی قاعدہ ہے کہ بہر حال حکومت کے مہمان بھی آتے ہیں تو ان کے لئے ایک گیسٹ ہاؤس بنایا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑا مہمان خانہ، اتنا بڑا کہ جو سارے مہمانوں کے لئے مناسب ہو، اس لئے کہ بادشاہ کے پاس چھوٹے موٹے قسم کے لوگ تو پہنچتے نہیں۔ وہاں والیانِ ملک اور بڑے بڑے نواب راجہ ہی پہنچ سکتے ہیں کہ جو بادشاہ کے مہمان ہوتے ہیں۔ تو ان کے مناسب حال ضرورت تھی کہ گیسٹ ہاؤس بنے، سرکاری مہمان خانہ بنے تو وہ سرکاری مہمان خانہ اسی کا نام ہے جنت۔ یہ جنت جو ہے یہ عرشِ عظیم کے نیچے ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سات آسمان ہیں۔ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے، اس لئے کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا مقام ہے سدرۃ المنتھیٰ اور یہ ساتویں آسمان پر ہے اور

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ:

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى

"سدرۃ المنتھی کے پاس سے جنت الماویٰ شروع ہوتی ہے۔"

تو حدیث اور آیت کے ملانے سے نتیجہ یہ نکل آیا کہ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ ہے۔

کل جنتیں سو ہیں

اور جنتیں ہیں سو ایک دوسرے کے اوپر اور ایک ایک جنت آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے تو اندازہ کیجیے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے تو لاکھوں آسمانوں کے برابر ایک جنت ہی ہو گی یہ ہے سرکاری مہمان خانہ کہ جس میں سرکاری مہمان رکھے جائیں گے۔

سرکاری مہمان سرکاری مہمان خانہ میں کب پہنچیں گے؟

اور سرکاری مہمان کب پہنچیں گے؟ جب آسمان بیچ سے نکال دیے جائیں گے جب ہی تو پہنچیں گے۔ اس لئے کہ اصل مہمان ملائکہ تو ہیں نہیں۔ یہ تو خدام ہیں جو کام کر رہے ہیں، مہمان تو وہ ہیں جو اللہ کے بتلائے ہوئے طریق پر اور راستے پر چل کر اس تک پہنچیں۔ وہ راستہ شریعت ہے اس پر چلنے والے انسان ہیں، تو حقیقت میں سرکاری مہمان یہ انسان ہوں گے کہ جو ٹھیک اس راستہ پر چل کر جو جنت کو جارہا ہے وہاں پہنچ جائیں گے، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد جتنے اہل جنت ہیں جنت میں بطور مہمان کے داخل کئے جائیں گے اور خوب مہمانی ہو گی ان کی۔

اہل جنت کی تین دن خاص مہمانی ہو گی

ان کے لئے زمین کی روٹی اور مچھلی کے جگر کا سالن بنایا جائے گا اور تین دن کی مہمانی اس انداز سے ہو گی کہ ان کو روٹی تو دی جائے گی اس زمین کی یعنی یہ پوری زمین اس کی ایک روٹی بنا دی جائے گی اور زمین جس پر قائم ہے وہ ایک عظیم الشان مچھلی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے اس کے جگر کے کباب ہوں گے تو زمین کی روٹی اور مچھلی کے کباب اور وہ بھی اس کے جگر کے کباب ہوں گے تو زمین کی روٹی اور مچھلی کے کباب اور وہ بھی اس کے جگر کے کہ سب سے زیادہ لذیذ گوشت ہوتا ہے وہ دی جائے گی غذا۔

زمین کی روٹی کیسے بنائی جائے گی؟

آپ سوال کریں گے کہ یہ زمین تو مٹی کی ہے اور اس کی روٹی تو بڑے چرچڑی ہو گی تو کھائی کس طرح سے جائے گی؟ اللہ میاں کے یہاں مہمانی ہو اور چرچڑی روٹی ملے؟ میں عرض کرتا ہوں کہ آج جو آپ غذا کھا رہے ہیں وہ بھی تو زمین ہی کھا رہے ہیں اس لئے کہ زمین ہی میں سے تو نکلتے ہیں غلہ بھی دانے بھی' چنے بھی گیہوں بھی' پھل پھول فروٹ سب زمین سے نکلتے ہیں تو یہ زمین کے ٹکڑے ہیں جو آپ کھاتے ہیں لیکن اللہ نے کچھ ایسی مشینیں لگا رکھی ہیں قدرتی کہ ان کے ذریعے چڑچڑا مادہ صاف کر کے خالص مزے کی چیز بنا

دی جاتی ہے۔ سیب کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن محسوس نہیں ہوتا۔ انگور کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن نہیں حالانکہ ہے یہ وہی مٹی۔ اسی کا اللہ نے جو ہر بنا کر چڑ چڑا پن نکال دیا باطنی مشینوں سے اور صاف ستھرا مادہ خوشبودار رسیلا بنا کے آپ کو دیا تو جب آج بھی آپ مٹی کھا رہے ہیں اور چڑ چڑا مادہ نہیں آتا تو کیا تعجب ہے کہ حق تعالیٰ اس دن ساری زمین کا چڑ چڑا مادہ نکال کر اس کا اصل جوہر بنا دیں۔ اس لئے کہ سارے مزے اس زمین ہی میں تو چھپے ہوئے ہیں۔ یہ سیب انگور انار امرود جو ہے زمینی ہے تو زمین ہی میں یہ سارے ذائقے چھپے ہوئے ہیں۔ مشینوں کے ذریعے سے ان ذائقوں کو الگ الگ کر کے چڑ چڑا مادہ نکال دیتے ہیں تو سارے ذائقوں کا مجموعہ یہ زمین ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس دن اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کے سارے مزے ایک جگہ جمع کر کے چڑ چڑا مادہ الگ کر دیں اور ان سارے مزوں کی ایک روٹی بنا دیں تو دنیا کے جتنے پھل اور فروٹ ہیں سب کے ذائقے اس روٹی کے اندر ہونگے۔ کوئی ذائقہ نہیں چھوٹا ہوگا۔ سارے ذائقے آجائینگے۔

زمین کی روٹی کیوں بنائی جائے گی؟

اور یہ اس لئے کریں گے کہ اول تو دنیا میں ہر انسان نے دنیا کا ہر پھل نہیں چکھا ہر ملک کے الگ الگ پھل ہوتے ہیں جو ترکی میں ہے وہ ہندوستان میں نہیں جو ہندوستان میں ہے وہ ایران میں نہیں جو ایران میں ہے وہ افغانستان میں نہیں تو لاکھوں کروڑوں انسان وہ ہیں جو اپنے اپنے خطے کے پھل تو کھائے ہوئے ہیں لیکن ساری زمین کے سارے ذائقوں سے واقف نہیں ہو سکتا ہے کہ شکایت کرے بنی آدم کہ ہمیں آدھے تہائے پھل دیئے وہ انہیں دیئے وہ انہیں دیئے کچھ ہمیں دیئے ہم تو واقف نہیں زمین کے سارے ذائقوں سے۔ اس لئے سارے ذائقے جمع کر کے سارے بنی آدم کو جو روٹی ہے وہ کھلا دیں گے تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

سالن مچھلی کا کیوں ہوگا؟

اور سالن بنائیں گے مچھلی کے جگر سے۔ اس لئے کہ غذائیں دو ہی ہیں دنیا میں یا بری یا بحری تو بحری غذاؤں میں سب سے اعلیٰ ترین غذا مچھلی اور بری غذاؤں میں سب سے اعلیٰ ترین غذا یہ فروٹ اور پھل اور دانے تو زمین کا جوہر نکال کے تو سارے فروٹ اور دانے جمع کر دیئے ان کا مزہ ایک جگہ ہو گیا اور بحری چیزوں میں وہ مچھلی کہ ساری مچھلیوں کی ماں ہے وہ اور اس میں سے ساری مچھلیاں نکلی ہیں اور مچھلیوں کی اقسام ہیں۔ کسی مچھلی کا کچھ ذائقہ ہے کسی کا کچھ ہے۔ وہ ساری قسمیں جمع ہو جاتی ہیں اس مچھلی میں جا کے جس پر زمین قائم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دریائی غذاؤں کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اور بر اور خشکی کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے۔ اس کی روٹی بنا دی اور اس کا سالن بنا دیں گے تو بحر و بر کی ساری غذائیں سارے بنی آدم نے چکھ لیں۔

اہلِ جنت کی ابتداً روٹی سالن سے کیوں خاطر کی جائے گی؟

اور یہ کیوں چکھائیں گے؟ ابتداء ہی میں جنت کی غذائیں کیوں نہ دے دیں؟ بتلانا یہ ہو گا ساری زمین کے ذائقے کھلا کر کہ بس یہ ہیں وہ ذائقے جن پہ تم رات دن لڑتے مرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بس سب کچھ یہی ہے۔ اب یہ کھا کر اب ہمارے بنائے ہوئے ذائقے کا مزہ چکھو' جو ہم نے تیار کئے ہوئے ہیں جنت میں مقیموں کے لئے تاکہ توازن اور تقابل کر سکو' اس واسطے کہ دنیا میں اول تو سب نے سارے ذائقے نہیں چکھے اور جتنے چکھے تھے وہ موت کی تلخی نے سارے ذائقے بھلا دیئے 'کوئی چیز ذہن میں نہیں کہ کیا کھایا اور کیا نہیں کھایا۔ اس واسطے ان سارے ذائقوں کو عین جنت میں کھلا کر تازہ کر دیں گے کہ بس یہ تھے وہ ذائقے جن پر آپ جی جی کر سر پھٹول کئے رہے' اور مار امار کئے رہے۔

دنیا میں جو لذتیں چھڑوائی گئی تھیں وہ ادنیٰ سے اعلیٰ کیطرف جانے کیلئے چھڑوائی گئی تھیں

ہم اگر چھڑوا رہے تھے دنیا کی لذتیں تو معاذ اللہ تمہارے ساتھ عداوت نہیں تھی' بلکہ یہ تھا کہ ادنیٰ کو چھوڑ کر اعلیٰ کی طرف جاؤ۔ جنہوں نے چھوڑا انہوں نے تو پایا اسے' اور جنہوں نے نہیں چھوڑا تو بیچ میں دھکے کھائے اس چیز کے تئیں' مگر بہر حال جب وہ بھول بھال چکے اب ہم وہ اپنے ذائقے چکھاتے ہیں' مگر یاد دلانے کے لئے پہلے ان ذائقوں کو سامنے کئے دیتے ہیں تاکہ تمہیں قدر محسوس ہو جنت کی۔ تو بہر حال اہل جنت کو جنت میں تین دن مہمان رکھا جائے گا اور اس میں غذا وہ دی جائے گی جس سے وہ مانوس تھے اور برسہا برس کھاتے ہوئے آ رہے تھے۔ تین دن کے بعد جب مہمانی ہو جائے گی پوری تو قیاس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ارشاد فرما دیتے کہ اب نکلو جنت سے کہ بس تین دن کی مہمانی (تھی) تین دن سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں' لیکن کریم کی شان سے یہ بعید ہے کہ کوئی نعمت دے کر پھر اسے واپس لے اس لئے فرمائیں گے کہ جس نے جس محل پر قبضہ کیا آج سے اَبَدُ الآباد تک وہ محل اسی کا ہے۔ وہ سارا رقبہ اسی کا ہے اب ہم واپس نہیں لیں گے۔ یہ کریم کی شان سے بعید ہے کہ گھر میں رکھ کر اور پھر کہے نکلو گھر سے۔ بس جس گھر میں آ گئے وہ آج سے تمہارا گھر ہے اور وہ محل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہو گا۔

ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو جنت ملے گی وہ دس دنیاؤں کے برابر ہو گی

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو رقبہ اور حصہ دیا جائے گا وہ دس دنیا کے برابر ہو گا' گویا دس دنیائیں بن جائیں اس کے اندر سے مع زمین اور بحر اور بر اور پہاڑوں سے تو دہ گنا ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ نے دس گنا کا اجر بھی رکھا ہے دنیا میں۔ اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی۔ یہ ضابطہ کا اجر ہے اور دس سے بڑھا دیں تو یہ انکے فضل سے بعید نہیں۔ چاہے سات سو گنا کر دیں چاہے ہزار گنا کر دیں' مگر دس گنا وہاں قاعدے میں داخل ہے۔ ضابطہ میں اسی قاعدے کیمطابق کم از کم حصہ دس گنا ہو گا دنیا کا۔

جنت میں جنتی ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا

یہاں ہفت اقلیم پوری دنیا کی بادشاہت اور اسے دس جگہ جمع کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا آدمی وہاں اور وہ اقلیم بھی وہ کہ جہاں کوئی کدورت نہیں کوئی غبار نہیں کوئی طمع نہیں کوئی پرانا پن نہیں بالکل صاف ستھری ابدی نعمت ہوگی اور دس دنیا کے برابر تو یہ حق تعالیٰ کی کریمی ہے کہ مہمان بنا کر داخل کریں گے اور جو یہاں پہنچ گیا پھر اس سے واپس نہیں لیں گے کہ اب یہیں رہو اور ابدالآباد تک رہو کوئی تمہیں نکالنے والا نہیں۔ یہ ہے سرکاری مہمان خانہ اور سرکاری مہمان خانہ ظاہر ہے کہ شاہی محلات کے قریب ہی ہوتا ہے تاکہ مہمانوں کو بادشاہ کے پاس آنے جانے میں دشواری نہ ہو دوری نہ ہو۔ جیل خانہ البتہ دور رکھتے ہیں اس لئے کہ قیدیوں سے ملنے کے کوئی معنی نہیں۔ قیدی تو دور ہی رہے تاکہ اس کو حسرت ہو کہ میں نعمت کے گھر کے قریب بھی نہیں۔

جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے ویسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے اور سرکاری جیل خانہ کا نام جہنم ہے

تو جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے ایسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے۔ سرکاری جیل خانہ کا نام شریعت کی اصطلاح میں "جہنم" ہے۔ اس میں وہ رہیں گے جو مجرم اور قیدی ہیں۔ اس کو رکھا گیا ہے ساتویں زمین کے نیچے۔ جنت رکھی گئی ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم رکھا گیا ساتویں زمین کی تہہ میں تاکہ بعید سے بعید ہو جائے وہ اللہ کی رحمت سے اور اس کے قرب کی لذت کا تصور بھی اس کے قلب میں نہ آسکے۔ اور قید کو اور عذاب کو اچھی طرح سے چکھے تو بعد بھی ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ اول تو اللہ سے بعید ہونا یہی ایک مستقل عذاب ہے اور بعید ہو کر حسی عذابات بھی ہوں اور یہ عذاب در عذاب اور عذاب ابدی اور دائمی ہوں تو یہ عذاب در عذاب ہے تو بعد بھی ہوگا عذاب کی نوعیت بھی شدید ہوگی اور ابدالآباد کا عذاب ہوگا۔ اسکے بالمقابل سرکاری مہمان خانوں کیلئے قرب بھی انتہائی (درجہ کا ہوگا کہ) ہر وقت بادشاہ کی زیارت کر سکیں۔

جنت میں زیارتِ خداوندی کے درجات

حدیث میں ہے کہ بعض تو وہ ہوں گے کہ انہیں چوبیں گھنٹے حق تعالیٰ کا مشاہدہ رہے گا۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کہ ایک لمحہ کے لئے بھی تجلیاتِ خداوندی ان کی نگاہوں سے غائب نہیں ہوں گی۔ ہر وقت اللہ کو دیکھتے رہیں گے اور بعض وہ ہوں گے کہ ہفتے میں دو تین بار زیارت ہوگی۔ جیسے کمّل اولیاء اللہ اور عامۂ مؤمنین وہ ہوں گے کہ ہفتے میں ایک بار ان کو زیارت کرائی جائے گی۔ دربار منعقد کیا جائے گا۔ انہی سو جنتوں کے اوپر دریا ہے اور دریا پر عرشِ عظیم ہے اور عرشِ عظیم کے بازو میں ایک میدان ہے جس کا نام ہے مزید اس میدان کی بڑائی کا یہ عالم ہے کہ

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی جسامت

حضرت جبرائیل علیہ السلام جو سید الملائکہ ہیں اور چھ سو بازو کے فرشتہ ہیں۔ چھ سو بازو ہیں اور جُثہ ان کا وہ ہے کہ اصلی حالت میں حضور ﷺ نے جو دیکھا انہیں دو دفعہ ایک دفعہ شب معراج میں اور ایک دفعہ وحی کی آمد کے وقت۔ وہ اس شان سے دیکھا کہ زمین سے آسمان تک جتنی فضا ہے سب بھری ہوئی ہے جبرائیل کے بدن سے۔ مشرق میں ایک مونڈھا ہے اور مغرب میں دوسرا مونڈھا ہے اور سر آسمان کے قریب ہے اور پیر زمین کے قریب اور ایک نورانی چہرہ ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے اور تاج ان کے سر کے اوپر ہے اور سبز رِدَاء (چادر) ہے ان کے بدن کے اوپر۔ اس شان سے آپ ﷺ نے دو مرتبہ دیکھا تو اتنے ڈیل ڈول کا فرشتہ حضرت جبرائیل وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس میدان میں گھومتا ہوں، مگر اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں تک ہے یہ میدان۔ وہ میدان ہے دربارِ خداوندی کا میدان۔

اللہ کی کرسی کی وسعت

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے وسط میں بچھائی جائے گی کرسی حق تعالیٰ کی، جس کا ذکر ہے قرآن کریم میں وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ کہ وہ کرسی آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے۔ حدیث میں ہے کہ کرسی جو سامنے ساتوں آسمان کے ہے (وہ ایسے ہے) جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھلا ڈال دیا جائے تو کرسی کی بڑائی اور عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے وہ کرسی بچھائی جائے گی میدان کے وسط میں۔ اس کے چاروں طرف منبر ہوں گے نور کے، وہ انبیاء علیہم السلام کے ممبر ہوں گے اور گول دائرہ بنایا جائے گا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام ان پر بیٹھیں گے اور ہر نبی کے ممبر کے پیچھے اس کی امت کی کرسیاں ہوں گی درجہ بدرجہ، جو دنیا میں جتنا زیادہ اطاعت گزار تھا اتنا ہی قریب ہوگا پیغمبر کے۔

جمعہ کا دن دربارِ خداوندی کا دن ہوگا

تو ہفتے میں ایک دن جو جمعہ کا دن ہوگا وہ دربار خداوندی کا ہوگا۔ اس دن میں تمام اہلِ جنت اپنی اپنی سواریوں پر چلیں گے اس میدان میں آنے کے لئے، اور کوئی نیچے کی جنت میں ہے، کوئی بیچ کی جنت میں ہے۔ اور کوئی اوپر کی جنت میں ہے اور سو جنتیں ہیں زمینوں اور آسمانوں سے بڑی، اس لئے ان کو سواریاں دی جائیں گی اور وہ سواریاں براق ہوں گے، رفرف ہوں گے تخت رواں ہوں گے کہ بڑی بڑی مسندیں بچھی ہوئی ہیں اور قوتِ خیال سے وہ اڑیں گے۔ کوئی مشین نہیں ہوگی کہ کل گھمانی پڑے اور پیٹرول دینا پڑے۔ اس کا سارا پیٹرول مشینری ہماری قوتِ خیال ہوگی۔ اتنی مضبوط بنادی جائیں گی کہ خیال کیا کہ وہاں پہنچیں، پل بھر میں وہاں پہنچ گئے، پل بھر میں نیچے آگئے تو پلوں میں یہ مسافتیں طے ہوں گی سب جمع ہوں گے اس میدان کے اندر اور فرمایا گیا ہے حدیث میں کہ سیٹیں متعین ہوں گی ہر ایک کی جیسے درباروں میں سیٹیں بنائی جاتی ہیں تو کارڈ چھپے ہوئے لگے ہوتے ہیں جن پر نمبر تک پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بٹھلانے والے اسی نمبر پر بیٹھنے

والے کو بٹھاتے ہیں' یہ نہیں کہ کسی دوسری پر کوئی جا بیٹھے۔ اپنی سیٹ پر (بیٹھتا ہے ہر فرد) وہاں بٹھانے والا کوئی نہیں ہو گا۔

ہر شخص اپنی جگہ اپنی طبعی کشش سے پہچان لے گا

حدیث میں ہے کہ ہر شخص اپنے مقام کو اپنی طبعی اور قلبی کشش سے پہچانے گا اور وہیں جا کر رکے گا جو اس کی سیٹ ہے اور اس کی کرسی ہے یہ نہیں ہے کہ غلطی کر جائے اس لئے کہ متمثل ہوں گے وہ مقامات جو اپنے قلب کے مقامات ہیں۔ مقامات قرب حق تعالیٰ کے نزدیک ہیں قوت ایمانی کے مقامات کے مطابق ہر شخص اپنے مقام کو خود پہچانتا ہے کہ میرا ایمان کس درجہ کا ہے' میرے اخلاق کس مرتبہ کے ہیں۔ وہی اخلاق وہی مقامات وہ متمثل کئے جائیں گے سیٹوں کی صورت میں ہر شخص اپنے اپنے مقام پر بیٹھے گا۔ انبیاء اپنے مقامات پر ہوں گے۔ اب یہ دربار پر ہو گیا' بھر گیا' کرسیاں ہوں گی اور ان کرسیوں کے پیچھے اس میدان کے کناروں پر بڑے بڑے قالین ہوں گے چبوتروں پر' اور چبوترے ہوں گے مشک اور زعفران کے اور ان پر غالیچے ہوں گے۔ عوام الناس جو کم درجہ کا ایمان رکھتے تھے ان کے پاس کرسیاں نہیں ہوں گی بلکہ وہ ان قالینوں پر بیٹھیں گے اب گویا پورا میدان بھر گیا۔ سیٹیں پر ہیں۔ انبیاء اپنی جگہ اور کرسی حق تعالیٰ کی خالی۔

دربار منعقد ہونے کے بعد تجلیات کا ظہور ہو گا

جب دربار پُر ہو گا اس کے بعد تجلیات کا ظہور شروع ہو گا کرسی کے اوپر اور یہی طریقہ بھی ہے کہ درباری جب جم جاتے ہیں ایک جگہ تب بادشاہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ بادشاہ پہلے بیٹھے ہوئے ہیں کوئی ہو نہ ہو لوگ آئیں تو بیٹھیں' جب سب جم جاتے ہیں' تب بادشاہ نکلتے ہیں اور سراپردہ کھولا جاتا ہے اور نقیب اور چوبدار آوازیں دیتے ہیں اور بادشاہ آتے ہیں تو سب تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ کے حکم سے کچھ تحائف تقسیم ہوتے ہیں' کچھ کھانے پینے کو دیا جاتا ہے۔ یہی صورت یہاں بھی ہو گی کہ تجلیاتِ ربانی کا ظہور ہو گا۔ احادیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح سے چرچرائے گی جیسے ٹوٹ کر گرنے والی ہے۔ وہ عظمت کا بوجھ ہو گا کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہے' بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے کرسی چرچرائے گی۔ تجلیات کا ظہور ہو گا اور بندے اپنے قلوب کی بصیرت سے پہچان لیں گے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں۔

تجلیات کے ظہور کے بعد جنتیوں کو مشروب پلایا جائے گا

حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے ملائکہ کو کہ جس شرابِ طہور اور پاک شربت کا ہم نے وعدہ کیا تھا وہ پلاؤ تو ملائکہ وہ نورانی صراحیاں لے کر شراب طہور تقسیم کریں گے۔ شراب کے معنی ہیں مطلق پینے کی چیز کے۔ اسے شراب نہیں کہتے جو نشے والی ہو۔ اسے خمر کہتے ہیں عربی زبان میں' شراب ہر پینے کی چیز کو کہتے ہیں' شربت کو بھی شراب کہیں گے' دودھ کو بھی شراب کہیں گے کہ پینے کی چیز ہے۔ خیر پینے کی کوئی چیز

دی جائے گی۔ اس میں سرور کی یہ کیفیت ہوگی کہ پینے کے بعد یہ محسوس ہوگا کہ غم والم کا تو ہے ہی نہیں نشان۔ رگ رگ میں فرحت اور سرور بڑھ رہی ہے اور ہر ایک میں ایک عجیب اُمنگ ہوگی اور معرفت بڑھ جائے گی اور حق تعالیٰ کی پہچان بڑھ جائے گی۔

اس موقعہ پر داؤد علیہ السلام اہلِ جنت کو مناجات سنائیں گے

اور اسی میں یہ بھی فرمائیں گے حضرت داؤد علیہ السلام کو ان کا معجزہ دیا گیا تھا آواز۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی حضرت داؤد علیہ السلام کی کہ جب وہ مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند پرند ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے، محو اور مست ہو جاتے تھے۔ یہ معجزہ ہے ان کو فرمایا جائے گا کہ اہل جنت کو وہ مناجاتیں سناؤ جو اللہ کی مدح اور ثناء میں تمہیں دی گئی تھیں اور داؤد علیہ السلام پیغمبر اور آواز بھی بڑی معجزانہ اور قربِ خداوندی، ملائکہ کا قرب، اللہ کا قرب اور تعریف، اللہ کی حمد و ثنا۔ وہ جو پڑھیں گے اپنی لے میں تو کیفیت یہ ہوگی کہ تمام اہل جنت گویا گم ہوں گے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہیں، وہ محو ہوں گے حق تعالیٰ شانہ، میں اور عجیب کیفیت طاری ہوگی۔ مشابہ اس کیفیت کے کہ جو اہل اللہ پر معرفت کے نشے میں کیفیت طاری ہوتی ہے، سکر کی اور نشے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت طاری ہوگی کہ جس سے روحانیت ہزار گنا بڑھ جائے گی۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس کا جو جی چاہے مانگے

اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے سلونی ما شئتم ۔ جس کا جو جی چاہے مانگے۔ اب سب حیران ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ عرض کریں گے کہ اے اللہ! کونسی نعمت ایسی ہے جو جنتوں میں آپ نے عطا نہیں فرمادی باقی کیا ہے کہ جس کو ہم مانگیں۔ فرمائیں گے نہیں مانگو۔ جس کو جو مرضی ہو مانگے۔ تو اب سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا مانگیں۔ ہر نعمت مل چکی ہر کھانے کی پینے کی۔ محلات، شہر، حکومت، جاہ، عزت، ساری نعمتیں مل گئیں۔ کیا چیز مانگیں اور قربِ خداوندی سے بڑھ کر نعمت نہیں اور کیا مانگیں؟ تو جب سمجھ میں نہیں آئے گا تو متوجہ ہوں گے سب لوگ علماء کی طرف کہ اہل علم سے مشورہ کریں، وہ اپنے علم کی طاقت سے کچھ بتلائیں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے کہ مانگیں؟

مولویوں کی محتاجگی جنت میں بھی ہوگی

گویا مولویوں کی محتاجگی وہاں بھی رہے گی جا کر۔ لوگ یہاں پیچھا چھڑانا چاہیں اپنا یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں بھی محتاجگی رہے گی۔ یہ محتاجگی علم کی ہوگی، کسی کی ذات کی نہیں ہوگی، آج بھی اگر ہم علماء کے محتاج ہیں تو گوشت پوست کے محتاج نہیں ہیں، وہ تو ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ انکے علم کے محتاج ہیں، وہ راہنما ہیں، راہ دکھلانے والے ہیں کہ علم سے کسی جہان میں بھی آدمی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جتنے بڑے جہان میں پہنچے گا اتنے ہی بڑے علم کی ضرورت ہوگی وہاں کی راہیں طے کرنے کے لئے، تو سب متوجہ ہوں گے علماء کی طرف کہ کیا چیز مانگیں؟ ادھر سے تو حکم ہے کہ مانگو اور ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کوئی

چیز باقی نہیں جو ہمیں نہیں مل گئی۔

جنتی جنت میں دیدارِ خداوندی مانگیں گے

وہ کہیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے، وہ مانگو، اور وہ ہے دیدارِ خداوندی۔ اس کا سوال کرو کہ اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ جس کی طمع میں ہم رات دن عبادت کرتے تھے اور عبادت میں جوش یہ ہوتا تھا کہ دیکھ لیں کسی طرح اللہ کو تو پہلے ہم دیکھتے تھے عقل کی آنکھ سے، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے ایمان اور عقیدہ کی آنکھ سے، اس کے بعد دیکھتے تھے خواب میں، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے کشف کے ساتھ۔ اب یہ سارے مراتب طے ہوگئے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے عیاناً دیکھیں اپنے پروردگار کو، یہ مانگیں گے جب سمجھ میں آجائے گا سوال ایک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ اے اللہ! سب کچھ آپ نے دے دیا، سب کچھ مل گیا، اب جمالِ خداوندی دکھلا دیجئے۔ بس ہم اس کو مانگتے ہیں۔ یہ دعا درخواست قبول کی جائے گی۔ اور حدیث میں ہے کہ پہلے حق تعالیٰ فرمائیں گے اِنَّ کما انتُم ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اس لئے کہ اگر یہ نہ فرمائیں تو لَاَحرَقتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا بَیْنَ یدیہ اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاکستر کردیں۔

چوں سلطان عزت علم برکشد

جہاں سر بزیب علم درکشد

جب سلطان عزت نمایاں ہوگا پھر وجود کس کا رہ سکتا ہے باقی، ایک آفتاب جو اس کی مخلوق ہے اگر ٹکٹکی باندھ کر ایک منٹ دیکھ لو تو غیر آفتاب سب غائب ہو جاتا ہے نگاہ سے، تو جدھر نگاہ کرتا ہے آدمی آفتاب ہی کی ٹکیہ نظر آتی ہے یا سرخ یا سبز یا زرد، غیر آفتاب محو ہو جاتا ہے، آنکھوں میں کسک نہیں رہتی کہ دیکھے۔ اپنے اندر بھی نگاہ ڈالے گا، وہاں بھی آفتاب نظر آئے گا۔ ادھر دیکھے گا وہاں بھی آفتاب، تو ایک مخلوق ہے آفتاب، اس کی نورانیت کا یہ عالم ہے کہ اگر پل بھر دیکھ لے تو ہر ماسوا غائب ہو جاتا ہے تو اللہ رب العزت کا جمال منکشف ہو اور تجلی کھلے اور پھر غیر کا کہیں وجود رہ جائے ممکن نہیں وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کو دیکھنے کے بعد وجود تو ختم نہیں ہوتا اشیاء کا، ہماری نگاہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن وہاں وجود نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ وجود کا سرچشمہ حق تعالیٰ ہے جب اصل وجود آئے گا تو ضمنی وجود کا پتہ بھی باقی نہیں رہے گا اس لئے پہلے ہی فرمادیں گے، ان کما انتم ہر چیز ٹھہری رہے اپنی جگہ اور اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ بس صرف ایک حجاب رہ جائے گا کبریا و عظمت کا، باقی سب حجابات اٹھ جائیں گے۔ اس وقت بندے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔

دیدارِ خداوندی کے سامنے ہر نعمت ہیچ ہوگی

اور اتنے گم ہوں گے کہ نہ جنت یاد رہے گی اور نہ کوئی نعمت یاد رہے گی بلکہ یوں محسوس ہوگا کہ اب تک ملی ہی نہیں تھی کوئی نعمت۔ سب چیزیں ردی تھیں جو ہمیں ملی تھیں۔ اب نعمت ہمیں ملی ہے۔ اس

دیدار کا اثر یہ ہوگا کہ قلب کے اندر قوت واطمینان پورے انشراح کے ساتھ رگ وپے میں اور زیادہ پھیل جائے گی۔ چہروں کا نور اور جمال اتنا بڑھ جائے گا کہ سوگنے تک خوبصورت اور حسین بن جائیں گے لوگ اس طرح سے یہ دربار ہفتے میں ایک دن ہوگا اور اسکے بعد فرمائیں گے کہ اہل جنت اب اپنے اپنے محلات کو جاؤ اور ہفتے بعد دوبارہ منعقد ہوگا، تو انبیاء علیہم السلام ہر وقت گویا حاضر باشانِ دربار رہیں گے، کمل اولیاء اللہ ہفتے میں دو تین بار حاضر باش ہونگے۔ عامہ مومنین کو ہفتے میں ایک دن دیا جائے گا، تو سرکاری مہمان خانہ اتنا قریب ہونا چاہئے کہ بادشاہ کے پاس آمد ورفت پائی جائے۔ اسلئے جنتوں کو رکھا گیا عرش عظیم کے نیچے۔

جنت میں روشنی عرشِ عظیم کی ہوگی

حتی کہ احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنتوں میں جو چاندنا ہوگا تو وہاں آفتاب اور ماہتاب نہیں ہوں گے آفتاب بے چارہ کی کیا حقیقت؟ عرشِ عظیم کی روشنی سے جنت روشن رہے گی، اور یکساں روشنی رہے گی وہاں رات نہیں آئے گی یکساں روشنی رہے گی اور اس کی مثال احادیث میں دی گئی ہے کہ صبح صادق کے بعد جو چاندنا ہوتا ہے سورج نکلنے سے پہلے ٹھنڈا چاندنا، تو اس کے اندر خیرہ بھی نہیں ہوتی آنکھوں میں چبھن نہیں ہوتی، بلکہ فرحت کا اثر پیدا ہوتا ہے، وہ نوعیت ہوگی جنت کے چاندنے کی اور بارہ مہینے ایک سا چاندنا رہے گا وہاں رات اور دن کا ہیر پھیر نہیں، تو جنت کی روشنی عرش کی ہوگی۔ اس سے گویا قرب دکھلایا گیا ہے کہ سرکاری مہمان خانہ ہے تو مہمانانِ خداوندی قریب میں رہیں گے۔ بعید نہیں انکو رکھا جائے گا۔ بعید تو مجرم رہا کرتے ہیں، تو مجرمین البتہ ساتویں زمین کی تہہ میں جہنم میں رکھے جائیں گے، تو میں نے عرض کیا کہ جب دارالسلطنت بنتا ہے تو سب چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ قلعہ بناتے ہیں، قلعہ کے اندر تخت رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کے سامان رکھتے ہیں اور سرکاری مہمان خانہ بنتا ہے، تو قلعہ شاہی کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وہ ذات ہے بادشاہ اللہ کی ذاتِ شاہانہ وہ ہے کہ اس نے سبع سموٰت سات آسمانوں کے تہہ بہ تہہ قلعے بنائے۔

ساتوں آسمانوں کی مضبوطی

اور فرماتے ہیں مضبوط اتنا کہ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ تم اگر غور سے دیکھو تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں، کوئی دراڑ نظر آرہا ہے، کوئی اونچ نیچ نظر آرہی ہے، کچھ بھی نظر آرہا ہے، یکساں ہے، ہزاروں برس سے یکساں ہے۔ نہ اس کی کوئی مٹی جھڑتی ہے نہ پلستر گرتا ہے، نہ کوئی اینٹ گرتی ہے، جس حالت میں ہے اسی حالت میں ہے۔

ساتوں آسمان مختلف دھاتوں کے ہیں

اسلئے کہ وہ دھاتوں سے بنائے گئے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ پہلا آسمان چاندی کا ہے، دوسرا سونے کا ہے، تیسرا زمرد کا ہے، چوتھا یاقوت کا ہے، پھر الماس کا ہے اور ساتواں آسمان خالص ایک موتی کا ہے،

لیکن کیسا ہوگا چاندی سونا؟ یہ یہاں کا چاندی سونا نہیں۔ دنیا میں چاندی سونے میں کچھ نہ کچھ کدورت کچھ نہ کچھ سیاہی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ روپیہ گننے بیٹھے تو دس پانچ منٹ میں انگلیاں کالی ہو جاتی ہیں، بو آنے لگتی ہے انگلیوں میں۔ تو وہاں کا سونا اور چاندی کدورت ملا ہوا نہیں، خالص سونا، تو وہ آسمان زمین سونے اور چاندی اور جواہرات اور موتی خالص کے ہیں اس واسطے ان میں کوئی جوڑ بھی نہیں کہ بھئی اینٹ ہی گر گئی، چونا نکل گیا، یہ نہیں۔ (ایک ذات ہے سارا آسمان) ماترى فى خلق الرحمن من تفوت۔ تم کوئی فرق نہیں دیکھو گے اللہ کی بناوٹ میں۔ اس لئے کہ یہ شاہی قلعہ ہے تمہارا مکان نہیں بنا ہوا۔ اللہ نے اپنا مکان بنایا ہے۔ ما ترى فى خلق الرحمٰن من تفوت فارجع البصر۔ پھر دوبارہ لوٹا کر نگاہ کرو هل ترى من فطور، کوئی فطور نظر آتا ہے تمہیں ثم ارجع البصر، پھر لوٹا نگاہ کو، کرتین دو مرتبہ دیکھ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسئا وهو حسير نگاہ لوٹ کر آئے گی اور نامراد واپس ہوگی، کوئی عیب لے کر نہیں آئے گی۔

چونکہ دارالسلطنت کو انتہائی طور پر مضبوط بناتے ہیں فطرت یہ ہے تو فطرت الٰہی سے یہ فطرت انسانوں نے لی ہے وہاں اصل فطرت نے کام کیا تو سب سے پہلے دارالحکومت کی تعمیر کی گئی اور اس میں سات شہر پناہیں بنائی گئیں اور شہر پناہوں کے اندر فوجیں رکھی گئیں۔

اللہ تعالیٰ کی فوج ملائکہ ہیں

اور فوجیں ہیں ملائکہ، جو نہایت ہی قوی فوج ہے کہ اگر سارے جہان، ساری کائنات سارے شیاطین بھی مل جائیں تو ایک فرشتہ ان کے قابو میں نہیں آسکتا۔

حضرت جبرئیل امین کی دو صفتیں امین اور قوی

حدیث میں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں کہ ان کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں قرآن کریم میں ایک قوی اور ایک امین کہ وہ قوی بھی ہیں اور امانت دار بھی ہیں تو امانت کے بارے میں تو یہ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل کہ لاکھوں اسرار اللہ کے میرے سینے میں ہیں، آج تک میں نے ظاہر نہیں کئے حق تعالیٰ ہی کا امر ہوتا ہے تو کسی مخصوص بندے پر کوئی ایک چیز ظاہر کرتا ہوں۔ جس سے ہم لوگ عارف کہلانے لگتے ہیں، کہ معرفت رکھتے ہیں، اسرار خداوندی کو جاننے والے ہیں تو کروڑوں اسرار میں سے بذریعہ ملائکہ کے کوئی ایک آدھ چیز قلب میں ڈال دی جاتی ہے وہ ہماری معرفت بن جاتی ہے تو اس ذات کے بارے میں قیاس کیا جائے کہ جبرئیل کتنے بڑے عارف اور کتنے بڑے صاحب معرفت ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لاکھوں اسرار میرے سینے میں محفوظ ہیں آج تک میں نے انہیں کسی پر ظاہر نہیں کیا، وہ امانت خداوندی ہیں، تو امانت کا تو یہ حال ہے اور قوت کا یہ عالم ہے کہ جب لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تو جبرئیل کو حکم دیا کہ تم پلٹ دو ان کی بستیاں۔ انہوں نے ایک ہاتھ ڈال کر وہ سارے شہر اور اقلیم ایک ہاتھ سے اٹھا کر اوندھے کر دیے ان کو پلٹ دیا، یہ حال قوت کا ہے تو فرشتے کی یہ طاقت ہے تو جیسا بادشاہ ویسی اس

کی فوج، بادشاہ لامحدود قوت والا ہے تو اس کی فوج بھی اتنی قوت والی ہے۔ کہ ایک فرشتہ پورے جہاں کے لئے کافی ہے سب کو لوٹ دے اٹھا کر، تو ملائکہ علیہم السلام ان آسمانوں میں مقیم کئے گئے جیسے فوجی۔

جیسے اللہ تعالیٰ پاک ہیں ویسے ہی انکی فوج پاک ہے

تو چونکہ بادشاہ سبوح قدوس ہے اور پاک ہے اسلئے فوجیں بھی پاک، دنیا کی فوجوں میں تو حد درجے کا تعیش بھی ہوتا ہے آزادی بھی ہوتی ہے مثل مشہور ہے کہ فوجی کو تو سات خون معاف ہیں جس پہ چاہے گولی چلادی کسی بستی میں گھس گئی تو ناموس تباہ ہوتا رہتا ہے۔ آبروئیں جاتی رہتی ہیں۔ کھیت اجڑ جاتے ہیں، باغ اجڑ جاتے ہیں، لیکن وہ اللہ کی فوج ہے اس کے قلعوں کے محافظ ہیں وہ بھی پاکباز مخلوق ہیں۔ بل عباد مکرمون نہایت ہی کرام اور مکرم بندے ہیں کرامت والے بندے ہیں۔ سب صاحبِ کرامت۔ اور لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون۔ کبھی نافرمانی نہیں کی اللہ کی ہمیشہ پابند ہیں احکام ربانی کے۔ منشاء خداوندی کو پاتے ہیں تو کر چلتے ہیں، تو مخلوق بھی نہایت پاکباز ہے جس کی فوج بنائی گئی ہے کہ اس سے زیادہ مطیع اور مقدس مخلوق دوسری نہیں اور ان کا کام رات دن اطاعت اور عبادت ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبات نہ ہو تو اتنی فوجیں رکھی گئی ہیں کہ چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی سپاہی موجود نہ ہو تو ان گنت فوج اس لئے کہ جیسا بادشاہ ویسی بادشاہی، ویسی ہی اس کی فوج، ویسی ہی پاکباز فوج، گویا سات قلعے بنے اس میں فوج رکھی گئیں اس کے اوپر وہ خندق ہے جو سمندر ہے جس کی ایک ایک موج زمینوں آسمانوں کے برابر ہے اور اس کے اوپر جا کر ہے کرسی اور کرسی اتنی بڑی کہ سارے آسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے چھلا۔

کرسی در حقیقت عرشِ الٰہی کا پائیدان ہے

وہ کرسی پائیدان ہے عرش کا، کرسی کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ تخت پر چڑھنے کے لئے جو سیڑھی بنائی جاتی ہے وہ کرسی در حقیقت پائیدان ہے عرش پر چڑھنے کا، تو جب سیڑھی اتنی بڑی ہے تو عرش کتنا بڑا ہوگا جو ساری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے تو یہ تختِ شاہی ہے جس سے یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ، تدبیراتِ الٰہیہ جاری ہوتی ہیں۔

عرش سے تدبیراتِ الٰہیہ جاری ہوتی ہیں

ان جہانوں میں جو کچھ چیزیں ہیں وہ دنیا ہو یا ستارے ہوں ان سب میں جو امر خداوندی جاری ہے، وہ عرش سے چلتا ہے احکام وہاں سے نافذ ہوتے ہیں۔ یدبر الامر تدبیر امر وہاں سے ہوتی ہے تو عرش عظیم گویا سب سے بڑی علامت ہے حکومت کی اور اسی واسطے کہا کرتے ہیں کہ تخت کے سامنے نذریں پیش کی جائیں گی۔ یوں نہیں کہتے کہ بادشاہ کو نذر دے رہے ہیں۔ درباری تخت کے سامنے نذر پیش کر رہے ہیں۔ یعنی بادشاہ تو بڑی چیز ہے۔ وہاں کس کی پہنچ، تختِ شاہی کے پائے کو چومتے ہیں وہی اظہارِ عقیدت ہوتا ہے بادشاہ

ہے، تو عرشِ عظیم گویا علامت ہے شہنشاہی الٰہی کی کہ اس کے سامنے نذریں پیش کرتے ہیں اس کے سامنے اطاعت کیلئے جھکتے ہیں۔

سورج جب نکلتا ہے تو عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوکر چلنے کی اجازت حاصل کرتا ہے

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سورج جب نکلتا ہے تو اذن حاصل کرتا ہے پہلے سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے اور پھر کہتا ہے اجازت ہے جانے کی اجازت مل جاتی ہے تو پھر اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ دورے کے بعد پھر پہنچا پھر اذن چاہا قیامت کے دن فرمائیں گے کہ آگے جانے کی اجازت نہیں پیچھے لوٹ جا تو آفتاب طلوع کرے گا مغرب سے اور وسط میں آکر پھر لوٹ جائے گا۔ اور اس کے بعد میں پھر حسبِ معمول طلوع و غروب ہونے لگے گا۔ یہ علامت کبریٰ ہوگی قیامت کی، تو بہر حال تخت کے سامنے جھکنا یہ بادشاہ کے آگے جھکنا ہے تو سب سے بڑا نورانی کرہ اس عالم میں آفتاب ہے وہ روزانہ سجدہ کرکے عرش کے نیچے اجازت طلب کرتا ہے، تب اسے اجازت ملتی ہے جانے کی، تو سرکاری مہمان خانہ بھی ہو گیا اور شاہی قلعہ بھی ہو گیا اور شاہی قلعہ کی فوج بھی ہوگئی اور عرشِ عظیم بھی اس کے اوپر ٹک گیا۔

بادشاہ کیلئے تاج ہوتا ہے لیکن وہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب نہیں

اب بادشاہ کے لئے تاج بھی درکار ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے تاج مناسب نہیں کہ تاج سر کے اوپر ہوتا ہے بادشاہ کے، اور اللہ علیؔ العظیم ہے، اس سے بلند کوئی چیز نہیں۔

اللہ کے تاج کی مثال

اس واسطے وہاں تاج کی مثال ایسی رکھی گئی کہ عرش پر حق تعالیٰ نے ایک لوح اور تختی رکھی کہ جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں سے بھی کہیں زیادہ ہے اس پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔ ان رحمتی سبقت غضبی میری رحمت ہمیشہ میرے غضب کے اوپر غالب رہے گی۔ اگر گنہگار آئے کہ نیکیاں بھی کی ہوں اور جرم بھی پہلے رحمت بڑھے گی کہ نیکیوں کا صلہ لے غضب نہیں بڑھے گا کہ اسکو سزا دے۔ اگر کسی نے جرائم ہی جرائم کئے ہوں تو مجبوری کو غضب بڑھے گا، ورنہ رحمت ہی بڑھے گی اور اٹھائے گی آغوش رحمت میں تو یہ دستاویز رکھی۔ یہ وہ ہے جسے کہا کرتے ہیں حکومت کی پالیسی، حکومت جب پالیسی بناتی ہے، منشور بناتی ہے تو فلاں قوم کے ساتھ یہ یہ برتاؤ ہوگا اور فلاں کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا، وہ پالیسی طے ہو جاتی ہے تو پھر وزراء امراء سب اسی پر عمل کرتے ہیں تو پالیسی حکومت الٰہی کی یہ طے ہوئی کہ رحمت غالب رہیگی۔ غضب پیچھے رہیگا۔

الرحمٰن علی العرش استوٰی فرمایا دیگر صفات ذکر نہیں کیں

اسی واسطے عرش عظیم پر جب بادشاہی کی حیثیت سے حق تعالیٰ نے استوا فرمایا تو فرماتے ہیں **الرحمٰن علی العرش استوی** رحمٰن چھا گیا عرش کے اوپر، یوں نہیں کہا **القھار علی العرش استوی** قہر والا چھا گیا۔ **الغضاب علی العرش استوی** غضب والا چھا گیا۔ اگر غضب کی تجلی چھاتی تو ساری کائنات ختم ہو جاتی۔

رحمت کے ساتھ سب کے ساتھ معاملہ کیا جارہا ہے۔ یہ رحمت ساتھ ہے، تو شکل ایسی بن گئی کہ ساری کائنات، اس کے اوپر آسمان اس کے اوپر دریا اس کے اوپر عرش، عرش کے اوپر رحمت خداوندی تو گویا پوری کائنات کو رحمت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ رحمت نے چلا رکھا ہے۔

غضبناک بادشاہ ملک کو زیادہ دیر نہیں چلا سکتا

اس سے گویا اشارہ نکلتا ہے کہ جو بادشاہ غضبناک ہو وہ ملک کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتا۔ وہی بادشاہ چلا سکتا ہے جس میں شفقت اور کرم غالب ہو اور جس کے اندر قہر اور غضب اور تعصب اور عناد غالب ہو گا، زیادہ دیر اس کی حکومت نہیں چل سکتی وہ ختم ہو جائے گی گویا اصول نکل آیا کہ پائیدار حکومت بنانا چاہتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بناؤ جو رحیم و کریم ہو، جس کی رحمت غالب ہو، غضب مجبوری کو جائے۔ جب مجرمین تنگ ہی کر دیں تب جا کر کے غضب کے احکام نازل کرے ورنہ رحمت چلتی رہے تو پہلے تو فرمایا **الذی خلق سبع سموٰت طباقا** بادشاہانہ ذات ہے اللہ کی جس نے سات طبق یعنی آسمان بنائے اور **ما تری فی خلق الرحمن من تفوت** تم اللہ کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں محسوس کرو گے اور ہم کہتے ہیں **فارجع البصر** نگاہ کو لوٹاؤ، غور کرو، ہے کوئی فرق؟ نہیں ہے۔ پھر لوٹاؤ دوبارہ لوٹاؤ تو لوٹ کر آجائے گی نگاہ مگر کوئی عیب اور فرق نہیں نکال سکے گی۔

آسمانوں کو ستاروں سے مزین کیوں کیا گیا

اب ظاہر بات ہے کہ قلعے تو بن گئے مگر اس میں اندھیرا بھٹ پڑا ہو تو رہنے والے کیسے رہیں گے، ظلمت ہو، تاریکی ہو تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا کام کیسے چلے گا اس لئے آگے فرمایا **ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح** بڑے بڑے چراغوں اور ہنڈوں سے ہم نے روشن کیا آسمانِ دنیا کو اور وہ چاند اور ہنڈے وہ چاند، سورج ہیں، ستارے ہیں، اور وہ ہماری ضرورت اس لئے کہ آسمان سے بالاتر جو عرش عظیم کی روشنی ہے، جنتوں میں بھی وہاں خوب صورت چاند کی نہیں چلتی یہ تو معمولی درجے کی روشنی ہے تو دنیا والوں کو ضرورت تھی۔ انہی کے لئے چھت بنایا آسمانِ دنیا کو اور طبعی طور پر لالٹینیں چھت میں ٹانگی جاتی ہیں۔ زمین میں چراغ کوئی نہیں رکھا کرتا یا دیوار پر لگاتا ہے یا چھت کے قریب اور جب بجلی کی روشنی ہو تو قمقمے تو چھت ہی میں ٹانگے جاتے ہیں تکلف کے طور پر وہ دیوار میں لگا لے لیکن اصل مقام ہے چھت۔ اسی واسطے دنیا کی چھت بنایا آسمان دنیا کو اور اس آسمان سے نیچے یہ تمام ہنڈوں کا ایک نظام سجادیا۔ کوئی زیادہ روشن کوئی کم روشن، سورج تیز روشن ہے تاکہ کام کاج کر سکیں۔ دن کا وقت ہے رات میں ضرورت پڑتی ہے سونے کی تو سورج نہیں چمکایا چاند چمکایا تاکہ ٹھنڈی روشنی ہو، بالکل اندھیرا گھُپ ہو گا تو وحشت بڑھے گی۔ نیند نہیں آئے گی۔ کچھ چاندنا بھی ہو، مگر چبھنے والا نہ ہو نگاہوں میں، تو چاند کی روشنی رکھی۔

چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے مستفاد ہے

یہ وہی سورج کی روشنی ہے مگر وہ ریفریجریٹر کے اندر کو نکل رہی ہے کہ جو ٹھنڈی کر کے پیش کی جاتی ہے تو وہی سورج کی روشنی یہاں ٹھنڈی بنادی گئی، چاند میں، اور اگر چاند بھی نہ ہو تو کروڑوں ستارے روشن کر دیے کہ کچھ نہ کچھ چاندنا رہتا ہے زمین پر، اگر ایک بھی ستارہ نہ ہوتا تو اندھیرا گھپ ہو جاتا اس لئے فرمایا کہ ہم نے کائنات بنائی تو روشنی کا بھی سامان کیا: ولقد زيّنا السمآء الدنيا بمصابيح.

جتنی بڑی سلطنت اتنے ہی بڑے اسکے دشمن

اب ظاہر بات ہے کہ جتنی بڑی سلطنت ہوتی ہے اتنے ہی بڑے دشمن بھی ہوتے ہیں تو فوجیں بے شک قوی ہیں، سلطنت بڑی عظیم ہے مگر جتنی بڑی حکومت ہے اتنے بڑے ہی دشمن بھی۔ سارے شیاطین دشمن ہی تو ہیں یہ کب چاہتے ہیں کہ اللہ کا حکم چلے۔ انبیاء علیہم السلام احکام لے کر آتے ہیں۔ ساتھ ہی انہیں چلانا چاہتے ہیں، لیکن قدم قدم پر شیطان رکاوٹیں ڈالتا ہے ایک پل بھر کے لئے شیاطین نہیں چاہتے کہ احکامِ خداوندی دنیا میں چلیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ سارے آدمی مل کر اللہ کے دشمن بن جائیں۔ مدمقابل آجائیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا فرمائی

تو حق تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا کی، حالانکہ اس کی حکومت کو ضرورت نہیں تھی مگر ایک مخالف پارٹی پیدا کی تاکہ اس کا کام یہی ہو کہ اللہ کی حکومت میں دین میں اعتراضات نکالتی رہے۔

اپوزیشن پارٹی کا فائدہ

تاکہ دوست تو یہ سمجھیں کہ بھئی یہ اعتراض کی چیز ہے اس کا یہ جواب دیں گے تو ان کا علم وسیع ہوگا اور دشمن جتنے ہیں وہ بھول بھلیاں میں رہیں تاکہ اچانک جب عذاب آئے پنجہ گرفتاری کا تو اس وقت اچانک گرفتار کرلیا جائے، تو دوست بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اپوزیشن پارٹی سے، دشمن عداوت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، دوست محبت اور دوستی میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مخالف پارٹی کا وجود فطری چیز ہے

تو بہرحال ایک مخالف پارٹی کا وجود فطرت ہے ضروری ہے، ترقی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مخالفت کرنے والی کوئی جماعت نہ ہو۔ اس واسطے شیاطین کی جماعت پیدا فرمائی جس کا کام ہے مخالفت، اور وہ جیسے دنیا میں نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو ویسے ہی آسمانوں میں بھی نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو۔ لیکن آسمان ہیں قلعے۔ اگر وہاں حکومت ختم ہو تو دنیا میں بھی حکومت باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے ان کی کوشش ہے کہ وہیں سے مٹانے کی کوشش کرو اس لئے حق تعالیٰ نے حفاظتی سامان بنایا تو فرمایا کہ ستارے جو ہم نے مصباح اور چراغ بنادئے ہیں انہی سے بموں کا بھی کام لیتے ہیں وجعلنا ها رجوما للشيطين۔ جہاں

شیاطین آسمانوں کے کناروں تک پہنچے اور یہ بم ان کے اوپر برسنے شروع ہوئے شہاب ثاقب، اور یہ بھسم ہو جاتے ہیں تو گویا ملائکہ علیہم السلام سارا گولہ بارود کا سامان لئے ہوئے ہیں۔ بم بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں دشمن الٰہی پہنچا قریب آسمانوں کے وہیں سے انہوں نے وہ گولہ پھینک کے مارا اور وہ بھسم ہوا۔

ستاروں سے دو کام لئے جاتے ہیں

تو فرماتے ہیں کہ ان چراغوں سے ہم دو کام لیتے ہیں ایک روشنی کا اور اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے دفع کرنے کا، تو مدافعت کا سامان بھی ہمرے یہاں پورا اور پوری طاقت موجود، ساری دنیا کے شیاطین جمع ہو جائیں وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ دروازے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے وہ ذرا قریب پہنچے وہیں سے بم پڑا ان کے۔ وجعلناھا رجوما للشیطین اب اس کے بعد خیر شیاطین تو پٹ پٹا گئے مگر وہ انسانوں کے دشمن ہیں وہ تو چاہتے ہیں کہ انہیں بھی اللہ سے جدا کرو تو بہت سو کو ورغلانے سے خدا کی دشمنی پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ انبیاء کی بھی مخالفت کریں، اولیاء اللہ کی بھی مخالفت کریں، علماء ربانی کی بھی، صلحاء امت کی بھی سب کے مد مقابل آئیں اور ایسی ایسی چیزیں کہیں کہ حق کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

اپوزیشن پارٹی دنیا میں ختم نہیں کی جائے گی

انہیں ہم دنیا میں تباہ نہیں کریں گے، دنیا تو آزمائش گاہ ہے، اور وہیں یہ تباہ ہو جائیں تو حق کے علو کا سامان کیا رہے؟ حق تو باطل ہی کے مقابلے میں اونچا ہوتا ہے تو باطل بھی باقی رکھیں گے۔ باقی اخیر میں ایک جیل خانہ ہم نے تیار کر رکھا ہے ان مجرموں کے لئے، تو یہ شیاطین مع اپنے شتونگڑوں کے مع اپنی پارٹی کے سب اس کے اندر جائیں گے اور وہ اپوزیشن پارٹی وہ ساری کی ساری ختم کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ حکمرانی کا کارخانہ جنتوں میں خالص حق کا ہوگا۔ باطل کا نشان نہیں، دنیا میں حق اور باطل کی آمیزش تھی۔ دونوں پرتیاں گندم کیں جب وہ مخلوق میں رکھا اور مخلوق کا عالم ختم ہو گیا اب رہ گئے خالص عالم تو جنت خالص حق کا عالم ہے اور جہنم خالص مصیبت کا عالم ہے ساری اپوزیشن وہاں اور سارے مطیع یہاں الگ الگ کر دیے جائیں گے۔ تو وَجَعَلْنَاهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ان کے لئے ہم نے ایک نہایت ہی کھولتا ہوا عذاب تیار کر رکھا ہے وہ وہاں پہنچا دیے جائیں گے۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ

جہنم جو سرکاری جیل خانہ ہے اسکی کیفیت کیا ہو گی

اور ساتھ میں ان کی کیفیت بھی بیان کی کہ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ جب وہ داخل کیے جائیں گے جہنم میں تو جہنم کے جوش کا یہ عالم ہوگا کہ جیسے غضب ناک ایک چیز ہوتی ہے اور پھٹ پڑے جوش سے ہیبت ناک آوازیں اور اس کی ہیبت ناک لپیٹیں اور اسکی ہیبت ناک تیزی یہ معلوم ہوگا کہ جیسے کھول رہی ہے اور غضب ناک ہے پھٹ پڑیگی۔ تکاد تمیز من الغیظ گویا پھٹ جائے گی غیظ کے سبب۔

جہنم کے محافظ جہنمیوں سے سوال کریں گے

اِذَآ اُلْقِیَ فِیْھَا فَوْجٌ جب کوئی پارٹی ڈالی جائے گی کفار کی تو سوال کریں گے جہنم کے محافظ و نگران ملائکہ کہ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا جس نے اس جہنم سے تمہیں ڈرایا ہو اس عذاب خداوندی سے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ پہنچا مگر ان پر اتمام حجت کے لئے اور ان میں حسرت پیدا کرنے کیلئے کہ عذاب دو گنا تگنا ہو جائے قوم سے کہیں گے کہ الم یاتکم نذیر کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں پہنچا کسی نے نہیں بتلایا کہ اللہ کا جیل خانہ بھی تیار ہے؟

جہنمی جواب دیں گے

قَالُوْا بَلٰی شرمندگی سے کہیں گے کہ ہاں پہنچے۔ بَلٰی قَدْ جَآءَ نَا نَذِیْرٌ آئے ہمارے پاس ڈرانے والے جنہوں نے راستہ دکھایا، محبت اور پیار سے سمجھایا بلی قد جاء نا نذیر فکذبنا ہم نے انہیں جھٹلایا۔ وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ اور ہم نے کہا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں بھیجی، یہ تمہارے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں۔ کچھ مولویوں نے بنالیا ہے کچھ علماء نے بنالیا ہے یہ بنائی ہوئی چیزیں ہیں خدانے کوئی چیز نہیں بھیجی اس نے تو عقل بھیجی وہ ہمارے پاس موجود ہے ہم سمجھتے ہیں اس سے، فَکَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ وَ قَالُوْا اس وقت وہ کہیں گے لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ کہیں گے، اے کاش ہم کچھ سوچ لیتے یا مان لیتے تو یہ عذاب کا دن ہمیں نصیب نہ ہوتا۔

حق ماننے کی دو صورتیں ہیں

اس لئے کہ حق ماننے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ ہے کہ آدمی بلاچوں چراں مان لے کہ یہ کہنے والا حق پر ہے اس کے ساتھ علامت حقانیت تھی تو مان لے تو سمع اور طاعت بھی کہ کانوں سے سنا اور اطاعت کی اور اگر محض سن کر اطاعت نہ ہو کچھ چھان بین کی ضرورت ہے تو پھر عقل دی ہے اللہ نے اس عقل سے غور کرے اور حق طلب کرنے کی کوشش کرے تو وعدہ خداوندی ہے کہ جب عقل لڑا کر چاہے گا آدمی کہ ہدایت پاجاؤں تو ضرور ہدایت دیں گے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا جو ہمارے رستے میں جدوجہد کرے گا، ہم ضرور اسے راستہ دکھلائیں گے تو دیکھنے کی راستے کے دو ہی صورتیں ہیں یا سمع و اطاعت کہ سن کر اطمینان کرلے اور مان لے آدمی یا یہ کہ پھر عقل لڑا کر غور کرلے اور سوچ سمجھ کر مانے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دونوں سے کام نہ لیا۔ لو کنا نسمع او نعقل ہم سن لیتے انبیاء کی بات یا خود اپنی عقل سے سوچتے کہ کوئی فرمانروا موجود ہے کوئی بادشاہِ عالمین موجود ہے تو ما کنا فی اصحاب السعیر پھر ہم ان جہنم والوں میں سے نہ بنتے مگر ہم نے وہ چیز کھودی وہ وقت گزار دیا۔ لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر فاعترفوا بذنبھم ؕ

جہنمی اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے

اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا مگر اس وقت اعتراف کرنے سے کیا فائدہ؟ مثل مشہور ہے

کہ اب سوچ سمجھ کر کیا کرو گے کہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ جب کھیت ہی نہیں رہا اور چڑیاں ہی نہیں ہیں اب اگر تم نے پرکھا کہ چڑیاں نہیں ہیں تو اب کیا پرکھنا۔ یہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔

آخرت میں ہر ایک مومن بن جائیگا

وہاں تو ہر ایک مومن بن جائے گا جاکے۔ آزمائشی ایمان تو دنیا میں تھا کہ مخالف اسباب موجود تھے، مگر پھر انبیاء کی حقانیت کو سامنے رکھ کر سب چیزوں کو پرے ڈال کر آدمی اطاعت کرتا سنتا تو کہیں گے افسوس ہم نے وقت کھودیا۔ فاعترفوا بذنبهم اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا مگر اس وقت جواب کیا ہوگا۔ فسحقا لاصحاب السعير پھٹکار ہو ان لوگوں کے لئے ان کو دور دھکیل دو یہ قریب بھی نہ آنے پائیں اور زیادہ بعید (دور) سے جہنم میں ڈال دو فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔

یہ تو نہ ماننے والوں کا حشر ہوا ماننے والوں کا کیا بنے گا؟

اب جب مجرموں کی بات بتلادی تو سوال پیدا ہوا کہ مطیعوں کا حشر کیا ہوگا؟ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۔ اور جو لوگ غیب سے ڈرتے تھے غیب مطلق یعنی حق تعالیٰ کو مانا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کو ہم آنکھ سے دیکھ لیں جب مانیں گے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے اللہ کو جب تک آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے تو غیبی چیزیں دیکھ کر نہیں مانی جاتیں سمجھ کر مانی جاتی ہیں ان الذین یخشون ربهم جوڈرتے بھی تھے اللہ سے اور انہیں خطرہ لگا ہوا تھا کہ وقت آخر آنے والا ہے جس غیب سے ہم یہاں آئے ہیں لوٹ کر پھر اسی غیب میں جانے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ جنہوں نے خوف اور خشیت اللہ اختیار کیا قلب کی رقت اور نرمی اختیار کی اور جب کوئی حق کی بات سامنے آئی تو گردن جھکادی کہ حق ماننے ہی کے لئے ہوتا ہے۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے یعنی اگر ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہوئے وہ بخش دئے جائیں گے اس لئے کہ نیت ان کی نیک ہے۔ عقیدت ان کے قلب میں موجود تھی۔ بشریت سے کچھ لغزشیں ہو گئیں تو ہماری طرف سے مغفرت تیار ہے اور جو نیکیاں کیں اس کے لئے اجر عظیم تیار ہے۔ پاکیزہ ثمرات تیار ہیں۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔

ایک قاعدہ کلیہ کا ذکر

آگے پھر ایک کلیہ فرمادیا کہ تم کسی بات کو چھپاؤ یا کھول کر کہو وہ تمہارے دلوں کی کھٹک سے واقف ہے کوئی چیز تم اللہ سے نہیں چھپا سکتے وہاں، مخلوق سے تم نے پردہ ڈال دیا چھپالی چیزیں مگر وہاں جاکر تو سب عیاں ہو جائیں گی وہ ساری پردہ داریاں، وہ سارے پردے وہاں چاک ہو جائیں گے انه عليم بذات الصدور اور اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ کیا پیدا کرنے والا جانے گا نہیں کہ میں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟ پہلے تو اسی کو علم ہوگا کہ اس مخلوق میں کیا چیزیں رکھ رہا ہوں کتنی عقل رکھی

ہے میں نے کتنا فہم رکھا کتنا علم رکھا تو جو بنانے والا ہے مخلوق کا وہ تو اس کے اندر باہر سے سب طرح واقف ہے۔ ورنہ وہ خالق ہی کیسا جو واقف نہ ہو تو عقلی دلیل بھی بیان فرما دی اور نقلی بھی۔ فرمایا کہ وہ علیم بذات الصدور ہے اور کیوں نہیں ہو گا علیم بذات الصدور الا یعلم من خلق کیا خالق بھی نہیں جانے گا مخلوق کو اور کون جاننے والا ہو گا؟ وھوا للطیف الخبیر اور اس کے لئے پھر دلیل یہ ہے کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ جسم سے بھی پاک اور روح سے بھی پاک اس لئے وہ تو ہر چیز کی رگوں کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے رگ رگ کی اسے اطلاع ہے اور پتہ ہے۔

اللہ کی ذات منبع انکشاف ہے

اس کی ذات ہی منبع انکشاف ہے اسے کوئی باہر سے خبر نہیں دیتا اس کی ذات میں سے علم پھوٹتا ہے جیسے آفتاب میں سے کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔ یہ ہوا گویا پہلے رکوع کا خلاصہ کہ جس کے اندر ذات بابرکات خداوندی کو بیان کیا گیا۔ پھر ان صفات کو جو بادشاہ کے لئے ضروری ہیں پھر ان لوازمِ سلطنت کو جو بادشاہت کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس ایک رکوع کا یہ خلاصہ ہے۔ اب دعا کر لیجئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ط وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ o ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَاءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ o اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَاءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ط فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرٌ o وَلَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرٌ o

وہی ہے جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست، اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اسی کی طرف جی اٹھنا ہے، کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں پھر تبھی وہ لرزنے لگے۔ یا نڈر ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسادے تم پر مینہ پتھروں کا سو جان لوگے کیسا ہے میرا ڈرانا، اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے پھر کیسا ہوا میرا عذاب۔

ملک اور ملکوت میں فرق

ایک حصہ تو وہ ہے جو ان آنکھوں سے نظر آتا ہے اور آسکتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے جو حصہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اس کا نام ہے ملک اور جو حصہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے ملکوت۔ دو حصے ہوئے حکمرانی کے ایک ملک اور ایک ملکوت۔ جیسا کہ شروع میں فرمایا گیا کہ تبارک الذی بیدہ الملک برکت والی وہ ذات ہے کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے تو ملک کے جتنے حصے آنکھوں سے نظر آتے ہیں وہ ملک میں داخل ہیں اور وہ عرش سے لے کر فرش تک اور فرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جتنے حصے ہیں ان سب کا نام ہے ملک اور جو روحانی آنکھ سے دیکھے

جاتے ہیں یعنی عالم روحانیات ہیں اس کو ملکوت کہتے ہیں جس کو سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا کہ:

فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ

پاک ہے وہ ذات کہ جس کے قبضے میں ہے ملکوت ہر چیز کا۔

یعنی ہر چیز کی روحانیت اور معنویت وہ بھی اس کا ملک ہے تو ظاہر اور باطن دونوں پر اسی کی حکمرانی ہے۔ ظاہر کا ملک عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جس میں عرش عظیم، کرسی، جنتیں آسمان اور پھر زمین اور زمین کے نیچے جہنم، یہ سب عالم ملک ہے اور ان کے اندر جو روحانیت اور معنویت کام کر رہی ہے عرش سے لے کر فرش تک اسی کا نام ہے ملکوت وہ باطنی حصہ ہے۔

ملک کے تین علاقے قرار دیئے گئے ہیں

تو اس ملک کے گویا تین علاقے قرار دیے گئے ہیں ایک آسمانوں سے اوپر اوپر، جس میں جنتیں، عرش، کرسی سب داخل ہیں، اور ایک آسمانوں سے نیچے نیچے جس میں زمینیں اور دنیا اور اس کے نیچے جہنم یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ ان سب کے کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کرتے ہیں حکم اس کا چلتا ہے۔ وسائل وہ ہوتے ہیں۔ جیسے آسمانوں میں ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ تو سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جن کی حکومت پورے عالم سمٰوات میں ہے۔

دنیا میں کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں

اس دنیا کے اندر کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں، تو اصل تو ہیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ماتحت ان کی وفات کے بعد پھر جو رہتے ہیں ان میں پھر عہدے ہیں، کسی کا نام ابدال ہے کوئی اقطاب ہے، کوئی اغواث ہے اس طرح سے تفصیل ہے من جانب اللہ۔

دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں کہ جن کا حکم چلتا ہے باطنی طور پر، ظاہری حکام کے قلوب میں وہی چیز ڈالی جاتی ہے جو ابدالوں میں طے ہوتی ہے۔ ابدالوں کے نیچے ہیں پھر اقطاب، چالیس ابدال ہیں وہ شام میں رہتے ہیں اور جو ایک وفات پاتا ہے نیچے سے ترقی دے کر ابدالوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ چالیس کا عدد پورا رہتا ہے پھر اقطاب ہیں ان کے نیچے، پھر اغواث، درجہ بدرجہ۔ یہ گویا ذمہ دار بنائے گئے ہیں اس دنیا کے، تو ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی مشیت وارد ہوتی ہے اور وہ اسی مشیت سے پھر قلب سے ہمتیں متوجہ کرتے ہیں ان ہمتوں سے ظاہری حکماء کے دل میں وہ چیزیں پڑتی ہیں کہ جو ظاہری حکم چلتا ہے۔

اللہ کا خلیفہ اعظم

اور پھر حق تعالیٰ کی جانب سے ایک شخصیت وہ بنائی گئی ہے کہ ملک سے لے کر ملکوت تک اسی کی حکمرانی قائم کی گئی ہے۔ وہ اللہ کا خلیفہ اعظم ہے اور وہ ہیں نبی کریم ﷺ کہ سمٰوٰت و ارضین میں آپ

کے اثرات ہیں۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چار وزیر ہیں دو آسمان میں دو زمین میں

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرے چار وزیر ہیں وزیرا ی فی السماء وزیرا ی فی الدنیا دو وزیر میرے آسمانوں میں ہیں اور وہ ہیں حضرت جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام اور دو وزیر میرے دنیا میں ہیں اور وہ ہیں ابو بکر صدیق اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) جو ان کے قائم مقام چلتے ہیں دنیا میں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی وزارت عالم سمٰوٰت میں بھی قائم ہے اور عالم ارض میں بھی جیسے بادشاہ کے ماتحت ایک نائب السلطنت ہوتا ہے کہ پوری سلطنت میں اس کا حکم اور اس کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ وہ ذاتِ بابرکات ہے نبی کریم ﷺ کی، تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کے دو وزیر آسمانوں میں ہیں اور دو وزیر دنیا میں ہیں (اور ظاہر ہے کہ وزیر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بادشاہ کے زیر اثر رہ کر احکام چلائیں) اور آپ کی ماتحتی قائم کر دی گئی ان سب کے اوپر، اس کا ظہور فرمایا گیا شب معراج میں کہ مسجدِ اقصیٰ میں نبی کریم ﷺ کو امام بنایا گیا اور تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام ملائکہ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام جو ان کے ذمہ دار ہیں انہوں نے اقتداء کی۔ گویا ظاہراً بھی دکھلایا گیا کہ آپ بالادست ہیں اور آپ کے ماتحت ہیں انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام، تو اس طرح سے عالم ملک کا انتظام بٹا ہوا ہے۔ لیکن ایک شخصیت ملک اور ملکوت دونوں میں ہی کام کر رہی ہے اور مشیت خداوندی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہے تو اس کا ایک حصہ تو ہے آسمان اور ایک حصہ زمین اور ایک حصہ ہے بیچ میں جو اور فضا خلا جسے کہتے ہیں یہ تابع ہے آسمانوں کے اور زمینوں کے گویا زمین کا پہلے آسمان پر جو فضا ہے اور آسمانوں کا ماحول ہے زمین پر وہی فضا ہے تو فضا بیچ میں ہے دونوں جہانوں کے اس لئے اصل دو عالم نکل آئے ہیں ایک عالم سمٰوٰت اور ایک عالم ارضین۔

پہلے رکوع میں عالم سمٰوٰت کا ذکر ہے

تو عالم سمٰوٰت کا ذکر تو پہلے رکوع میں کیا گیا ہے جس کی کچھ تفصیل ابھی کی گئی کہ اس میں جنتیں بھی آجاتی ہیں جہنم بھی، ماننے والے بھی نہ ماننے والے بھی۔ قانونِ خداوندی ذات وصفات حق تعالیٰ کی یہ پہلے رکوع میں بیان کی گئیں۔

دوسرے رکوع میں زمین کا ذکر ہے

اس دوسرے رکوع میں ذکر ہے زمین کا۔ جس کو فرمایا کہ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ۔ انسانوں کو خطاب فرمایا جا رہا ہے کہ زمین کو ہم نے تمہارے لئے ذلیل بنا دیا تمہارے کام میں لگا دیا کتنا عظیم کرہ ہے زمین کا جس میں ہزاروں پہاڑ ہیں، جنگل ہیں بحر ہے، بر ہے۔ وہ سب تمہارے لئے مسخر کیا گیا کہ اس کے مادے سے تم کام کرو۔ سب سے پہلی چیز ہے انتفاع اس سے نفع اٹھانا۔

زمین میں ہر چیز کے خزانے رکھ دیئے گئے ہیں

تو زمین میں خزانے رکھ دیئے گئے رزق کے مثلاً کھانے پینے کی چیزیں وہ سب زمین سے نکلتی ہیں اسی طرح سے معدنیات ہیں جواہرات ہیں وہ سب زمین سے نکلتے ہیں۔ سونا ہو چاندی ہو اسی طرح سے اور معدنیات ہیں جیسے تیل کے چشمے ہیں، پٹرول ہے کوئلہ ہے یہ سب چیزیں انسانوں کے کام میں آتی ہیں اور اللہ نے انسانوں کے اندر فطرت میں انکی ڈال دیا ان چیزوں کا تصرف کہ وہ کھود کرید کر کے پتہ چلاتا ہے کہ تیل کی خزانے کہاں ہیں؟ جواہرات کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ سونا کہاں سے نکلے گا؟ چاندی کہاں سے نکلے گی؟ اس کی تدبیریں ذہن میں ڈال دی گئیں کہ مشینوں کے ذریعے یا ہاتھ سے دستکاری کے ذریعہ مٹی سے سونے کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے چاندی کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے تیل اگر نکلے اس میں اجزاء زمین کے ملے ہوئے ہوتے ہیں تو صاف کرنے کا یہ طریقہ ہے پہلے لوگ اپنی دستکاری سے صفائی کرتے تھے اب دور مشینی دور ہے تو مشینوں کی بات اللہ نے ذہنوں میں ڈال دی اور ایسی ایسی مشینیں ایجاد کر لیں انسان نے کہ منٹوں میں ہزاروں من مٹی میں سے سونا نکال لیتے ہیں چاندی نکال لیتے ہیں، اسی طرح سے جواہرات، اسی طرح سے قسم قسم کے پتھر، سنگ خارا اور سنگِ مرمر کی پھر اقسام ہیں سرخ اور سبز اور زرد وہ وہ سب انسان نکالتا ہے اور پھر کاموں میں لاتا ہے تاکہ دنیا میں تصرفات چلیں۔

زمین کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے

تو فرمایا کہ ہم نے ذلیل کر دیا تمہارے لئے زمین کو وہ چوں نہیں کر سکتی۔ حالانکہ تمہاری اصل ہے تم سے کہیں زیادہ بڑی ہے لیکن اس کو کھودے جاؤ، اس میں نہریں بناؤ کنوئیں بناؤ ذرا بھی چوں وچرا نہیں کرتی اور تمہارے ہاتھ میں مسخر ہے اس کے اخلال طبعی یعنی جگر کے ٹکڑے سونے چاندی نکالے جاؤ وہ ذرا بھی چوں نہیں کرتی۔ یہ سب تمہارے لئے حاضر ہے پھر اس میں تصرف کی طاقت بھی رکھی کہ دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز پیدا کر لو۔

انسانی ایجاد کی حقیقت

یہی انسان کی ایجاد کی حقیقت ہے۔ ایجاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی مادہ خود پیدا کر دے سونے کو خود پیدا کر دے، چاندی کو پیدا کر دے، یہ نہیں ہے، بلکہ چند چیزوں کو ملا کر ایک چیز نکال لیتا ہے، یا دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز بنا لیتا ہے۔ دو درخت ہیں دو قسم کے پھل ہیں۔ ان میں قلم لگایا اور ایک تیسری نوع تیار کر لی۔ سونے اور چاندی کو ملایا تو اس سے طرح طرح کے ظروف اور برتن بنا لئے۔ تو انسان کی ایجاد حقیقت ترکیب اور تحلیل دو چیزوں کو ملا کر تیسری چیز بنا لینا یا ایک چیز کا تجزیہ کر کے اس سے اجزاء نکال لینا اور اس سے چیزیں بنانا تو ترکیب کر دینا دو کی یا ایک کی تحلیل کر کے اس کے اجزاء کر دینا۔ یہی انسان کی ایجاد کا حاصل ہے ایک ذرہ برابر زمین نہیں پیدا کر سکتا آدمی، پیدا شدہ میں سے کام نکال سکتا ہے آفتاب کی ایک

کرن ساری دنیا کے انسان ملیں تو نہیں بنا سکتے، لیکن ان کرنوں کی گرمی اور روشنی سے طرح طرح کی چیزیں بنا سکتے ہیں۔

ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل ہے

ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل نکل آتا ہے اس میں تصرف کئے جاؤ اور نکالے جاؤ، تو پیدا کی ہوئی تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں ان کو جوڑنا، کھول دینا، ملا دینا، الگ کر دینا اس کی طاقت انسان کو دی گئی ہے اس سے وہ اپنے کام نکالتا رہتا ہے تو زمین کو ہم نے تمہارے لئے ذلیل بنا دیا ہے اور زمین ہی میں سارے خزانے چھپے ہوئے ہیں ان خزانوں کو تمہارے ہاتھ میں مسخر کر دیا اس کے لئے ضرورت پڑتی ہے کہ آدمی چلے اور پھرے زمین میں تاکہ ان معدنیات کا پتہ چلائے کتنے سفر کرنے پڑتے ہیں اس لئے فرمایا کہ فامشوا فی مناکبھا زمین کے کندھوں پر چلو اور پھرو سفر کرو اور سیر کرو کہیں آدمی پیدل چلتا ہے، پیدل نہیں چل سکتا تو سواریاں، کچھ قدرتی سواریاں ہیں کہ گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر جائے آدمی، جس کو فرمایا کہ والخیل والبغال والحمیر لترکبوا ھا وزینۃ۔ گھوڑے اور گدھے اور خچر یہ سب کے سب ہم نے تمہارے لئے بنائے۔ لترکبو ھا تاکہ تم سواری بھی کرو ان پر و زینۃ اور اپنا ٹھاٹ اور کرو فر بھی دکھلاؤ جب جلوس نکلتے ہیں گھوڑوں پر، ہاتھیوں پر، بڑی بڑی جھولیں دھرپال ڈالی جاتی ہیں تاکہ حشم خدم پیدا ہو، تو زینت بھی ہے اور سواری بھی ویخلق مالا تعلمون، فرمایا یہ تو وہ سواریاں ہیں جو آج موجود ہیں اور جو آگے اللہ پیدا کرے گا وہ اور بہت ہیں سو برس پہلے دو سو برس پہلے کس کو خبر تھی کہ موٹر ایجاد ہو جائے گا۔ ریلیں ایجاد ہو جائیں گی۔ یہ اونٹ جو سواریاں ہیں ان پر سواریاں شروع کیں، جب یہ ریل اور موٹر ایجاد ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایروپلین ایجاد ہو جائیں گے ہوائی جہاز، آج ہوائی جہاز ایجاد ہوئے تو مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے آدمی، پھر ان جہازوں میں نئی نئی ایجادات ہیں کہ ایک جہاز ڈھائی سو میل چلتا تھا تو پانچ سو میل کی رفتار فی گھنٹہ میں نکال لیا انہوں نے اب اس کے بعد اطلاعات آ رہی ہیں کہ ایک گھنٹہ میں ایک ہزار میل اڑے گا ہوائی جہاز یا پندرہ سو میل اُڑے گا تو پندرہ سو میل ایک گھنٹہ میں ایک ہزار گھنٹہ میں طے ہوں گے ڈھائی ہزار میل ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہو جائیں گے۔ گویا یہاں سے آدمی ڈیڑھ گھنٹہ میں جدہ پہنچ جائے گا اور جدہ سے آدھ گھنٹہ میں مکہ پہنچ جائیگا اور ایک وقت آئیگا کہ آدمی چائے پی کر گھر سے کہے گا کہ میں ذرا عمرہ کر آؤں جا کے اور کھانا یہیں کھاؤں گا آ کے' تو وہ چائے پی کی جائے گا ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچ گیا عمرہ کیا اور جہاز سے واپس آکر گھر پر کھانا کھا لیا تو جو مسافت کہ آدمی اپنے پیروں سے نہیں طے کر سکتا تھا۔ حق تعالیٰ نے قلوب میں ایسی حکمتیں القاء فرمائیں کہ نئی سے نئی سواری آدمی نے ایجاد کی تو فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِھَا زمین کے کندھوں پر تم چلو اور زمین کے تابع ہے فضا تو فضا میں اڑو وہ بھی اس کے ساتھ میں آگئی تو آسمان زمین کے درمیان میں جو ہے اور خلا ہے اس میں بھی انسان اپنی سواریاں پہنچا رہا ہے حتیٰ کہ اس نے ہمتیں

باندھیں کہ میں تو چاند پر پہنچ جاؤں گا اور اگر وہ پہنچنا چاہے اور اللہ تعالیٰ قدرت دے تو پہنچ بھی سکتا ہے آدمی اس میں کوئی مانع نہیں ہے کوئی ممنوع نہیں ہے وہ چیز' فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا (زمین کے کندھوں پر تم چلو)۔

سیر وسفر کا حاصل

اب سارے سیر وسفر کا حاصل کیا ہے کہ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ زمین کے رزق سے فائدہ اٹھاؤ کھانے کی چیز سے کھانے کا فائدہ استعمالی چیز سے استعمال کا فائدہ زینت کی چیز سے زینت کا فائدہ' کچھ پیٹ میں جاتی ہیں چیزیں کچھ بدن کے اوپر رہتی ہیں اور کچھ بدن کے باہر رہتی ہیں۔ پیٹ میں کھانا جاتا ہے۔ بدن کے اوپر لباس رہتا ہے۔ لباس سے باہر باہر مکان اور بلڈنگ اور بنگلے رہتے ہیں اور یہ سب زمین ہی سے پیدا ہو رہے ہیں سب کے مادے زمین ہی سے نکل رہے ہیں تو زمین کو ایک عجیب وغریب خزانہ حق تعالیٰ شانہ' نے بنادیا اور انسان کے ہاتھ میں دے دیا کہ کرو تصرف' اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی تصرف سے روکا نہیں گیا بلکہ منشاء قدرت ہے کہ تصرف کرو۔

سب کچھ کرو مگر ہمیں مت بھولو

مگر ایک چیز بتلادی کہ سب کچھ کرو مگر ہمیں مت بھولو' اس لئے کہ ہم ہی تو ہیں محسن حقیقی ہم نے ہی تو یہ زمین بنائی' ہم نے ہی تو تمہارے دلوں میں یہ چیزیں ڈالیں کہ کس طرح اس زمین کے مادے کو اس کی نعمتوں کو استعمال کرو' تو یہ سارا کا سارا جو کچھ بھی ہے ہمارے انعام اور احسان کا ثمرہ ہے۔

بد فطرت اور سلیم الفطرت انسان

تو بد فطرت ہوگا وہ انسان کہ منعم کا انعام کمائے اور منعم کو بھول جائے۔ محسن کے احسان سے فائدہ اٹھائے اور محسن کو بھلادے' وہ بد فطرت کہلائے گا' سلیم الفطرت انسان وہ ہے کہ جتنی نعمت بخشی جائے اتنا ہی شکر بڑھتا جائے' اتنی ہی طاعت بڑھتی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ سلیم الفطرت انسان ہے۔

اللہ نے سب سے زیادہ نعمتیں انسان کو عطا کیں

دنیا کی ہر چیز کو اللہ نے نعمتوں سے مالا مال کیا مگر سب سے زیادہ نعمتیں جو دیں وہ انسان کو عطا کیں' سب سے زیادہ چہیتی مخلوق اللہ کی اور پیاری مخلوق انسان ہے اس لئے اسے وہ کچھ دیا کہ وہ کسی کو نہیں ملا اسی کو ایک جگہ فرمایا گیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔

ہم نے انسان کو معظم اور مکرم بنایا اور بحر و بر میں اسے اٹھایا کہ بر میں بھی جہاں چاہے چلا جائے اور بحر میں بھی جہاں چاہے چلا جائے' بر کے لئے سواریاں الگ دیں' دریا کے لئے سواریاں الگ دیں' فضا کے لئے سواریاں الگ دیں' دنیا کا ہر جاندار اپنے پیروں سے چلتا ہے' آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ گھوڑا گھوڑے پر سوار ہو کر جائے' شیر شیر پہ' سانپ سانپ پر' بچھو بچھو پر ہر ایک چیز اپنے پیروں پر سفر کرتی ہے حتی کہ دریا میں بھی

اگر جائے تو تیر کر نکلتی ہے۔ یہ کرامت انسان کو دی گئی کہ دریا میں جائے تو سواریں موجود' خشکی میں چلے تو سواریاں موجود' فضاء میں جائے تو سواریاں موجود تو حَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔

ہر جاندار کی غذا متعین ہے اور انسان کے لئے ہر چیز وقف ہے

پھر دنیا کے جس جاندار کو دیکھیں گے آپ اس کی ایک غذا متعین ہے' شیر مثلاً خون ہی پیئے گا' گوشت ہی کھائے گا' پرندے ہیں وہ دانہ چگیں گے وہ گوشت نہیں کھاتے' حیوان چرندے ہیں وہ گھاس کھائیں گے' لیکن انسان کے لئے ساری چیزیں وقف ہیں' گھاس یہ کھاجائے' ماس یہ کھاجائے' مٹی یہ کھاجائے' پتھر یہ کھا جائے۔ سونا اور چاندی یہ کھا جائے جواہرات یہ کھا جائے' اول تو ساری چیزیں مٹی سے بنی ہوئی ہیں' تو مٹی کھاتا ہے آدمی ویسے بھی مٹی کھاتا ہے' اب یہ پان کھاتے ہیں ہم' یہ چونا مٹی کے سوا اور کیا ہے' پتھر بھی کھا لیا آدمی نے' پھر سونے اور چاندی کہیں ورق بن رہے ہیں تو وہ دواؤں میں کام آرہے ہیں' سونے اور چاندی کے زیور تو الگ ہیں کھانے میں بھی سونا اور چاندی استعمال کیا جاتا ہے' جواہرات ہیں تو یاقوتیاں بنتی ہیں وہ مقوی باہ ہوتی ہیں' وہ مقوی بدن ہوتی ہیں تو یاقوت اور زمرد بھی کھاجاتا ہے آدمی' تو گھاس بھی کھاجائے' ماس بھی کھاجائے' پتھر بھی کھاجائے' مٹی بھی کھاجائے۔ پھر کون سی سبزی ہے جو نہیں کھاتا آدمی ترکاریاں ہر قسم کی بجزاس کے کوئی کڑوی ہو اور نہ چلے منہ میں تو چھوڑ دے اس کی عنایت ہے۔ کھانے والی اسے بھی کھاجاتے ہیں تو غرض دنیا کی ہر چیز کھاتا ہے انسان' تو فرمایا کہ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ہر پاکیزہ چیز ہم نے انسان کو دی ناپاک چیز سے روک دیا کہ وہ مت کھاؤ' کھانے کے لئے بہتیری چیزیں ہیں پاک' مردار مت کھاؤ' خنزیر مت کھاؤ' شراب مت پیئو کہ یہ چیزیں نجس بنائی گئی ہیں تم نجاستوں کے استعمال کے لئے نہیں بنائے گئے' تم بنائے گئے ہو پاک باز معظم اور مکرم' تو تمہاری غذا بھی پاک ہونی چاہیئے نہ کہ ناپاک چیزیں تو پاک چیزیں اتنی بنا دی ہیں کہ ان کی حد و نہایت نہیں' تو یہ کیا مصیبت ہے کہ ناپاک کی طرف جائے آدمی' ناپاک کی طرف جب جائیکہ جب پاک چیزیں نہ ہوں' حرام خوری جب کرے کہ جب حلال چیزیں نہ ہوں' ناجائز پیشہ جب اختیار کرے کہ جائز پیشہ نہ ہو' تجارت ہے' زراعت ہے' صحافت ہے' ملازمت ہے' صنعت ہے' حرفت ہے کیا ضروری ہے کہ آدمی سود ہی لے اور رشوت ہی لے اور چوری کرے اور ڈکیتی کرے یہ ناجائز پیشے ہیں' تو جائز اس لئے لگادیئے ہیں ہم نے کہ اگر ان کے اندر محدود رہو تو حرام اور ناجائز کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہ صرف حرص و ہوس ہے کہ انجام سے بے خبر ہو کر حرام چیزوں میں پڑ جاتا ہے آدمی جس سے دنیا بھی ضائع ہوجاتی ہے۔ آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

سب چیزیں تمہارے لئے ہیں استعمال کرو مگر اُصول کے تحت

اس لئے فرمایا کہ زمین مسخر' سارے خزانے تمہارے' استعمال کرو مگر اللہ کو مت بھولو' یعنی ان اصول کے تحت رہو کہ جو اللہ نے حرام و حلال کے اصول بنادیئے' جائزات کے حدود میں رہو' اسراف مت کرو'

اپنے استعمال میں چیز لاؤ' مگر فضول خرچی سے نہیں بلکہ حدود کے اندر' دوسرے کو استعمال کے لئے دو' عنایت کرو' ہدیہ دو مگر حدود کے اندر' یہ ہدیہ نہیں ہے کہ سارا گھر لٹادے آدمی' اور یہ بھی نہیں ہے کہ امساک اور بخل میں آکر ایک پائی بھی نہ نکلے اس کے ہاتھ سے' تو دینے میں عطا کرنے میں بھی درمیانہ چال ہونی چاہیئے' اپنے استعمال میں درمیانی چال ہونی چاہیئے' حتی کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ دریا کے کنارے بیٹھ کر وضو کرو تو لَا تُسْرِفْ فِي الْمَآءِ اسراف مت کرو کہ خواہ مخواہ پانی اچھال رہے ہو بیٹھے ہوئے اور ایک لوٹے میں وضو ہو سکتا ہے تو دو گھڑوں میں وضو کر لیا وہ اسراف میں شمار ہوگا' کپڑا پہنو' مگر حدود کے اندر' فرمایا گیا ہے کہ جو آستین پہونچوں سے نیچے لگی ہوئی ہو وہ اسبال اور سدل کے حکم میں ہے وہ فضول خرچی ہے اس پر مواخذہ ہوگا عند اللہ' تو کپڑا پہننے میں بھی حد بندی کر دی' کھانے پینے میں بھی حد بندی کر دی۔ خزانے پر بیٹھے ہو مگر حدود کے اندر استعمال کرو' یہ مت سمجھو کہ جب دس لاکھ روپے ہیں میرے پاس تو جس طرح چاہے خرچ کر لوں' اس میں بھی حد بندی ہے کہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرو' نہ اتنا خرچ کرو کہ کل کو تم خود بھک منگے بن جاؤ' نہ اتنا امساک اور بخل کرو کہ نہ اپنے کام آئے نہ غیر کے کام آئے' ایک درمیانہ چال رہے انہیں اصول پر چلنا اور جائزاتِ شرعیہ کے اندر رہنا یہی ہے حد بندی اور اللہ کو یاد کرنا۔

اللہ کو یاد کرنے کے دو معنی ہیں

تو ایک اللہ کو یاد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ استعمال کرتے وقت قلب میں غفلت نہ ہو' ذکر جاری ہو کوئی اچھی چیز کھائی تو اَلْحَمْدُلِلّٰه کہے' ابتداء کرے کھانے کی تو بِسْمِ اللّٰهِ سے کرے' لباس پہنے آدمی تو بِسْمِ اللّٰهِ سے لباس پہنے' اور جب پہن لے آدمی تو حمد و ثناء کرے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا۔ اللہ کی حمد ہے کہ جس نے مجھے پہننے کو دیا۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ اللہ کی حمد ہے کہ اس پر کہ مجھے کھانے کو دیا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانِیْ۔ الحمد للہ کہ مجھے پینے کو دیا' گھر میں داخل ہوں تو ذکر اللہ یہ ہے کہ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ هٰذَا الْبَیْتَ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ بلڈنگ دی' یہ مجھے مکان دیا تو قدم قدم پر دعائیں بتلائیں تاکہ مالک یاد رہے تو ایک تو ذکر اللہ کے یہ معنی ہیں کہ آدمی دعائیں پڑھتا رہے مختلف اوقات کی جو دعائیں بتلائی گئی ہیں ان کو استعمال کرتا رہے۔ حمد و ثناء کرتا رہے۔

ہر چیز کو اصول شرعیہ کے مطابق استعمال کرنا بھی ذِکر اللہ میں داخل ہے

اور دوسرے یہ ہے کہ اس شئے کو اصولِ شریعت کے مطابق استعمال کرے یہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے چاہے زبان سے ذکر اللہ ہو یا نہ ہو مگر جب جائز کی حد میں ہے' طریقۂ شرعیہ پر چل رہا ہے' سنت کے مطابق چل رہا ہے وہ عمل ذکر ہے اگرچہ زبان پر ذکر نہیں تو ذکر اللہ کے اور مُنعم اور محسن کو یاد کرنے کے دو طریقے بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ زبان سے یاد کرو اس کے لئے وہ دعائیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیں اور اگر کسی کو وہ دعا نہ بھی یاد ہو تو ہر کام میں جو نعمت ہو کہے اے اللہ' تیرا شکر ہے' یہ تو کہہ

سکتا ہے' استنجا کر کے واپس آئے اگر دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کہے کہ اے اللہ تیرا شکر ہے میرے اندر سے تو نے فضلات نکال دیئے' میں ہلکا ہوگیا یہ تو کہہ سکتا ہے زبان سے' سونے کے لئے لیٹے اگر وہ دعا یاد نہ ہو تو آیۃ الکرسی پڑھ کر سو جائے' بسم اللہ پڑھ کر سو جائے۔ غرض اللہ کے نام سے سوئے' جاگ جائے تو گویا موت کے بعد زندگی دی (اللہ نے) تو چاہیئے کہ وہ دعا پڑھے جو حدیث میں فرمائی گئی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے مجھے موت کے بعد زندگی دی اور میں اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہوں۔

لیکن اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کلمہ ہی پڑھتا ہوا اُٹھے آدمی' سبحان اللہ کہتا ہوا اٹھے' اَلْحَمْدُلِلّٰہ کہہ کر اُٹھے' تو ایک ہے لسانی ذکر اس میں اعلیٰ ترین طریقہ وہ ہے کہ سنت کے مطابق جو الفاظ ثابت ہیں انہیں یاد کر لے بچوں کو یاد کرا دیئے جائیں با آسانی یاد کر لیں گے' جو بچے پورا قرآن شریف یاد کر لیتے ہیں وہ کیا دعائیں حدیث کی یاد نہیں کر سکتے' مہینے بھر میں سب دعائیں یاد ہو جائیں گی اور اگر نہ ہو تو کم سے کم اللہ کا نام زبان پر ہو یہ لسانی ذکر ہے اور ایک یہ کہ ہر چیز کے استعمال میں یہ دیکھ لے کہ شریعت کے مطابق کر رہا ہوں استعمال یا نہیں' وہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے' کمانے کے لئے بیٹھے آدمی تو یہ دیکھ لے کہ جائز پیشہ اختیار کیا ہے یا ناجائز' جائز کو اختیار کرے یہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہے یہ بھی اللہ کی یاد ہے تو فرماتے ہیں کہ نعمتیں استعمال کرو' کوئی روک نہیں' مگر حدود میں رہ کر اسراف نہ ہو فضول خرچی نہ ہو جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا کہ یٰٓاَیُّھَاالرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اے رسولوں کے گروہ پاک غذائیں استعمال کرو پاک چیزیں استعمال کرو کھانے کی ہوں پہننے کی ہوں' لیکن عمل صالح کرتے رہو وہ ذکر اللہ آگیا تاکہ محسن کا حق ادا ہوتا رہے اور اس کا احسان دل کے اندر تازہ بہ تازہ رہے یہ جو نمازیں پڑھتے ہیں یہ بھی وہی ذکر اللہ ہے کہ اے اللہ ہم نے نعمتیں استعمال کیں مگر آپ کو نہیں بھلایا جو اوقات فرض کر دیئے حاضر ہیں آپ کی بارگاہ میں۔

مؤذن کی اذان محض اعلان نہیں ہے

مؤذن اذان دیتا ہے اللہ اکبر' اللہ اکبر یہ محض اعلان نہیں کہ اطلاع دے دی جائے کہ آجاؤ نماز کے لیے یہ یاد دلانا ہے ذکر اللہ کا کہ تم ہر وقت اللہ کی کبریائی اور عظمت دل میں رکھو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ توحید اپنے دل میں رکھو' اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ نبوت کی عظمت اور عقیدت اپنے دل میں رکھو' حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ نماز کی طرف جھکو حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ دنیا و آخرت کی بہبود اور فلاح کی طرف آؤ' تو کبریاءِ خداوندی' توحید الٰہی' نبوتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ یاد دلانے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ مؤذن پانچ وقت تاکہ بندے غفلت میں نہ پڑ جائیں اور اگر پڑے ہوئے ہوں اپنی نعمتوں میں تو اذان کی آواز سنتے ہی چونک جائیں ایک دم کہ اب ہمیں حق بھی ادا کرنا ہے اس محسن کا کہ جس نے یہ ساری نعمتیں دیں' اس لئے فرمایا کہ زمین کی نعمتیں استعمال کرو اس کے کندھوں پر سیر و سیاحت کرو' سفر کرو' مگر ہمیں مت بھلاؤ۔ اس لئے کہ اگر تم

بھول گئے تو وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ دیکھو کل کو آنا ہمارے سامنے یہی رہنا ہوتا تو دنیا میں ابد الآباد تک کے لئے تب بھی انسان یہ غور کرتا کہ جانا تو مجھے ہے ہی (چاہے یاد کروں چاہے نہ کروں) چھوڑنا ہے ایک دن زمین کو اور موت کا منظر سامنے ہے ہزاروں لاکھوں انسان گزر رہے ہیں۔ اس زمین کو چھوڑ کر جارہے ہیں جو لکھ پتی تھے وہ بھی جارہے ہیں جو بھک منگے تھے وہ بھی جارہے ہیں غرض ایک نہ ایک دن اس زمین کو چھوڑنا ہے اور اس کی ساری نعمتوں کو چھوڑنا ہے اور چھوڑ کر جانا ہے؟ فرماتے ہیں ہمارے ہی پاس تو آنا ہے جہاں سے گئے تھے وہیں تو لوٹ کر آؤ گے تو اس دن کو بھی یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اسے بھلا دو اور اس کو فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ

اللہ کے حضور میں ہر شخص تنہا جائے گا

فرماتے ہیں کہ دیکھو ہمارے پاس تم تنہا تنہا آؤ گے کوئی لشکر ساتھ نہیں ہوگا بادشاہ ہے وہ بھی اسی زمین فرشِ خاک پر جائے گا ہمارے پاس' اور فقیر ہے وہ بھی اسی فرشِ خاک پر' کوئی لاؤ لشکر تمہارے ساتھ نہیں ہوگا تو جیسے تنہا ہم نے بھیجا تھا تمہیں کہ ماں کے پیٹ میں تم ہی تھے اسی طرح سے زمین کے پیٹ میں جو اصل ماں ہے تم تنہا ہی آنے والے ہو' پھر اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی تمہارے ساتھ لاؤ لشکر ہوگا جو ہمارے مقابلے میں تمہاری مدد کریگا تنہا آؤ گے اور اگر ساری دنیا کا لشکر لیکر بھی آؤ تو ہمارے مقابلہ میں کیا چل سکتی ہے تمہاری' ہم تو خالق ہیں پیدا کرنے والے ہیں۔ جب چاہیں موت دے دیں' جب چاہیں ضعیف کردیں' جب چاہیں کمزور بنادیں تو مقابلہ تو اس کا کرو جو عاجز ہو قادرِ مطلق کا مقابلہ کیا۔ تو اول تو تم تنہا آؤ گے یہ سارا لاؤ لشکر یہیں رہ جائیگا۔ اور اگر کسی کے ساتھ بالفرض ہو بھی لشکر ہمارے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا۔

ایک شبہ کا حل

یہاں سے انسان کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اللہ کا لشکر تو فرشتے ہیں جو دارالسلطنت میں رہتے ہیں آسمانوں کے اندر رہیں...... جو میں ہیں فضائیں ہیں بھلا اتنے لشکر آوے گا۔ اتنے ہم اپنا کام بھی کرلیویں گے تو کیا ضرورت ہے یاد کریں' مقابلہ کے لئے تیاری کرلو اس سے ہم اپنا کام کر گزریں گے۔ بہر حال لشکر کے بننے سنورتے دیر لگتی ہے اتنے میں ہمارا کام ہو جائے گا تو کیا مقابلہ ہوگا؟ اس لئے آگے فرمایا کہ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ تم فرشتوں کے لشکر کو لے رہے ہو یہ زمین بھی تو ہمارا لشکر ہے اگر اس کو ہم زلزلے سے دھنسا دیں اور سب دھنستے ہی چلے جاؤ تو کسی فرشتے کے بھی آنے کی ضرورت نہیں جو زمین فرش بنی ہوئی تھی وہی قبر بن جاتی ہے منٹ بھر کے اندر اسی میں دفن ہو جاتا ہے آدمی تو ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ کیا آسمان والے سے تم بے پروا ہو گئے اگر زمین کو ہم زلزلے میں ڈال دیں اور لگے موجیں مارنے اور جگہ جگہ اس میں دراڑ کھل جائیں اور پناہ نہ ملے تب کیا ہوگا؟ فرشتوں کو

آتے آتے اگر بالفرض دیر بھی لگی تو لشکر اوپر کا کیا آئے گا یہ تو نیچے ہی لشکر موجود ہے اور میں کہتا ہوں زمین بھی بعد کی چیز ہے ایک چیونٹی کو مسلط کر دے کان میں گھس جائے بس زندگی ختم ہے انسان کی' ایک کیڑا مکوڑا ناک میں گھس جائے زندگی ختم ہے انسان کی' تو ایک چیونٹی جسے ختم کر سکتی ہے وہ مطمئن ہو کر بیٹھے گا قادر مطلق کی طرف سے کہ فرشتے آویں گے مقابلہ ہوگا دیکھی جائے گی' فرشتے تو بعد میں آویں گے جو تمہارا فرشِ خاک ہے وہی تمہارے لئے مقابلہ کا لشکر ہے اس کی پیداوار میں ایک چیونٹی تمہارا مقابلہ کر سکتی ہے۔

نمرود کی سرکشی اور اس کا انجام

نمرود جیسے عظیم بادشاہ کو جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کا دماغ نیچے آتا ہی نہیں تھا وہ تو کہتا تھا کہ میں ربّ ہوں' اس کو کیسا نیچا دکھایا کہ ایک مچھر اس کی ناک میں گھس گیا اور دماغ میں جا کر لپٹ گیا اور وہ پُھر پُھر کرتا تھا۔ اب وہ بے چین تو طریقہ یہ رکھا تھا اس نے' ایک خادم مقرر تھا کہ وہ جوتے سر پر مارتا تھا جب جوتے پڑتے تھے تو ذرا دیر کے لئے ٹھہر گیا مچھر' اور جہاں جوتے الگ ہوتے پھر پُھر پُھر ایا' پھر اس نے خادم کو بلوایا تو جن پر خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا انہیں کے ہاتھ سے جوتے پٹوا دیئے سر پر' تو مطلب یہ ہے کہ چیونٹیاں بھی بعد کی چیز ہیں خود انسان ہی کو مسلط کر دے تمہارے اوپر جس کو تم اپنا بندہ جانتے ہو خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو اسے ہی جوتیاں دے کر تمہارے سر پر مسلط کر دیئے تو کیا کرو گے' تو خالق سے بچ کر کہاں جائے گا آدمی' تو زمین ہے' زمین کی پیداوار ہے اور خود انسان ہے وہ تمہارے حق میں مدِ مقابل آجائیں گے اور ایک فوج انسانوں کی کھڑی کر دے اور وہ تلواریں لے کر آجائے تو سارا کروفر رہ جاتا ہے تو انسان ہی انسان کو بتلا دیتا ہے وہ در حقیقت خدا کی طرف سے مسلط ہوتا ہے لشکر' تاکہ متکبروں کا غرور توڑ دیا جائے نخوت شعاروں کی نخوت توڑ دی جائے' انسان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ بہرحال ایک وقت آتا ہے کہ ہماری طرف آؤ گے اور آنے کے سلسلے میں موت بھی قبول کرنی پڑے گی۔

موت کے ہزاروں اسباب ہیں

اور موت کے اسباب ہزاروں ہیں جانور کاٹ لے ہارٹ فیل ہو جائے زمین میں دھنس جائے' کوئی اوپر سے آپڑے مصیبت' ہزاروں اسباب ہیں کہ جن کے ذریعے سے ہم تک آؤ گے تو اس وقت کو بھی یاد رکھو کہ سدا یہ وقت نہیں رہے گا کہ بلڈنگ بھی ہے دولت بھی ہے کام چل رہا ہے یہ سب وقتی چیزیں ہیں۔ اصل وہی وقت ہے کہ جو آنے والا ہے۔ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ اسی کی طرف تمہیں چھیل کر جانا ہے تو ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ زمین میں ہی دھنسا دے تو کیا ہوگا اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا کیا تم مطمئن ہو مامون ہو آسمان والے سے اگر پتھر برسا دے آسمان سے' بادل آئیں اور بجائے پانی برسنے کے پتھر برسنے لگیں اور میں کہتا ہوں کہ یہ جو اولے پڑتے ہیں پتھر ہی تو ہیں اسی پانی کو منجمد

کر کے جما کر پتھر کی شکل دے دیتے ہیں اگر وہ بڑھ جائیں دو دو سیر کا ایک ایک اولہ پڑنے لگے تو پناہ نہیں مل سکتی' مکان ٹوٹ جاتے ہیں ڈھ جاتے ہیں انسان تو بجائے خود ہے تو کس چیز نے تمہیں مطمئن بنا رکھا ہے مالک کی طرف سے کون سی پناہ گاہ ہے کہ اس سے بچ کر تم اس میں پناہ پالو گے؟

موت سے کسی طرح نہیں بچا جا سکتا

اَیْنَ مَاتَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ اگر تم بڑے بڑے سنگین قلعوں میں' بڑے بڑے پتھر کے برجوں میں' لوہے کے برجوں میں رہو گے موت وہیں جا پکڑے گی' یہ نہیں ہے کہ موت میدان میں آتی ہے اگر برجوں کے اندر تم کوئی مَنْفَذْ ہی نہ رکھو ہوا کا راستہ نہیں تو حبس دم ہو کہ آدمی ختم ہو جائے۔ ہوا کا راستہ رکھو تو بھی بہر حال ختم ہو سکتا ہے تو فرشتے موت کے ان کے یہاں نہ سنگین کوئی چیز ہے نہ لوہے کے قلعے کوئی چیز ہیں جیسے بجلی جب آتی ہے تو کتنا ہی بڑا لوہا ہو وہ تو اس کے جگر میں سما جاتی ہے تو ملائکہ تو بجلی سے بھی زیادہ لطیف ہیں وہ ہر چیز میں سما کر اندر دخول کرتے ہیں تو موت کے فرشتے وہیں پہنچ جائیں گے تو فرماتے ہیں کہ زمین بھی سبب موت بن سکتی ہے۔ پانی بھی سببِ موت بن سکتا ہے' بادل بھی سببِ موت بن سکتے ہیں اولے برس جائیں' پتھر برس جائیں۔

آخر لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے اور کیوں برسائے گئے اس لئے کہ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا' جائز طریقہ دیا گیا تھا کہ نکاح سے عورتوں کی طرف آؤ انہوں نے لڑکوں کو استعمال کیا۔ اس لواطت کے جرم میں آسمان سے پتھر برسائے گئے اور کوئی پناہ نہیں پا سکے۔ قوم ثمود ان کو تباہ کر دیا گیا ایک چنگھاڑ سے جبرائیل علیہ السلام نے ایک ڈانٹ دی گھر کی دی کلیجے پھٹ گئے۔ قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا کہ سات دن تک ہوا کے جھکڑ چلے ہیں اس طرح سے کہ جو مکان گہری گہری بنیادوں کے تھے مع بنیادوں کے ہوا نے اکھاڑا اور اوپر لے جا کر پٹخا نیچے' حدیث میں ہے کہ جب مکان اوپر جاتے تھے تو جانوروں کی آوازیں اوپر سے سننے میں آتی تھیں فضا سے مع جانوروں کے مکان اوپر گئے اور لے جا کر پٹخ دیئے گئے تو وہی ہوا جس سے ہم زندگی حاصل کرتے ہیں وہی موت کا ذریعہ بن جاتی ہے وہی زمین جو فرش تھا ہمارے لئے وہی قبر بنادی جاتی ہے وہی بادل جو پانی برساتے تھے اور زندگی کا سامان ہوتا تھا وہی ذریعہ موت کا بنے تو ہم تو زندگی کے اسباب کو چاہیں تو موت کا سبب بنا دیں پھر تم مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ گئے' کس طرح سے غفلت میں پڑے۔ اس واسطے ادھر توجہ دلائی کہ زمین کا ملک بے شک تمہارے لئے ہم نے کیا مگر دیکھو دینے والے کو مت بھلاؤ أَأَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ زمین میں دھنسا دیئے جائیں اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا یا پتھر برسا دیئے جائیں آسمان سے فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ انبیاء علیہم السلام نے جن چیزوں سے ڈرایا تھا وہ معاذ اللہ واہی باتیں نہیں تھیں وہ ایک امر واقعہ تھا جو ہونے والا تھا تو اس وقت نذیروں کی نذارت کا پتہ چلے گا۔ ڈرانے والوں کے ڈرانے کا پتہ چلے گا

اس وقت تم ایمان لاؤ گے کہ سچ کہتے تھے وہ لیکن اس وقت ایمان لانے سے کیا فائدہ کہ جب موت سر پر آگئی۔ موت سے پہلے پہلے درجہ ہے ایمان کا بھی اور ڈرانے کا بھی۔

آخرت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے

پھر دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ جنہوں نے تصدیق کی اور جو کچھ انبیاء نے فرمایا انہوں نے امنّا کہہ کر دل میں جگہ دی اور ان کے طریق پر چلے دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی ان کے لئے' ایک جھٹلانے والے تھے جنہوں نے تکذیب کی اپنے غرور میں آکر کسی نے دولت کے گھمنڈ میں کسی نے رسمی علم کے گھمنڈ میں کسی نے اپنی تھوڑی سی عقل کے گھمنڈ میں وحی کو نہ ملنا' انبیاء کی باتوں کو جھٹلایا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ○ اس وقت وہ لوگ کہ جو جھٹلا نے والے تھے جب وہ انجام بد سامنے آئے گا تب وہ کہیں گے واقعی جو نکیر کی جارہی تھی وہ اب سامنے آئی۔

بچے کی مثال

بالکل اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں نو مہینے سے اندر پرورش پارہا ہے اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری زمین اور آسمان بس یہی ہے ماں کا پیٹ اس کا دھیان ہی آگے نہیں جاتا ایک آنے والا وہاں خبر دے کہ جس عالم میں بسر کر رہا ہے یہ تو مہا گندا عالم ہے۔ بہت تھوڑا سا عالم ہے۔ ایک عالم ہے دنیا بڑا بھاری عالم ہے ماں کے پیٹ جیسے مکان کروڑوں بن سکتے ہیں اس کے اندر تو اگر وہ کم عقل ہے بچہ تو وہ یوں کہے گا کہ یہ واہی باتیں کر رہا ہے بھلا اس سے بڑھ کر کوئی اور عالم ہو سکتا ہے حیض کا خون مل رہا ہے کھانے کو اور پانی کے اندر میں تیر رہا ہوں کتنا اعلیٰ مکان ہے اس کے بساط میں ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو سمجھے اس نے دنیا کو جھٹلادیا لیکن جب پیدا ہوا اور دنیا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ماں کے رحم جیسے تو کروڑوں عالم بن سکتے ہیں اس دنیا میں وہاں غذا ملتی تھی گندے خون کی یہاں اعلیٰ درجے کی مٹھائیاں ہیں غذائیں ہیں تو کہنے والا سچ کہتا تھا۔ میں نے جھٹلایا اب وہ نادم ہے لیکن جب اس دنیا میں آگئے تو اسی آنے والے نے پھر کہا اب ایک دفعہ تو جھٹلا چکا ہے اب میں خبر دیتا ہوں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور بہت بڑا عالم آنے والا ہے جس کو عالم برزخ کہتے ہیں اور وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیائیں جیسی کروڑوں دنیائیں بن سکتی ہیں اس کے اندر' جب ایک میت کے سامنے قبر وسیع کی جائے گی اور حد نظر تک ایک عالم نظر آئے گا تو ایک ایک برزخ والے کو اتنا بڑا ملک ملے گا جیسی ایک دنیا تو دنیائیں کروڑوں بن سکتی ہیں عالم برزخ میں سے' اتنا بڑا عالم ہے تو آنے والا کہتا ہے کہ ایک دفعہ تو نہیں سمجھا تھا مگر اب سمجھ جا اس کے بعد ایک عالم آنے والا ہے اور اس کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے جس کو عالم جنت کہتے ہیں تو یہ برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں سے بن جائیں وہاں ادنیٰ جنتی کا حصہ دس دنیا کے برابر ہوگا یہاں تو ایک ہی دنیا کے برابر ہے تو جھٹلانے والے تو اخیر تک جھٹلاتے چلے جائیں گے اور تصدیق کرنے والے ابتداء سے ہی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بھی سچ کہا کہنے والے نے اگلی بات بھی سچ کہی اس

سے اگلی بھی سچ کہی' تو تصدیق کرنے والا امن میں ہے اس لئے کہ جسے مان لیا تھا وہ چیز آ گئی اس کی آنکھوں کے سامنے' جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ وَ نَادٰی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا۔ اہل جنت کہیں گے ہم نے تو اللہ نے جو وعدے کئے تھے ٹھیک اس کے مطابق پالئے تمام انعامات ہمیں مل گئے تمہیں بھی وہ چیز مل گئی جس کا تم سے کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانو گے تو جہنم ملے گی تو تمہیں مل گیا اللہ کا وعدہ؟ قَالُوْا نَعَمْ کہیں گے ہاں اب ہم اقرار کرتے ہیں کہ مل گیا' لیکن اس وقت کا اقرار کام نہیں دے گا۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ایک نداء کرنے والا ندا کرے گا کہ ان ظالمون پر اللہ کی لعنت جواب آ کر سمجھے ہیں وہاں ایمان نہیں لائے تو بعد میں ایمان لانا وہ ایمان نہیں ہے وہ تو مجبوری کا ایمان ہے جب موت کے فرشتے سامنے آ گئے اور آنکھوں سے نظر آ گئے اب کوئی کہے میں ایمان لاتا ہوں وہ ایمان نہیں۔

ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کے ماننے کو

ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کو ماننا غیب کی خبر اُس نے نہیں مانی وہ تو فرعون کا سا ایمان ہے فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی' جب غرق کیا گیا اور گلے گلے پانی آیا تو اس وقت کہا کہ میں ایمان لایا موسیٰ کے خدا پر' بنی اسرائیل کے خدا پر' اس وقت فرمایا گیا آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ اب ایمان لایا اور چار سو برس تک زمین میں فساد پھیلایا وہاں تو موسیٰ کی بات نہ مانی اب کہتا ہے کہ میں ایمان لایا تو وہ تو ایمان مجبوری کا ہے جب آنکھوں کے سامنے عذاب آ گیا تو اب بھی ایمان نہیں لائے گا تو اسے ایمان تھوڑا ہی کہتے ہیں تو وقت کے بعد کسی چیز کو سمجھنا وہ ایسا ہی ہے جیسے مثل مشہور ہے فارسی کی۔

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلۂ خود باید زد

دشمن نے جب آ کر گھیر لیا اور سب ہتھیار بے کار ہو گئے اس وقت کہا افوہ! قلعے میں فلاں ہتھیار بھی تو رکھا ہوا ہے اب اس ہتھیار کو اپنے منہ پر مارنا چاہیئے۔ دشمن تو قابض ہو گیا تو بعد از وقت جو چیز یاد آتی ہے وہ بیکار ہوتی ہے اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ نعمتوں کے زمانے میں یاد کرو ہمیں' جب آ پڑی مصیبت اس وقت کا یاد کرنا یاد نہیں کہلائے گا۔

حدیثِ قدسی

ایک حدیث میں ہے جو حدیث قدسی ہے حق تعالیٰ بندوں سے خطاب کرتے ہیں کہ

"اے بندے تو اپنی صحت کے زمانہ میں مجھے یاد کر تا کہ تیری بیماری کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے تو اپنی نعمت کے زمانہ میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مصیبت کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں اور اپنی زندگی میں مجھے یاد کرو تا کہ تیری موت کے وقت میں تیری دستگیری کروں۔"

جب اس وقت یاد نہ کیا تو موت کے وقت کیا یاد کرے گا۔ اور جب نعمت میں یاد نہ کیا تو مصیبت کے

وقت کیا یاد کرے گا؟ تو یاد کرنا وہ ہے کہ قبل از وقت یاد کرے آدمی۔

سات قسم کے افراد قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے

اسی واسطے فرمایا گیا حدیث شریف میں کہ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِىْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ سات قسم کے افراد ہوں گے جن کو قیامت کے دن عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ نہیں ہوگا بجز اللہ کے سائے کے' ان میں سے ایک قسم فرمائی گئی کہ شَابٌّ نَشَأَ لِعِبَادَةِ اللهِ وہ نوجوان جس نے جوانی میں اللہ کو یاد کیا اور عبادت میں گزارا وقت' اس لئے کہ بڑھاپے میں اگر عبادت کرے وہ زیادہ عجیب بات نہیں۔ جب قبر میں پیر لٹکا چکا آدمی دنیا کی قوتیں جواب دے گئیں جذبات سرد پڑ گئے اُمنگ باقی نہ رہی' کھٹے میٹھے کی طرف کوئی توجہ نہ رہی اب بھی اگر اللہ کو یاد نہ کرے گا تو اور کون سا وقت آئے گا تو وہ مجبوری کا یاد کرنا ہے اس لئے فرمایا گیا کہ یاد کرنا وہ ہے کہ جوانی کے زمانہ میں یاد کر لے آدمی جبکہ امنگوں کے سبز باغ سامنے ہیں اُمنگیں سامنے ہیں' دنیا کی بہاریں سامنے ہیں' قوت اندر موجود ہے' اس وقت ہر چیز سے کٹ کر آدمی متوجہ ہو اللہ کی طرف وہ زیادہ عجیب چیز ہے تو وقت آنے سے پہلے پہلے یاد کر لے یہی یاد کہلاتی ہے اور وقت آ جانے کے بعد یاد کرے وہ یاد یاد نہیں ہے اس لئے اس آیت میں توجہ دلائی گئی۔ وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ زمین سے فائدہ اٹھاؤ' چلو پھرو ہمارے خزانوں سے متنفع ہو مگر اسے یاد رکھو کہ لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے۔

قیامت کے دن ایک ایک ذرّہ کا حساب دینا پڑے گا

اور حساب دینا پڑے گا اور ایک ایک چیز کا ایک ایک ذرہ کا حساب دینا ہوگا' اس کو ایک جگہ فرمایا گیا قرآنِ کریم میں کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ پھر قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائے گا تم سے کہاں سے کمایا کس طرح استعمال کیا۔

نعیم کی تفسیر

اور نعیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سردی کے زمانہ میں گرم پانی بھی نعیم ہے پوچھا جائے گا کہ سردی میں ہم نے گرم پانی دیا تم نے کیا شکر ادا کیا اور گرمیوں کے زمانہ میں ٹھنڈا پانی نعیم میں داخل ہے تو سوال کیا جائے گا کہ برستی ہوئی آگ میں ہم نے تمہیں ٹھنڈا پانی دیا تم نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا یا نہیں؟ تم نے توجہ کی ہماری طرف یا نہیں؟ وہاں ایک ایک ذرہ کا سوال کیا جائے گا' ایک ایک چیز کا اِنَّ اللهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ یہ ساری اربوں کھربوں مخلوق ہر ایک سے اس کی اربوں کھربوں چیزوں کا سوال کیا جائے گا اور حق تعالیٰ سوال کر لیں گے اور پچاس ہزار برس کا دن رکھا ہے قیامت کا تاکہ ساری اُمتوں کا حساب اس دن آ جائے تو ایک ایک چیز کا سوال کیا جائے گا تو اس سے پہلے کہ وہاں سوال کیا جائے یہیں اپنے ذہن سے کیوں نہ سوال کرو حدیث میں ہے کہ حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا قبل اس سے کہ حساب لیا جائے قیامت کے دن تم ہی اپنا کچا چٹھا کیوں نہیں درست کر لیتے یہاں' پہلے ہی اپنا حساب کیوں نہیں لے لیتے ایک معمولی سا عمل ہے اگر اسے ہی کر لے آدمی تو ساری زندگی درست ہو جائے۔

سونے سے پہلے مراقبہ

آپ بہر حال دن بھر کام کاج کر کے رات کو پڑ کے سوتے ہیں' چارپائی پر لیٹ کر ایک دس منٹ مراقبہ کرلے آدمی یہ سوچے کہ آج دن بھر میں میں نے کتنی اللہ کی اطاعت کی ہے' کتنی نافرمانی کی' نعمتوں پر کتنا شکر ادا کیا کتنا غفلت میں گزارا' جتنی چیزیں غفلت میں گزریں' جتنی چیزیں معصیت کی ہوں گناہ کی ہوں سچے دل سے توبہ کرے اور فرمایا گیا اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ جیسے کیا ہی نہیں تھا اس نے گناہ اگر حقوق العباد ہیں تو سوچ لے رات کو پڑ کے کہ کس کس کی حق تلفی کی ہے۔ مال کی حق تلفی' کسی کو گالی دی ہے' کسی کو تیز جملہ کہا ہے کسی کا دل دکھایا ہے۔ یہ بھی حق تلفی ہے۔ اگلے دن اس سے معذرت کرلے کہ بھئی وقتی بات تھی جذبہ آگیا تھا۔ میں نے تمہیں یہ کہہ دیا تم اللہ کے لئے معاف کرو' کچا چٹھا صاف ہو گیا کسی کی چیز زبردستی جھپٹ لی ہے واپس دے دو' اگر وہ خود تمہیں رضا سے دے دے لے کے رکھ لو معاملہ صاف ہو گیا۔ کسی کو گالی دی ہے اس سے معافی مانگ لو معاملہ صاف ہو گیا۔ تو قبل اس کے کہ ان گالیوں کا ان معصیتوں کا وہاں حساب لیا جائے اس سے پہلے ہی کیوں نہ حساب لیا جائے تو اگر روزانہ آدمی سوتے وقت ایک دس منٹ سوچ لے' تو دن بھر کی تو ساری باتیں یاد رہتی ہیں کہ کتنی نیکیاں کیں کتنی بدیاں کیں' جتنی بیاں کی ہیں ان سے توبہ کرلے' جتنی نیکیاں کیں کہے اے اللہ تیرا شکر ہے میں تو اس قابل نہیں تھا کہ یہ نیکی انجام دوں تیری توفیق بخشی سے انجام دیں تو شکر پر وعدہ ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ جتنا شکر کرو گے نعمت پر نعمتوں کو میں بڑھاتا جاؤں گا' نیکیوں پر شکر کیا تو نیکیاں بڑھتی جائیں گی اور بدی سے توبہ کی وہ مٹتی رہے گی تو روزانہ اگر آدمی چٹھا صاف کرلے بدیاں مٹا دے نیکیوں میں اضافہ کرلے یہ کون سی مشکل بات ہے اگر پانچ دس منٹ سوچ لیا کرے چارپائی پر لیٹ کر تو روز کا روز حساب ہوتا رہے گا اور اگر نہیں سوچا اور اس غرضے میں ہے کہ جب موت کا وقت آئے گا جب کرلوں گا اکٹھی توبہ۔ تو اول تو جسے آج توفیق نہیں ہوئی کیا ضروری ہے کہ کل کو توفیق ہو گی۔ کل جب آئے گی تو کہے گا کل کو کرلوں گا۔ پھر وہ کل آئی تو کل کل میں گزر جائے گی اسے موقعہ ہی نہیں ملے گا اور اگر موقعہ بھی ملا موت سے قبل تو اس وقت کہاں اتنا موقعہ ہے کہ اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور جو چیزیں کی ہیں ان کی تلافی کرے وہ تو مرنے کا وقت ہے اس واسطے قبل از موت کرے۔

قبل از موت محاسبہ میں سہولت ہے

اس میں سہولت یہ ہے کہ روز کا روز حساب کرتا رہے گا تو نامہ اعمال درست ہوتا رہے گا جیسے ایک سرکاری ملازم ہو اگر وہ روز کا روز اپنا حساب دیکھ لے کاغذات درست کرلے وہ مطمئن رہے گا کہ چیکر جس وقت بھی آجائے گا میں پیش کردوں گا۔ یہ میرا حساب صاف ہے ہر وقت اسے اُمید لگی ہوئی ہو گی اور وہ چاہتا ہو گا کہ کوئی چیکنگ کرنے کے لئے آئے تاکہ میرا صاف ستھرا حساب دیکھے تو میری ترقی ہو گی اور گورنمنٹ سے میرا اعزاز ہو گا اور ایک وہ ملازم ہے کہ اپنا وقت آرام سے گزار رہا ہے اس نے کہا غلطیاں ہیں مہینہ کے

ختم پر کرلوں گا اکٹھی لیکن مہینہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ بیچ میں چیکر آ گیا اب جو چیکنگ کی تو معلوم ہوا سارا حساب غلط ہے تو سوائے برخواستگی کے سوائے جرمانے کے سوائے جیل خانہ کے اور کیا ہوگا اس کے لئے؟ تو بہترین شخص وہ ہے جو روز کا روز حساب اپنا درست کرلے تا کہ انجام کے وقت مطمئن ہو کر چلا جائے کہ میرا چٹھا تو صاف ہے۔

آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک

جس کا حساب صاف ہے اس کو محاسبہ اور چیکنگ سے کوئی بھی ڈر نہیں ہوگا وہ تو تمنا میں رہے گا کہ کاش کوئی چیکنگ کرے تو میرا انعام بڑھے میری ترقی ہو اس لئے میں نے عرض کیا کہ مہینہ اور سال کو چھوڑ کر اگر روز کا روز سوتے وقت ایک دس منٹ آدمی غور کرلیا کرے کہ کتنی میں نے حق تلفیاں کیں اور کتنی ادائیگیاں کیں حقوق کی، جتنی ادائیگی اللہ کے حقوق کی، بندوں کے حقوق کی ہوئی شکر کرے حمد کرے اور کہے کہ اللہ یہ تیری توفیق سے ہوا میں تو اس قابل نہیں تھا اور جتنی غلطیاں ہوئیں فوراً معافی مانگ لے، اہل حقوق ہیں ان سے معاف کرالے۔ وہ صاف ستھرا رہے گا۔ پھر اس کے قلب میں تشویش نہ ہوگی طمانیت ہوگی، بشاشت ہوگی، بادشاہوں کی مانند اس کی زندگی ہوگی کہ میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں، کسی کا دین دار نہیں ہوں، وہ بادشاہوں کی طرح بسر کرے گا، یہ بہتر ہے کہ آدمی ایک فقیر پریشان پراگندہ حال کی طرح زندگی بسر کرے، یا یہ بہتر ہے کہ بادشاہ بن کر زندگی بسر کرے؟ جس کا قلب صاف ہے وہ بادشاہت میں ہے اور جس کے قلب میں بے چینی ہے وہ فقیر ہے پریشان حال ہے تو اس پریشانی کو دور کرنے کی صورت میں شریعت نے رکھی محاسبہ کہ روزانہ اپنا حساب کرلیا کرے اس لئے فرمایا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ نعمتوں کے استعمال سے ہم نہیں روکتے مگر دو باتیں چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ حدود میں ہو استعمال، حد سے گزرا ہوا نہ ہو اور ایک یہ کہ موت کو یاد کرتے رہو بے فکر ہو کر مت رہو۔

مسلمان کی حقیقت متفکر ہونا ہے

تو گویا مسلمان کی حقیقت نکلی متفکر، وہ فکر میں رہے کہ میرے سے کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے، ہر وقت فکر لگی ہوئی ہو، اسی کو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ تفکُّرُ ساعةٍ خیرٌ مِّنْ عبادةِ سنةٍ ایک گھڑی فکر کرنا اپنے معاملہ میں یہ ایک برس کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ صحیح فکر سے ایک برس کی عبادت کا رستہ درست ہو جاتا ہے کھل جاتا ہے تو بے فکری عبادت کار آمد نہیں ہے فکر مندانہ عبادت ہوگی وہ کار آمد ثابت ہوگی، اسی لئے وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ سے توجہ دلائی گئی کہ حساب آتا ہے اور ہماری طرف پہنچنے والے ہو تم اس وقت کو پیش نظر رکھ کر کرو جو تمہارا جی چاہے کرو چاہے اسلام اختیار کرو چاہے کفر مگر یہ سمجھ لو کہ آ کر حساب دینا ہے اور اگر یہ کہو کہ ہمارے فرشتے وقت پر نہیں آئیں گے اول یہ خام خیالی ہے لیکن اگر یہ ہو بھی تو فرشتوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے یہ زمین ہی کافی ہے تمہارے لئے بادل ہی کافی ہیں، ایک مچھر ہی کافی

ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ اللہ کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا کہ کہاں کہاں ہیں چاہے مچھروں سے کام لے لے، چاہے چیونٹیوں سے کام لے لے، چاہے بادلوں سے کام لے لے، چاہے زمین سے کام لے لے پہلے سے پہلے نذیروں کے ڈرانے کو یاد رکھ ایسا نہ ہو کہ وقت کے وقت پر تمہیں یاد آئے تو کہو کہ واقعی ڈرانے والے صحیح کہہ رہے تھے ہم ہی غلطی کے اوپر تھے اس وقت کا اعتراف کار آمد ثابت نہیں ہوگا، تو یہاں تک حق تعالیٰ نے گویا زمین کا جو صوبہ ہے اس کی حکومت کا اس کے متعلق ایک اجمالی صورت بیان فرمائی کہ نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی، حدود بتلادیں۔ اب دوسرا علاقہ جو ہے وہ جو اور فضا کا ہے جس کو شروع کیا گیا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ سے وہ انشاء اللہ کل کو بیان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے عمل صالح کی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ۞ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ط اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ۞ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ط اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۞ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ج بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۞ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۞

ترجمہ: اور کیا نہیں دیکھتے ہو اڑتے جانوروں کو اپنے اوپر پر کھولے ہوئے اور پر جھپکتے ہوئے ان کو کوئی نہیں تھام رہا رحمان کے سوائے اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری، مدد کرے تمہارے رحمٰن کے سوائے منکر پڑے ہیں بڑے بہکائے ہیں۔ بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں شرارت اور بدکنے پر، بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر۔ تو کہہ وہی ہے جس نے تم کو بنا کھڑا کیا، اور بنا دیئے تمہارے واسطے کان اور آنکھیں اور دل، تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو، تو کہہ وہی ہے جس نے بکھیر دیا تم کو زمین میں اور اسی کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے۔

حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں

میں نے کل عرض کیا تھا کہ حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں جو اس سورۃ میں بیان فرمائے گئے ہیں ایک سمٰوٰت، آسمان اور اس کی مخلوق اور اس پر حکمرانی کا انداز اور ایک زمین اور زمینی مخلوق اور اس پر حکومت کا انداز اور ایک جو اور فضا جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے اس پر حکمرانی کا طریق، تو دو علاقوں کے بارے میں میں نے بقدرِ ضرورت تفسیر عرض کی۔ آج یہ تیسرا علاقہ ہے جو اور فضا کا جس کو شروع کیا گیا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ سے اور اس کی بنا یہ ہے کہ زمینی مخلوق میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی حکومت کو مانیں اور اس کے قانون پر چلیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان پر

بلیات اور فتنے برسیں گے اور وہ مصائب میں مبتلا ہوں گے۔ منجملہ ان کے دو چیزیں بیان فرمائی گئی تھیں کہ کیا تم آسمان والے سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ گے اس سے کہ زمین تمہیں دھنسا دے اور خسف کر دیئے جاؤ یا یہ کہ آسمان سے پتھر برسا دیئے جائیں اور ان سے پتھراؤ ہو جائے انسانوں پر' اس پر انسان اگر سلامتی کے ساتھ غور کرے اور اطاعت شعاری کے جذبے سے غور کرے تو بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔

انسان میں یہ روگ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے

مگر انسان میں ایک روگ یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے اور اس خود رائی کا منشاء ہوتا ہے اپنی دی ہوئی عقل' تو عقل تو دی گئی تھی اس لئے کہ اللہ کے احکام کو سمجھے اور غور کرے اور کوئی شبہ پیش آئے تو عقل سے اس شبہ کو صاف کر لے اس نے عقل کو استعمال کیا معارضہ میں اور حق تعالیٰ کے مقابلہ میں عقل کو ذریعہ بنایا اللہ کے احکام میں طرح طرح کے شبہات نکالنے کا' شکوک پیدا کرنے کا اور اس میں الجھنے کا' تو قلبِ موضوع ہو گیا' دی گئی تھی عقل اس لئے کہ سمجھے احکام کو اور کوئی شبہ طبعی طور پر پیش آئے تو عقل سے اس کو دفع کر لے' اس نے کیا یہ کہ عقل کو لڑائی کا ذریعہ بنایا اللہ سے' اور اس کے احکام میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات نکالنے شروع کئے اور معارضہ شروع کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ گویا یہ احکام معاذ اللہ عقل کے خلاف ہیں۔ پھر میں کیوں مانوں انہیں۔

انسان کو عقل تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے دی گئی تھی لیکن اس نے اسے اللہ کے مقابلہ میں استعمال کیا

تو اپنی برأت ذمہ کے لئے اس نے عقل کو استعمال کیا حق کے مقابلہ میں' حالانکہ عقل دی گئی تھی حق کی اطاعت کے لئے کہ پوری طرح سے سمجھو تو یہاں بھی انسان نے یہی کیا کہ جب فرمایا کہ ہم آسمان سے پتھر برسا دیں گے تو اس نے کہا بھلے یہ کیسے ہو سکتا ہے پتھر تو ایک وزنی چیز ہے اور وزن دار چیز ہمیشہ نیچے کی طرف کو آتی ہے زمین مرکزِ ثقل ہے اور وہ اپنی طرف کھینچتی ہے اسے اوپر نہیں جانے دیتی تو آسمان میں پتھر کہاں ہیں جو وہاں سے برسیں یہ عقل کے خلاف ہے کہ وزنی چیزیں اوپر جائیں حالانکہ اگر وہ اس پر غور کرتا کہ جس خالق نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان میں طبعی رفتار رکھی ہے تو طبیعت کا پیدا کرنے والا بھی تو وہی ہے اگر وہ بدل دے طبیعت کو تو اس کے اختیار میں ہے اتنا تو اس کا اختیار سمجھا کہ وہ طبیعت کے مطابق بنا دے اور یہ نہ سمجھا کہ طبیعت کے خلاف کرے۔

طبیعت کا خالق طبیعت کو اس کے خلاف بھی چلا سکتا ہے

حالانکہ جو خالق ہے طبیعت کا وہ طبیعت کو ادھر بھی چلا سکتا ہے طبیعت کے خلاف کرے' تو طبیعت اس پر حاکم تو نہیں ہے حاکم تو وہ ہے طبیعت کے اوپر۔ ایک درخت جب پیدا ہوتا ہے اور آپ منوں مٹی کے نیچے بیج ڈال دیتے ہیں اس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے کونپل اتنی کمزور ہے کہ اگر چٹکی سے ملیں تو مسل دی جائے' لیکن اللہ نے اس کو اتنا طاقتور بنایا کہ منوں مٹی کے جگر چیر کر وہ اوپر کی طرف آتی ہے' حالانکہ طبیعت

یہ تھی کہ نیچے کی طرف کو جائے پتے کو اگر آپ چھوڑیں گے تو وہ نیچے جائے گا اوپر نہیں جائے گا' لیکن وہی پتا جب بیج سے نکلتا ہے تو وہ جاتا ہے اوپر کی طرف' اول تو منوں مٹی کو چیرتا ہے اس کے جگر کو شق کر کے باہر نکلتا ہے پھر باہر نکل کر بھی یہ نہیں کہ نیچے کی طرف جائے وہ چڑھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے اور ایک بڑا اتنا اور درخت بن جاتا ہے یہ طبیعت کو کس نے بدل دیا طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ درخت نیچے کی طرف آئے لیکن نیچے کے بجائے اسے اوپر کی طرف لے گئے تو قدرت ہے مالک کی وہ اس طبیعت کے خلاف حکم جاری کر دے۔ طبیعت کو اپنے خلاف چلنا پڑے گا طبیعت کے موافق اگر حکم دے موافق چلنا پڑے گا۔ طبعی چیز یہ ہے کہ آدمی اگر نقش و نگار بنائے تو کاغذ پر بنا سکتا ہے۔ پتھر پر بنا سکتا ہے' لکڑی پر نقش و نگار بنا سکتا ہے لیکن کیا یہ کسی کو قدرت ہے کہ پانی کے اوپر نقاشی کر دے؟ مگر اس کی قدرت یہ ہے کہ ایک گندے پانی کے قطرے کے اوپر ایسے نقش و نگار بناتا ہے کہ انسان بن جاتا ہے تو ایک پانی کے قطرے پر نقاشی کرنا یہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن اللہ کی قدرت کے تو خلاف نہیں تو جب قدرت والے کو قدرت والا مان لیا تو مان کر پھر اسے مقید کرنا کہ آپ ادھر کو چلیں ادھر کو نہ چلیں یہ انسان کی کج فطرتی کی بات ہے ورنہ وہ یوں کہتا کہ طبیعت کو چلا دیا ادھر یہ بھی اس کی قدرت ہے اور طبیعت کو اس کے خلاف چلا دیا یہ بھی اس کی قدرت ہے پتھروں کو نیچے ڈال دے یہ بھی اس کی قدرت ہے اور اوپر اٹھا کر لے جائے یہ بھی اس کی قدرت ہے تو پہلے تو غور کرنا چاہیئے تھا عقل سے مگر عقل کو مقابلہ پر استعمال کیا اللہ کی قدرت کے' اور اپنی موافقت کے گویا عقل میری ہے اور میری تائید کرے گی آپ کے خلاف کرے گی اور یہ نہ جانا کہ عقل بھی انہی کی پیدا کی ہوئی اور تم بھی انہی کے پیدا کئے ہوئے تمہیں حق کیا ہے کہ مالک کے خلاف چلو اور اپنے آلات اور قویٰ کو اس کے خلاف میں استعمال کرو' تو یہ تو ہے ایک عقلی چیز۔

عقلی شبہ کے دو جواب دیئے گئے

لیکن حق تعالیٰ نے جواب دیا دو طرح پر ایک تاریخ پیش کی' اور ایک حسی مثال پیش کی' تاریخ کی طرف تو اشارہ کیا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے کہ پچھلوں نے بھی اعتراضات کئے لیکن پچھلوں پر تاریخ شاہد ہے کہ پتھر برسائے گئے لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسا دیئے گئے۔ ایک تاریخی واقعہ ہے اور سچی تاریخ ہے اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے تو اسی کو دیکھ کر عبرت پکڑو تھوڑی سی کہ جس نے ایک قوم پر برسا دیا پتھروں کو وہ آج بھی برسا سکتا ہے' گنہگار جب بھی تھے اور آج بھی ہیں' تو جس نوع کے گناہ پر پچھلے دور میں پتھر برس سکتے ہیں اسی دور میں اسی قسم کے گناہ پر آج کے دور میں کیوں نہیں برس سکتے۔

اللہ کے فضل اور نبی علیہ السلام کی رحمت کے طفیل یہ اُمت عام عذابوں میں مبتلا نہیں کی گئی

یہ تو رحمۃ للعلمین کا فضل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتِ عامہ کا فضل ہے کہ اس قسم

کے عام عذابوں میں اُمت کو مبتلا نہیں کیا گیا' لیکن اس کی نفی بھی نہیں کی گئی کہ اگر ضرورت پڑی تو اس امت پر بھی ہم عذاب نازل کریں گے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے لَيْسَ عَذَابُ اُمَّتِي الْخَسْفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْمُ اِنَّ عَذَابَ اُمَّتِي اَلْفِتَنُ وَالْقَتْلُ وَالزَّلَازِلُ میری امت کا عام عذاب یہ نہیں ہوگا کہ ان کی صورتیں مسخ کردی جائیں جیسے پچھلی امتوں کو بندر بنادیا گیا۔ بعضوں کو خنزیر بنادیا گیا۔ اس امت پر یہ رحمت ہے کہ عام طور سے نہیں ہوگا لیکن جزوی طور پر اگر ہو جائے کسی کو مسخ کر کے خنزیر کی صورت بنادیا جائے یا کسی کو بندر کی صورت دے دی جائے تو یہ آج بھی ممکن ہے اور واقعات پیش آئے ہیں۔

قرآن مجید کی توہین کا عبرت انگیز واقعہ' ایک عورت کی شکل خنزیر کی شکل سے بدل دی گئی

ابھی پچھلے دنوں آپ نے سنا ہوگا کہ اخبارات میں ایک واقعہ آیا بھوپال میں یہ قصہ گزرا اور وہ یہ کہ ایک عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو اس نے کسی سادھو سے رجوع کیا اور کہا کہ کوئی تدبیر ایسی بتلایئے کہ میرے اولاد ہو جائے' اس کم بخت نے کہا کہ قرآن شریف کو نیچے رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ کر تو غسل کر تو تیرے اولاد ہو جائے گی حالانکہ وہ مسلمان عورت تھی' لیکن بعض دفعہ عورتیں اولاد کی طمع میں اللہ اور رسول کو چھوڑ دیتی ہیں اور اس قسم کے ٹوٹے اور ٹوٹکوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں اس ظالم نے یہ حرکت کی اور ایمان کو پس پشت ڈال کر قرآن شریف پر بیٹھی اور وہاں سے اُٹھ کر جب آئی تو اس کی صورت خنزیر کی سی تھی۔ بال وال تو سر پر تھے جس سے یہ پہچانا گیا کہ وہ انسان تھی لیکن شکل مسخ ہو گئی۔ یہ اخبارات میں بھی آیا واقعہ' اور بعضوں کو شبہ ہے کہ صاحب اخبار میں کیوں اس واقعہ کو لکھ دیا اس سے تو معاذ اللہ اسلام کی توہین ہوئی کہ ایک مسلمان بدک گیا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف میں واقعات اس قسم کے کیوں بیان کئے کہ پچھلی امتیں مومن ہوتے ہوئے جب حق کے مقابلہ پر آئیں تو انہیں خنزیر کی صورت دے دی گئی اس سے اس دور کے اسلام کی توہین نہیں تھی تو آج بھی اگر اس قسم کا واقعہ آئے اور وہ عام کیا جائے تو اس میں اسلام کی توہین نہیں یہ تو کفر کی توہین ہے کہ اسلام چھوڑ کر جب کفر اختیار کیا تو صورت مسخ ہوئی اگر عیاذاً باللہ یہ ہوتا کہ اسلام قبول کرنے پر' تلاوت قرآن کرنے پر معاذ اللہ صورت بگڑ جاتی تو اسلام کی توہین تھی' لیکن اسلام کو چھوڑ کر کفر کی اہانت اس میں واضح ہوئی تو یہ اسلام کی توہین نہیں بلکہ کفر کی توہین ہے اور اسلام کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے' اور اگر اس میں اہانت تھی تو حق تعالیٰ قرآن کریم میں ایسے واقعات ہی بیان نہ فرماتے' تو اگر آج کے لوگوں نے اس قسم کے واقعات کو نقل کر دیا ہے تو قرآن کی پیروی کی کہ اللہ نے پچھلے واقعات نقل کئے انہوں نے سامنے کا واقعہ نقل کر دیا۔ اسلام کی عظمت اس سے نمایاں ہو گئی۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ خسف یا مسخ یہ عام تو نہیں ہوگا رحمۃ للعالمین کی اس امت میں لیکن خاص خاص طور پر ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض طبقات دھنسائے جائیں گے زمین کے اندر' اس اُمت کے اندر بھی ایسے واقعات ہوں گے' تو اگر ایسا واقعہ پیش آئے معاذ اللہ' اس کو نقل کر دے مسلمان تو یہ ڈرانا ہو گا اس سے کہ دیکھو تقدیر کے خلاف کرنے میں یہ وبال پڑتا ہے۔ لہٰذا تقدیر کی حمایت کرو اسلام کے مطابق چلو تاکہ اس قسم کے وبال سے بچ جاؤ' تو قرآن کریم نے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ پچھلے دور میں ہو چکا ہے ایسا' پورے طبقے کے طبقے مسخ کر دیئے گئے پوری امت ڈرا دی جائے یا پوری امت دھنسا دی جائے' اس واسطے کہ یہ امت دوامی اور ابدی ہے اس کے مٹنے کے بعد کوئی اور امت آنے والی نہیں' اس لئے قیامت تک یہ امت رہے گی اور ایک طبقہ حق پر رہے گا۔ خلاف کرنے والوں پر اس قسم کے عذابات آئیں گے اور اس قسم کے وبال ڈالے جائیں گے تو اشارہ دیا قرآن کریم نے کہ جنہوں نے پہلے تکذیب کی تھی ہوا ان پر یہ واقعہ' لہٰذا تم بچو اس قسم کی تکذیب سے کہ تم نہ کہیں مبتلا کر دیئے جاؤ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ تاریخی واقعات سے عبرت پکڑو' لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔

قرآن کریم میں گزشتہ امتوں کے واقعات محض قصہ و کہانی کیلئے بیان نہیں ہوئے

قرآن کریم نے جو پچھلی امتوں کے واقعات بیان کئے ہیں وہ قصہ کہانی کے طور پر نہیں ہیں کہ وقت گزاری کے لئے تفریح طبع کے لئے کچھ قصے سنا دیئے' وہ بیان کئے گئے ہیں عبرت کے لئے تاکہ آدمی غور کرے کہ پچھلوں کی ان حرکتوں پر جب یہ عذاب آیا تو آج اگر وہ حرکتیں ہو گئیں تو آج بھی عذاب آ سکتا ہے۔ یہی معنی اعتبار کے اور عبرت پکڑنے کے ہیں تو ایک جواب تو دیا ہے تاریخی اور دوسرا جواب ہے حسی اور وہ یہ کہ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ کیا تم اللہ کی قدرت نہیں دیکھتے کہ یہ پرندے فضا کے اندر اُڑ رہے ہیں وہ بھی تو اجسام ہیں جیسے پتھر جسم ہے وہ بھی تو مٹی کے بنے ہوئے ہیں پرندے' لیکن ہزاروں گز اوپر ہوا میں ان کو تھام رکھا ہے تو کس نے تھاما ہے ان کو؟

سوال کا جواب

اگر آپ یہ کہیں کہ ان میں قوت ایسی تھی کہ وہ تھم گئے تو سوال یہ کہ وہ قوت کس نے رکھی ان کے اندر' اس لئے فرمایا ان کو تھامنا یہ اللہ کی قدرت ہے اور جب چاہتے ہیں انہیں گرا دیتے ہیں' بعض دفعہ اُڑتا اُڑتا جانور ایک دم نیچے آ پڑتا ہے' وہ قوت اس وقت اس میں سے سلب کر لی جاتی ہے۔ چھین لی جاتی ہے تو جب ایک جسم کو حق تعالیٰ ہزاروں گز فضا کے اندر اُڑا کر تھامتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ ایک پتھر کو اُڑا دیں اور وہ چلا جائے نیچے اور اسے ڈال دیں نیچے پہلے تو اوپر جائے اور رُکے فضا میں اور پھر نیچے آ جائے۔

اعتراض کا جواب

اگر اس پر یوں کہا جائے کہ صاحب ہو سکتا ہے کہ ایک جانور بے چارہ ہوا اُڑا کر لے گئی اور وہ چلا گیا وہ ہوا کی طاقت سے اُڑ گیا۔ ہوا بیچ میں سے نکل گئی وہ نیچے آ پڑا تو یہ ہوا کی کارستانی ہے قدرت کی تھوڑا ہی ہے

عیاذاً باللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَھُمْ تمہارے سروں پر یہ پرندے اُڑ رہے ہیں اور صٰٓفّٰتٍ ٹکڑیاں اور جماعتیں بن بن کر اُڑ رہے ہیں اگر ہوا اٹھا کر لے جاتی تو ایک کو دو کو چار کو ایک اتفاقی واقعہ پیش آتا، لیکن یہ تو ترتیب وار صف بندی کر کے اُڑتے ہیں' یہ تو ان کے شعور اور ارادہ کا دخل ہوا وہ اللہ نے ان کے اندر پیدا کیا تو یَقْبِضْنَ خدا کے سوا کسی نے روک رکھا ہے انہیں؟ اور وہ صف بن کر اُڑتے ہیں جیسے مرغابیاں اُڑتی ہیں تو ہمیشہ مثلث کی صورت پہ اُڑتی ہیں دو ٹکڑیاں ہوتی ہیں مثلث آگے ان کا سردار ہوتا ہے' وہ آگے آگے چلتا ہے اور پیچھے وہ چلتی ہیں جیسے پریڈ کرتی ہوئی فوج جاتی ہے۔ ترتیب وار' یا مرغابیاں جب اُڑتی ہیں تو ترتیب وار اُڑتی ہیں' بطیں جب اُڑتی ہیں تو ترتیب وار اُڑتی ہیں چھوٹی چڑیاں جب اُڑتی ہیں تو ٹکڑیاں بن کر اُڑتی ہیں تو ترتیب وار اُڑتی ہیں تو سارے نمونے دکھلا دیئے انفرادی طور پر بھی پرندے اُڑتے ہیں صف باندھ کر بھی اُڑتے ہیں' ٹکڑیاں بن کر بھی اُڑتے ہیں 'معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محض طبعی کارخانہ نہیں ہے بلکہ فاعل مختار کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں کہ کسی کو اس طرح بنا دیا کسی کو اس طرح' اگر طبعی بات ہوتی تو طبیعت کی ایک رفتار ہوتی جب جانور گرا نیچے آپڑتا' لیکن ترتیب وار اُڑنا قاعدہ سے اُڑنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص نظام کے تحت وہ اُڑ رہے ہیں کسی اختیار کے تحت اُڑتے ہیں صٰٓفّٰتٍ صفیں باندھ کر پرّہ بن کر۔

شبہ کا دفعیہ

کوئی اگر یوں کہے کہ صاحب پر چونکہ ان کے بنائے ہوئے ہیں وہ کھول دیئے 'لہٰذا اُڑ رہے ہیں تو پروں کی کارستانی ہے تو فرماتے ہیں وَیَقْبِضْنَ ایسا بھی تو ہے کہ پر سمیٹ لیتے ہیں اور پھر جا رہے ہیں دور تک' تو اب کیوں جا رہے ہیں؟ اگر پروں کی کارستانی تھی تو پروں کو سمیٹ کر بھی اُڑتے ہیں بہت سے جانور' بہت سے پر پھیلا کر اُڑتے ہیں۔ بہت سے پروں کو سمیٹ کر اُڑتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ایک مسافت تک پر کھولے ہوئے ہیں اور ایک مسافت میں پر سمیٹ لئے اور چلے جا رہے ہیں تو اگر پروں کی وجہ سے اُڑ رہے ہیں تو وہاں بھی پروں کو سمیٹ لیا گیا۔ اب کیسے اُڑ رہے ہیں؟ اب کس نے تھام رکھا ہے انہیں؟ تو پروں سے بھی اُڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ کر بھی اُڑتے ہیں۔ اس لئے دونوں چیزیں فرمائیں کہ صٰٓفّٰتٍ صفیں باندھ کر اُڑتے ہیں۔ یہ طبعی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کے اختیار اور قدرت کی بات ہے وَیَقْبِضْنَ اور ان پروں کو وہ سمیٹ دیتا ہے وہ پھر بھی اُڑتے ہیں اور فضا میں معلق ہو جاتے ہیں بہت دیر تک بعضے جانور نہیں اُڑتے اور لٹکے ہوئے ہیں فضا میں 'مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ رحمٰن کے سوا کون ہے جس نے تھام رکھا ہے' تو جو ان پرندوں کے اجسام کو اوپر تھام سکتا ہے وہ اگر پتھروں کو تھام دے تو تمہاری عقل کیا کہتی ہے اس کے بارے میں' عقلیں یہاں لڑائی تھیں، لیکن انہی کی طبعی رفتار نے تمہاری عقلوں کو کند کر دیا اور انہوں نے جواب دے دیا' تو پتھر کے بارے میں بھی سمجھ لو کہ تمہاری عقلیں کند ہیں قدرت اللہ کی تابع نہیں ہے تمہاری عقلوں کے یا تمہارے ڈالے ہوئے وسوسوں کے' وہ تو اپنی قدرت سے کام کرتا ہے مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا

الرَّحْمٰنُ تو حاصل یہ نکلا کہ تاریخ دیکھو تب واقعات ثابت' پھر کیوں نہیں مانتے انہیں تاریخ پر نظر نہ کرو تو محسوسات پر نظر کرو جو ہر وقت تمہارے سامنے ہیں اس کو سامنے رکھو اب اگر تم نہ اسے مانو نہ اسے مانو تو معلوم ہوا مقصود مقابلہ ہی ہے حق تعالیٰ کا یہ عقل کا نام محض حیلے کے طور پر لے رکھا ہے ورنہ عقل تو سمجھا رہی ہے کہ جب یہ واقعہ پرندوں میں پیش آسکتا ہے تو پتھر میں بھی پیش آسکتا ہے۔

عقل کے پرستاروں سے سوال

اگر میں کہوں کہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ جب آپ اینٹ پھینکتے ہیں تو بیس گز تک چلی جاتی ہے حالانکہ اینٹ کی طبعی رفتار کا تقاضا ہے کہ نیچے آئے مگر آپ کے ارادہ کی قوت اسے اوپر پھینک دیتی ہے جب آپ کے ارادہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے پھر وہ اصلی رفتار پہ آکر اینٹ نیچے آجاتی ہے تو آپ کے ارادہ میں تو یہ طاقت ہو کہ اینٹ کی طبیعت کے خلاف اسے اوپر پہنچادے اور اللہ کے ارادہ میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اس کی طبیعت کے خلاف اوپر پہنچادے۔ اور تمہارا اردہ زیادہ سے زیادہ پچاس گز تک اس کی قوت جا سکتی ہے۔ اللہ کا ارادہ لا محدود ہے وہ اگر پچاس ہزار گز سے اوپر اڑادے تو اس کی طاقت سے بعید نہیں تو معلوم ہوا کہ باہر کی طاقت لے جا سکتی ہے اوپر اشیاء کو اور جتنی طاقت ہو گی اتنا لے جائے گا۔ انسان کی طاقت محدود ہے کہ بیس گز اس نے پھینک دیا ڈھیلا اور اللہ کی طاقت لا محدود ہے اس نے پچاس ہزار گز سے اوپر پھینک دیا پتھر کو اور پھر نیچے ڈال دیا تو مطلب یہ ہے کہ حسی طور پر دیکھو' عقلی طور پر دیکھو' تاریخی طور پر دیکھو' کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے سوائے ڈھٹائی کے۔ سوائے سرکشی کے۔ اس واسطے فرمایا کہ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ بَصِیْرٌ۔ اس واسطے کہ وہ ہر چیز کو بصیرت سے جانتا ہے اس لئے کہ وہی تو پیدا کرنے والا ہے اسے تو معلوم ہے کہ کس چیز میں میں نے کتنی قوت رکھی ہے اور کس طرح میں اسے استعمال کروں گا تو اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ بَصِیْرٌ۔ تم پتھر پھینکتے ہو تو تمہیں بصیرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے اندر کیا قوت ہے کیا نہیں ہے؟ تم نے تو اٹھا کر ڈھیلا پھینک دیا۔ چلا گیا' وہ بصیرت کے ساتھ اپنی طاقت کے ساتھ لے جائے اس پر تو اعتراض اور تم جو بے بصیرتی کے ساتھ ایک حرکت کر گزرو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو یہ سوائے عصبیت اور جہالت کے اور کیا چیز ہے کوئی عقلی دلیل تو نہیں ہے کہ انکار کرو۔

کفار عبرت حاصل کرنے کے بجائے لڑنے کو مقصد بنائے ہوئے ہیں۔

حاصل اس کا یہ نکلا کہ تمہیں تو لڑنا ہی مقصود ہے اللہ میاں سے' نہ عقل سے کام لینا' نہ حس سے کام لینا' نہ تاریخ سے عبرت پکڑنا' لڑنا مقصود' فرمایا کہ اچھا آؤ لڑو اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّکُمْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ۔ یہ کون ہے جو خدا کے مقابلے پر لشکر آئے گا تمہاری مدد کرے گا۔ اس لشکر کو بھی ہمیں بتادو وہ کون سا لشکر ہے؟ یہ لشکر جتنا تم لاؤ گے اس مخلوق میں سے لاؤ گے یہ تو ہماری بنائی ہوئی چیز (ہے) تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے ہی مقابلے پر تھوڑا ہی آسکتی ہے۔ تمہاری کوئی بنائی ہوئی چیز ہو وہ تمہارے مقابلے پر

نہیں آتی تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے مقابلے پر کیسے آ جائے گی؟ اور تم جو بھی لشکر لاؤ گے وہ مخلوق میں سے لاؤ گے اس لئے کہ خالق سے تو تم نے تعلق پیدا نہیں کیا کہ اس کے تابع بنتے اس کی طاقت کو لیتے اس سے تو لڑائی ٹھان لی اب مقابلہ کرو گے تو اپنی طاقت سے اور مخلوق کی طاقت سے تو بتلاؤ وہ کون سی مخلوق ہے جو ہمارے مقابلے پر آ ئے گی۔ اَمَّنْ ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ جُنْدٌ لَّکُمْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ وہ کون ہے جو رحمٰن کے مقابلے پر تمہاری مدد کرے گا۔ اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ سوائے اس کے کہ تم دھوکے میں پڑے ہوئے ہو اور بہکے ہوئے ہو اس کے سوا اور کیا کہا جائے' عقل کی تم نہیں کہتے' حس کی تم نہیں کہتے' تاریخ کی تم نہیں کہتے' کوئی قوت تمہارے ہاتھ میں نہیں کہ خدا کا مقابلہ کرو اور لڑنے کے لئے تیار بقول شخصے۔ ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لڑنے کو موجود اور نہ ہاتھ اور نہ ہاتھ میں تلوار' اور پھر وہ قوتیں بخشی ہوئی خدا کی ہیں تو اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کے مقابلہ پر لانا اس سے زیادہ حماقت کی بات اور کیا ہو گی اب آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ صاحب سامان اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں ہم بجلی کی مدد سے کام لیں گے ہم گیس کی طاقت سے کام لیں گے' ہم راکٹ سے کام لیں گے' ان چیزوں کو لائیں گے مقابلے پہ تو اول تو ظاہر ہے کہ یہ تو مخلوقات خداوندی ہیں۔ ان میں یہ جرأت کہاں ہے کہ اپنے خالق کا مقابلہ کریں یہ حماقت تو انسان ہی پر سوار ہے کہ وہ مقابلہ کرتا ہے خالق سے' نہ پتھر مقابلے پہ ہیں نہ درخت مقابلے پہ ہیں' نہ پہاڑ نہ دریا' کوئی چیز مقابلے نہیں کرتی یہ چیزیں حق ہیں۔ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا آسمانوں میں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ عبد اور بندہ بن کر اللہ کے سامنے آیا ہوا ہے۔ ڈھٹائی پر یہی انسان ہے کہ مقابلہ کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے اس لئے کہ ہم نے کچھ طاقتیں دے دی تھیں کچھ عقل کی طاقت دے دی تھی کچھ وسائل دے دیئے تھے تو سوال یہ ہے کہ اَمَّنْ ھٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ وہ رزق دینے والا ان سامانوں کا وہ کون ہے؟ تم نے خود پیدا کر لئے تھے؟ بجلی تم نے پیدا کی ہے؟ یہ اللہ نے کی ہے کام اس سے لے لیتے ہو تم' زمین اللہ نے پیدا کی ہے کام اس سے لے لیتے ہو تم بیج کا درختوں کو اگانے کا' لیکن نہ درخت تم نے پیدا کیا' نہ بیج تم نے پیدا کیا نہ زمین تم نے پیدا کی' تمہاری بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں (البتہ) استعمال کرنے کی کچھ قوت ہے تمہارے اندر' تو حاصل یہ نکلا کہ رزق دینے والے حق تعالیٰ ہیں وہ دانے کا رزق ہو' کھانے کا رزق ہو' کپڑے کا رزق ہو' ہتھیاروں کا رزق ہو' عقل کا رزق ہو' قوتوں کا رزق ہو' دینے والے وہ ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی چیزیں چھین لیں تو کیا حشر ہو؟

اچھا اگر وہ اپنے رزق کو چھین لیں پھر تم کیا کرو گے تمہارے قبضے میں تو نہیں' ایک بارش رک جائے' دانہ نہ ہو بیٹھ جاتے ہیں حضرت انسان اب آگے کچھ نہیں' بارش صرف روک دے اور بارش تو خیر سال بھر

میں آتی ہے ہر وقت آپ دھوپ سے اور ہوا سے کام لیتے ہیں ایک منٹ کے لئے وہ اپنی ہوا نکال لے اب کیا ہوگا؟ بس سانس گھٹ کر ختم ہو جائے گا انسان' یہ کل آپ کی طاقت ہے تو اسی کے دیئے ہوئے رزق پر غرہ اور اسی کا مقابلہ کرنا اس سے زیادہ حماقت اور سفاہت کیا ہوگی' کوئی اپنی چیز لاتے جو خدا کے مقابلے پر استعمال کرتے تو اپنی چیز تو کیا ہوتی تم خود بھی اپنے نہیں تم نے خود بنالیا ہے آپ کو؟ بنانے والے نے بنایا ہے تم کون ہو تو جب تم خود نہیں بنے اپنے آپ تو بقیہ چیزیں تم کیا بنا سکتے ہو تو جو کچھ ہے وہ رزق دیا ہوا ہے اللہ کا تو اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ اگر اللہ اپنا رزق روک لے تو وہ کون ہے جو اللہ کے مقابلے پر آ کر تمہیں رزق دے گا؟ اچھا ہم بارش روک لیتے ہیں اور ساری مخلوق کو اکٹھا کر لو کہ وہ تمہیں رزق دے تو کہاں سے دے دے گی اس لئے کہ دار و مدار بارش پہ اور وہ قبضے میں اس کے' ہم نے رزق روک لیا تو جس کا رزق ہم روکنا چاہیں وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے دے' ہم نے رزق روک لیا تو کون ہے جو دروازے رزق کے تمہارے اوپر کھول دے بات کیا ہے بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ سوائے اس کے کہ یہ بدک رہے ہیں سوائے اس کے سرکشی پر ہیں اور ڈھٹائی پر جمے ہوئے ہیں۔ ہٹ دھرمی کے سوا کوئی حجت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے' عقل کی' نہ حس کی' نہ طبع کی' نہ قویٰ کی' کوئی چیز ان کے قبضے میں نہیں ہے ڈھٹائی پر آمادہ ہیں اور وہ ڈھٹائی انہی کے انجام کو خراب کرے گی اللہ میاں کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ۔

کفار کی مثال

تو اب ان کی مثال ایسی ہوگی کہ جیسے ایک شخص تو وہ ہے کہ سیدھے راستے پر دیکھتی آنکھوں چل رہا ہے اور منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے اور ایک وہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا رستہ (چلا) اور اوندھا لیٹ گیا اس کے اوپر' آنکھ بھی کام نہیں کرتی' ہاتھ پیر بھی کام نہیں کرتے اور چاہتا یہ ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے تو کون پہنچے گا منزل مقصود پر؟ وہ پہنچے گا کہ جو سیدھے راستے پر جا رہا ہے عقل سے کام لے رہا ہے۔ محسوسات کو دیکھ رہا ہے اپنی قوتوں کو خالق کی راہ میں اختیار اور استعمال کر رہا ہے رستہ دیکھ کر جا رہا ہے چل رہا ہے وہ پہنچ گیا وہ پہنچے گا جو اوندھا لیٹ گیا ہے اور ہاتھ پیر بھی چھوڑ دیئے آنکھیں بھی زمین میں دھنسا دیں نہ رستہ سامنے نہ منزل سامنے تو تمہاری مثال وہی ہو گئی کہ رستے کے اوپر ہو مگر اوندھے لیٹ کر' نہ آنکھ سے دیکھتے ہو نہ دل سے سوچتے ہو' نہ غور و فکر کرتے ہو اور چاہتے ہو منزل پر پہنچ جائیں تو منزل پر تو وہی پہنچیں گے جو متبعین انبیاء ہیں کہ راستے پر پڑے ہوئے ہیں' چل رہے ہیں ہاتھ پیر استعمال کر رہے ہیں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ عقل سے حق کا رستہ معلوم کر رہے ہیں اس کی تائید کر رہے ہیں وہ پہنچیں گے منزل پر تم نہیں پہنچو گے تو تمہاری مثال اس شخص کی ہے کہ زمین کا راستہ سامنے ہے بجائے چلنے کے اوندھا لیٹ جائے۔ سب قویٰ کو بے کار کر دے ہاتھ پیر کو بے کار' اس لئے کہ جب کسی قوت سے کام نہیں لیتے تو اور کیا مثال ہے تمہاری یہی مثال بن سکتی ہے تو اس کو فرمایا کہ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ آیاوہ شخص جو چل رہا ہے اوندھا چہرے کے اوپر الٹا پڑا ہوا ہے وہ ہدایت پائے گا یا وہ پائے گا جو سیدھے راستے پر سیدھا سیدھا چل رہا ہے؟ تو جو سیدھے چلنے والے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام ہیں ان کے متبعین ہیں ان کے پیروکار ہیں کہ علم وحی سامنے آیا کانوں سے سنا آنکھوں سے دیکھا عقل سے سوچا اور چل پڑے راستے کے اوپر' وہی پہنچیں گے منزل پر' وہ نہیں کہ آنکھ بھی بند کرلی۔ یعنی اوندھے لیٹ گئے۔ دل کو بھی بےکار کرلیا یعنی عقل سے بھی نہ سمجھا ہاتھ پیروں کو الٹا ڈال دیا کہ چلنے کے قابل نہ رہے اور مدعی اس کے ہیں کہ ہم پہنچیں گے منزل مقصود پہ تو سوائے اس کے اندھاپن کہا جائے اور کیا کہا جائے گا وہ رستہ پر پہنچے گا یا یہ رستہ پر پہنچے گا؟ اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ہے سامان سا ہی مختلف چیزیں ہم نے دیں عقل دی سب کچھ دیا۔

انسان خود اپنی ذات میں غور کرے

لیکن خود تم اپنے اوپر غور کرو تم کہاں سے آئے؟ آیا تمہیں اللہ نے بنایا یا خود بخود بن گئے تھے تم؟ ظاہر ہے کہ خود بخود تو بنے نہیں اگر خود بخود بن جاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وجود تمہارے ہاتھ میں ہے تو اگر وجود ہاتھ میں تھا تو یہ موت کیوں قبول کرتے ہو جبراً؟ کس کا جی چاہتا ہے کہ مر جائے تو اگر وجود ہاتھ میں ہے تو مَلَکُ الْمَوْتَ کو واپس کر دیا کرو کہ صاحب ہم زندگی دینا نہیں چاہتے آپ کو وہاں تو چپ پڑ رہتے ہو وہاں تو سانس چلنے لگتا ہے جان چھپائی کے لئے تیار ہو جاتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں تو جب روکنا زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں تو لانا بھی زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

جب ہم پیدا ہو رہے تھے تو ہماری درخواست نہیں تھی خواہش نہیں تھی' دینا تھا جان اللہ کو تو لینی پڑی، مجبور آنا پڑا' چاہے ہمارا جی چاہتا تھا آنے کو یا نہیں چاہتا تھا اور جب لے جائیں گے تو جانا پڑے گا چاہے ہمارا جی چاہے نہ چاہے تو وجود تو آپ کا یہ ہے کہ نہ حیات پہ قبضہ نہ اپنے وجود پہ قبضہ اور دعوے یہ ہیں کہ اللہ کے احکام میں مِن میخ نکالتے ہیں کہ ہم یوں کر ڈالیں گے اور قدرت کے چیلنجوں کو منظور کرتے ہیں بعض عقل کے اندھے' یہ جو درمیان میں بہت سے سیلاب آئے اور انہوں نے بستیوں کو غرقاب کیا ہزاروں آدمی مارے گئے تو بعض عقل کے اندھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نے بند لگانے شروع کر دیئے ہیں اور قدرت کے چیلنج کو ہم نے قبول کرلیا ہے ہم مقابلے کے لئے تیار ہیں اور جو بند باندھے اگلے ہی سال اس میں شق واقع ہوگئے دراڑ واقع ہوگئے پھر مرمت شروع ہوئی اور خدا جانے کب تک وہ مرمت کام دے گی۔ خدانخواستہ وہ پھٹ پھٹا گئے تو پھر ساری بستیاں اور جلدی غرق ہوں گی۔

بعض عقل کے اندھے قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھ کر مقابلہ کی ٹھانتے ہیں

بعض عقل کے نابینا وہ بھی ہیں کہ وہ قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے چیلنج مان لیا ہم مقابلہ کریں گے اور طاقت یہ ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنے ہاتھ میں نہیں اپنی قوت بھی اپنے ہاتھ میں نہیں تو

فرماتے ہیں قُلْ هُوَ الَّذِيْ اَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ جن قویٰ پر تم نازاں ہو آنکھ پہ ناک پہ یہ دینے والا کون ہے هُوَ الَّذِيْ اَنْشَأَكُمْ وہی ہے جس نے تمہیں ابتداء میں بنایا اور از سر نو بنایا اور وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ تم میں سننے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات سن کر حاصل کرو، آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات دیکھ کر حاصل کرو، دل میں بوجھنے کی طاقت رکھی تاکہ غور و فکر سے کچھ معلومات میں اضافہ کر دیہ ساری قوتیں حق تعالیٰ نے دیں اور عجیب صنائع کے ساتھ دیں۔

انسانی دل ایک عجیب کائنات ہے

قلب کو ایک عجیب کائنات بنایا اللہ نے، اس قلب کے اندر محققین لکھتے ہیں کہ دو دروازے ہیں قلب کے ایک نیچے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی ہے قلب میں ایک اوپر کی طرف، اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو عالم غیب کے مشاہدات کرتا ہے۔ وحی اور الہام ربانی اور جمالات اور کمالات خداوندی کو دیکھتا ہے عالم غیب منکشف ہوتا ہے اور نیچے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے تو محسوسات نظر پڑتے ہیں دریا اور پہاڑ اور جنگل تو محسوسات کو نیچے کے سوراخ سے دیکھتا ہے اور مغیبات کو اوپر کے سوراخ سے دیکھتا ہے قلب ایک ہی ہے لیکن اس میں بینائیاں دو قسم کی رکھیں ایک اوپر کے دیکھنے کی ایک نیچے کے دیکھنے کی، ایک ظاہری چیزیں دیکھنے کی ایک باطنی چیزیں دیکھنے کی، ظاہری چیزوں کے دیکھنے کے لئے آلات بنائے، قلب کے لئے آنکھ بنائی تاکہ شکلیں اور صورتیں دیکھے کان بنائے تاکہ آوازوں کو سنے، زبانیں دیں تاکہ ذائقوں کو چکھیں، ناک دی تاکہ خوشبو اور بدبو کو سونگھے، تو شئی کی صورت بھی دیکھتا ہے انسان شئی کی خوشبو بدبو کا بھی ادراک کرتا ہے شئی کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ آوازیں سن کر بچاؤ بھی کرتا ہے۔ اپنے کام بھی نکالتا ہے۔ اگر شیر کی دہاڑ سنی تو بچنے کی کوشش کرتا ہے تو کان کے ذریعے بنتے ہیں بچنے کا اور اگر آواز سن لی کسی اچھے خوشنما پرندے کی تو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کی زینت بناؤں گا تو کان ذریعہ بنا منافع حاصل کرنے کا بھی اور مضار یعنی مضرتوں سے بچنے کا بھی۔ اسی طرح سے آنکھ ذریعہ بنتی ہے چیزوں کے لینے کا بھی اور چیزوں سے بچنے کا بھی۔ اگر صورت دیکھ لے سانپ کی تو بھاگتا ہے آدمی اگر صورت دیکھ لی کسی اچھے خوش نما پتھر کی سونے کی چاندی کی دوڑتا ہے اس کے اٹھانے کے لئے اگر آنکھ نہ ہوتی تو نہ نفع حاصل کر سکتا نہ مضرت سے بچ سکتا تو آنکھ کو اللہ نے ذریعہ بنایا دور سے دیکھ کر منافع حاصل کرنے کا اور مضرتوں سے بچنے کا بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سامنے نہیں ہیں ان کی آواز بھی نہیں آتی، لیکن ان کی بدبو اور خوشبو سے سمجھ لیتا ہے کہ یہاں فلاں چیز موجود ہے۔ شیر کے منہ میں بدبو ہوتی ہے اگر وہ سامنے بھی نہیں تو اس کے منہ کی بدبو دور تک سونگھ سکتا ہے آدمی، سمجھ لیتا ہے کہ یہاں شیر موجود ہے بھاگتا ہے وہاں سے اور اگر دوسرا جانور سے اس کی بو آئی اور وہ استعمال کا ہے تو شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناک ذریعہ بنتی ہے بہت سی چیزوں سے بچنے کا اور بہت سی چیزوں کے حاصل کرنے کا، اسی طرح سے ذائقہ بعضی چیزوں کو چکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ مضر ہوں گی اس کا ذائقہ بتلا

رہا ہے کہ یہ مضر ہے بعض ذائقے ہیں جو فرحت بخشتے ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آنکھ ناک کان وغیرہ آلات ہیں اور ادراک کرنا دل کا کام ہے

تو آنکھ، ناک، کان، منہ یہ تمام چیزیں آلات ہیں مگر حقیقت میں ان ساری چیزوں کا ادراک کرنے والا قلب ہے یہ سب خدام ہیں اس کے آنکھ حقیقتاً خود نہیں دیکھتی دل دیکھتا ہے یہ عینک چڑھی ہوئی ہے دل کے اوپر آنکھ، آنکھ خود نہیں دیکھتی بسا اوقات آپ کسی بازار میں چلے جا رہے ہیں اور بڑی اعلیٰ اعلیٰ مناظر بڑی بہترین دکانیں اور روشنیاں ہیں گھر آکر دوسرا کہتا ہے کہ بھئی بڑے بڑے تماشے تھے آج تو بازار میں آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں پڑا کہتا ہے میاں آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں افوہ میں تو فلاں خیال میں غرق تھا مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا معلوم ہوا آنکھ دیکھنے والی نہیں ہے دل دیکھنے والا ہے جب دل متوجہ ہے دوسری طرف کچھ نظر نہیں آتا۔ آپ کسی دھیان میں پڑے ہوئے ہیں اور زور سے گھنٹا بجا آپ کو پتہ بھی نہ چلا تو دوسرے نے کہا کہ میاں تم نے نماز نہیں پڑھی وہ گھنٹہ جو بج گیا تھا اور تم نے افطار نہیں کیا وہ اتنا بڑا گولہ چھوٹا تھا اے ہے! میں نے تو سنی ہی نہیں اے میاں! بڑے زور سے بجا تھا کہتے ہیں افوہ میں تو فلاں خیال میں لگا ہوا تھا۔ مجھے تو دھیان ہی نہیں آیا معلوم ہوا کہ دل سنتا ہے کان نہیں سنتا جب دل متوجہ ہے تو کان سنیں اور دل متوجہ نہیں تو کھلے ہوئے کان نہیں سنتے اسی طرح سے ذائقہ کی بات ہے بعض دفعہ دھیان نہیں ہوتا تو نہ کھٹے کا ذائقہ آتا ہے نہ میٹھے کا۔

ایک واقعہ

مجھے ایک واقعہ یاد آیا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سالے تھے حاجی مقبول صاحب بڑے بزرگ لوگوں میں سے تھے حضرت ہی کے یہاں رہتے تھے ان کا کھانا وانا سب وہیں تھا۔ اتفاق سے دو تین دن سے روزانہ چنے کی دال پک رہی تھی انہوں نے بہن سے شکایت کی کہ روز چنے کی دال کوئی اور دال بھی پکالیا کرو خیر انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکالی کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے آج بھی وہی چنے کی دال پکائی تھی انہوں نے کمر میں دو ہتڑ ماری اندھے یہ دال چنے کی ہے کہ ماش کی؟ اخوہ مجھے وہی دھیان رہا جو تین دن سے تھا اسی دھیان میں کھاتا رہا مجھے وہی مزہ آتا رہا جیسے چنے کا تھا معلوم ہوتا ہے زبان نہیں چکھتی بلکہ دل چکھنے والا اگر دل متوجہ ہو جائے تو آدمی متوجہ ہو کر سب کچھ چکھ لیتا ہے۔ دل متوجہ نہ ہو نہیں چکھتا۔ تو اصل میں دیکھنے والا بھی دل ہے سننے والا بھی دل ہے۔ چکھنے والا بھی دل ہے تو دل عجیب چیز نکلا وہ ان تمام خدام کو استعمال کر رہا ہے محسوسات کو دیکھتا ہے۔

دل اشیاء کا صرف ادراک ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں اپنے اندر محفوظ بھی کر لیتا ہے

اچھا اب اس کے بعد پھر ایک عجیب کائنات دل کی یہ بھی ہے کہ ان ساری چیزوں کے ذریعے اس نے دیکھ بھی لیا، سن بھی لیا، چکھ بھی لیا چکھنے کے بعد وہ ذائقہ غائب ہو جانا چاہیے تھا دیکھنے کے بعد صورت غائب ہو جانی چاہیے تھی لیکن دل نے اتنا قبول کیا کہ اب وہ شئی سامنے نہیں ہے لیکن ذرا آپ نے گردن جھکائی تو

شئی دل کے سامنے ہے یہ کہاں موجود ہے یہ آنکھ میں تو موجود نہیں اگر آنکھ میں ہوتی موجود تو دوسری چیز دیکھنے کے قابل نہ رہتے وہ چیزیں ہی ٹکراتی رہتیں تو آنکھ کہاں سے دیکھتی آنکھ دیکھ کر فارغ ہوئی قلب نے فوٹو اتار لیا اور قلب کے وہ نقشہ موجود ہے اب جب چاہیں گے آپ دیکھ لیں گے کسی شاعر نے کہا ہے نا ں کہ ۔

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

بس جہاں مراقبہ کیا اور سامنے موجود چیز جہاں غور کیا چیز موجود' تو دل فقط دیکھتا ہی نہیں بلکہ نگلتا بھی ہے ان چیزوں کو دیکھنے میں تو یہ ہے کہ دیکھ لیا باہر کی چیز ہے' دیکھ کر اس کی صورت کو نگلتا ہے اپنے اندر اور اس کا نقشہ کھینچ لیتا ہے۔ فوٹو لے لیتا ہے تو دل ایک بڑا زبردست کیمرہ بھی ہے۔ تو اس میں صورتیں بھی موجود' ذائقے جو چکھے تھے وہ بھی موجود آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کے یہاں میں نے ایسا عجیب و غریب سالن کھایا کہ آج تک ذائقہ میری زبان میں موجود ہے وہ زبان میں نہیں وہ دل میں موجود ہے' اگر زبان میں وہ ذائقہ ہوتا تو دوسرا ذائقہ مل ملا کے کوئی ذائقہ باقی نہ رہتا خلط ملط ہو جاتا تو زبان چکھ کر الگ ہوئی اس نے پہنچا دیا قلب کے اندر تو یہ درحقیقت ہرکارے اور خدام ہیں جو صورتیں' آوازیں' ذائقے بٹور کر۔ قلب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں گویا یہ ایک سی آئی ڈی ہے کہ جس کے ذریعے سے قلب تمام چیزوں کے احوال معلوم کرتا ہے صورتوں کے بھی آوازوں کے بھی' ذائقوں کے بھی' خوشبو بدبو کے بھی۔

دل نے پانچ دروازے حواسِ ظاہرہ کے رکھے اور پانچ دروازے حواسِ باطنہ کے

تو قلب ایک عجیب کائنات نکلی تو اس نے پانچ دروازے رکھے جو حواس ظاہرہ کے ان کے ذریعہ محسوسات کو دیکھ کر اپنے اندر لے لیتا ہے اور پانچ ہی پھر حواس ہیں باطنی' قوت وہم اور قوتِ خیال اور قوتِ متصرفہ اور قوت عاقلہ تو ان کے ذریعے سے وہ غیبی چیزیں دیکھتا ہے۔ علوم میں جب غور کرتا ہے تو نئے نئے علوم اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ بدن کے اندر نہیں ہے روح میں ہے اور روح کا کنکشن ہے روحِ اعظم سے تو وہاں سے علوم اترتے ہیں تو قلب ہی کے اندر یہ خاصہ ہے کہ جب غیب کی طرف متوجہ ہو تو علوم اور کمالات لیتا ہے وہاں سے' تو عجیب کائنات اللہ نے بنائی ہے تو یہ اتنی سی ڈبیہ گاجر کی شکل کی سینے کے بائیں جانب پڑی ہوئی ہے لیکن ایک بطن اس کا وہ ہے جو اوپر کی چیزیں منکشف کرتا ہے اور ایک بطن وہ ہے جو نیچے کی چیزیں منکشف کرتا ہے تو اگر انسان اوپر کے دروازے کو بند کر دے اور صرف نیچے کی چیزیں دیکھے نہ علم ہو نہ کمال ہو نہ اللہ کا اعتقاد ہو نہ وہاں سے علوم ہوں تو وہ اندھا ایسے ہی کام کرے گا جس کی شکایت کی جارہی ہے اس نے آنکھیں بھی بند کر لیں ہاتھ بھی سکوڑ لئے کچھ بھی نہیں کر رہا اور ایک وہ لوگ ہیں جو محسوسات دیکھتے ہیں اور ساتھ میں مغیبات کے علوم بھی انکے قلب میں ہیں انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے وہ ان علوم کے ذریعہ سے ان ساری محسوسات کو اپنی اپنی حد پر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس

محسوس کو کہاں استعمال کرنا چاہئے اور کہاں نہیں کہاں جائز ہے کہاں ناجائز کہاں حرام ہے کہاں حلال؟

حرام وحلال کی تمیز علم غیب (وحی) سے ہوتی ہے

تو حرام وحلال کی تمیز علم غیب سے ہوتی ہے ان محسوسات سے نہیں ہوتی اور وہ سمجھنے والا صرف قلب ہے' آنکھ' ناک' کان یہ حق اور باطل دونوں چیزیں قبول کرتے ہیں آنکھ اگر آپ جائز چہرے پر ڈال لیں جب بھی لذت لے گی اور حرام چہرے پر ڈال لیں جب بھی آنکھ لذت لے گی' ہاتھ اگر آپ جائز مال پر ڈال لیں اسے بھی گرفت کرلے گا اور اگر رشوت کا مال لیں تو وہ چھپے گا نہیں ہاتھ میں اُسے بھی قبضہ کرلے گا۔ اسی طرح سے کان ہے اگر آپ کسی ناجائز آواز پر گانے بجانے پر متوجہ کردیں تو اس سے بھی کانوں کو لذت ہوگی اور جائز آوازیں ہیں مثلاً تلاوت قرآن ہورہی ہے' ذکر اللہ ہو رہا ہے وہ بھی کان لے لیں گے تو آنکھ حق وباطل میں امتیاز نہیں کرسکتی کان حق وباطل میں امتیاز نہیں کرسکتا ہاتھ حق وباطل میں امتیاز نہیں کرسکتا' لیکن قلب وہ ہے کہ وہ امتیاز کرتا ہے حق اور باطل میں' اگر غلط چیز آئی تو کھٹکا رہے گا قلب جب تک کہ سچی بات سامنے نہیں آئے گی مطمئن نہیں ہوگا' ناجائز مال آئے گا قلب کے سامنے کھٹکتا رہے گا چور کے دل میں کبھی اطمینان نہیں ہوگا۔ ضمیر ملامت کرتا رہے گا کہ برا کیا، چاہے نفس مانے نہ مانے تو قلب احساس کرتا ہے حرام کا بھی' حلال کا بھی' جائز کا بھی' ناجائز کا بھی' لیکن یہ کس طرح سے یہی علوم غیب کے ذریعے وہی جو اوپر سے ضمیر میں آرہی ہے چیز اس کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز ہوتا ہے ورنہ صورتوں اور شکلوں میں امتیاز نہیں ہوتا حق وباطل کی تو جن لوگوں نے اوپر کا دروازہ بند کردیا قلب کا نہ انبیاء کی بات سنی نہ علم وحی کو قبول کیا نہ اللہ کے احکام کو لیا ان کے سامنے صرف محسوس زندگی رہ گئی۔ یہی اینٹ' ڈلا' پتھر خوشبو یہی چیزیں رہ گئیں اب اس پر چاہے وہ غرور کرے وہ بھی جہالت ہوگی کیونکہ اوپر کا علم نہیں ہے۔ عظمت خداوندی سامنے نہیں ہے اسے غلط استعمال کرے تو کرسکتا ہے اس لئے کہ اوپر کا علم سامنے نہیں ہے جو غلط کو غلط بتاتا اور صحیح کو صحیح' تو ان کی آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود اندھی ہیں۔ کان کھلے ہونے کے باوجود بہرے ہیں کہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہیں کرسکتے۔

محض صورتوں کو دیکھنا کمال نہیں ان میں اِمتیاز کرنا کمال ہے

تو صورتوں کا دیکھ لینا کمال نہیں جانور بھی دیکھتا ہے' بیل بھی دیکھتا ہے صورتیں' ان صورتوں میں یہ امتیاز کرنا کہ یہ دیکھنے کے لائق ہیں یا نہیں یہ حلال یا حرام یہ قلب کا کام ہے مگر وہی قلب جس کے اندر ایمان کی روشنی ہو جس میں انبیاء کی اطاعت کا جذبہ ہو' ان لوگوں نے جب وہ جذبہ کھو دیا تو ظاہر بات ہے کہ صرف محسوسات رہ گئیں اسی کے چکر میں پڑے رہے نہ عقل کام دے گی نہ علم کام دے گا۔

سائنس اور فلسفہ علم نہیں حِس ہے

آج مجازی طور پر آپ علم کہہ دیں سائنس کو فلسفے کو مگر یہ علم نہیں ہے یہ حس ہے یعنی محسوسات کو

دیکھنا تجربات سے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے رہنا یہ بس دیکھنا ہے اور دست کاری۔

علم کسے کہتے ہیں؟

علم کہتے ہیں مغیبات کو یعنی ایسی چیز کے جاننے کو کہ جو آنکھ اور کان سے نہ دیکھی جاسکے اور وہ علم اللہ کا ہے جو وحی کے ذریعے آتا ہے تو علم کہلانے کا مستحق وہ ہے یہ جو حسی چیزیں ہیں ان میں حس سے تصرفات کریں گے یہ احساسات سے تعلق رکھتے ہیں اسے حس کہیں گے علم نہیں کہیں گے اور حس جانور میں بھی ہوتی ہے انسان میں بھی۔ جانور کے لاٹھی ماردو گے وہ بھی تکلیف پائے گا۔ انسان کی خصوصیت نہیں اس کو ڈھیلا مارو' وہ بھی جذبہ میں آجائے گا۔ یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا۔ طبیعت سے تعلق رکھتا ہے حس سے تعلق رکھتا ہے تو یہ جتنی چیزیں ہیں یہ احساسات ہیں علوم نہیں علوم کا تعلق ہے مغیبات سے اور وہ جبھی آتا ہے جب قلب کے اوپر کا دروازہ کھلے اور اس دروازے میں وہاں سے آمد شروع ہو جائے علم کی اور کنکشن ہو' تو حاصل یہ نکلا اس آیت کا کہ انہوں نے اوپر کا دروازہ بند کر لیا ہے قلب کا اور وہ کام نہیں لیتے جو قلب کا کام ہے کہ جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں صورتیں دیکھنے پر قناعت کر رہے ہیں تو پھر کہاں سے انہیں منزلِ مقصود نظر آئے گی اور پھر یہ سامان بھی جتنا ہے دیکھنے کا یہ بھی ہمارا ہی تو دیا ہوا ہے اس نے خود کہاں پیدا کیا ہے اگر ہم روک لیں تو دیکھ بھی نہ سکے' چکھ بھی نہ سکے تو ان طاقتوں کے بل بوتے پر ہمارے مقابلے پر آرہا ہے جن کے خالق ہم ہیں' تو حماقت اور جہالت واضح فرمائی گئی اس کو فرمایا **قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ** کہہ دیجئے اے پیغمبر کہ وہی ہے اللہ جس نے تمہیں پیدا کیا پیدا کرنے والا وہ ہے اور پیدا بھی کیا اس شان سے کہ جن قوتوں پر ناز کرتے ہو وہ اس نے رکھیں۔ سننے کی طاقت اس نے رکھی' دیکھنے کی طاقت اس نے رکھی' بوجھنے کی طاقت اس نے رکھی' دِل دیا' آنکھ دی کان دیئے **مگر قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ** بہت کم ہیں جو شکر گزار ہیں اللہ کے کہ ان نعمتوں کو نعمت سمجھیں' بس یوں سمجھ لیا ہے کہ ہماری ملکیت ہے کون ہے دینے والا تو نہ شکر کا کام ہے نہ حمد کا کام ہے تو جب حمد و شکر نہیں اس واسطے اس کا استعمال بھی صحیح نہیں اس لئے کہ ادھر عقل لڑاتے ہی نہیں اور فرماتے ہیں یہ تو ہیں قوتیں اب خود اپنی ذات کو دیکھ لو جس میں یہ قوتیں رکھی گئیں وہ ذات کہاں سے آئی؟ وہ بھی تو اللہ ہی نے بنائی ہے تم خود ہی تو نہیں بنے تو اس کو فرمایا **قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ** آپ فرما دیجئے اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں بکھیر دیا عجیب اعجازی شان سے کہ ایک نفس واحد کو پیدا کیا آدم علیہ السلام کو' اور اس کے ذریعے اربوں کھربوں انسان پوری زمین میں بکھیر دیئے تو یہ بکھیرنے والے ہم ہیں یا تم ہو؟ ہم نے ہی تو تمہاری ذات کو دنیا کے اندر بھیجا تو ذات جب ہم نے بھیجی تو ذات میں جو کراماتیں رکھی ہیں سننا' دیکھنا' عقل' یہ بھی تو ہم ہی رکھنے والے ہیں جو ذات کا دینے والا وہ صفات کا دینے والا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذات تو تم بناؤ اور صفات میں ہم تمہارے تابع ہو جائیں یا ذات ہم بنائیں اور صفات تم رکھ لو جو ذات بنائیگا وہی صفات بنائیگا۔

سارے بیان کا حاصل

تو حاصل یہ نکلا کہ اگر اللہ کی قدرت پر غور کرو تب بھی جواب موجود ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اور عبرت پکڑو اور اگر عقل سے غور کرو تو عقل بھی بتلاتی ہے کہ دینے والا جو ہے اسی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا' اگر حس پر غور کرو تو پرندوں کو دیکھ لو وہی ہے اوپر لے جانے والا' وہ پتھروں کو اوپر لے جا کر برسا سکتا ہے اگر تاریخ پر غور کرو تو پچھلوں میں ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ لیکن جب نہ تاریخ سامنے رکھو' نہ آنکھ کان کھول کر دیکھو نہ عقل سے دیکھو' نہ ایمان لاؤ تو سوائے ہٹ دھرمی کے اور کیا ہے؟ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم گویا مستعد بن رہے ہو ہمارے عذاب اٹھانے کے لئے تو ہم عذاب بھیجنے والے ہیں ہم نے دنیا میں بھی عذابات دیئے ہیں قیامت کا دن بھی رکھا ہے کہ اس میں آخری طور پر عذاب دیں گے۔ اب آگے جب یہ بات ہوئی تو فرمایا گیا گویا جب تم عذاب ہی چاہ رہے ہو تو اچھا تیار رہو عذاب کے لئے مگر مصیبت یہ ہے کہ انسان کی کٹ حجتی پر کہ تیار ہونے کے باوجود پھر تیار نہیں وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اجی صاحب وہ عذاب کب کو آئے گا' وہ قیامت کب آئیگی اب اس پر بھی یقین نہیں کہ آنے والی ہے اس لئے کہ یقین کا سبب اور اسباب تو پیدا کئے نہیں۔ اس سے کام نہیں لیا تو قیامت کی دھمکی دی کہ اب قیامت مانگنے کو تیار کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یہاں سے پھر آگے قیامت کا اثبات شروع کیا کہ آخری سزا کے لئے قیامت کا دن تیار ہے دنیا میں جب تک گزار رہے ہو گزار لو، یہاں بھی عذاب آئے گا اور وہاں بھی عذاب آئے گا۔ یہاں کے عذاب کو ممکن ہے کہ تھوڑا بہت اسباب کے ذریعے ٹال لو گو وہ ٹلے گا نہیں لیکن قیامت کے دن تو کوئی صورت ہی نہیں ہے ٹلنے کی۔ وہ تو آنے والا ہے چاہے اسے مانگو تم چاہے نہ مانگو، اس واسطے قیامت کے ثبوت اور قیامت کے اثبات پر بحث فرمائی ہے اب یہاں سے کل ہو گا۔ ان شاء اللہ دعا فرمائیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌo فَلَمَّا رَاَوْہُ زُلْفَۃً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَقِیْلَ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تَدَّعُوْنَ o قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَھْلَکَنِیَ اللّٰہُ وَمَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ یُّجِیْرُ الْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ o قُلْ ھُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِہٖ وَعَلَیْہِ تَوَکَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ ھُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍo قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍo

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ تو کہہ خبر تو ہی اللہ ہی کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر، پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آلگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کردے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے، تو کہہ وہی رحمٰن ہے ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا سو اب تم جان لو گے کون پڑا ہے صریح بہکاوے میں۔ تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا۔

جب نبی کریم ﷺ نے قوم کو قیامت سے ڈرایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ پوری دنیا ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوگی تو اس زندگی کے لئے اس زندگی میں کچھ کرو، اگر کچھ کر لیا سامان تو اگلی زندگی راحت سے کٹے گی اور اگر نہ کیا یا برا سامان مہیا کیا تو اگلی زندگی تکلیفوں میں کٹے گی اور چونکہ وہ اگلی زندگی دوامی اور ابدی ہے اس لئے راحت کا سامان کیا تو راحت بھی دوامی ہوگی اور مصیبتوں کے سامان کر لئے تو وہ مصیبتیں بھی دوامی اور ابدی ہوں گی جو کاٹے نہیں کٹیں گی اس لئے آپ نے قیامت کو پیش فرمایا، تو اس پر قوم نے جھٹلایا حضور کو جس کی شکایت فرمائی حق تعالیٰ نے کہ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ یہ جو آپ قیامت سے ڈراتے ہیں وعدہ دیتے ہیں وہ کب کو آئے گی، وہ آ کیوں نہیں جاتی قیامت؟ تو اگر ہو تو اُسے لے کر آیئے جلدی سے برس ہا برس سے صدیوں سے ہزاروں برس سے وعدے دے رکھے ہیں آپ نے کہ دنیا ختم ہوگی تب وہ آئے گی تو اُسے اگر آنا ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آجاتی تاکہ آپ کو بھی ہمیں جھٹلانے کا موقع نہ رہے قیامت سامنے آجائے تو مجبور ہو کر ہم یقین کر لیں۔ یہ سوال کیا کہ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ کب آئے گی وہ قیامت؟

قیامت کے سوال کا منشاء دو چیزیں ہو سکتی ہیں

اس سوال کا منشاء دو ہو سکتے ہیں اور تھے بھی دو، ایک تو یہ کہ بعضے قیامت ہی کے منکر تھے کہ کوئی زندگی اگلی آنے والی نہیں ہے ان کے مزاجوں میں دہریت تھی نہ وہ اس عالم کی ابتداء کے مقر تھے نہ انتہا کے مقر تھے کہ بس یونہی چلا آرہا ہے قصہ، یونہی چلتا چلا جائے گا ابدالآباد تک۔ اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیٰوتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ یہ زندگی ہماری مر رہے ہیں۔ جی رہے ہیں یونہی دیکھتے چلے آرہے ہیں۔

یونہی دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے تو زمانہ ہمیں زندگیاں دے رہا ہے زمانہ ہی آتا ہے وقت گذرتا ہے موت آجاتی ہے، یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ نہ قیامت ہے نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، تو کچھ تو دہریہ مزاج تھے کہ جو شروع ہی سے منکر تھے قیامت کے۔

فلاسفۂ یونان بھی دہریوں کی طرح قیامت کے منکر ہیں

جیسا کہ فلاسفۂ یونان وہ بھی منکر ہیں قیامت کے، وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے دنیا اور ہمیشہ اسی طرح چلی جائے گی نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، نہ کوئی انتہا ہے اس عالم کی۔

فلاسفہ ہند بھی قیامت کے منکر ہیں

فلاسفہ ہند، یہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ابتداء بھی نہیں ہے اور انتہا بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی انتہا تو وہ انتہائیں بھی ہزاروں آئیں گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اتنے ارب اتنے کھرب اتنے کروڑ اتنے لاکھ برس تک یہ قائم رہی ہے دنیا اور پھر پرلو آجاتی ہے قیامت آجاتی ہے۔ عالم مٹ جاتا ہے اور پل بھر میں پھر از سر نو بننا شروع ہو جاتا ہے اور چار بیسی یعنی جو سب سے اول پیدا ہوتے ہیں تبت کے پہاڑ ہیں اُن پر ریت اترتا ہے پھر دنیا چلتی ہے اور چار ارب اور چار کھرب اور چار کروڑ برس تک پھر چلتی رہے گی پھر پرلو آئے گی اور پھر از سر نو سلسلہ شروع ہو جائے گا تو ارواح ان کے یہاں گنتی کی متعین ہیں وہی لوٹ پھیر کر آئے جاتی ہیں وہ مختلف جون بدلتی رہتی ہیں۔ تو ابتداء وانتہا کے یہ بھی قائل نہیں اور فلاسفہ یونان بھی قائل نہیں یعنی جتنے بھی بندگانِ عقل ہیں وہ قائل نہیں ہیں قیامت کے اُن کا خدا ان کی عقل ہے یہ اس واسطے کہ ان کے عقائد میں یہ چیز آتی نہیں کہ ابتداء ہے اس عالم کی، تو وہ در حقیقت خدا کے وجود کے بھی منکر ہیں اور کائنات کی انتہا کے بھی منکر ہیں، ایک نمونہ عرب میں موجود تھا جو منکر تھے قیامت کے تو ایک منشاء تو ان کے سوال کا استہزاء اور مسخرہ پن ہے کہ جو چیز آنے والی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اس سے ڈرا رہے ہیں ہمیں نہ قیامت آوے نہ عالم ختم۔ بعض قائل تھے قیامت کے مگر اس کے مقصد سے واقف نہیں تھے کہ حقیقت کیا ہے قیامت کی، اس کی جہالت کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا تمسخر آمیز کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ کب کو آئے گی وہ قیامت تو قیامت کی حقیقت پیش نظر نہیں یعنی یہ پیش نظر نہیں تھا کہ ایک زندگی ختم ہو کر اس کے ثمرات اگلی زندگی میں نکلیں گے اور اس کے لئے لازمی ہے کہ ایک عالم ختم کیا جائے اور دوسرے عالم کی بنیاد ڈالی جائے تاکہ مجموعہ بنی آدم کو نتائج دیکھنے کا موقعہ ملے اچھے اور برے، یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک جہان بدل کر دوسرا جہان نہ لایا جائے تو بعضے اس حقیقت کے منکر تھے قیامت کے قائل تھے مگر حقیقت سے لاعلم تھے اس واسطے یہ سوال کیا کہ کب کو آئے گی وہ قیامت؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا انکار ہو یا قیامت کے مقصد کا انکار ہو یہ اپنی بھی تکذیب ہے اور مشاہدات کی بھی تکذیب ہے خود اپنے دیکھے کو جھٹلانا ہے۔

قیامتیں تین ہیں، شخصی، قرنی اور کلی

اس واسطے کہ قیامت ایک ہی نہیں ہے بلکہ کئی ہیں قیامتیں، ایک قیامت ہے شخصی اور ایک قیامت ہے قرنی اور ایک قیامت ہے کلی۔ شخصی قیامت ہر شخص کی موت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ' جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی، تو یہ شخصی قیامت ہے کہ ہر شخص کے اُوپر آ رہی ہے یعنی ایک زندگی ختم ہوتی ہے اگلی زندگی شروع ہو جاتی ہے تو یہ شخصی زندگی ہے، شخصی موت ہے اور شخصی قیامت بھی، دوسری قیامت ہے قرنی یعنی ایک نسل کا اختتام ہے جس کا اندازہ تخمینہ سو برس ہے سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نسل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی فرد کی عمر اتفاق سے بہت بڑھ جائے سو دو سو برس ہو جائے تو ایک فرد کا نام زمانہ نہیں ہوتا زمانہ کہتے ہیں اکثریت کو کہ ایک نسل کی نسل آجائے اور نسل کی نسل ختم ہو جائے ایک آدھ فرد رہ جائے تو اس سے نسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایک صدی گویا رکھی گئی ہے ایک نسل کے لئے تخمینی طور پر، اسی واسطے حدیث میں تجدید کا وعدہ فرمایا گیا ہے کہ دین کو تازہ بہ تازہ کیا جائے گا اور ہر صدی کے اوپر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس امت میں، نبی تو نہیں آئے گا اس امت میں کیونکہ یہ نبوت آخری ہے لیکن مجددین آئیں گے، ہر سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ مجدد پیدا کرے گا کہ لوگ اپنی خود رائیوں سے دین میں جو خلط ملط کریں گے۔ کچھ بدعات ملا دیں گے، کچھ منکرات، مجدد آکر پھر دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دے گا اور پھر از سر نو دین تازہ بہ تازہ ہو جائے گا اس لئے وعدہ دیا گیا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ اس اُمت میں حق پر رہے گا کبھی حق منقطع نہیں ہو گا اس سے وہ ایک بیج کی مانند ہو گا اس میں سے کونپلیں پھوٹیں گی اور نئی شاخیں پھر اُبھر آئیں گی اور مجددین آکر دین کی تجدید کریں گے اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا کہ اللہ تعالیٰ تازہ بہ تازہ کرے گا اس دین کو ہر صدی پر، ہر صدی پر مجدد آئیں گے۔

ہر صدی کے شروع میں مجدد آنے کی حکمت

تو ہر سو برس کے بعد مجدد کا وعدہ اس لئے کیا گیا ہے کہ سو ہی برس ہوتے ہیں ایک نسل کے جب نئی نسل آتی ہے تو کچھ نظریات بھی نئے ہوتے ہیں کچھ حالات نئے ہوتے ہیں، زمانے میں کچھ ترقی ہوتی ہے، ان ترقیات سے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے (دین کے بارے میں) مجدد آکر اس قرن کی ضروریات کو سامنے رکھ کر دین کی جب تجدید کرتا ہے تو پھر دین قلوب میں تازہ بہ تازہ ہو جاتا ہے کیونکہ ایک نسل کے آغاز اور ایک نسل کے اختتام کا عمومی طور پر اندازہ سو برس ہے اسی لئے سو برس پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا حاصل نکلا کہ ہر سو برس بعد ایک قیامت قائم ہوتی ہے یعنی ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کے لئے جگہ چھوڑتی ہے اُسے قیامتِ قرنی کہتے ہیں اور ایک تیسری قیامت ہے جو قیامتِ کلی ہے کہ پورے عالم پر موت طاری ہو جائے آسمان سے لے کر زمین، پہاڑ دریا حتیٰ کہ ملائکہ علیہم

السلام ارواحِ مقدسہ کوئی چیز باقی نہ رہے اور احدیت مطلقہ کا ظہور ہو صرف ایک اللہ کی ذات قائم رہے تو جیسے اُس کا نام واحد ہے کہ وہ ایک ہے ایسے ہی اس کا نام احد بھی ہے کہ وہ یکتا ہے اور بے مثل اور بے مثال، تو یکتائی کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز مٹ کر تنہا ذات واحد نہ رہ جائے۔

عالمِ دُنیا اللہ تعالیٰ کی صفات کے ظہور کیلئے بنایا گیا ہے

یہ عالم اللہ نے بنایا ہے اپنی صفات کے اظہار کے لئے تو تمام صفات ظاہر ہوں گی رحمانیت بھی ظاہر ہو رہی ہے غفوریت بھی ظاہر ہے رزاقیت بھی ظاہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت کے ظہور کے لئے قیامت کا آنا ضروری ہے

احدیت کا ایسا ظہور کہ کوئی نہ ہو اور وہ ہو یہ جب ہی ہو گا کہ جب پورے عالم کا نظام ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر ایک نظام لایا جائے تو احد کی صفت کے ظہور کے لئے قائم کی گئی ہے تو ایک قیامت شخصی ہوئی ایک قرنی ہوئی ایک قیامت کلی ہوئی دو قیامتیں وہ ہیں جو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہر انسان جب مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوئی یہ ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے ہے تو جس عالم کے اجزاء پر قیامتیں آ رہی ہیں کیسے ممکن ہے کہ اس کے کُل پر قیامت نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فنا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے جبھی تو ہر ہر جزء اس کا موت کی طرف جاتا ہے اگر اس عالم میں صلاحیت نہ ہوتی موت کے قبول کرنے کی تو ایک فرد بھی اس کا نہ مرتا، ایک جزء میں بھی تغیر نہ ہوتا۔ سارے اجزاء علیٰ حالہ باقی رہتے لیکن جب ایک جزء موت کی طرف جاتا ہے تو مجموعہ بھی یقیناً موت کی طرف جائے گا۔ ان اجزاء کے مجموعہ ہی کا نام تو عالم ہے اب انفرادی طور پر یہ اجزاء جتنے ہیں ایک وقت آئے گا کہ مجموعہ مل کر مٹ جائے گا پورے عالم پر موت طاری ہو جائے گی تو جس کے ایک جزء میں یہ خاصیت ہے وہ کل کے اندر بھی ہو گی ورنہ اجزاء میں وہ بات نہ پیدا ہوتی اجزاء میں خاصیت نہ آتی، تو موتِ شخصی قیامت شخصی ہم روز دیکھتے ہیں ہر فرد پر۔

عالمِ دنیا کے ہر ہر جزء پر موت طاری ہوتی ہے

انسان ہی نہیں جانور بھی مرتے ہیں اور جانور ہی نہیں تمام اجزاء مرتے ہیں۔ ایک پتھر رکھا صحیح سالم وہ ٹوٹ گیا اس کی ہیئت کذائی مٹ گئی۔ درخت ہیں ان پر موت طاری ہوتی ہے بعضے درختوں کی عمر سال بھر ہے جیسے پپیتہ سال بھر میں اگا اس کے بعد نئی شاخ پھوٹ آئی یا کیلا ہے کہ سال بھر رہا اس کے بعد مٹ گیا۔ بعضے درختوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے بعضوں کی سو سو برس ہوتی ہے، تو جس طرح سے بنی آدم میں عمریں مختلف ہیں نباتات میں بھی مختلف ہیں انسان بھی مرتے ہیں، تو جب اس عالم کے سارے اجزاء موت کو قبول کرتے ہیں تو عقل بتلاتی ہے کہ مجموعہ بھی قبول کرے گا اس کے اندر موت آنے کی صلاحیت موجود ہے تو جو لوگ روزانہ دیکھتے ہیں قیامت کو آتے ہوئے وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں مجموعہ قیامت کا، یہ تو اپنے مشاہدہ کو جھٹلانا ہے۔

قیامت کا انکار کرنا خود اپنے آپ کو جھٹلانا ہے

تو قیامت کا انکار کرنا خود اپنی تکذیب ہے اپنا انکار کرنا ہے ورنہ جو منکرین ہیں قیامت کے انہیں چاہئے کہ وہ مرا نہ کریں اور ملک الموت کا مقابلہ کریں اور کہہ دیں کہ ہم میں صلاحیت نہیں ہے موت آنے کی۔ ہم میں تو ابد الآباد تک رہنے کی صلاحیت ہے لہٰذا ہم مرنا نہیں چاہتے اگر وہ اس پر قادر ہوتے تو عالم کے بارے میں بھی دعویٰ کر سکتے تھے کہ اس عالم پر بھی موت نہیں آئے گی۔ جب اس کے اجزاء پر نہیں آتی تو کل پر بھی نہیں آئے گی لیکن جب آتی ہے اجزاء پر تو کل پر آنا ممکن ہے اس واسطے یہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے اب دوسری چیز یہ ہے کہ قیامت کا مقصد پیش نظر نہیں اُن کے جس سے وہ انکار کرتے ہیں۔

قیامت کا مقصد

قیامت کا مقصد یہ ہے کہ پہلی زندگی میں کچھ سامان کیا جائے تا کہ اگلی زندگی میں کار آمد ثابت ہو اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس موت کا عالم ہو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ زندگی ختم ہوگی تو آدمی سامان کرے گا اگلی زندگی کا، مثلاً ایک شخص مرتا ہے تو کیا وہ اپنی زندگی میں اس کی فکر نہیں کرتا کہ میں اپنی اولاد کے لئے کچھ کر جاؤں تا کہ کل کو آنے والے مجھے بُرا بھلا نہ کہیں اس واسطے آدمی جائیداد خریدتا ہے تجارتیں قائم کرتا ہے کمپنیاں بناتا ہے کہ میں تو نہیں میری اولاد کے کام آئے اس کو یقین ہے کہ میں گزر جاؤں گا اس عالم سے تو میری نسل مصیبت میں نہ پڑے احادیث میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "تم بجائے اس کے مرتے وقت اولاد کے ہاتھ میں بھیک کا ڈھوگرا دے جاؤ، یہ بہتر ہے کہ ایسا سامان کر جاؤ کہ تمہاری اولاد خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرے"۔ یعنی تنہا اپنی فکر نہ کرو بلکہ اپنی اولاد کی بھی کرو تو اولاد کی فکر آدمی اسی زندگی میں تو کرتا ہے اور کرتا ہے اگلی زندگی کے لئے، تو کیا وہ یہ پوچھا کرتا ہے کہ صاحب پہلے یہ بتلادو کہ کون سے دن کون سی تاریخ میری موت آئے گی جب میں سامان کروں اولاد کیلئے، وہاں مطلقاً اتنا کافی ہے کہ موت کا علم ہو کہ آئے گی ضرور، کب آئے گی کون سی تاریخ پہ آئے گی یہ ضروری نہیں جب تم اپنی شخصی زندگی کو جانتے ہو کہ ایک زندگی میرے بعد آئے گی مجھے نیک نامی کا سامان کرنا چاہئے اور اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ موت کے وقت کا علم ہو تو مجموعہ عالم کی موت میں کیوں سوال کرتے ہو کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ کون سی تاریخ کو آئے گی قیامت؟ بھئی جیسے تمہیں شخصی قیامت کے وقت کا علم نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مجموعہ قیامت کا بھی علم نہ ہو دن تاریخ کا تو اس میں کیا نقصان بیٹھتا ہے؟ وہاں بھی بلا تاریخ کے علم کے اگلے سامان کرتے ہو یہاں بھی تم اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کا سامان کرو قیامت کے دن کے لئے وہاں تاریخ نہیں پوچھتے یہاں کیوں پوچھتے ہو؟ وہاں کیوں نہیں کہتے کہ صاحب موت کب آئے گی پہلے مجھے یہ علم ہو کہ جنوری کی فلاں تاریخ میں میرا انتقال ہوگا جب تو میں اپنی اولاد کے لئے کچھ آئندہ کا سامان کروں اور اگر یہ علم نہ ہو تو مرنے دو اولاد کو بھی جانے دو، جب وہاں سوال نہیں کرتے یہاں بھی سوال نہیں کرنا

چاہئے۔ اسی طرح سے قرنی قیامت قائم ہوتی ہے۔ ایک نسل ختم ہوتی ہے دوسری نسل آتی ہے یہ نسل بھی تو سامان کرتی ہے کہ ہماری اگلی نسلیں ٹھیک رہیں اگر کسی نسل میں حکومت ہے تو وہ اپنے دم بھر صحیح حکومت کرے گی کہ میرے خاندان میں باقی رہے یہ حکومت میری قوم میں باقی ہے دوسری قوم اس پر غالب نہ آئے تو کیا وہ یہ پوچھا کرتی ہے کہ ایک صدی کی کون سی تاریخ کون سے منٹ پر ہماری قوم ختم ہوگی۔ جب تو ہم سامان کریں گے اگلی نسل کے لئے اور جب معلوم نہ ہو تاریخ تو نہ کریں، کوئی اس کی فکر نہیں کرتا۔ اسے اتنا معلوم ہے کہ سو برس میں اندازاً ایک نسل گزر جائے گی اُسے اگلی نسل کی فکر کرنی چاہئے وہاں وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ یہ کب کو آئے گی کون سی تاریخ ہوگی؟ جب وہاں بلا تاریخ کے علم کے اگلی نسلوں کا بندوبست کرتے ہو تو یہاں بلا علم تاریخ کے کیوں نہیں کرتے قیامت کا بندوبست؟ قیامت کے بعد کی زندگی کا کیوں نہیں فکر کرتے۔ معلوم ہوا کہ سوال تمہارا مہمل ہے۔ محض ٹال مٹول کیلئے یہ سوال کر رہے ہو کوئی معقول سوال نہیں ہے اگر معقول ہوتا تو شخصی موت میں بھی یہ سوال کرتے اور قرنی موت میں بھی یہ سوال کرتے لیکن وہاں نہیں کرتے اسے معقول جانتے ہو تو کلی قیامت میں اس سوال کو کیوں تم نے معقول سمجھا؟ یہاں بھی غیر معقول، تو اصل میں قیامت کے مقصد کا علم نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ اس زندگی میں کچھ کر جاؤ تاکہ اگلی زندگی کام آئے یہ ایک مقصد ہے۔ یہ شخصی قیامت میں بھی ہے قرنی قیامت میں بھی ہے کلی قیامت میں بھی ہے تو یا تو اس کا علم نہیں یا جان بوجھ کر اپنے کو جاہل بنا رکھا ہے ٹال مٹول کر کے دعوے کو رد کرنا ہے اس واسطے سوالات کرتے ہو تو حاصل یہ نکلا کہ قیامت کا آنا یہ آنکھوں دیکھی چیز ہے روزانہ قیامتیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جب مشاہدہ ہے تو پھر انکار کرنا اس کا جھٹلانا ہے اپنے مشاہدہ کو وہ اپنی تکذیب ہے وہ خدا کی تکذیب نہیں، اللہ کا وعدہ اپنی جگہ سچا ہے وہ اس کا درجہ کا ہی نہیں کہ کوئی جھٹلا سکے، اسے جھٹلانے والا اپنے کو جھٹلا رہا ہے جیسے ایک موقع پر فرمایا کہ:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ

کہ یہ جو اللہ کو جھٹلا رہے ہیں در حقیقت اپنے نفسوں کو جھٹلا رہے ہیں

اپنے کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں تو مشاہدہ کا انکار خود اپنا انکار ہے۔ جب آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ قیامتیں روزانہ ہیں پھر قیامت کا انکار وہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلانا یہ اپنے کو جھٹلانا ہے خدا کو جھٹلانا نہیں وہ بری ہے اس سے کہ کوئی جھٹلائے اس کو یہ تو ہے مشاہدہ

عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ قیامت آنی چاہئے

اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو عقل بھی اس کی مؤید ہے کہ قیامت آنی چاہئے۔ عقل خود شاہد ہے، اس واسطے کہ یہ ایک عقلی قاعدہ ہے کہ جو چیز مخلوط ہوتی ہے چند اجزاء سے جب تک کہ اسے توڑ کر اجزا الگ الگ نہ نکالے جائیں وہ نفع نہیں دیتی۔ جب اس کے اجزاء الگ الگ چیزوں کو نفع پہنچاتے ہیں تو مجموعہ کو توڑ پھوڑ کر جب تک اجزاء الگ الگ نہیں کر دیے جائیں گے وہ نفع بخش ثابت نہیں ہوں گے۔ مثال اس کی

ہے کھیتی، ایک کسان نے کھیتی بوئی جو، اور چھ مہینے بعد اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، چھ مہینے کے بعد کھیتی لہلہا اٹھی آنکھیں بھی اس کو دیکھ کر لے رہی ہیں اور کاشتکار کا دل بھی خوش ہے کہ اب میرے لئے موقع آ گیا ہے میرا گھر بھر لے گا، بہت خوش، لیکن جب کھیتی پک گئی اور دانے پختہ ہو گئے تو وہی کسان جس نے خون پسینہ ایک رنگ کر کے اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا درانتی لے کر خود ہی اسے کاٹنا شروع کر دیا اور ساری کھیتی کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ کاٹ ڈالا۔ پھر اسی پر بس نہیں کی کہ کھیتی کاٹ دی ہو کھیتی کو کاٹ کر کھلیان میں جمع کیا اور اس کے بعد بیل چلا کے اسے چکنا چور کرنا شروع کیا، چکنا چور کر دیا، ریزہ ریزہ کر دیا، پھر اسی پر بس نہیں کرتے کسان کاٹنے کے بعد خود اپنے پیروں سے نہیں بلکہ بیلوں کے پیروں سے روندوایا اس کے بعد تھال میں لے کر اڑاتے ہیں جو ساری بکھر کر الگ الگ ہو جائے، اگر کوئی کاشتکار سے یوں کہے کہ بیوقوف! چھ مہینے کی خون پسینہ کی کمائی تیری، تو نے ہی تو اسے آباد کیا تھا، پروان چڑھایا تھا اور بیوقوف اپنے ہی ہاتھ سے اجاڑ دیا اس کو یہ تو نے بڑی غلطی کی غیر معقول بات کی اپنی پروان چڑھائی ہوئی کھیتی کو کاٹ ڈالا ریزہ ریزہ اور چکنا چور کر دیا تو وہ یہ کہے گا کہ بیوقوف تم ہو سوال کرنے والے، میں نے عقل مندی کا کام کیا اس لئے کہ میری کھیتی میں بھوسہ اور جو مخلوط تھے۔ بھوسہ غذا ہے بیلوں کی اور جو غذا ہے انسانوں کی جب تک میں کاٹ کر اسے چکنا چور نہ کروں بھوسہ الگ نہیں ہو سکتا تھا دانے سے، جب میں نے الگ کر دیا تو بھوسہ تو گیا جانوروں کے پیٹ میں اور دانہ گیا انسانوں کے پیٹ میں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہر چیز پہنچ گئی۔ مجموعی کھیتی اگر نہ توڑی جاتی نہ چکنا چور کی جاتی تو ہر ایک کو اپنی اپنی غذا نہیں مل سکتی تھی، یہ جواب معقول ہو گا اس کا اور سوال نامعقول ہو گا۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

فرماتے ہیں: "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" یہ دنیا کھیتی ہے آخرت کی اس میں کفر اور اسلام، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ سب رلا ملا چل رہا ہے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ایک دوسرے کے منافی ہیں مگر یہاں رلی ملی چل رہی ہیں ایک حقانی دلائل پیش کرتا ہے ایک باطل پسند کچھ ملمع سازی کر کے حق کو رلا کر باطل میں ملا کر پیش کر دیتا ہے وہ اپنے باطل کو حق ثابت کر رہا ہے، بہت لوگ جو زیرک ہیں دانش مند ہیں وہ تو اصلیت کا پتہ چلا لیتے ہیں مگر ہزاروں بہک بھی جاتے ہیں، پھر دلائل کو ایسی ملمع سازی سے پیش کریں گے کہ لوگ اہل حق تو بیچارے بیٹھے رہ جائیں گے اور باطل کو فروغ ہو جائے گا تو دنیا میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، اخلاص اور نفاق، کفر اور اسلام سب خلط ملط چل رہا ہے اور ہر ایک مدعی ہے کہ میں حق پر ہوں، الگ نہیں ہے کہ دودھ الگ ہو پانی الگ ہو، عقل لڑا کر غور کرو تو الگ ہوتا ہے ورنہ دیکھنے میں بالکل یکساں ہیں، ہیرا بھی یکساں ہے اور کانچ کا ٹکڑا بھی یکساں ہے اب جوہری تو کم ہوتے ہیں جو ہیرے کو الگ کر دیں اور کانچ کے ٹکڑوں کو الگ، سارے تو جوہری نہیں وہ کہیں گے بھئی یہ جو نقلی ہے یہ بھی وہی ہے اصلی ہے وہ بھی وہی ہے ہمیں تو کوئی فرق معلوم ہوتا نہیں۔

دنیا میں سب چیزیں خلط ملط ہیں آخرت میں سب کو الگ الگ کر دیا جائے گا

تو دنیا میں دونوں چیزیں چل رہی ہیں خلط ملط، حق تعالیٰ نے اس دنیا کی کھیتی کو پروان چڑھایا ہزاروں ہزار برس سے اس کو پانی دیا، سینچا لہلہا اٹھی اور قیامت کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ چکنا چور کر کے تباہ و برباد کر دیں گے، آسمان نیچے گر پڑے گا، چاند سورج کے ٹکڑے، زمین کے ٹکڑے، پانی، مٹی یہ سب گڈمڈ ہو کر خلط ملط ہو جائے گا، اگر کوئی حق تعالیٰ سے سوال کرے کہ آپ ہی نے تو اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا۔ ہزار ہا ہزار برس آپ کی قدرت نے اسے سینچا اور بنایا اور اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا، فرمائیں گے اس میں کفر اور اسلام، حق و باطل ملا ہوا تھا، اس میں حق اور حقانی لوگ یہ غذا ہیں جنت کی اور کفر اور کفر والے لوگ یہ غذا ہیں جہنم کی، جب تک کہ اس کھیتی کو کاٹ کر اجزاء الگ الگ نہ کیے جائیں تو جنت کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی جہنم کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی تو میں نے اسے پروان چڑھایا تاکہ پک جائے، پکنے کے بعد اب غذا دینی ہے، جنت اپنی غذا مانگ رہی ہے تو اسلام اور صاحب اسلام اس عالم کو بھی بھرنا ہے تو آج جنت خالی، جہنم بھی خالی، مگر دونوں مانگ رہے ہیں کہ میری غذا دیجئے، جنت میں بھی رات دن سوال کر رہی ہے کہ مجھے بھیجیے لوگ اور وعدہ ہے اللہ کا کہ ہم بھر دیں گے اور جہنم بھی پکار رہی ہے کہ مجھے بھر دیجئے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ ہاں بھریں گے لیکن ذرا بھوک کو کامل ہونے دو ایک وقت گزر جائے جب تکمیل کو پہنچ جائے گی بھوک تب غذا دیں گے تاکہ تمہارے اندر سرور پیدا ہو، بلا بھوک کے اگر کھالیا تو وہ ہضم نہیں ہو گا اور اس کے لطف بھی محسوس نہیں ہوں گے۔ جب معدہ پوری طرح کامل بن جائے اس وقت غذا دی جائے تو فرحت اور سرور اور قوت کا باعث ہوتا ہے اور اگر اشتہاء صادق نہ ہو اشتہاء کاذب ہو، مانگتا رہے معدہ اور بھرتے رہیں تو بیماریاں پیدا ہوتی رہیں گی تو کامل بھوک کے وقت جو چیز دی جاتی ہے وہ پچتی بھی ہے کھپتی بھی ہے اور مسرت کا باعث ہوتی ہے اس لئے ہم نے ایک وقت رکھا ہے اس وقت اس کھیتی کو کاٹ کر چکنا چور کر کے دانہ الگ نکال دیں گے، بھوسہ الگ نکال دیں گے۔ بھوسہ جائے جہنم میں دانہ چلا جائے گا جنت میں اس جہان میں دانہ ہے حق اور اہل حق اور بھوسہ ہے کفر اور اہل کفر، وہ جہنم کی غذا ہیں یہ جنت کی غذا ہیں تو جس طرح سے روزانہ ایک کاشتکار اپنی کھیتی کو ہر چھٹے مہینے پامال کرتا ہے تاکہ الگ الگ غذا کرے حق تعالیٰ شانہ اس پورے عالم کی کھیتی کو ایک دن چکنا چور کر کے اجزاء الگ الگ کر دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ قیامت کا ماننا گویا عقلاً ضروری ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایک عالم آنا چاہئے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو کر نکھر جائے اسی کا نام قیامت ہے۔

قیامت تخریب کا نام نہیں تعمیر کا نام ہے

تو قیامت حقیقت میں تخریب کا نام نہیں ہے کہ عالم کو اجاڑ دو تعمیر کا نام ہے بس اتنا ہے کہ اگر کسی

پرانے مکان کی جگہ آپ نیا بنانا چاہیں تو قاعدہ ہے کہ اسے ڈھا کر جو اچھے اجزاء ہیں وہ لے لیتے ہیں، بقیہ پھینک دیتے ہیں اور نئی تعمیر کرتے ہیں، کو ٹھی دار پرانے اجزاء پھینک دیتے ہیں اور کار آمد ملبہ میٹریل لے کر نئی تعمیر بناتے ہیں تو قیامت در حقیقت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے مگر وہ بن نہیں سکتا جب تک کہ اس پرانے عالم کو ڈھانہ دیا جائے اور ڈھانے کے بعد جو میٹریل عمدہ اور مضبوط ہے وہ تو ادھر لے لیں گے اور جو خراب خستہ ہے اسے پرے پھینک دیں گے۔ اس طرح سے ایک نئے عالم کی تعمیر ہوگی تو قیامت در حقیقت تعمیر کا نام ہے۔ تخریب کا نام نہیں ہے مگر تعمیر ہوتی نہیں جب تک تخریب نہ کی جائے جب تک ڈھانہ دیا جائے بوسیدہ عمارتوں کو، اس وقت تک جگہ خالی نہیں ہوتی، اور نیا عالم نہیں بنتا تو اب جب قیامت کا مقصد واضح ہو گیا کہ پرانی چیزوں کو ختم کر کے نئے عالم کی تعمیر ہو اور اس پرانے میں بھی دودھ الگ کر دیا جائے پانی الگ کر دیا جائے دانہ الگ بھوسہ الگ اس کے لئے لازمی ہے اس کی تخریب کر کے چکنا چور کرو پھر نئے عالم کو بساؤ یہ ایک ایسی معقول چیز ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جب یہ معقول ہے تو قیامت کا آنا کیوں غیر معقول اور جب وہ غیر معقول نہیں ہے تو یہ سوال کیسا کہ

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت؟

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک کاشت کار نے بیج بویا اور کونپلیں نکل آئیں اور اس نے کہا کہ مجھے توقع ہے کہ اس کھیتی میں دانہ لگے گا اور ہزاروں روپے ہوں گے۔ دوسرا جھٹلا دیتا ہے کہ دانہ دے کیوں نہیں دیتا نکال؟ یعنی آج تو کھیتی بوئی ہے اور کل کو بولے کہ بھئی لے آناں وہ دانہ کہاں ہے؟ اگر نہیں لاتا تو یہ جھوٹ موٹ باتیں کر رہا ہے تو کاشت کار کہے گا کہ یہ احمق ہے۔ نہ اسے کھیتی کی خبر، نہ اسے یہ پتہ کہ کتنے دنوں میں اگتی ہے؟ نہ یہ پتہ کہ کیا اندازہ ہے کھیتی کا؟ بس اس نے تو دانہ کا نام سن کر آج ہی مانگنا شروع کر دیا کہ اگر تو سچا ہے تو لے آناں حالانکہ آج ہی تو کونپل نکلی ہے اور کونپل بھی نکلے گی، چار مہینے میں ذرا بڑا ہوگا اور کوئی یوں کہے کہ لاؤ نا بھئی وہ کہاں ہے دانا؟ تو کہے گا احمق ذرا ٹھہر جا تھوڑے دن یہ تو طبعی رفتار ہے چھ مہینے میں دانہ پختہ ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں ہوتا تو جو اس چھ مہینے کو نہ مانے اور دو ہی مہینے بعد مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تو سچا ہے تو دکھلا وہ دانہ، وہی کفار کی مثال ہے کہ قیامت اپنے وقت پہ آئے گی انہوں نے جھٹلا کے کہا کہ صاحب آنی ہے تو آج ہی کیوں نہیں آجاتی تو معلوم ہوا کہ یہ سوال بالکل غیر معقول ہے اور جہالت پر مبنی ہے۔ معقول پسندی پر مبنی نہیں ہے صرف ڈھینگا ڈھانگی ہے ہٹ دھرمی ہے کہ ماننا نہیں ہے پیغمبر کی بات، صرف ادھر ادھر کے سوالات میں الجھا دو، لیکن اللہ کے معاملات میں الجھاوا چلتا نہیں فوراً دودھ الگ ہو جاتا ہے اور پانی الگ۔

دین اسلام دین فطرت ہے

اس لئے کہ دین فطرت کا دین ہے اس کی تمام منقول چیزیں معقول بھی ہیں جب عقل اور نقل سے ثابت ہو تو دوسرا مجبور ہو کر چپ ہو گا اور نا معقول ہی اس کا قائل ہو گا، تو قرآن کریم میں پہلے تو ان کا سوال نقل کیا:

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ؟" کہتے ہیں کہنے والے کہ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت؟ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ ناں کب کو آئے گی کوئی تاریخ بتلاؤ یا آج ہی لے آؤ اس قیامت کو، حق تعالیٰ نے ان کو دفع کرنے کے لئے جواب دیا کہ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ اے پیغمبر! آپ فرما دیجئے بھئی مجھے کچھ خبر نہیں کب تک آئے گی، میں تو اتنا جانتا ہوں کی آئے گی، کب آئے گی کون سی تاریخ میں آئے گی تو یہ علم اللہ کو ہے یہ مجھے علم نہیں۔

قیامت کی تاریخ کا علم نہ ہونا ہی مصلحت ہے:

اور اس کی ضرورت بھی نہیں اس واسطے کہ اگر قیامت کا علم دے دیا جاتا کہ دس ہزار برس کے بعد آئے گی تو جتنی نسلیں اس سے پہلے ہوتیں وہ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتیں کہ بھئی ہمارے اوپر تو آئے گی نہیں قیامت جن پر آئے گی وہ بھگت لیں گے لہٰذا ہم تو آزاد ہیں جو چاہے کریں، حرام ہو، حلال ہو، جائز ہو ناجائز ہو، پھر اس درجہ ڈھٹائی میں مبتلا ہوتے پھر کسی کو ہوش نہ ہوتا عمل صالح انجام دینے کا، سوائے اس کے کہ کچھ فکر اس نسل کو ہو شاید جس کے اوپر قیامت آتی، تو ایک تو اس میں یہ مضرت تھی کہ قیامت کی تاریخ بتلا دینے میں جو تاریخ سے بعید لوگ تھے وہ بے فکر ہو کر دنیا کی زندگی کو تباہ کر لیتے اور عمل صالح کی انہیں توفیق نہیں ہوتی، لیکن جب ان کو اتنا علم ہے کہ آئے گی تاریخ کا علم نہیں تو ہر وقت ایک خطرہ لگا ہوا ہے کہ معلوم نہیں کب قائم ہو جائے قیامت، اور جب قیامت آنے والی ہے تو بھئی اپنی زندگی کو درست کر لو اس کی فکر کرو۔ اس کے لئے کچھ سامان کرو، تو علم نہ دینے ہی کے اندر مصلحت ہے کہ انسان آمادہ رہے نیکی کرنے میں، علم ہو جانے کے بعد یا نیکی چھوڑ دیتا یا اتنا خائف ہوتا کہ نیکی سے معطل ہو جاتا۔

انسان کو اسکے مرنے کی تاریخ کا علم نہ دینے میں بھی مصلحت ہے

حق تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے کہ کسی کو اس کی موت کا علم نہیں دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ط

کسی نفس کو یہ پتہ نہیں کہ میں کب مروں گا اور کہاں انتقال کروں گا، اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اگر ہر انسان کو مطلع کر دیا جاتا کہ تیری عمر ساٹھ برس کی ہے تو اول تو اس کی زندگی اجیرن ہوتی، ہر روز گنتا کہ آج ایک دن کم ہو گیا آج دو دن کم ہو گئے، پھر نہ نیکی کرتا نہ بدی کرتا وہ تو ہر وقت لرزتا رہتا کانپتا رہتا اور

زندگی اس کی اجیرن ہو جاتی۔ نہ کھانے میں لطف، نہ پینے میں لطف، تو جب سارے ہی انسان ایسے ہو جاتے نظام عالم تباہ ہو جاتا، نہ ترقی کی سوجھتی نہ تمدن کی سوجھتی نہ دنیا کو آباد کرنے کی سوجھتی، بس ہر شخص بیٹھا ہوا کانپتا رہتا لرزتا رہتا کسی کے پاس جاتے کہ بھئی کیوں کانپ رہے ہو؟ کہ جی میری عمر کے ایک سو انچاس دن رہ گئے ہیں دوسرا کہتا کہ میاں میرے تو چالیس ہی رہ گئے تیسرا کہتا میرے تیس ہی رہ گئے تو ایک دوسرے سے دکھڑا رو کر رونے میں گزارتے نہ عمل ہوتا نہ دنیا آباد ہوتی اور منشاء خداوندی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلے اور دنیا سے تمدن بھی چلے۔ اس تمدن میں رہ کر ہی تم دین بنا سکتے ہیں اس لئے دنیا کی آبادی ضروری ہے اور وہ ہو نہیں سکتی تھی جب تک کہ موت کے وقت سے تمہیں غافل نہ بنایا جائے یہ علم تو رہے کہ آنے والی ہے یہ نہ ہو کہ کب آنے والی ہے، تم سے وقت کا اور تاریخ کا چھپانا ہی مصلحت ہے اسی طرح سے قیامت کلی کے وقت کو چھپانا مصلحت تھا اتنا علم دے دیا جانا ضروری تھا کہ آئے گی قیامت اور یہ جہان ایک دن ختم ہو جائے گا تو جتنا علم دیا وہ بھی معقول اور جتنا نہیں دیا وہ بھی معقول اور ظاہر بات ہے کہ معقول کا انکار وہ اپنی عقل کا بھی انکار ہے وہ اپنے کو ہی جھٹلانا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی تکذیب نہیں بلکہ اپنی تکذیب ہے وہ تو بری ہے تکذیب سے اس کا ہر دعویٰ سچا ہے تو اپنے کو جھٹلا رہا ہے آدمی جبکہ ایک معقول چیز کو جھٹلا رہا ہے، اس واسطے فرمایا گیا قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ بھئی علم، کب آئے گی؟ یہ اللہ کے پاس ہے جب پیغمبروں کو بھی خبر نہیں دی گئی اس کی تو میری اور آپ کی کیا حقیقت کہ ہمیں اس کا علم دیا جائے، آگے فرمایا وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ علم اللہ کے پاس ہے میں تو ڈرانے والا ہوں اتنا علم مجھے دیا گیا ہے کہ آئے گی قیامت تو اسے پیش کر کے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں کہ جب آنے والی ہے تو کچھ سامان کرا دو اس کے لئے۔

جہاں جتنا رہنا ہے اتنا ہی سامان اس کے لئے کرنا چاہئے

جیسے کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيْهِ وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيْهِ" اَوْ كَمَا قَالَ

"دنیا کے لئے اتنا سامان کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے آخرت کے لئے اتنا سامان کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے۔

دنیا میں رہنا ہے چند دن تو یہاں تھوڑا بھی کافی ہے تمہیں آخرت میں رہنا ہے، ابدالآباد تک رہنا ہے وہاں کا تو کوئی سامان نہیں کر رہے اور جہاں چند دن رہنا ہے وہاں کے سارے سامان کر رہے ہیں تو یہ عقل کی گمراہی ہے عقل کا کھوٹ ہے، ہونا چاہئے تھا برابر، تو آپ نے فرمادیا کہ:

قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ

علم تو اللہ کے پاس ہے کہ تاریخ کون سی ہے قیامت کی، میں تو ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اس لئے کہ مجھے آنے کا علم دیا گیا ہے وہ علم میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور وہی علم مصلحت بھی ہے تاریخ

اور وقت کا علم مصلحت نہیں ہے تمہارے لئے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ تم جو مانگ رہے ہو کہ جلدی آ جائے قیامت۔ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

تم کیا سمجھے ہوئے ہو قیامت کو جب آئے گی قریب تو حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے، منہ سیاہ ہو جائیں گے تمہارے، کفار کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ بڑی آسانی سے تم مانگ رہے ہو آ جائے قیامت جب وہ آئے گی تو کیا حال ہو گا تمہارا، یہ تھوڑا ہی ہو گا جیسے آج مگن بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہو کہ صاحب لے آؤ قیامت کو جب آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے۔ حلیے بگڑ جائیں تمہارے اور وہ آئے گی، یہ نہیں ہے کہ کوئی بڑے مقدمات اس کے چلیں گے کہ چھ مہینے پہلے کچھ اطلاعات دی جائیں اور چھ مہینے پہلے کوئی گڑ گڑاہٹ ہو۔

قیامت پل بھر میں قائم ہو جائیگی

وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی۔ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ قیامت کا آنا لَمْحِ بَصَرْ جیسے نگاہ جھپکتی ہے اتنے میں آ جائیگی، کوئی پتہ پہلے سے نہیں ہو گا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دو آدمی کپڑا سکھا رہے ہوں گے رنگریز، ایک پلہ ایک کے ہاتھ میں ہو گا ایک پلہ دوسرے کے ہاتھ میں وہ اسے سکھا رہے ہوں گے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائیگی، حدیث میں ہے کہ ایک عورت آٹا گوندھ رہی ہو گی گھر میں بیٹھی ہوئی اسکا ہاتھ آٹے میں ہو گا کہ اچانک قیامت قائم ہو جائیگی، پل بھر میں قائم ہو گی۔

صور کی کیفیت

صور جب پھونکا جائے گا جو عالم کی تباہی کا سبب ہو گا ابتداء بہت ہلکی آواز ہو گی کسی کو وہم بھی نہیں گزرے گا کہیں گے کوئی چیز ہے کوئی باجا ہے کوئی چیز ہے بج رہی ہے رفتہ رفتہ بڑھنا شروع ہو گی جب آواز ذرا بڑھے گی تو اب لوگ چونکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے تو ادھر ادھر دیکھیں گے۔ پھر کچھ کام میں لگ جائیں گے اس کے بعد اس میں درد کی سی آواز پیدا ہو گی تو اب حیران ہوں گے پریشان ہونگے، درد یک دم ہوتا ہے یہ تو تدریجی طور پر بڑھتا جا رہا ہے جب زیادہ درد ہو گی تو اب اضطراب اور بے چینی پیدا ہو گی، جنگلوں سے گھروں میں آئیں گے گھروں سے جنگلوں میں جائیں گے جانور انسانوں میں، انسان جانوروں میں کوئی کسی کو اپنی حالت کی خبر نہیں ہو گی اور اس کے بعد جب وہ انتہائی بڑھے گی حدیث میں ہے کہ جیسے سو گرجوں کے برابر ایک گرج ہوتی ہے مسلسل تو پھر کلیجے پھٹنے شروع ہونگے گرنے شروع ہوں گے اور یہاں تک تو جانیں جائیں گی جب زیادہ بڑھے گی آواز تو پہاڑ پھٹنے شروع ہوں گے۔ سب چیزیں ریزہ ہو کر گڈمڈ ہو جائیں گی، دنیا میں جب کوئی بم پھٹتا ہے تو دیواریں ہلتی معلوم ہوتی ہیں اور کھڑکیوں کے کواڑ ٹوٹ جاتے ہیں انسان بعضے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو اس کی بناء یہ ہے کہ اصل میں روح جو ہے یہ اللہ نے پیدا کی ہے۔ قوت ہوائی اور آواز جو ہے یہ بھی ہوائی، یہ سانس زیادہ نکلتا ہے وہی آواز کہلاتی ہے تو سانس کے ٹھونکنے کا نام آواز ہے ظاہر بات ہے کہ جب آواز اور ہوا زیادہ گرجتی ہو گی تو وہ جذب کرے گی

چھوٹی ہوا کو تو یہ ارواح چونکہ ہوا سے پیدا کی گئی ہیں جب اصل مادہ زوروں پر آئے گا اور وہ ہے آواز اور وہ ہوا ہے تو روحوں کو جذب کرنا شروع کرے گا۔ روحیں ہلنی شروع ہوں گی تو غرض قیامت ہوگی صور پھونکنے سے۔

صور بتدریج پھونکا جائے گا

اور صور بتدریج پھونکے گا تو جب وہ پھونکا جانا شروع ہوگا اور آواز آئے گی تو یہ نہیں کہ پہلے سے کچھ اطلاعات ہوں گی یا پہلے خطرات ہوں گے۔ وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ جتنی دیر میں نگاہ جھپکاتے ہو بلکہ اس سے بھی کم میں ایک دم اچانک آجائے گی، جیسے موت انسان کی اچانک ہی آتی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے سے اطلاعات دی جائیں بیمار بھی اگر آدمی ہوتا ہے تو یہ اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلے منٹ میں آجائے گی موت، چل رہا ہے بیماری جب آتی ہے تو ایک دم نزع شروع ہو گیا۔ لوگ بھی سمجھ گئے کہ بھئی مرنے کا وقت آگیا تو شخصی قیامت بھی اچانک آتی ہے۔ کلی قیامت بھی اچانک آئے گی۔ اس کا علم دے دیا گیا تو فرمایا اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ اس کی دن تاریخ کا علم تو اللہ کو ہے ہمیں نہیں ہے ہمیں تو اتنا علم ہے کہ آئے گی اور وہ ہی کافی ہے ہمارے عمل کے لئے وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اور تم جو سہولت سے کہہ رہے ہو کہ لے آؤ اس قیامت کو تو فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جب وہ آجائے گی اچانک تو تمہارے حلیے بگڑ جائیں گے۔ چہرے بگڑ جائیں گے تم اس حالت میں نہیں ہو گے جس حالت میں آج ہو کہ سہولت سے مانگ رہے ہو قیامت کو تم سمجھ نہیں رہے کہ ہے کیا قیامت؟ اس واسطے بڑے اطمینان سے مانگ رہے ہو، جیسے آدمی گھبرا کر بعض اوقات کسی مصیبت سے تنگ آکر موت کی دعا کرنے لگتا ہے تو یہی جواب اس کا ہوتا ہے کہ بیوقوف پتہ نہیں ہے کہ موت کیا چیز ہے وہ یوں سمجھ رہا ہے کہ یہ مصیبت تو ہے بہت بری اور موت بڑی معمولی چیز ہے موت آجائے گی تو مصیبت ٹل جائے گی۔

موت سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے

موت تو سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے سب سے بڑھ کر مصیبت ہے یہ تیری حماقت اور غلطی ہے کہ اس مصیبت سے تنگ آکر موت مانگ رہا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

تو یہ سمجھ لینا کہ موت ہلکی چیز ہے یہ دنیا کی مصیبتیں بڑی ہیں یہ غلط ہے۔ یہ ساری مصیبتیں اولین آخرین کی جمع کر دی جائیں تب ایک موت بنتی ہے تو موت سرچشمہ ہے سارے مصائب کا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے بارے میں سوال

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام نے ملک الموت سے پوچھا، حضرت ابراہیم

علیہ السلام نے سوال کیا ملک الموت سے کہ موت کی کیا کیفیت ہے انہوں نے عرض کیا کہ میں کیفیت کا کیا بتلاؤں جو جس پر گزرے گی وہ جانے گا مگر میں ایک مثال کے ذریعے کچھ فہم کے قریب کر دونگا اصلیت نہیں سمجھا سکتا وہ تو گزرنے کی چیز ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سمجھو انسان کے بدن میں تار ڈالا جائے ایڑی سے لے کر چوٹی تک اور جتنی رگیں ہڈیاں ہیں اتنی شاخیں ہوں اس تار میں اور ہر ہر شاخ ایک ایک رگ میں پیوست کی جائے اور ان شاخوں میں کانٹے بھی ہوں لوہے کے وہ کانٹے دار تار ہر ہر رگ کے اندر پیوست ہو تو اب گویا ایک تار انسان کے اندر گیا ہوا ہے اور اتنی شاخیں ہیں جتنی رگیں ہیں پٹھے ہیں اور ہر تار میں ہر شاخ میں کانٹے ہیں اور وہ پھٹ گیا اس کے بعد اس کو کھینچنا شروع کرو تو یوں معلوم ہوگا کہ رگ رگ درد سے بھرپور ہے اور گویا ساری رگیں کھنچ آئیں گی اوپر، فرمایا کہ یہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اور جان کندنی کی کہ جیسے رگ رگ کے اندر کانٹے دار تار ڈال کر اسے کھینچا جائے اوپر تو جو اذیت اس وقت محسوس کر سکتا ہے آدمی وہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اذیت کی، تو موت کوئی آسان چیز تھوڑا ہی ہے کہ ذرا سی مصیبت میں گھبرا کر آدمی موت مانگنے لگے موت کوئی آسان بات نہیں ہے عظیم چیز ہے۔

مومن و کافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی صورت

حدیث میں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا ملک الموت سے کہ تم کس شکل میں آکر روح قبض کرتے ہو، فرمایا کہ مومن کے آگے تو نہایت اعلیٰ اور باجمال صورت ہے۔ اس میں میں آتا ہوں اس سے بڑھ کر جمال نہیں ہو سکتا اور کفار کے آگے انتہائی بھیانک شکل میں آتا ہوں کہ جس سے بڑھ کر ڈراونی صورت نہیں ہو سکتی۔ کہا مجھے دکھلا دو وہ صورت، کہا آپ تحمل نہیں کر سکیں گے مگر اصرار کیا، تو حدیث میں ہے کہا اس شکل میں آئے جس سے مومن کی روح قبض کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اگر اللہ کوئی بھی نعمت نہ دے مومن کو صرف یہ شکل دکھلا دے تمہاری تو سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے۔ اس کو دیکھ کر قلب میں فرحت اور سرور بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب وہ شکل بھی دکھلاؤ کہا آپ تحمل نہیں کریں گے۔ کہا نہیں دکھلاؤ اس شکل میں آئے تو دیکھتے ہی بیہوش ہو گئے حضرت ابراہیم علیہ السلام، برداشت نہیں کر سکے، اس کے بعد ہوش آیا تو کہا کہ اگر کوئی بھی مصیبت نہ آئے کافر پر، فقط یہ شکل دکھلا دی جائے تو ہزار مصیبتوں کی یہ ایک مصیبت ہے اس کی کچھ شکل حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ ملک الموت جس شکل میں آتے ہیں کفار کے آگے وہ ایک عجیب بھیانک شکل ہے ایک شخص کی، سیاہ فام اور بدن پر جو رواں ہے وہ مثل نیزوں کے ہے اور ہر نیزے میں ایک شکل بنی ہوئی ہے انسان کی شکل یا جانور کی، تو اس سے گویا لاکھوں شکلیں صورتیں ایک شخصیت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ جتنی گویا ڈراونی شکلیں ہیں ہیبت ناک وہ سب سامنے ہوتی ہیں تو وہ دیکھ کر خود ہی خون خشک ہو جاتا ہے وہ مستقل مصیبت ہے تو بہر حال موت کوئی سہل چیز نہیں ہے۔ الا یہ کہ حق تعالیٰ ہی سہل فرما دیں کسی کے لئے اسے سب کچھ قدرت ہے

ساری شدت بھی گزرے اور محسوس بھی نہ ہونے دے۔

موت کے آسان ہونے کی صورت

جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی صورت فرمائی، فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ "مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَائَهٗ"، جو شخص اس کا خواہش مند ہے کہ میں کب ملوں اپنے اللہ سے ہر وقت منتظر ہے شوق لگ رہا ہے عالم آخرت میں جانے کا اور۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتے کہ وہ کونسا مبارک دن ہوگا کہ ہم غزل خواں، شاداں و فرحاں اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اس اجڑے ہوئے عالم کو چھوڑیں گے تو جن لوگوں کے دلوں میں شوق ہے اللہ سے ملنے کا فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے یہاں بھی شوق ہے وہ بھی منتظر ہیں کہ یہ بندہ کب ملے مجھ سے آ کے تو ادھر سے بھی شوق، مرنے کا جب وقت آتا ہے اس مومن پر وہ شوق و غلبہ کے ساتھ قلب پر ہجوم کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح جلدی پہنچوں لگا ہوا ہے اس شوق میں، اس شوق کے اندر اتنا منہمک ہوتا ہے کہ ساری تکلیفیں بھی گزر رہی ہیں اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیا تکلیف گزر رہی ہے اور کچھ محسوس بھی ہوتا ہے تو نعمتیں سامنے اتنی ہیں کہ وہ کہتا ہے اس سے دوگنی بھی مصیبت گزر جائے یہ سامنے نعمتیں موجود ہیں اب میرے پاس آنے والی ہیں پل بھر کی بات ہے۔

مصیبت کے سہل اور آسان ہونے کی مثال

مثلاً آپ کو ایک گورنمنٹ یہ کہے کہ یہاں سے پانچ میل پر جو اسٹیشن ہے وہاں ایک پانچ لاکھ کا بنگلہ آپ کے لئے تیار کیا ہے گورنمنٹ نے اور اس میں خزانہ بھی ہے دس لاکھ روپے کا، ابھی پہلی گاڑی سے جاؤ اور اس پر جا کر قبضہ کرلو آپ خوشی خوشی چلے ریل میں گئے تو وہاں بیٹھنا تو بجائے خود کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھرڈ کلاس میں جا کر کھڑے ہوئے اور اتنا ہجوم کہ ہڈی پسلی چور ہو جائے تو انتہائی تکلیف میں ہے مگر شوق لگا ہوا ہے کہ پانچ منٹ کی بات ہے اب گئے اور دس لاکھ کے بنگلے پر قبضہ ہو گیا تو ذرہ برابر آپ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا کہیں گے چاہے اس سے دوگنی آ جائے بس پانچ ہی منٹ کی تو بات ہے اب گئے اور جائداد ملی لاکھوں کی، تو جیسا کہ ایک دنیا کی ایک معمولی جائیداد کے شوق میں بڑی سے بڑی تکلیف بھگت جاتے ہیں اور احساس نہیں ہوتا تو ابَدُ الآباد کی نعمت اور وہ نعمتیں جن کا یہاں کبھی تصور بھی نہیں ہو سکتا وہ سامنے کی جائیں تو لاکھوں من بھی اگر تکلیف کا بوجھ پڑا ہوا ہوگا۔ بھاویں بھی نہیں ہوگا کہ منٹ بھر کی بات ہے اب یہ نعمتیں مل رہی ہیں۔

مومن کی روح قبض کرنے کے وقت فرشتے جنت کے تحائف لیکر آتے ہیں

اسی واسطے فرمایا گیا کہ مومن کی قبضِ روح کے وقت ملائکہ علیہم السلام کچھ تحائف لے کر آتے ہیں

جنت کے ،وہاں کے پھل اور وہاں کے کپڑے اور وہاں کے کفن اور خوشبوئیں ا،ایک دم روح اس طرح سے جاتی ہے کہ بس وہ یوں کہتی ہے کہ میں پہنچ جاؤں پل بھر میں چاہے ہزار کانٹوں میں سے گزرنا پڑے تو خود قبول کرتی ہے اس تکلیف کو کہ جتنی بھی تکلیف آئے مجھے جھگتنی ہے اس لئے کہ سامنے وہ نعمت موجود ہے تو اس وقت مشاہدہ ہوتا ہے نعمت کا ،انبیاء علیہم السلام اور کمّل اولیاء اللہ ان کو آنکھ سے دیکھنے سے زیادہ یقین ہوتا ہے اللہ کے وعدوں پر، ہر وقت ان کے سامنے وہ نعمتیں ہیں اس واسطے کوئی تکلیف انکے یہاں تکلیف نہیں ہوتی، ہزاروں ابتلاءات ہزاروں مصیبتیں انبیاء پر گزرتی ہیں اور ان کے قلوب مبارکہ پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اللہ کے وعدہ ہائے حق سامنے ہیں اس لئے چند دن کی تکلیف ہے اب وہ نعمتیں آ رہی ہیں۔

انبیاء کرام اپنی روحانی قوت سے وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے

توانبیاء اپنی ایمانی قوت سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ہم آنکھ سے دیکھ کر جتنا یقین کرتے ہیں اس سے زیادہ قوی یقین انبیاء کا اللہ کے وعدوں پر ہوتا ہے اس لئے وہ ساری تکالیف جھیل جاتے ہیں، ورنہ انبیاء سے زیادہ کون ہے تکلیفیں اٹھانے والا، لیکن ان کے قلوب پر ذرہ برابر اثر نہیں، قلب مگن اور مطمئن، اس لئے کہ وعدہ ہائے خداوندی اندر موجود ہیں تو بہر حال مومن باوجود یہ کہ موت اتنی شدید ہے باوجود یہ کہ اتنی ایذاء دہ ہے لیکن مومن اس سے گھبرائے گا نہیں خوش دلی سے برداشت کرے گا، اگر خدانخواستہ کوئی وعدہ سامنے نہ ہوتا تو مرنا بھی موت ہو جاتا۔ لیکن چونکہ نعمتیں موجود ہیں اب تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس واسطے وہ کہتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں چلو، چاہے مصیبتوں میں کانٹوں میں جائیں مگر وہ نعمت ہے ابھی میں پہنچ جاؤں گا دو منٹ بعد، اس لئے ہوتی بھی ہے تکلیف اور نہیں بھی ہوتی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی شدید قسم کا آپریشن کیا جائے کسی کا تو پہلے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر لیتے ہیں اس کے بعد اس کا سر کاٹ دو پیر کاٹ دو، اسے کچھ خبر نہیں۔ تو گزر رہے ساری تکلیف مگر احساس باطل ہو گیا کہ جس سے اس کی اذیت محسوس نہیں ہوتی، اسی طرح سے موت کی اذیت جب گزرے گی تو محبت خداوندی کا کلوروفارم سونگھا دی گئی اس میں وہ اتنا مؤثر مگن ہو گا کہ اس تکلیف کا ادنیٰ برابر اسے احساس نہیں ہو گا اور محسوس بھی ہو تو بھاویں بھی نہیں ہوں گی تو نعمتوں کے آگے کیا چیز ہے تکلیف تو پھر انشاء اللہ مومن کے لئے راحت ہے باوجود اذیت کے۔

موسیٰ علیہ السلام سے موت کی کیفیت کے بارے میں سوال

موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ موت کی کیفیت کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ کیفیت ہے کہ آدمی کو بیچ میں رکھ کر دو پہاڑوں کو ملا دیجئے۔۔۔ اس میں جو اذیت ہے بس وہ موت میں ہے اور بعض انبیاء نے مثال دی کہ

جیسے ایک نہایت ہی جابر قسم کا قصائی ہو ذبح کرنے والا اور بڑا قوی اور ایک بکری کا بچہ اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ کانٹ چھانٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے بس یہ حالت ہے موت کی ملک الموت کے سامنے اس طرح سے ہوگا آدمی اس وقت، تو باوجود اس اذیت کے وہ جو قوت ایمانی ہے وہ سنبھالتی ہے دنیا میں بھی جو بڑی سے بڑی مصیبت آتی ہے تو قوت ایمانی تو سنبھالتی ہے۔ بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے تو تکلیف معلوم بھی نہیں ہوتی وہی قوتِ ایمانی وہاں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی قبر میں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی حشر کے اندر سنبھالے گی ہر جگہ تکلیف آدمی جھیل جائے گا۔

حضرت عمرؓ کا حضور ﷺ سے سوال

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف رکھتے تھے مجلس نبوی میں اور آپ ﷺ قبر کے ہولناک حالات بیان فرمارہے تھے، تو لوگ لرز رہے تھے کانپ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ تمام لوگ لرزاں اور ترساں اور آپے سے باہر ہوگئے ہیں۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری عقل بھی صحیح سالم ہوگی قبر میں فرمایا ہاں عقل رہے گی، کہا تو اب کوئی فکر کی بات نہیں بس نمٹ لیں گے تو عقل سے مراد یہ عقل معاش نہیں تھی جو موٹر بنانے کی عقل ہے ہوائی جہاز بنانے کی عقل ہے عقل معاد تھی جو آخرت کی عقل ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان بھی رہے گا فرمایا رہے گا تو بس اب جھیل جائیں گے۔

قوت ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کر دیتی ہے

قوت ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کر دیتی ہے تو اصل چیز ایمان ہے دنیا کی مصیبتوں میں بھی جب آدمی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو توکل اور صبر سے تو مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ جانے جو کچھ ہوگا ہورہے گا، مجھے تو خدا پر بھروسہ ہے تو دنیا کی مصیبتیں بھی اللہ ہی کا یقین اور ایمان سہل کرتا ہے۔ موت کی مصیبت یہی ایمان سہل کرے گا۔ اور ان سب سے گزر کے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائے گا۔ وہی جو راحتوں کا ٹھکانہ ہے جس کا نام جنت ہے تو کافر کے لئے یہاں سے لے کر وہاں تک اور ابد تک مصیبت ہی مصیبت ہے اس لیے کہ وہ جو مصائب میں ڈھارس دینے والی چیز ہے وہ اس نے کھودی، وہ ایمان ہے جب وہ نہ رہا تو اب سہارا کوئی باقی نہیں اس واسطے اس کے لئے ہر تکلیف تکلیف ہے مومن کے لئے کوئی تکلیف تکلیف نہیں اس کو فرمایا کہ جو قیامت مانگ رہے ہوں تم جب وہ آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے، ہوش ہوا میں اس واسطے کہ وہ قوت تو نہیں ہے جس سے سہارا لیتے تم یعنی ایمان کی قوت وہ تو ہے نہیں اور جب وہ نہیں ہے تو مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں حلیے بگڑ جائیں گے اور جس میں ہے وہ کبھی نہیں مانگے گا قیامت کو وہ کہے گا جب آئے گی آئیگی میں تو اللہ کے وعدے کو سچا جانتا ہوں کہ آنے والی ہے مجھے تو عمل صالح کرنا ہے وہ نہ مانگے گا قیامت، فرمایا کہ جب وہ آجائے گی تو سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کفار کے حلیے اور چہرے بگڑ جائیں گے اور اس وقت کہا جائے کہ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ

وہ جو مانگتے تھے یہ ہے اب اسے بھگتو، وہ آگئی قیامت لے لو اسے، تو مختلف سوالوں سے کفار لانا چاہتے تھے عقائد، تو پہلا تو یہی سوال کر دیا مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کہاں ہے صاحب وہ وعدہ اس کا تو جواب دے دیا گیا اس کے بعد جب اس میں چپ ہوئے تو ایک دوسرا سوال شروع کر دیا اور وہ کیا وہ یہ کہ صاحب جب قیامت آئے گی نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے۔ تو فکر کی کیا بات ہے تم بھی ہلاک ہو گے اگر تم پر قیامت آئی، اس کا جواب دیا حق تعالیٰ نے فرمایا پیغمبر سے کہ تم کہہ دو کہ بھئی مجھے یا میرے ساتھوں کو اگر اللہ ہلاک کریں یا مجھ پر رحم کریں اور ہلاک نہ کریں کوئی بھی صورت ہو تمہیں کیا فائدہ اس سے؟ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہوں یا میں اور میرے ساتھی نجات پائیں تو تمہیں کیا فائدہ پہنچا تم پر جو گزرنی ہے گزرے گی اپنی فکر کرو ہماری فکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو ہم چاہے ہلاک ہوں چاہے نجات پائیں تم تو اپنی فکر کرو۔ اس لئے کہ قیامت تو آنے سے ٹلے گی نہیں اور جب وہ آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی تو اب کوئی شخص یوں کہے کہ چونکہ تم پر آئیگی اس واسطے مجھے کوئی فکر نہیں اس سے زیادہ کون احمق ہے بھئی تیرے اوپر بھی تو آئے گی دوسرے پر کچھ بھی گزرے تو فرمایا قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ بھلا بتلایئے کہ اللہ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کرے اَوْ رَحِمَنَا یا ہم پر رحم کرے فَمَنْ يُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ کفار کو عذاب سے بچانے والی کون سی چیز ہے اگر ہمیں ہلاک ہی کر دیا تو تم بچ گئے عذاب سے؟ تو تم اپنی فکر کرتے بجائے اپنی کے ہمارا فکر شروع کر دیا کہ تم نہ رہو گے نہ ہم رہیں گے بھئی ہم رہیں نہ رہیں تمہارا کیا بنے گا تم اپنی فکر کرو تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی سوال مہمل ہے اور یہ سارے سوال اسی لئے ہوتے ہیں کہ عقیدہ کو رلا ملا کر ختم کر دیں ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال کر ضائع کر دیں اس چیز کو، قرآن میں ایک ایک چیز کو پکڑتے ہیں اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ تو کہہ دیجئے کہ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ہم تو رحمٰن پر ایمان لے آئے ہیں اور اس پر بھروسہ کر لیا ہے اور اس کی وجہ سے ہم عمل صالح کر رہے ہیں اور ہمیں اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ ہمیں راحتیں ملیں گی اس عالم میں، تو ہم مطمئن ہیں تم اپنی فکر کرو تم کس چیز پر اطمینان رکھتے ہو نہ ایمان نہ تم میں توکل اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ہمارا ایمان بھی درست عمل بھی درست ہمیں یقین ہے کہ انجام ہمارا نیک ہوگا اب تم اپنی فکر کرو نہ ایمان نہ توکل، تو تم کہاں جاؤ گے باتیں بنانے سے عذاب ٹلنے والا نہیں ایمان لانے سے ٹلنے والا ہے، اور تم باتیں بنا بنا کے چاہتے ہو ٹلا دو عذاب کو اس طرح نہیں ٹلا کرتا، فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ عنقریب تم جان لو گے کہ کون گمراہی میں تھا اور کون حق پر تھا جب نتائج سامنے آئیں گے تو پتہ چل جائے گا، تو دنیا میں تو ہم نے تمہیں عقل صحیح سے بھی سمجھا دیا۔ مشاہدہ سے بھی سمجھا دیا۔ اب اگر نہیں سمجھتے مشاہدہ ہی چاہتے ہو تو عنقریب وقت آنے والا ہے تمہیں پتہ چل جائے گا کون ہدایت پر تھا کون ضلالت پر۔ جب برے نتائج آئیں گے سامنے تو سمجھ میں آجائے گا کہ تم گمراہی میں تھے اور جب ہمارے سامنے اچھے نتائج آئیں گے تو ہم بھی سمجھ جائیں گے کہ ہم ہی حق پر تھے۔

اب آگے تمہیں زیادہ سے زیادہ بھروسہ اس دنیا کے سامانوں پر ہے۔ اول تو یہ وہاں نہیں جائیں گے لیکن اگر وہاں نہ بھی جائیں یہ تو بعد کی بات ہے دنیا میں بھی رہنا تو کوئی لازمی بات نہیں ہے، سامان ہوتے ہیں اور پھر چھین لیے جاتے ہیں ہزاروں امیر غریب بنتے دیکھے گئے۔ ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے گئے۔ ہزاروں امراء ہیں کہ دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور چین میسر نہیں حالانکہ دولت کا مقصد یہ ہے کہ چین ہو، تو بہت سے دولت مند ہیں چین نصیب نہیں ہے کوئی گھن لگ گیا قلب پر کوئی فکر لگ گیا۔ تو لاکھوں روپیہ رکھا ہوا ہے مگر وہ جو گھن لگا ہوا ہے ساری زندگی کرکری ہو گئی اس سے، تو جن سامانوں پر تم بھروسہ کر رہے ہو، آخرت تو بعد کی چیز ہے۔ دنیا میں بھی نفع دینے والے نہیں کہ سامان ہوتے ہیں اور چین میسر نہیں آتا۔

سکون وچین آنے کا ایک ہی راستہ ہے

چین اگر آتا ہے تو پھر وہی ایک رستہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرے آدمی توکل اور اعتماد اور ایمان چین اسی سے ملے گا۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اللہ کے ذکر سے ہی دل چین پا سکتے ہیں سامانوں سے چین نہیں پا سکتے سامان ہیں وہ خود ذریعہ بن جاتے ہیں جتنا زیادہ ہوگا سامان زیادہ مصیبت پڑے گی وہ کسی عربی کے شاعر نے کہا ہے:

> اِذَا اَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً
> وَاِنْ اَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

دنیا جب جاتی ہے تو حسرتیں چھوڑ جاتی ہے برسوں روتا ہے آدمی اور جب آتی ہے تو سینکڑوں مصیبتیں ساتھ لاتی ہے کہیں محافظ کی فکر کہیں سنتری کی فکر، کہیں چور کی کہیں ڈاکو کی ایک مصیبت میں مبتلا اور ایک وہ ہے کہ بقدر ضرورت ہے کھانے پینے کو تو ''کس نیاید بخانہ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ'' درویش کے گھر کوئی نہیں آتا کہ بھئی ٹیکس ادا کرو خراج ادا کرو وہ اپنا بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔

جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں

تو جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والی نہیں بیچ میں جواب دے جاتی ہے بیوفائی کرتی ہے تو ایسی بےوفا پر تم بھروسہ کیے ہوئے ہو آخرت کے بارے میں، آخرت تو بعد میں ہے تم دنیا تو سنبھال لو وہ لازمی نہیں سنبھلتی ایک چیز چھن جائے اللہ کی طرف سے تو ساری زندگی ختم، فرمایا کہ ہم مثال دیتے ہیں پانی کی، پانی کنوؤں میں ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ پانی کو نیچے کر دیں، خشک سالی کے زمانے میں ایسا ہوتا ہے کہ کنوئیں ہو جاتے ہیں خشک، پانی چلا جاتا ہے نیچے، اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا۔ اگر گہرائیوں میں پانی چلا جائے تو تم کھدائی کر کے نہیں پہنچ سکتے۔ فمن یاتیکم بماء معین پھر پانی لانے والا کون ہے تمہارے واسطے، یہ سامان تھا اس پر بھروسہ تھا اللہ نے ذرا نیچے کر دیا پچاس گز۔ اب بیٹھے ہوئے ہیں نہ کھدائی کر سکتے ہیں اور اگر کھودیں گے تو اور نیچا ہو جائے گا اور نیچا تو تحت الثریٰ تک تو کھودنے سے رہے وہ کھودے جاؤ تو

کھودتے رہو گے مرتے رہو گے تو ایک پانی کی مثال دی کہ اسے اگر گہرائیوں میں اتار دے تو زندگی کا کوئی سامان نہیں دریا خشک ہو جائیں اور قحط سالیوں کے زمانے میں ہوتا ہے کہ آسمان تو برسانا بند کر دیتا ہے۔ دریاؤں میں خشکی آجاتی ہے۔ کنوئیں نیچے اتر جاتے ہیں تو ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں تو ایک پانی پر جب اس کا قبضہ نہیں ہے وہ آدمی بھروسہ کرے گا کہ قیامت میں اچھی طرح سے ہوں گا اور قیامت آجائے تو میں نمٹ لوں گا تم ان چیزوں سے نمٹو گے جو تمہارے پاس ہر وقت موجود اگر آفتاب کے اندر گرمی نہ رکھی جائے تو ساری دنیا برف کی طرح جم کر رہ جائے اس کی حرارت ہے جس نے پگھلا رکھا ہے ہوا اگر منٹ بھر کے لئے روک دی جائے سانس لینے بند ہو جائیں تو زندگی ختم ہو جائے، تو آگ نہ رہے جب ختم آدمی پانی نہ ہو جب ختم، ہوا نہ رہے جب ختم، مگر اور چیزیں تو خیر اوپر کی ہیں پانی تو ہر وقت کا ہے جس کو کھودا اور نکال لیا اس کو نیچے اتار دیں تب اس پر قبضہ نہیں تو آخر کون سی چیز پر تمہارا قبضہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو کہ صاحب لے آؤ قیامت کو جیسے معلوم ہو بڑا لشکر جرار ان کے ہاتھ میں ہے کہ قیامت آئے گی یہ مقابلہ کریں گے اسے دھکیل کر پرے کر دیں گے تم اپنی عمر کے ایک سال کو نہیں دھکیل سکتے زندگی جاتی ہوئی روک نہیں سکتے۔ آتی ہوئی ہو تو نہیں روک سکتے تو کون سی طاقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے اور اللہ سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ تو

قُلْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ

فرمادیجئے کہ اگر اس حالت میں تم صبح کرو کہ پانی کنوؤں کے نیچے اتر جائے تو پانی لانے والا کون ہے تمہارے پاس، تو یہ ایک مثال ہے سارے عناصر کو اس پر قیاس کر لو اور پانی پر آگ کو بھی ہوا کو بھی مٹی کو بھی جب ہاتھ پلے کچھ نہیں تو دعوے مت کرو غالب اور قوی خدا کے سامنے جھک جاؤ یہی ہے پناہ کی صورت لڑنا پناہ کی صورت نہیں ہے۔ بس دعا کیجئے ایک سورۃ ختم ہو گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

حدیث رسول کا قرآنی معیار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ

آخری دین

الحمد للہ وسلام علی عباد الذین اصطفیٰ

امابعد!

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام اور اُس کے آسمان سے اُترا ہوا آخری دین ہے جو قیامت تک کے تمام انسانوں کے لئے پیغام اور دستورِ زندگی ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی دین آنے والا ہے نہ کوئی شریعت۔ کیونکہ نبوت ختم ہو چکی اور خاتم النبیین آچکے ہیں۔ اس لئے خاتم الانبیاء کا دین ہی قدرتی طور پر خاتم الادیان، ان کی شریعت خاتم الشرائع اور اس شریعت کی کتاب خاتم الکتب ہو سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ دین مع اپنی بنیادوں کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہے ورنہ اس صورت میں کہ یہ دین اور شریعت تو باقی نہ رہے اور جدید شریعت آنے والی نہ ہو تو دنیا سے حق کلیۃً منقطع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دُنیا کی بقاء ہی حق اور نام حق سے ہے جس دن ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا اس زمین پر باقی نہ رہے گا اسی دن قیامت قائم کر دی جائے گی اور یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے قیامت سے پہلے کوئی ساعت بھی ایسی نہیں آسکتی کہ اس میں حق اور ناحق سرے سے باقی نہ رہے۔

سو ختم نبوت اور خاتم الشرائع کے آجانے کے بعد جبکہ کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں، بقاء حق کی صورت اس کے سوا دوسری نہیں ہو سکتی کہ آخری دین کو قیامت تک باقی رکھا جائے اور زمانہ کی دستبرد سے اس کی حفاظت ہو۔ تاکہ کسی راہ سے بھی اس میں خلل اور زلل نہ آنے پائے۔ خواہ تلبیس کرنے والے کتنے بھی پیدا ہو جائیں۔ فرقے اور گروہ کتنے ہی بن جائیں۔ تحریف و تاویل سے شکوک و شبہات کے دروازے کتنے بھی کھول دیئے جائیں۔ لیکن اصلی دین اپنی اسی اصلی شان اور اپنی پوری پوری کیفیت و حقیقت کے ساتھ اسی انداز سے باقی رہے جس انداز سے وہ اپنی ابتدائی زندگی میں محفوظ تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسی غیر معمولی حفاظت انسان اور نوعِ بشری کے بس کی بات نہ تھی۔ انسان مجموعہ تغیرات ہے۔ اس کا دل و دماغ، اس کی ذہنی رفتار اور طبعی رجحان و میلان بلکہ عقلی تقاضے ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتے۔ اس تغیر پذیر ذہنیت سے ممکن نہ تھا کہ وہ یکسانی کے ساتھ اپنے دین کو ہر دور میں یکساں محفوظ رکھ سکتا۔ اگر انسان ایسی لاتبدیل فطرت کا حامل ہوتا تو توراۃ و انجیل بے نشان کیوں ہوتیں؟ زبور کی

اصلیت کیوں گم ہو جاتی؟ صحف آدم اور صحف ابراہیم دنیا سے ناپید کیوں ہو جاتے؟ اگر آخری دین کی حفاظت بھی مثل سابق انسانوں کے ہاتھوں میں دے دی جاتی، تو اس دین کا حشر بھی وہی ہوتا جو ادیانِ سابقہ کا ہوا کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہتا اور انسان کی تغیر پذیر ذہنی رفتار اس میں بھی تغیر و تبدل کئے بغیر نہ رہتی۔

لیکن ادیانِ سابقہ اگر محفوظ نہ رہے اور ختم ہو گئے تو دنیا کی بقاء میں اس لیئے فرق نہ آیا کہ نبوت ختم نہ ہوئی تھی۔ جو شریعت گم ہوتی تھی اس کی جگہ نئی شریعت بنوت کے زیرِ سایہ اس کے قائم مقام ہو جاتی تھی اور دنیا سے حق منقطع نہ ہوتا تھا۔ کہ فناءِ دنیا کی نوبت آتی۔ لیکن ختم نبوت کے بعد اس دین کے گم ہو جانے سے یہ صورت ممکن نہ تھی کہ نیا دین آجائے اور دنیا فناء نہ ہو۔ اس لئے اس آخری دین کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی اور یہ اٹل وعدہ فرمایا کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ

"ہم ہی نے یہ ذکر اُتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔

حفاظتِ دین کی صورتیں

ظاہر ہے کہ حفاظت دین کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ محافظِ دین ایسی طاقت ور شخصیتیں کھڑی کی جاتی رہیں جن کا طبعی ذوق اور ذاتی میلان ہی دین کا تحفظ ہو۔ اور وہ عقیدہ و عمل کی سرحدات کو اپنی فکری و عملی قوتوں سے اس حد تک مضبوط کرنے کی فکر میں لگی رہیں کہ اس میں کسی ادنیٰ تغیر و تبدل یا خلل کے تصور کو بھی برداشت نہ کر سکیں۔

ہر صدی کے شروع میں مجدّد کی آمد

دوسری صورت یہ ہے کہ اصل قانونِ دین، خود ایسا فطری ہو کہ اس میں خود اپنے بقاء و تحفظ کی ذاتی اسپرٹ ہو، اور اس حد تک ہو کہ اس کی طبیعت ہی کسی تغیر و تبدل اور کمی بیشی کو برداشت نہ کر سکے۔ بلکہ اس کی مضبوط ترین حجت و برہان اپنی فطری نمو اور طبعی قوت سے ہر تغیر کے خطرہ کو دفع کرتی رہے جس سے اُس کے آمنے سامنے اور دائیں بائیں کسی باطل کہ پہنچ ہی ناممکن ہو۔ سو اس دین کی حفاظت کے لئے دونوں صورتیں اختیار کی گئیں۔

پہلی صورت یعنی سر تاپا دین اور مجسم اسلام قسم کی شخصیتیں ہر ایسے دور میں مختلف اندازوں اور عنوانوں سے پیدا کی جاتی رہیں کہ جن میں دین اور اجزائے دین کے خطرہ میں پڑ جانے کا کوئی امکان دیکھا گیا۔ مثلاً انسانی ذہنیت سو برس کے دور میں طبعاً متغیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سو برس میں ایک قرن ختم ہو کر دوسرے قرن کے لئے جگہ خالی کرتا ہے اور ایک نسل پوری کی پوری ختم ہو کر دنیا کو دوسری نسل کے ہاتھ میں چھوڑ جاتی ہے۔ جس کی ذہنیت یقیناً وہ نہیں رہتی جو سو برس کے پہلے کے لوگوں کی تھی۔ انسان کے

ذہنی ارتقاء کے تحت ذہن بدل جاتا ہے۔ نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور نئے ترقی یافتہ نظریات سامنے آجاتے ہیں۔ تمدنی رجحانات پہلے سے نہیں رہتے۔ طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور گویا یہ انسان وہ نہیں رہتا جو سَو برس پہلے کا انسان تھا۔

اس لئے ہر قرن کے آغاز میں دین کے لئے یہ خطرہ قدرتی تھا کہ نئے انسانوں کی ذہنی تبدیلیاں اسے بدل نہ ڈالیں اور اس کے سابقہ رنگ کو پھیکا کر کے اس پر کوئی نیا رنگ نہ چڑھادیں جس سے اس کا اصلی اور قدیم رنگ ناقابلِ التفات ہو جائے، اس لئے ہر صدی کے سرے پر اسلام میں مجدّدوں کا وعدہ دیا گیا جو دین کو ان نئے انسانوں کی ذہنیت کی رعایت رکھتے ہوئے نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ کرتے ہیں اور اس کے اصول و فروع کو نکھار کر اس طرح سامنے لائیں کہ نئے نئے شکوک و شبہات کا قلع قمع بھی ہو جائے اور قدیم مسائل جدید دلائل کے ساتھ اور زیادہ روشن اور صاف ہو کر نئے قرن کے سامنے آجائیں۔

ان اللہ یبعث لھٰذہ الامت علی رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا

(مشکوٰۃ شریف)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے شروع میں ایسے لوگ پیدا فرماتا رہیگا جو امت کے دین کو تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو کرتے رہیں گے"۔

دین کی معیاری جماعتیں:

لیکن اس کے بعد یہ اندیشہ صدی کے اندر اندر بھی باقی رہتا تھا کہ اشرار و فجار اور ملحدین و منافقین اسلام کے نام سے اسلام کا حُلیہ تبدیل کر دیں اور اسلام میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اسے صحیح العقیدہ لوگوں کے لئے مشتبہ بنانے کی کوشش کریں۔ لوگ تو مجدد کے انتظار ہی میں رہیں اور یہ شر پسند اور کج فہم گروہ رکیک تاویلات اور غلو آمیز کاوشوں سے دین میں زندقہ الحاد پھیلانے میں کامیاب ہو جائے جس سے دین کے بنے بنائے نظام میں خلل پڑ جائے اور اس طرح دین سے دُنیا کا اعتماد اُٹھ جائے۔

تو صدی کے سرے کی قید چھوڑ کر صدی کے اندر اندر بھی سلف صالحین کے اخلافِ رشید پیدا کرتے رہنے کا وعدہ دیا گیا اور اطمینان دلایا گیا کہ امت پر صدی کے اندرونی حصہ اور درمیانی دور میں بھی کوئی وقت ایسا نہ آئے گا کہ امت کو سلف کے نمونہ کے خلف نہ مل سکیں؟ نہیں بلکہ ضرور ملیں گے جو اپنے صحیح علم و نظر اور نکھری ہوئی شرعی حجتوں سے انسان نما شیاطین کی وسوسہ اندازیوں اور سیاہ کاریوں کا پول کھولتے رہیں گے اور دین پر کسی نہج سے بھی آنچ نہ آنے دیں گے۔

ارشادِ نبوی ہے:

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاھلین۔

"(سلف کے بعد) اخلاف میں سے ایسے معتدل لوگ ہمیشہ اس علم (دین) کے حامل ہوتے رہیں گے جو غلو زدہ لوگوں کی تحریفوں اور باطل پرستوں کی دروغ بافیوں اور تلبیسوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے (اور ان خرافات کی نفی کرتے رہیں گے)"۔

لیکن پھر سلف و خلف میں بھی بہر حال کچھ نہ کچھ فصل اور وقفہ ضرور ہوتا ہے۔ سلف کے بعد خلف کو بنتے ہوئے بھی بہر حال کچھ نہ کچھ دیر ضرور لگتی ہے۔ اندیشہ تھا کہ سلف کے اُٹھنے پر جبکہ خلف ابھی حدِ تکمیل کو نہ پہنچے ہوں، باطل پرست میدان خالی دیکھ کر آدھمکیں اور وقت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا ابلیسی کام کر گزریں۔ جس سے اُمت میں ذہنی انتشار اور تشویش راہ پا جائے اور دین رخصت ہونے لگے، تو امت کو اطمینان دلانے کے لئے یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ کوئی بھی ساعت اور وقفہ اُمت پر ایسا نہ گزرے گا کہ اس میں ہمہ وقت کوئی طائفہ حقہ موجود نہ رہے جو مؤید من اللہ اور منصور منجانب اللہ ہو۔ یعنی امت مرحومہ کو ہرگز پریشان نہ ہونا چاہئے۔ وہ لاوارثی امت نہیں۔ زندہ نبی کی امت اور زندہ شریعت کی پیرو ہے جس میں دین کے معیار کی زندہ جماعتیں ہمیشہ برقرار رہیں گی۔

فرمایا گیا:

عن معاوية قال سمعت النبی صلی الله عليه وسلم لا يزال من امتی امته قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتی ياتی امرالله هم علی ذالك. **(بخاری و مسلم)**

"(سیدنا حضرت) معاویہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ امرِ حق پر قائم رہے گی، نہ ان کو کسی کا رسوا کرنا رسوا کر سکے گا، اور نہ کسی کا خلاف اُنہیں نقصان پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ اسی حالت پر مستقیم ہوں گے"۔

دین کی نافعیت تمام قرون میں:

حتیٰ کہ اگر امت کو یہ بھی خطرہ پیدا ہو کہ زمانوں کے گزرنے سے گو دین باقی رہے۔ لیکن اس کی وہ کیفیت اور رسوخ کی شان نہ رہے جو سلف میں تھی تو دین کی صورت ہی صورت باقی رہ جائے گی جس میں حقیقت نہ ہوگی تو ایسے بے حقیقت دین کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔ اس لئے اس کا بھی اطمینان دلایا گیا کہ امت کی خیریت کسی خاص دور کے طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خواہ وہ اوّل کا ہو یا آخر کا۔ بلکہ دین کی خوبی و خوب صورتی وہی اگلی کیفیت و حقیقت اور وہی اصلی خیر و برکت ہر دور میں قائم رہے گی۔

چنانچہ بشارت دی گئی کہ:

ابشروا وابشروا انما مثل امتی مثل الغیث لا یدریٰ اخرہٗ خیر ام اولہٗ. الخ

"بشارت حاصل کرو اور خوش خبری لو کہ میری امت کی مثال بارش کی سی ہے، نہیں جانا جا سکتا کہ اس کا اول قطرہ زمین کے لئے زیادہ نافع تھا یا آخر کا۔"

(یعنی خیریت اور نافعیت امت کے تمام قرون میں پھیلی ہوئی ہے درجات و مراتب کا فرق ضرور ہوگا مگر اصل خیر ہر مرحلہ پر بدستور قائم رہے گی۔

بہر حال ہر صدی کے سرے پر، صدی کے اندر اور ہر صدی کی ہر ہر ساعت میں ایسی شخصیتوں کے وجود و بقاء کی خبریں اور وعدے لسانِ نبوت پر دیئے گئے ہیں جو دین کی حفاظت و صیانت کے لئے جارحہ حق اور وسائط الٰہی ثابت ہوں گی۔ جس سے دین اپنی اصلی صورت و حقیقت اور کیفیت و کمیت کے ساتھ تاقیام قیامت، باقی اور محفوظ رہے گا اور کوئی وقت بھی امت پر انقطاعِ حق کا نہیں گزرے گا۔

دین کی دو ۲ اصلیں

مگر یہ ظاہر ہے کہ دین کی یہ حفاظت بیرونی اور خارجی وسائل سے متعلق ہے۔ ذاتی حفاظت یہ ہے کہ خود دین اپنی ساخت پرداخت اور وضع کے لحاظ سے انمٹ اور بذات خود محفوظ رہنے کی اسپرٹ اپنے اندر رکھتا ہو۔ اسلامی شریعت اپنے اصول و مبانی اور دلائل و براہین کے لحاظ سے بذات خود بھی منجانب اللہ محفوظ و انمٹ ہے جس میں کسی رخنہ اندازی کی گنجائش نہیں۔

یعنی حفاظتِ دین کی دوسری صورت بھی اختیار کی گئی کہ خود اسکی ذاتی حجت کو انمٹ بنایا گیا اور اس طرح کہ اس دین کی دو ہی اصلیں ہیں جو مصدر شریعت اور دین کا سرچشمہ ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ یوں اس دین کی دو اصلیں اور بھی ہیں جن کا نام اجماع اور قیاس ہے جو بلاشبہ واجب الاطاعت ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے امت پر تین ہی اطاعتیں فرض بھی فرمائی ہیں۔

اطاعتِ خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعت اولی الامر یعنی راسخین فی العلم کے اجتہادی نظائر کی اطاعت، یا اس قسم کے ہم قرن اہلِ رسوخ کی اجماع کردہ شئے کی اطاعت جو یقیناً حجت شرعی ہے۔ یہ قیاس اور اجماع کی دونوں اصلیں باوجود حجت شرعیہ ہونے کے تشریعی نہیں بلکہ تفریعی ہیں جو مستقل بالحجت نہیں۔ جب تک کہ ان کا رجوع کتاب و سنت کی طرف نہ ہو۔ کیونکہ ماتجمع علیہ (جس پر اجماع کیا جائے) وہی معتبر ہو سکتا ہے جس پر پہلے سے کوئی دلیل کتاب و سنت سے قائم ہو ورنہ مجرد میل اور محض ہوئی سے کسی چیز پر جمع ہو جانا اجماع نہیں۔ درحالیکہ امت میں ایسا اجماع جو گمراہی پر ہو، ہو بھی نہیں سکتا۔

اسی طرح قیاس کی مقیس (یعنی قیاسی جزیہ) وہی معتبر ہو سکتا ہے جس کا مقیس علیہ (جس پر قیاس کیا جائے) کتاب و سنت میں موجود ہو اور اس مقیس اور مقیس علیہ میں کوئی رشتہ جامعیت بھی ہو جو منصوص کے حکم کو غیر منصوص میں منتقل کردے۔ پس ان کی تشریعی حیثیت خود اصل نہیں بلکہ کتاب و سنت کے

تابع ہے۔ اس لئے دین کی مستقل حجت اور تشریعی اصلیں دو ہی رہ جاتی ہیں ایک کتاب اللہ دوسرے سنت رسول اللہ، گو بعض علماء نے ایک تیسری چیز اجتہاد نبوت کو بھی مستقل حجت اور مصدر احکام کہا ہے لیکن وہ بھی مستقل بالحجیت نہیں۔ کیونکہ جب کوئی حکم منصوص نازل نہ ہوتا اور بعد انتظار آپ اجتہاد فرماتے تو در صورت صواب بذریعہ وحی یا سکوت رضا آپ کو اس پر مستقر کردیا جاتا جو حکم میں سنت کے ہو جاتا ورنہ علی الفور تنبیہ کر کے اس سے ہٹادیا جاتا تھا۔

اس لئے اس کا مرجع بھی بالآخر وحی ہی نکلی متلو ہو یا غیر متلو۔ یعنی کتاب اللہ یا سنت نبویؐ، اس لئے مستقل حجتیں دو رہتی ہیں۔ کتاب اور سنت اور جب کہ یہی دو اصلیں تشریعی تھیں جو آخر کی دو تفریعی اصلوں سے بالاتر، بلکہ ان کی اساس تھیں۔ تو قرآن کریم نے جس طرح چاروں اصلوں کو وجوب اطاعت میں جمع فرمادیا تھا (جس طرف ابھی اشارہ گزرا) اسی طرح اکثر مواقع پر صرف ان دو اصلوں کو وجوب اتباع میں جمع فرمایا ہے۔ گویا نفس حجیت میں قرآن وحدیث کو مساوی اور متوازی شمار کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

یا ایُّها الّذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرّسول ولا تبطلوا اعمالکم.

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے عمل کو باطل مت کرو"۔

اور کہیں فرمایا:

واطیعوا اللہ و اطیعوا الرّسول واحذروا.

"اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ڈرتے رہو"۔

کہیں ارشاد ہوا؟

یا ایُّها الّذین امنوا استجیبوا للہ وللرّسول اذا دعاکم.

"اے ایمان والو! اجابت کرو اللہ کے حکم کی اور رسولؐ کے حکم کی، جبکہ وہ تمہیں بلائیں"۔

کہیں فرمایا:

"وما کان لمؤمنٍ ولا مؤمنةٍ اذا قضی اللہ ورسولہ امرًا ان یکون لهم الخیرة من امرهم.

"اور کسی مومن اور مومنہ کے لئے اختیار نہیں رہتا (کہ مانیں یا نہ مانیں) جب اللہ ورسولؐ کی طرف سے کسی امر میں حکم آجائے"۔

ان آیات سے کلام خدا اور کلام رسولؐ کا مستقلاً حجت شرعیہ ہونا واضح ہے کہ حجت قرآن کے ساتھ ساتھ حجیت حدیث کی بھی روشن دلیل ہے۔ لیکن پھر ان دونوں اصلوں میں باوجود دونوں کے حجت مستقلہ ہونے کے باہم ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ کتاب حجۃ قاطع ہے اور حدیث سوائے متوارت کے حجت ظنی

ہے کیوں کہ حدیث غیر متواتر کا ثبوت اس درجہ کا نہیں جس درجہ کا قرآن حکیم ہے۔ اس لئے جو درجہ اُن کے ثبوت کا ہے وہی درجہ اُن کی حجت کا بھی ہے۔

رسولؐ نورِ مطلق اور ظلمتِ محض میں واسطۂ وصول ہے:

نیز قرآن حکیم اصل کلی ہے اور حدیث اس کا بیان ہے جس کے بغیر قرآن حکیم کے مضمرات اور مرادات کا انکشاف دشوار بلکہ عادۃً ناممکن ہے کیونکہ قرآن کریم اسلام کا صرف بنیادی قانون اور دستور اساسی ہی نہیں بلکہ معجزہ بھی ہے۔ جو اپنے لفظ و معنی اور تعبیر و مفہوم دونوں ہی کے لحاظ سے اعجازی شان رکھتا ہے۔ نہ الفاظ کی ترکیب اور جوڑ بند اور انداز بیان ہی میں اس کا مثل لایا جانا مخلوق سے ممکن ہے اور نہ ہدایت واحکام کی جامعیت علوم و معارف کی گہرائی اور مضامین کی ہمہ گیری ہی میں اسکی نظیر بنالیا جانا ممکن ہے۔

چنانچہ اس کی تعبیر نے دنیا کو تھکادیا کہ وہ اس کے چیلنجوں کے باوجود اس کا مثل نہ لاسکی۔ ایسے ہی اس کی معنوی وسعتوں اور ہمہ گیر گہرائیوں نے بھی دنیا کو عاجز کر دیا کہ وہ اس جیسی جامع علوم و معارف اور حاوی احکام واصول کتاب یا اس کے کسی جزو جیسا کوئی جزو لاسکے کہ جسکی ایک ایک تہہ اور شکن میں صدہا علوم کے دریا چھپے پڑے ہیں جو تیرہ صدیوں سے مسلسل نکلتے چلے آرہے ہیں اور ہنوز ان کی تہاہ کا پتہ نہیں۔

حرف　حرفش　راست　اندر　معنیٰ
معنیٰ　در　معنیٰ　در　معنیٰ

ظاہر ہے کہ اتنے بے شمار اور لفظ لفظ میں سموئے ہوئے علوم و معارف کا ان سے نکال لانا بھی عامۂ خلائق کے فہم سے بالاتر تھا ورنہ اگر بشریت کا دماغ اور فہم اتنا جامع، اتنا ہمہ گیر اور اتنا وسیع و عمیق ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان سے ایسے کلام کے بنالینے یا کسی نہ کسی حد تک اس کے مثل لانے کی توقع نہ کی جاسکتی اور یہ بالکل ہی ناممکن ہوتا۔ آخر قرآن کریم جیسا کلام جن وانس مل کر اس لئے تو نہیں لاسکتے کہ ان کے ذہن وذکا وفہم و عقل اور علم وادراک میں وہ لاتحدیدی اور ہمہ گیری نہیں جو ایسے اعجازی کلام سے لئے درکار ہے۔

اس لئے اس تنگئ فہم، اس محدودیت ذہن اور قلیل و علیل علم میں یہ سکت نہیں کہ وہ قرآن جیسا وسیع و عمیق اور معجزانہ کلام صادر کر سکے۔ سو وہی تنگی فہم اور محدودیت ذہن و فکر یہاں بھی موجود ہے جو اس معجز کلام کے تمام مشمولات کے سمجھنے میں اپنے عجز ودرماندگی کو نہیں چھپاسکتی اور اس میں یہ گنجائش نہیں نکل سکتی کہ وہ قرآن کے معجزانہ اصولی اور کلی جملوں سے نکلتے ہوئے دقائق وحقائق کا ادراک اور ان کی معانی اور وجود میں سے مراد اور غیر مراد کا تعین محض اپنے مطالب و مرادات کے بیان کی ذمہ داری خود لے کر اس بارہ میں اپنے رسول ﷺ کو اپنا ترجمان بنا کر بھیجا۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بھی لایا جاسکتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ کی ذات پاک لامحدود ہے۔ اسی طرح اس کی صفات کمال بھی لامحدود ہیں اور ہم بندہ اپنے ظاہر و باطن، جسم وروح، قلب و دماغ، فکر و فہم اور عقل و فراست سب کے لحاظ سے محدود اور متناہی ہے۔

اس لئے یہ کسی چیز کا ادراک بغیر تحدیدات، تعینات اور تشخیصات کے نہیں کر سکتا اور اس کے لئے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محدود رہتے ہوئے لا محدود ذات و صفات تک رسائی پائے یا اس کا ادراک و معرفت کرلے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے اور بندوں کے درمیان بندوں ہی میں ایک برزخ اور درمیانی طبقہ پیدا فرمایا جو اپنے مخصوص کمال اور مافوق العادت احوال کے لحاظ سے تو ذاتِ حق سے قریب تر اور اسکے کمالات کا نمونہ ہوتا ہے۔ اور اپنے تعینات کے لحاظ سے بندوں میں شامل اور کمالِ بشریت کا نمونہ ہوتا ہے۔

ادھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق میں شامل

یہی طبقہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقدس جماعت ہے جو نورِ مطلق اور انسان جیسے ظلمت محض میں واسطہ وصول و قبول ہے۔

پس جبکہ کمالاتِ ربانی کے نمونے نبی کی ذاتِ قدسی صفات میں ظہور کرتے ہیں تو بندوں کے لئے سہل ہو جاتا ہے کہ اس سے وابستہ ہو کر (جس سے وابستگی بوجہ مخلوقیت کے اشتراک کے ممکن ہوتی ہے) حسبِ استعداد خدا تک رسائی پالیں ورنہ بغیر اسکے کمالات خداوندی کے متشخص اور متعین ہو کر سامنے آنے اور مخلوق کے ان سے وابستہ ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

فہمِ حدیث کے بغیر فہمِ قرآن ممکن نہیں:

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ پیغمبر کی زبان سے ہر کلام ہدایت کسی نہ کسی کیفیت سے صادر ہوتا ہے۔ یہ کیفیات ظاہر ہے کہ نفسانی نہیں ہوتیں جو ہر کس و ناکس پر طاری ہو سکتی ہیں بلکہ روحانی و رحمانی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ کلام درحقیقت اسی متعلقہ کیفیت میں ڈوبا ہوا اسی سے سرزد ہوتا ہے اور اسی کا مظہر ہوتا ہے۔ گویا وہ کیفیت ہی الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پھر اس کیفیت سے یہ کلام چل کر اسی کیفیت کی طرف لوٹتا بھی ہے جس سے یہ کیفیت قلب میں اور زیادہ مستحکم ہو کر جڑیں پکڑتی ہے۔ گویا اس کلام کے اول و آخر رحمانی اور روحانی کیفیت چھائی رہتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس کلام کی اول درحقیقت اسی کیفیت میں چھپی رہتی ہے کیونکہ کلام کسی نہ کسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے اور مقصد کسی نہ کسی باطنی کیفیت کا مقتضاء ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر کلام کی صحیح مراد کو وہی پا سکتا ہے جو کسی نہ کسی حد تک اس کیفیت سے آشنا اور اس سے ہم آہنگ ہو۔ عاشق کی مراد کو عشق آشنا ہی پوری طرح جان سکتا ہے۔ صناع کی مراد صنعت آشنا ہی پوری طرح پا سکتا ہے۔

اس لئے کلامِ رب کو رب آشنا ہی کسی نہ کسی حد تک پا سکتا ہے جو ربانی کیفیات سے کسی حد تک مانوس ہو۔ ورنہ بے کیفیت اور نا آشنا ممکن ہے کہ کلام کے لغوی مفہوم اور معنی اول تک پہنچ جائے لیکن متکلم کے صحیح منشاء و مراد تک اس کیفیت سے مانوس ہوئے بغیر پہنچنا عادت کے خلاف ہے۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جو ان

کیفیات کی متضاد اور ضد کیفیات سے مانوس اور ان میں غرق ہوں تو عادۃً وہ مراد کو سمجھانے سے بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جس سے ادراکِ مراد کا حق ادا ہو جائے اور اگر اتفاقاً وہ الفاظ کی مدد سے کسی حد تک مراد حق پر مطلع بھی ہو جائیں تو اس کیفیت کے بغیر اس میں مبصر نہیں بن سکتے جس سے اُس کی مخفی حقائق ان پر کھل سکیں اور ان حقائق میں مضمر شدہ احوال ان پر طاری ہو سکیں جن سے حقیقی معرفت کا دروازہ کھلتا ہے اور آدمی مبصر بن جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی فات اور ان میں بھی بالخصوص صفت علم اور اخص خصوص صفت کلام جو اس کے علوم کی ترجمان اور معبر ہے اور اس کا مظہر اتم قرآن حکیم اپنی اصولیت کلیت کمال جامعیت اور ان شئون الٰہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام سرزد ہوا ہے ذات ہی کی طرح لا محدود الحقائق، لا محدود المعارف اور لا محدود المطالب ہے جو ایک نوع نہیں بلکہ ماضی و مستقبل اور حال کی ہزار ہا انواع علوم پر حاوی اور شامل ہے۔

فيه نبأ ما قبلكم و خبر ما بعدكم و حكم ما بينكم هو الفصل ليس بالهزل. من تركه من جبار قصمه الله و من ابتغى الهدى فى غيره اضله الله وهو حبل الله المتين وهو الذكر الحكيم وهو الصراط المستقيم وهو الذى لا تزيغ به الاهواء ولا تلبس به الالسنة ولا تشبع منه العلماء ولا يخلق عن كثرة الرد ولا تنقضى عجائبه وهو الذى لم تنته الجن اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قراناً عجباً يهدى الى الرشد فامنا به من قال به صدق ومن عمل به أجر ومن حكم به عدل ومن دعا اليه هدى الى صراط مستقيم خذها اليك يا اعور. (ترمذی عن حارث الاعور)

’’اس میں تم سے پہلوں کی باتیں ہیں اور پچھلوں کی خبریں ہیں اور درمیانی حال کے احکام ہیں وہ یقینی چیز ہے، مذاق نہیں۔ جس متکبر نے اسے چھوڑا، اس کی گردن خدا نے توڑی اور جس نے ہدایت اس کے سواء میں ڈھونڈی اس کو خدا نے گمراہ کر دیا، وہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے وہ حکیمانہ یادداشت ہے وہ سیدھا راستہ ہے۔ وہ، وہ چیز ہے کہ اس سے دلوں کے میلانات ٹیڑھے نہیں ہوتے اور زبانیں مشتبہ نہیں ہوتیں اور اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوتے۔ وہ کثرتِ تلاوت سے پرانا نہیں پڑتا۔ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ وہی ہے کہ جب جنات جیسی سرکش قوم نے اسے سنا تو سرکشی سے اک دم رُک گئے، اور یہی کہتے بن پڑا کہ ہم نے عجیب کلام سنا ہے جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے، ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اسے زبان پر لایا اس نے سچ کہا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا جس نے اس

کے ساتھ حکم کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف اسے بلایا اسے سیدھے سچے راستے کی ہدایت ہوئی۔ سو اے اعور! اسے مضبوطی سے تھام لے"۔

اتنا جامع ہمہ گیر اتنا وسیع العلم کلام جو ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعوں اور حال کے احکام کو سمیٹتے ہوئے جس کا بولنا سچائی ہو، عمل اجر ہو حکم عدل ہو، دعوت ہدایت ہو اور جس کے عملی عجائبات کی کوئی حد و نہایت نہ ہو۔ علماء کا کبھی اس سے پیٹ نہ بھرے۔ جس کی تعبیرات اصولیت وکلیت کی انتہا پر پہنچی ہوئی ہوں۔ جن کے لفظ لفظ سے حقائق و معارف ٹپکے پڑ رہے ہوں جس کی تعبیر ایسی حکیمانہ ہو کہ اس کی عبارت سے الگ الگ علوم واحکام نکلیں اور اس کی دلالت اشارت سے الگ معارف الٰہیہ پیدا ہوں اور اقتضاء سے الگ پھر اس کی آیات بینات علاوہ محکم اور ظاہر فصاحت وبلاغت کی غمازی کر رہی ہوں۔ کوئی آیت خفی ہے کوئی مجمل، کوئی مشکل اور کوئی کنایہ۔ پھر ان ظواہر وبواطن کے ساتھ باطنی کیفیات اور دقائق نفس پر الگ مشتمل ہوں اور نفسیات پر الگ دیانات پر الگ اور سیاسیات پر الگ۔ سو ایسے محیر العقول اور اعجازی کلام سے معانی نکالنا مطالب اخذ کرنا شئون روحانیت سے آشنا بن کر مراد خداوندی کو غیر مراد سے متمیز کر کے سمجھنا ظاہر ہے کہ بلا خدائی رہنمائی کے ممکن نہ تھا اور اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ کوئی ایسا کلام اس کی تفہیم کا واسطہ بنے جس کا متکلم تو ہم فرشیوں میں سے ہو لیکن اپنے قلب صافی اور دماغ عالی کی جہت سے عرشیوں میں سے ہو، وہ اس کلام سے متعلقہ شئون الٰہیہ کے عکوس وظلال سے بھرپور ہو۔

ان کیفیات سے پوری طرح آشنا اور ان کے رنگ میں رنگا ہوا ہو جن سے یہ کلام حق نکل کر اس تک پہنچا ہے۔ ساتھ ہی مؤید من اللہ ہو اور خدا نے ہی اسے اپنی مراد سمجھائی ہو اور وہی اس کے ظاہر و باطن کی تربیت فرما کر اس کے دل و دماغ کو اپنے اس معجز کلام سے ہم آہنگ بنائے ہوئے ہو جس سے وہ ان جامع مطالب کی تشخیص وتعین کر کے انہیں ہمارے محدود فہموں کے قریب کر دے۔

ظاہر ہے کہ وہ کلام خدا ہی رسول کا کلام ہو سکتا تھا جس نے اولاً خود کلام الٰہی کو اللہ سے سنا اور اسکی رہنمائی سے سمجھا اور اسی ذوق و کیفیت سے اپنے مخاطبوں کو سمجھایا اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ رسول اور کلام رسول اتارا تاکہ تلاوت آیات کے بعد تعلیم وتربیت کے ذریعے جو عادۃً کلام اور افہام و تفہیم ہی سے ممکن ہے ان کیفیات میں ڈوبے ہوئے معانی کو قلوب سے قریب کیا جائے جس کی صورت عادۃً یہی ہو سکتی تھی کہ لب ولہجہ سے بحیثیت کذائی سے ماحول کے عرفی مقتضیات سے، اور ساتھ ہی بتوسط الفاظ قلبی تاثیر وتصرف سے اس مراد کو نفوس میں اتارا جائے، اور نہ صرف اُتارا ہی جائے کہ مراد حق دلوں میں اتر اتر کر غیر مراد کے تصور کی بھی نفس میں گنجائش باقی نہ رہے۔ نظر بوجوہ بالا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ذات خداوندی تک بلا رسول کے واسطے کے ہماری رسائی ناممکن تھی، اسی طرح کلام خداوندی تک بلا کلام رسول ہمارے فہموں کی رسائی ناممکن تھی۔

قرآنِ کریم کے نزول اور شرح و بیان کی ذمہ داری:

جس طرح حق تعالیٰ نے اپنا قانون اور کلام خود ہی اتارنے کا ذمہ لیا کہ مخلوق خود ویسا جامع اور اٹل قانون بنانے پر قادر نہ تھی اسی طرح اُس کے شرح و بیان کی ذمہ داری بھی حق تعالیٰ نے خود ہی لی کہ مخلوق بلا بتلائے اس کے ضمائر اور مخفیات و مرادات کو ازخود پالینے پر قادر نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ نزول وحی کے وقت اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو یاد رکھنے کے لئے بار بار زبان سے رٹتے اور تکرار فرماتے تاکہ ذہن میں الفاظ وحی جم جائیں۔

تو حق تعالیٰ نے تکرار لسان سے بایں عنوان روکتے ہوئے کہا:

لا تحرك به لسانك لتعجل به

"اے پیغمبر! اپنی زبان مت ہلاؤ جلدی نہ کرو"

اور پھر قرأت حق کو محض سنتے رہنے کی ہدایت بایں عنوان فرماتے ہوئے کہا کہ:

فاذا قرأناه فاتبع قرانه

"جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ سنتے رہیں"۔

ذمہ دارانہ ارشاد فرمایا:

ان علینا جمعه و قرانه

"ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا (آپؐ کے سینہ میں) جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اسے پڑھوا دینا۔"

یہ ذمہ داری ظاہر ہے کہ وحی کے الفاظ کو سینۂ نبوی میں محفوظ کر دینے سے متعلق تھی، کیونکہ پیغمبر کی زبان کی حرکت اور قرأت حق نیز پیغمبر کا اسے سنتے رہنے کا تعلق الفاظ ہی سے ہو سکتا ہے معنی سے نہیں۔ معنی نہ رٹنے کی چیز ہے نہ قرأت کی اور نہ سننے کی۔ اس لئے الفاظ وحی کے بلا کم و کاست سینۂ نبویؐ میں اتار دینے اور محفوظ کر دینے کی ذمہ داری تو اس آیت سے ثابت ہو گئی۔

اس کے بعد الفاظ وحی کے معنی و مطالب کا درجہ تھا تو انہیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں چھوڑا گیا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ آپؐ آیاتِ قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے اور ایک یہ، اور ان میں سے فلاں مطلب چونکہ الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے، اس لئے یہی مراد خداوندی ہو گا۔ نہیں بلکہ بیان مراد اور معانی قرآن کے کھول دینے کا ذمہ خود حق تعالیٰ ہی نے لیا اور فرمایا:

ثم ان علینا بیانه

"پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس قرآن کا بیان"

ظاہر ہے کہ یہ بیان اس قرأت کے سوا ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذمہ اس آیت کے پہلے ٹکڑے

میں لیا گیا تھا۔ ورنہ اس دوسرے ٹکڑے کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ کہ الفاظ کے سنا دینے کو بیان کہتے بھی نہیں، قرأت کہتے ہیں۔ بیان کسی مخفی یا مبہم یا غیر معلوم بات کھول دینے کو کہتے ہیں جو علم میں نہ ہو۔ سو الفاظ جبکہ حضور ﷺ سن چکے اور آپ کے علم میں آ چکے تو ان کے کھول دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں بن سکتے کہ یہ علاوہ محاورہ ولغت کے غلط استعمال کے تحصیل حاصل بھی ہوگا جسے محال کہا جاتا ہے۔ اس لئے لامحالہ بیان کا تعلق لغت محاورہ اور عقل کی رو سے الفاظ سے نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ الفاظ کے بعد معانی ومرادات ہی رہ جاتے ہیں جو الفاظ سن لینے کے باوجود بھی مخاطب پر مخفی رہ سکتے ہیں۔ اس لئے متعین ہو جاتا ہے کہ بیان کا لفظ معانی ومطالب کے لئے لایا گیا ہے۔ جیسا کہ وہ لغتاً بھی معانی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام کے معانی سمجھانے کا ذمہ بھی خود لیا۔

مطالبِ قرآنی پر کوئی حاکم نہیں:

جس سے واضح ہو گیا کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ ہیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ان دونوں میں مدعی نہیں بلکہ ناظر اور امین ہیں۔ یعنی نزول الفاظ جمع الفاظ حتیٰ کہ اقرأ الفاظ بھی ادھر ہی سے ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب پیغمبر کو بھی معانی شرح مطالب کے سمجھنے میں بیانِ حق کے تابع رکھا گیا جس پر کہ خود قرآن اترا۔ تو امت کی کیا مجال تھی کہ اس کے فہم کو مطالب قرآنی پر حاکم بنا کر آزاد چھوڑ دیا جاتا اور وہ سلسلہ معانی میں مدعی یا مجتہد بن بیٹھتی۔ اسلئے اسے بھی حق تعالیٰ نے فہم مراد میں بیانِ حق ہی کا تابع رکھا۔

اور وہی بیان جو اپنے پیغمبر کے سامنے خود حق تعالیٰ نے دیا تھا جس سے آپ نے مرادات ربانی کو سمجھا تھا۔ اسی بیان کی نقل وروایت کا ذمہ اپنے پیغمبر پر عائد فرمادیا کہ وہ امت کو اس بیان سے یہ مرادات ربانی سمجھائیں اور تعلیم کردیں۔ فرمایا:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

"اور ہم نے اتارا تمہاری طرف (اے پیغمبر!) ذکر (قرآن) تاکہ تم اسے لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کردو جو ان کی طرف اتارا گیا اور تاکہ وہ (خود بھی) تفکر کرسکیں"۔

گویا تفکرات کا درجہ بھی فہم مراد کے بعد رکھا گیا۔ تاکہ تفکر کا تعلق تعین مراد سے نہ رہے بلکہ اس بیان کے ذریعہ متعین شدہ مراد کے دائرہ میں محدود رہ کر فکر اپنا کام کرے تاکہ اس تفکر سے مرادات خداوندی ہی سے حقائق ولطائف کھلیں۔ غیر مراد چیزیں محض لفظوں کی آڑ لے کر پیدا نہ کی جائیں کہ وہ معارف الٰہیہ نہ ہوں گے۔ بلکہ تخیلات نفسانیہ اور اوہام ردیہ ہوں گے جو نا قابلِ التفات فلسفہ ہوگا، حکمت نہ ہوگی۔ دوسری جگہ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ

"اور ہم نے یہ کتاب تم پر (اے پیغمبر!) نہیں اتاری مگر اس لئے کہ تم کھول کر بیان کر دو ان باتوں کو جن میں لوگ جھگڑے (اور اختلافات) میں پڑے ہوئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ جھگڑا یا تو خود قرآن کے بارے میں ہو گا کہ اس کی آیت کے معنی میں اختلاف ڈالیں اور جھگڑے میں پڑ جائیں یا معاملات میں ہو گا جس میں ہر فریق اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے قرآن ہی سے سند لانے کی کوشش کرتا ہو اور اس طرح معاملہ کے حکم میں اختلاف پڑ جائے۔ دونوں کا قرار واقعی علاج بیانِ رسول کو بتلایا گیا جس سے معنی اور معاملہ کا ایک رخ متعین ہو جائے۔

پس یہ بیان دو مختلف باتوں میں ترجیح اور تشخیص کا کام دے گا۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ یہ بیان اس قرآن سے الگ ہو۔ اگر وہ بعینہٖ وہی قرآن ہو تو جب کہ لوگوں نے خود اسی میں جھگڑا ڈالا ہوا ہے تو ان جھگڑالو لوگوں کے لئے وہی مختلف فیہ معنی فیصلہ کیسے بن سکیں گے۔ اس لئے نبی کے بیان کو جو بیانِ الٰہی ہے قرآن کے علاوہ ایک حقیقت کہا جائے گا جو ان مختلف پارٹیوں یا افراد کے سوچے سمجھے مختلف معانی کے حق میں مرجح ہو گا جس سے اختلاف چک جائے گا اور فیصلہ حق سامنے آ جائے گا۔

حدیث نبویؐ قرآن کا بیان ہے

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ بیانِ رسولؐ اس قرآن سے الگ کوئی چیز ہے جو قرآن کے حقائق اور او جھل شدہ معانی کو متعین طریق پر کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے اور جبکہ وہ نکلا ہوا اسی نور سے ہے جس سے قرآن نکلا تو اس میں اس نور کو نمایاں کرنے کی جو قوت ہو گی وہ کسی دوسرے کلام میں نہیں ہو سکتی۔

پس اسی بیان کا نام خواہ وہ قولی ہو یا عملی، سکوتی ہو یا تقریری قرآن کی اصطلاح میں بیان ہے اور حضور ﷺ کی اصطلاح میں اس کا نام حدیث یا سنت ہے جو حدثوا عنی یاعلیکم بسنتی سے مفہوم ہوتا ہے۔ یہ بیان مبہمات قرآنی کے لئے ایضاح ہے۔ مجملات قرآنی کے لئے تفصیل ہے مشکلات قرآنی کے لئے تفسیر ہے۔ مخفیاتِ قرآنی کے لئے اظہار ہے۔ کنایاتِ قرآنی کے لئے تصریح ہے جس کے بغیر اختلافات کا فیصلہ اور مراداتِ خداوندی کی تعین کی کوئی صورت نہیں اس لئے مجموعہ حدیثِ نبویؐ، مجموعہ قرآن کے لئے یا ہر حدیث نبویؐ الگ الگ کسی نہ کسی آیت کے لئے بیان ہے اور آیتوں کے مضمرات چونکہ مختلف انواع ہیں اس لئے ان کے یہ بیانات مختلف الانواع ہیں اور اس لئے ان کے اصطلاحی نام بھی جدا جدا ہو گئے۔

مثلاً اگر آیت و روایت کا بعینہٖ ایک ہی مضمون ہے تو حدیث کو بیانِ تاکید کہا جائے گا۔ اگر آیت کے مختلف محتملات میں سے کسی ایک احتمال کو حدیث نے متعین کیا ہے تو بیانِ تعیین کیا جائے گا۔ اگر آیت کا پیش کردہ حکم مقدار کے لحاظ سے مبہم ہے جسے حدیث نے مشخص کیا ہے تو بیان تقریر کہا جائے گا۔ اگر آیت کے کسی اجمال کو حدیث نے کھولا اور پھیلایا ہے تو بیان تفصیل ہو گا۔ اگر آیت کے کسی چھوڑے ہوئے

مضمون مثلاً کسی قصہ کے ٹکڑے کو یا دلیل کے کسی مقدمہ کو حدیث نے اس کے ساتھ ملا دیا تو بیان الحاق کہا جائے گا۔ اگر آیت کے حکم کی وجہ حدیث نے ظاہر کی ہے تو بیان توجیہ کہا جائے گا۔ اگر آیت کے کسی کلیہ کا کوئی جزیہ حدیث نے ذکر کر دیا ہے تو بیان تمثیل ہوگا۔ اگر حکم آیت کی علت حدیث نے واضح کی ہے تو بیان تعلیل کہا جائے گا۔ اگر کسی قرآنی حکم کے خواص و آثار حدیث نے کھولے ہیں تو بیان تاثیر کہا جائے گا۔

اگر کسی حکم آیت کی حدود حدیث نے واضح کی ہوں تو بیان تحدید کہا جائے گا۔ اگر کسی عام کا کوئی فرد مشخص کر دیا ہو تو بیان تخصیص کہا جائے گا۔ اگر آیت کے کسی جزیہ کے مشابہ کوئی جزیہ کسی مشترک علت کی بناء پر حدیث نے پیش کیا ہو تو بیان قیاس کہا جائے گا۔ اگر آیت کے کسی اصول کلی سے حدیث نے کوئی جزیہ مستنبط کر کے پیش کیا ہے تو بیان تفریع کہا جائے گا۔ اور اگر قرآن کے کسی جزیہ سے حدیث نے کوئی کلیہ اخذ کر کے نمایاں کیا ہو تو بیان استخراج کہا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ جن کی مثالیں طول کے خیال سے نقل نہیں کی گئیں۔

کتاب و سنت کا مابینی ربط اور اس کا فہم:

اب یہ کام مجتہد یا راسخ فی العلم کا ہے کہ سنت کے ان بیانات کی نوعیت کا پتہ چلا کر اس کے مناسب اس بیان کو کتاب اللہ کی طرف رجوع کر دے اور اس بیان کو اس سے ماخوذ ثابت کر دے مگر اس میں نہ ہر کس و ناکس کا فہم معتبر ہے نہ ہر ایک کو یہ علمی قوت حاصل ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مابینی علاقہ اور رابطہ کا پتہ چلا کر اس پر حکم لگائے۔ یہ کام ارباب استنباط اور اصحاب تفقہ و اجتہاد کا ہے کہ وہ اس غامض علم پر بتوفیق خداوندی مطلع ہوں اور عوام علماء کو مطلع کریں۔

حدیث بحیثیت حجت مستقل:

بہر حال جس قدر بھی حدیثی احکام ہیں۔ وہ در حقیقت قرآن ہی سے ماخوذ اور اسی کا بیان ہیں۔ البتہ ان کی خاص نوعیت کی وجہ سے ان میں دو جہتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک جہت تابع قرآن ہونے کی ہے سو اس جہت سے اس کا نام بیان قرآن ہوگا۔ گو اس بیان اور قرآن کا درمیانی واسطہ دقیق ہو اور بغیر عمیق علم کے ہر ایک پر نہ کھلے۔ دوسری جہت اس کی تشریع احکام کی ہے۔ اس کی رو سے حدیث ایک مستقل مصدر تشریع اور شریعت کی حجت مستقلہ ثابت ہوگی۔ اس لئے جن نصوص سے حدیث کا بیان ہونا واضح ہوتا ہے ان سے تو حدیث کی تابعیت اور فرعیت کی شان نمایاں کی گئی ہے اور جن نصوص سے حدیث مصدر تشریع ثابت ہوتی ہے ان سے اس کے احکام کو مثل احکام قرآن بتلا کر حدیث کا قرآن کے مماثل حجت شرعیہ ہونا واضح کیا گیا ہے جیسے حدیث نبویؐ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

الا انی اوتیت القران ومثله معه (ابو داؤد)

"خبردار ہو کہ مجھے قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی دیا گیا ہے"

اور فرمایا گیا:

وانما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ

"اور تحقیق رسول اللہؐ نے بعض چیزیں حرام کی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیں"۔

اس سے تشریعی طور پر حدیث کی استقلالی شان واضح کی گئی ہے۔ رہا یہ پہلو کہ بعض وہ احکام جو احادیث میں ہیں اور قرآن میں نہیں جیسے مقدام بن معدی کرب کی حدیث میں آپ نے حجیت حدیث اور اس کی مستقل تشریعی شان کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ حمارِ اہلی کی حرمت قرآن میں نہیں اسے رسول اللہؐ نے حرام کیا ہے۔ یا درندوں کے گوشت کی حُرمت کلام اللہ میں نہیں، کلام رسول میں ہے وغیرہ وغیرہ۔ جن سے حدیث کی نہ صرف مستقل شان تشریع ہی قرآن سے الگ ہو کر ثابت ہوتی ہے بلکہ بظاہر بعض احکام کا قرآن سے علاقہ بھی ثابت نہیں ہوتا جو بظاہر حدیث کے بیانِ قرآن ہونے کے منافی اور سابقہ دعویٰ کے خلاف ہے جس میں تمام احادیث کے بیان قرآن ہونے کا ادعا کیا گیا تو جواب یہ ہے کہ یہ روایت اور یہ احکامِ حدیث بھی بیان قرآن ہونے سے نہیں نکل سکتے۔ کیوں کہ اس قسم کی روایات کے احکام گو جزوی طور پر کسی خاص آیت پر نظر نہ پڑیں مگر وہ کلی طور پر آیت کے ذیل کے بیان ثابت ہوں گے جسے قرآن نے ایک مستقل اصول کی حیثیت سے بیان فرمادیا ہے:

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔

"جو رسول لا کر دیں اس کو لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رُک جاؤ"۔

پس اس قسم کے تمام حکام جن کو اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے شروع فرمادیا ہے در حقیقت اس مذکرہ آیت کا بیان واقع ہو رہے ہیں جس میں رسولؐ کو خود احکام دینے کی ہدایت دی گئی ہے اور تشریع رسول کو تشریع الٰہی کے متوازی قرار دیا گیا ہے۔ گویا اوپر کی دو ذکر کردہ حدیثیں در حقیقت اس آیت کا بیان واقع ہو رہی ہیں۔ اور اس طرح حدیثِ نبویؐ کے دیئے ہوئے مستقل احکام سب اسی آیت کے نیچے آکر بیان قرآن ثابت ہو جائیں گے۔

چنانچہ سلف صالحینؒ اور صحابہ کرامؓ ایسے مستقل حدیثی احکام کو اسی آیت کی رو سے قرآنی احکام اور بیانِ قرآن کہتے ہیں۔

سیدنا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ایک بُڑھیا نے کہا کہ آپؓ گودھنے والی عورت پر لعنت کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں گودھنے کی ممانعت کہیں بھی نہیں ہے۔ فرمایا: کاش! تو قرآن پڑھی ہوتی؟ کیا قرآن میں یہ آیت نہیں ہے کہ "جو رسولؐ لا کر دیں اُسے لے لو اور جسے روکیں اس سے رُک جاؤ"۔

کہا۔ ہاں! یہ تو ہے۔

فرمایا کہ بس اسی کی رُو سے رسولؐ نے واشمہ (گودھنے والی) پر لعنت کی۔ اور اس فعل قبیح سے روکا۔ تو

یہ حکم رسولؐ اس آیت کا بیان ہو کر قرآنی حکم ہو گیا۔

یا جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار حرم مکہ میں بیٹھ کر علمی جوش میں فرمایا کہ آج میں ہر سوال کا جواب قرآن سے دوں گا تو کسی نے حرم میں قتل زنبور تتیامارنے، کا حکم پوچھا کہ قرآن میں کہاں ہے؟ جو امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ فرمایا آیت ما اتاکم الرسول سے۔ تو حکم رسولؐ کا ماننا واجب نکلا اور حدیث اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ میرے بعد ابو بکرؓ و عمرؓ کی اقتداء کرو، سے سیدنا حضرت ابو بکرؓ و سیدنا حضرت عمرؓ کے حکم کا ماننا واجب نکلا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

یقتل الزنبور فی الحرم

''حرم میں تتیا، بھڑ کی ماری جا سکتی ہے''

اس لئے یہ قتلِ زنبور کا حکم بیک واسطہ آیت ما اتاکم الرسول کا بیان ثابت ہو کر قرآنی حکم ثابت ہوا۔

بہر حال حدیث کی دو جہتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بیان قرآن ہونے کی، جو اس کے تفریعی ہونے کی دلیل ہے اور اس کے مستقل حجت ہونے کی جو مخفی رشتہ سے گو بیان قرآن بھی ہو مگر جلی طور پر وہ حکم رسولؐ اور حکم حدیث ہے۔ جو حجیت میں اس کے مماثل قرآن ہونے کی جہت ہے۔ اس لئے حدیث میں ان دو پہلوؤں کے لحاظ سے دو شانیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک اصل ہونے کی اور ایک فروع ہونے کی۔

سو وہ قرآن کے لحاظ سے تو فروع مانی جاوے گی کہ وہ اس کا بیان ہے اور تابع اصل ہوتا ہے اور اجتہادی فقہوں کے لحاظ سے اصل مانی جاوے گی کہ احکام اس سے ماخوذ بھی ہیں اور اس سے شرح شدہ بھی ہیں۔ اس طرح حدیث ایک برزخ کبریٰ ثابت ہوئی جو قرآن سے علم لیتی ہے۔ اور فقہ کو دیتی ہے۔ اگر حدیث درمیان میں نہ ہو تو فقہ کا کوئی جوڑ براہ راست قرآن سے نہیں لگ سکتا اور مفہوم بھی نہیں ہو سکتا۔

قرآن اور فقہ کے ساتھ حدیث کا ربط

اسی بناء پر امت میں حدیث نبوی کی جو اہمیت تسلیم کی گئی ہے وہ کسی علم کی نہیں۔ کیونکہ وہ قرآن کی تو تفسیر ہے اور فقہ کا متن ہے۔ اس لئے حدیث کے بغیر نہ قرآن حل ہو سکتا ہے نہ فقہ بن سکتا ہے اسلئے املاء حدیث کی مجلسیں اور حدیث سنانے کی محفلیں جس دھوم دھام سے اسلامی حلقوں میں منعقد ہوئیں دنیا کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی کہ اپنے رسول کے کلام کو اس تحفظ اور تیقظ کے ساتھ کسی قوم نے محفوظ کر دکھایا ہو۔ اور اس سے نوع بنوع مسائل اور شرائع اور علوم کا استنباط کیا ہو۔ حدیث کے بارے میں یہ دھوم دھام در حقیقت قرآن فہمی کی دھوم دھام تھی اور ساتھ ہی ساتھ فقہ سازی کی دھوم دھام بھی تھی۔ جو (فقہ) قرآن و حدیث کے اجمالات کی تفصیل اور کتاب و سنت کے تخم سے نکلا ہوا ایک شجرہ طیبہ ہے

جس کی جڑ قرآن ہے۔ بنیادی تنا اور ساق جس پر درخت کھڑا ہوا ہے حدیث ہے اور پھول پتیوں کا پھیلاؤ فقہ اور مستنبطات ہیں۔

سردست اس سے بحث نہیں کہ فقہی اور اجتہادی مسائل کی اسلام میں کیا نوعیت ہے؟ اور اس کا حکم کیا ہے؟ بلکہ صرف فقہ کے نشو و نما اور وجود پذیر ہونے کی نوعیت پر روشنی ڈالنی ہے کہ وہ حدیث کا نتیجہ اور قرآن کا ثمرہ ہے لیکن یہ نتیجہ اور ثمرہ بلا واسطہ حدیث وجود پذیر ہونا ممکن نہ تھا اس لئے حدیث دو بعید چیزوں کو باہم ملا دیتی ہے یعنی کلام مجتہدین کو کلام رب العالمین سے مربوط کر دیتی ہے۔

پس جس طرح اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان رسول واسطہ ہیں کہ ان کے بغیر بندے خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی طرح کلامِ خدا اور کلامِ اجتہاد و استنباط کے درمیان کلام رسولؐ واسطہ ہے کہ اس کے بغیر کلام عباد کو کلامِ خدا سے کوئی سند نہیں مل سکتی۔

اس لئے جو طبقہ بھی حدیث کو ترک کر دے گا نہ وہ قرآن تک پہنچ سکے گا، نہ فقہ تک۔ گویا اس کے ہاتھ میں دین کی کوئی بھی اصل اور حجت باقی نہ رہے گی اور وہ محض اپنے انسانی تخیلات کا بندہ ہوگا جنہیں اغواء شیطانی سے اس نے فرمانِ خداوندی سمجھ رکھا ہوگا۔ حالانکہ اس میں کلامِ خدا اور کلامِ رسول تو بجائے خود کلام فقہاء تک سمجھنے کی بھی اہلیت نہ ہوگی۔

سند میں کلام کی گنجائش اور حجّیتِ حدیث سے انکار:

بہر حال حدیث نبویؐ دین کے لئے حجت شرعی، تفریع مسائل کے لئے ماخذ اور قرآن کے لئے واضح ترین بیان اور شرح ہے۔ حدیث اپنے ثبوت کے لحاظ سے ظنی سہی مگر اپنی ذاتی نوعیت کے لحاظ سے قرآن کی طرح قطعی ہے۔ اس میں ظنیت اگر آئی ہے تو حدیث ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ سند کے سلسلے سے آئی ہے اگر یہی حدیثی حکم ہمیں بلا واسطہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالمشافہ دیتے تو اس کی اطاعت اسی طرح فرض تھی جس طرح قرآنی حکم کی۔

اس قطعیت میں اگر فرق پڑا ہے تو کلامِ رسولؐ ہونے کی جہت سے نہیں بلکہ درمیانی وسائط کی وجہ سے، جس سے اُس کا حکم رسول ہونا قابلِ غور ہوا کہ نہ حکم رسول کا ماننا قابل تامل ہوا کیونکہ اس کے ماننے کی قطعیت توما اتاکم الرسول سے ثابت شدہ ہے جس کا ماننا، قرآن کا ماننا اور جس سے انکار کرنا قرآن سے انکار کرنا ہے۔ نیز اس کی اطاعت بعینہٖ خدا کی اطاعت ہے۔

من اطاع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اس لئے اطاعت رسول سے انکار اطاعتِ خداوندی سے انکار ہے۔ جس سے دونوں کا ماننا قطعیت کے ساتھ فرض ٹھہرتا ہے اس لئے بحث حدیث کی نہیں بلکہ سند اور روایات کی ہے۔ پس اگر اس کی سند و روایت اسی نوعیت کی ہیں جو نوعیت قرآن کی روایت کی ہے تو بلا شبہ وہ حدیث مورث یقین بن جائے گی جیسے حدیث متواتر کہ اس کا ماننا فرض قطعی ہوگا اور اگر سند اور ثبوت میں

کسی شبہ کی گنجائش پیدا ہو جائے تو حدیث موجب ظن ہو گی۔ اس لئے اصولاً انکارِ حدیث یا انکارِ حجیت حدیث کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ سند میں کلام کرنے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ سو وہ حدیث یا حجیت حدیث کا انکار نہیں۔

اگر کوئی اس گنجائش کی وجہ سے حدیث سے انکاری ہے تو وہ دھوکہ میں ہے۔ کیونکہ اس گنجائش کا اثر زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ سند کے بارے میں چھان بین کی جائے اور جس درجہ کی سند ہو اسی درجہ کی حدیث سمجھی جائے۔ نہ یہ کہ حدیث یا اس کی حجیت سے انکار کر دیا جائے۔

پس اس سے حدیث کی حجت ہونے کے درجات یا اس کی حجت سے درجات متفاوت نکلیں گے۔ یعنی جس درجہ کی سند ہو گی اسی درجہ کی حدیث ہو گی۔ اگر سند حدیث کے رجال سب کے سب اصولِ فن کے لحاظ سے ثقہ اور عادل ضابط ہوں گے اور ساتھ ہی مسلسل اور متصل ہوں تو حدیث واجب القبول ہو جائے گی ورنہ اس درجہ کی نہ ہو گی۔

ظاہر ہے کہ سند میں کلام کی گنجائش ہونے کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ یہ حدیث قطعی نہیں یا ثابت نہیں نہ یہ کہ حدیث حجت نہیں یا کلام رسول حجت نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ راستہ کی خرابی کی وجہ سے اگر کوئی شخص منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے تو کہہ دے کہ منزل ہی غیر موجود یا معدوم ہو گئی۔ ایسے شخص کو مالیخولیا کا مریض کہہ کر پاگل خانے بھیجا جائے گا نہ کہ اس کی جوابدہی کی فکر کی جائے گی۔ اس لئے ضعف سند وغیرہ کی وجہ سے اصولاً انکارِ حدیث کی گنجائش نہیں نکلتی۔ زیادہ سے زیادہ اس سند خاص کے انکار کی گنجائش نکل آتی ہے جو اہل فن کی رائے میں مجروح ہو سو وہ انکارِ حدیث نہیں تنقید سند ہے۔

کلام رسول کے اثبات و تحفظ میں قرآن کا اہتمام

اس سے کبھی زیادہ دانشمندی یہ ہے کہ حدیث کا انکار قرآن کے سر رکھ کر کیا جائے حالانکہ قرآن اُسے بیان قرآن کہہ رہا ہے۔ اس بیان کو اہمیت دے رہا ہے۔ اس کے بارے میں خدائی ذمہ داری دکھلا رہا ہے اور پھر خدا ہی کی طرف سے اس ذمہ داری کو رسول کے سر عائد کر رہا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حدیث کے انکار کی گنجائش نہ تو اس کی سند کی وجہ سے ہو سکتی ہے، کیونکہ ضعف سند کی صورت میں زیادہ سے زیادہ گنجائش اس سند خاص کے انکار یا اس پر تنقید کی نکلتی ہے جسے انکارِ حدیث نہیں کہا جا سکتا، تنقید سند کہا جائے گا۔ ان دونوں کو ملا کر خلط ملط کر دینا عقل کے مختلط ہونے کی علامت ہے اور نہ ہی حدیث کے انکار کی گنجائش قرآن کی آڑ لے کر ہو سکتی ہے جبکہ قرآن اسے اپنا بیان کہہ کر اس کے ساتھ خدائی ذمہ داری دکھلا رہا ہے۔

بہر حال کلامِ رسول کے اثبات و تحفظ میں قرآن کا یہ اہتمام دیکھتے ہوئے اسی قرآن کو کلام رسول

کی نفی کی دلیل سمجھ لیا جانا مالیخولیا سے بھی کچھ آگے ہی کا درجہ رکھتا ہے۔ نیز اسی طرح حدیث کا انکار اس وجہ سے کیا جانا کہ اس میں درمیانی روایت کا واسطہ آ گیا ہے اس سے بھی زیادہ دانشمندی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اس مصنوعی اصول سے تو قرآن کا اقرار و تسلیم بھی باقی نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ بھی تو ہم تک بوسائط ہی پہنچا ہے۔ اسی طرح اگر اس وجہ سے حدیث کا انکار کیا جائے کہ اس کے رواۃ عدد یا کیفیت میں قرآن جیسے نہیں یعنی ایسے اور اتنے نہیں جیسے اور جتنے قرآن کے ہیں۔

سو اس کا حاصل بھی زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ چونکہ فلاں قسم حدیث کی سند جیسی نہیں اس لئے ہم اسے قرآن جیسا قطعی الثبوت نہیں مانتے نہ یہ کہ ہم جنس حدیث کو نہیں مانتے کیونکہ یہ عبارت کہ رواۃ ایسے اور اتنے نہیں تفاوت سند پر دلالت کرتی ہے نہ کہ انکارِ سند پر۔

بہر حال جنسِ حدیث کے انکار کے لئے کوئی اصولی راستہ نہیں نکلتا کہ منکرین حدیث اس کے ذریعہ راہ مفر اختیار کریں۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنسِ حدیث کے بیان قرآن ہونے سے تو ہمیں انکار نہیں جبکہ اس کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے لیکن اس جنس کی انواع و اقسام کی اور اس کے مشخص افراد کا ماننا ہمارے ذمہ ضروری نہیں جبکہ تشخیص کے ساتھ قرآن نے انواعِ حدیث کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی۔

لیکن اول تو یہ شبہ ہی مہمل ہے کیونکہ اگر قرآن کوئی اصلِ کلی بیان کر دے تو اس کی جزوی مثالوں اور فروعات کو اس کی تاریخ میں تلاش کرنا چاہئے نہ کہ خود اس کے اوراق میں، ورنہ وہ دستورِ اساسی کیا ہوگا اچھا خاصا بائی لاز ہو کر رہ جائے گا۔ جو اس کی شان کے منافی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن میں تو شرعیات کی بنیادیں ہی قائم کی گئی ہیں، ان کی جزئیات کو بھی اسی میں تلاش کرنا قانون اساسی کی وضع سے بے خبری بلکہ اس کے بارے میں بے حسی کی دلیل ہے۔ اس لئے جب جنسِ حدیث کو قرآن سے ثابت شدہ مان لیا گیا تو اس کی فروعات اور انواعِ اقسام کو بالاولیٰ ثابت مان لیا گیا۔ جبکہ فروعات جنس میں مدغم ہوتی ہیں اور ضمناً وہ بھی اصل کے ساتھ ثابت شدہ مانی جاتی ہیں اس لئے اصل کے اقرار کے بعد فروع کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

تعدادِ رواۃ کے اعتبار سے روایت کی چار قسمیں

البتہ اس سلسلہ میں ایک مطالبہ کسی حد تک جائز سمجھا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ جب قرآن نے جنس حدیث کو خود ثابت کیا اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی تو کم از کم اس اہم ترین اصول کی کوئی ایک آدھ مثال تو اسے دے دینی چاہئے تھی، جس سے حدیث کے تنوع اور تعددِ انواع کا جواز سمجھ میں آ جاتا جس سے آنے والوں کے لئے حدیث کے انقسام اور ان کی حد بندیوں کے لئے سندِ جواز مل جاتی۔

تو میں عرض کروں گا کہ قرآن نے کمال جامعیت کے ساتھ یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا ہے۔ اس نے نہ صرف انواعِ حدیث کی ایک آدھ مثال ہی دے دی ہے بلکہ سند اور رجال کے اعتبار سے حدیث کی بنیادی قسموں پر بھی کافی روشنی ڈال دی ہے جس سے راویوں کی تعداد اور ان کے اوصاف کے لحاظ سے حدیث کا مقام بھی متعین ہو جاتا ہے۔ اور اقسام کی طرف بھی راہ نمائی ہو جاتی ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے پہلے اس پر غور کیا جائے کہ محدثین نے حدیث کی بنیادی تقسیم کیا کی ہے جس سے بقیہ اقسامِ حدیث شاخوں کی طرح شاخ در شاخ ہو کر نکلتی گئی ہیں۔ سو حصرِ عقلی کے ساتھ تعدادِ رواۃ کے اعتبار سے روایت کی چار ہی قسمیں ہو سکتی ہیں جنہیں محدثین نے فنِ مصطلحات الحدیث میں اولیت کا درجہ دیا ہے۔

خبرِ غریب:

ایک یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہم تک کسی حدیث کی روایت ایک ایک راوی سے ہو آ رہی ہو۔ اگر درمیان میں راوی کہیں ایک سے زائد بھی ہو جائیں تب بھی اسے ایک ہی ایک راوی کی روایت شمار کیا جائے گا۔ اس حدیث کا نام محدثین کی اصطلاح میں خبرِ غریب یا خبرِ فرد ہے۔

ایسی روایت سے گو قطعی یقین حاصل نہ ہو لیکن ظن ضرور پیدا ہو جاتا ہے جس کا دین و دنیا کے تمام معاملات میں قطعی طور پر اعتبار کیا گیا ہے۔ اور ایسی خبر نہ صرف یہ کہ رد نہیں کی جا سکتی بلکہ اس پر ہزارہا دینوی واخروی معاملات کا فیصلہ کر دیا جانا ایک مسلّمہ اور مروّجہ حقیقت ہے۔ البتہ اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ وہ راوی ثقہ اور قابلِ اعتماد ہوں اور ان کے حفظ و عدالت پر کوئی تہمت نہ ہو۔

خبرِ عزیز:

دوسری صورت یہ ہے کہ پیغمبر سے لے کر ہم تک کسی روایت کو دو دو ثقہ اور عادل آدمی روایت کرتے آ رہے ہیں۔ خواہ درمیان میں کہیں رواۃ کا عدد دو سے بڑھ بھی جائے۔ مگر وہ دو دو ہی کی روایت شمار ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر پہلی روایت سے قوتِ سند کے لحاظ سے بڑھی ہوئی ہو گی اور اس لئے اگر یہ پہلی روایت صرف ظن کا فائدہ دیتی تھی تو یہ غلبہ ظن کا فائدہ دے گی اور وہ معاملات میں پہلے سے زیادہ قوی حجت سمجھی جائے گی۔ ایسی خبر کو محدثین کی اصطلاح میں خبرِ عزیز کہتے ہیں۔

خبرِ مشہور:

تیسری صورت یہ ہے کہ اوپر سے نیچے تک کسی روایت کو کم از کم تین تین ثقہ آدمی روایت کرتے آ رہے ہوں۔ گو بیچ میں اس سے زیادہ بھی ہو جائیں۔ مگر یہ روایت تین ہی تین آدمی کی شمار ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت دوسری روایت سے کہیں زیادہ قوی اور معاملات میں قوی ترین حجت شمار ہو گی۔ جس کا انکار عادت وعرف میں صریح مکابرہ اور جحود سمجھا جائے گا۔ اس کبر سے نہ صرف غلبہ ظن بلکہ فی الجملہ یقین پیدا

ہو جائے گا۔ گو ضابطہ قضا میں وہ یقین نہ کہلائے لیکن دیانتاً اسے یقین کہتے ہیں کوئی جھجک محسوس نہیں کی جائے گی۔ ایسی خبر کو محدثین کی اصطلاح میں خبر مشہور کہتے ہیں۔

خبر متواتر:

چوتھی صورت یہ ہے کہ اوپر سے نیچے تک کسی روایت کو تین اور چار کی قید سے بالاتر ہو کر اتنے ثقہ اور عادل افراد روایت کرتے آرہے ہوں جن کا جھوٹ پر جمع ہو جانا عادتاً محال ہو اور کسی دور میں بھی چار سے کم نہ ہوں خواہ زائد ہو جائیں اور زائد کی کوئی حد مقرر نہیں۔

تو یہ روایت تیسری نوعِ روایت سے بدرجہا مضبوط اور قوت واعتبار میں انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہوگی اور اس سے نہ صرف دیانتاً ہی یقین حاصل ہو جائے گا بلکہ وہ یقین پیدا ہوگا جسے عرفِ عام اور ضابطہ و قانون میں بھی یقین ہی کہا جائے گا۔ اور کسی حالت میں بھی اس کا ردّ وانکار جائز نہ ہوگا۔ بلکہ وہ حجتِ قطعیہ سمجھی جائے گی اس کا نام اصطلاحِ محدثین میں خبر متواتر ہے۔

تواتر کے اقسام و درجات:

اب اگر تواتر افراد سے گزر کر طبقات اور بڑی بڑی جماعتوں تک پہنچ جائے اور کسی روایت کو ہر دور میں ایک جمِ غفیر اور جماعتیں کی جماعتیں روایت کرتی آرہی ہوں تو ظاہر ہے کہ تواتر کی قوت میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو جائے گا۔ تاہم جنسِ تواتر ایک ہی رہے گی۔

اس جنس کی ان دو قسموں کے اصطلاحی نام حضرت الاستاذ الاکبر علامہ انور شاہ صاحب قدس سرہٗ نے تجویز فرمائے تھے۔ تواتر کی ابتدائی قسم کا نام تواتر سندی اور دوسری قسم کا نام تواتر قرنی وضع فرمایا تھا۔ پس قرآنِ کریم کی روایت تواتر قرنی ہے۔

بہر حال متواتر روایت میں کسی ادنیٰ شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ایسی خبر کا منکر زبانِ خلق پر مطعون یا مجنون کہلائے گا۔ کیونکہ یہ متواتر روایت گویا زبانِ حق ہوگی جو زبانِ خلق سے کام کرے گا۔ اس لئے اس خبر کو گویا خدا کی خبر اور خدائی نقل وروایت کہا جائے گا جسے جھٹلانے کی کوئی اصولی صورت ممکن نہ ہوگی۔ کیونکہ اس خبر کا محافظ خود خدا ہوگا نہ کہ مخلوق۔

بہر حال روایت کے سلسلے میں ایک سے لے کر چار تک حصر عقلی کے ساتھ یہ چار ہی صورتیں نکل سکتی ہیں جن میں راویوں کے لحاظ سے ہر زائد عدد والی روایت کم عدد والی روایت سے مضبوط اور محکم ہوگی اور اسی حد تک اس کی حجت اور اعتبار کا درجہ بڑھتا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر روایت جس قدر بھی فرد سے گزر کر جماعت کی حد میں آتی جائے گی اسی قدر ظن سے یقین اور یقین سے کمالِ یقین کی طرف بڑھتی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے ایک عدد سے گزر کر دو کے عدد کو جماعت تسلیم کیا ہے۔

فرمایا گیا کہ:

"الاثنان وما فوقهما جماعة"

"دو اور دو سے زیادہ جماعت ہے"

چنانچہ نماز میں اگر دو بھی جمع ہو جائیں تو شرعاً وہ نماز جماعت کہلائے گی۔ اور تین ہو جائیں تو جماعت معہ ہو جائے گی۔ گویا تین افراد کا مجموعہ شرعاً معتد بہ ہے۔ پس جماعت کی حد ایک کے بعد ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اگر عدد تین سے بھی بڑھ جائے۔ مثلاً چار یا اس سے زائد افراد اکٹھے ہو جائیں تو وہ جماعتِ کبیرہ کے حکم میں آ جائے گی۔ جس سے جمعہ بھی ادا کیا جا سکے گا۔ جس کا موضوع ہی شرعی جامعیت اور اجتماعیت ہے۔ جیسا کہ لفظ جمع اور اس کے مادہ (جمع) سے ظاہر ہے۔ پھر یہ جماعتِ کبیرہ اگر ثقہ اور عادل لوگوں پر مشتمل ہو جن کا ایک ایک فرد ثقت وعدالت کا مجسمہ ہو۔ گویا ایک ایک امت اور جماعت کے حکم میں ہو جیسے ان ابراهيم كان امة۔ تو یہ جماعت ایک جماعتِ عظیمہ کے حکم میں ہو گی۔ جس کی کہی ہوئی بات قطعیت کے انتہائی مقام اور یقین کے اعلیٰ ترین درجہ پر سمجھی جائے گی جس سے زیادہ یقین آور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف اصطلاحاً بلکہ اصولاً اور فطرتاً اس سے قلوب اطمینان کی ٹھنڈک محسوس کریں گے۔

پس جماعت کی حد ایک کے بعد ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور چار پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ آگے اگر درجہ ہے تو کمالِ جماعت کا ہے نہ کہ اصلِ جماعت کا۔ اسلئے تعددِ روایت کے سلسلہ میں اعتماد، یقین اور اطمینان اور اعتبار کا قصہ بھی کم از کم چار پر پہنچ کر پورا ہو جاتا ہے۔ آگے یقین و اطمینان میں اضافہ کے درجات آتے رہیں گے۔ لیکن نفس یقین کا سرچشمہ چار ہی کا عدد رہے گا۔ بشرطیکہ راوی ثقہ اور عادل ہوں۔ اس لئے راویوں کے عدد کے لحاظ سے روایت کی چار قسمیں حصر عقلی کے ساتھ نکلتی ہیں۔ جو خبر غریب، خبر عزیز، خبر مشہور اور خبر متواتر کے نام سے محدثین کے یہاں معروف ہیں۔

خبر متواتر اور اس کی حجیت:

تدبر کیا جائے تو قرآن حکیم نے جنس حدیث کے اثبات کے ساتھ روایت کی۔ ان چاروں قسموں کی بنیادیں بھی خود ہی قائم کر دی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے خبر متواتر اور اس کی حجیت کا ثبوت تو خود قرآن کریم کی ذات ہی ہے جس کی روایت کا طریقہ ہی تواتر ہے جس سے وہ زمانہ نبوی سے ہم تک منقول ہوتا ہوا آ رہا ہے۔ گویا قرآن کی روایت ہی تواتر کا وجود ہے۔ اگر تواتر سے انکار کر دیا جائے تو قرآن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ جو قرآن اور اس کی حجیت کو تواتر کی بناء پر تسلیم کرلے گا اسے خبر متواتر اور اس کی حجیت کو بھی قطعی طور پر تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ قرآن کی حجیت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کیونکہ جو تواتر قرآن کی حجت ماننے کا موجب ہوا ہے وہی تواتر حدیث، متواتر میں بھی موجود ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسے حجت نہ مانا جائے اور کوئی وجہ نہیں کہ علت تو دونوں جگہ مشترک ہو اور حکم الگ الگ ہو جائے۔

یہ صحیح کہ قرآن کا تواتر بہت اونچا اور ایک خاص تواتر یعنی تواتر قرن ہے۔ جس کا مقابلہ عام تواتر نہیں کر سکتا۔ لیکن اس فرق کا ثمرہ زیادہ سے زیادہ فرق مراتب نکلے گا نہ کہ نفس تواتر کا انکار۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ قرآن کریم کے تواتر سے اگر، کمال یقین حاصل ہو جس کا درجہ اونچا ہے۔ تو نفس تواتر سے یقین حاصل ہو۔ نہ یہ کہ نفس تواتر غیر معتبر ہو جائے۔

پس کمال تواتر کا ثمرہ قوت یقین ہے نہ کہ اصل تواتر اور اس کا ثمرہ (نفس یقین) کا انکار جو لوگ قرآن کے اعلیٰ ترین تواتر کو سامنے رکھ کر حدیث متواتر کی حجیت کے بھی قائل نہیں اور یا پھر حدیث متواتر کے انکار متواتر جھوٹے ہیں کیونکہ کمال تواتر میں بہر حال نفس تواتر بھی تو موجود ہے اور کمال یقین میں بلا شبہ اصل یقین بھی مضمر ہے۔

پس کمال تواتر کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ نفس تواتر میں اضافہ ہو جائے۔ ایسے ہی کمالِ یقین کی حقیقت اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ اصل یقین میں زیادتی ہو جائے اور کوئی شخص بھی اضافہ تک بغیر اصل سے گزرے ہوئے نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے زیادہ کا قائل در حقیقت اصل کا بھی قائل ہے جو اس زیادہ میں مضمر ہے۔

اندریں صورت اضافہ کو سامنے رکھ کر اصل کا انکار کر دینا در حقیقت اضافہ سے بھی انکار ہے۔ ورنہ بغیر اصل کے یہ اضافہ آخر آیا کہاں سے؟ اور یہ منکر اس تک پہنچا کیسے؟ پھر بھی اگر وہ اضافہ کا نام لے کر اصل کا انکار ہی کرتا رہے، تو اس کی مثال ایسی ہی ہو گی کہ جیسے کوئی نیچے کی منزل منہدم کر کے اوپر کی منزل پر رہنے کا دعویٰ کرے۔

سو جیسے یہ شخص عقلاء کے نزدیک جھوٹا اور دروغ گو شمار ہوگا ایسے ہی وہ شخص بھی جھوٹا شمار ہوگا جو قرآن متواتر کی حجیت کو تواتر کی بناء پر مان کر حدیث متواتر کی حجیت کا انکار کرنے لگے۔ کیونکہ خبر متواتر ہی کا تو یہ تواتر ہے جس پر اضافہ ہو کر قرآن کا کمال رونما ہوا ہے۔ بہر حال خبر متواتر اور اس کی حجیت کا ثبوت خود عین قرآن اور اس کی روایت ہے۔

قرآن سے مطلق روایت وخبر کا ثبوت:

بلکہ اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم کی روایت سے صرف خبر متواتر ہی کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ نفس روایت وخبر کے معتبر ہونے کا ثبوت بھی بآسانی نکل آتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی روایت ظاہر ہے کہ روایت متواترہ ہے اور روایت متواترہ ایک قسم ہے نفس روایت کی۔ گویا نفس روایت وخبر مقسم کا درجہ ہے اور خبر متواتر اس کی ایک قسم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قسم کو مان کر مقسم کا انکار یا قسم کو معتبر مان کر مقسم غیر معتبر ہونے کا اقرار ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی مقید مان کر مطلق کا انکار کر دے یا خاص مان کر عام کا انکار کر دے۔

حالانکہ مقید بن ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ مطلق نہ ہو اور خاص بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ عام نہ ہو۔ اس لئے قرآن کی روایت خاص یعنی متواتر کا اقرار کر کے آدمی مطلق روایت کے اقرار سے کبھی بچ ہی نہیں سکتا جبکہ یہ مطلق روایت اس مقید میں موجود ہے اور خبر متواتر کے معتبر ہونے کو مان کر نفس خبر و روایت کے معتبر ماننے سے کبھی گریز کر ہی نہیں سکتا جبکہ متواتر کے اعتبار میں نفس روایت کا اعتبار بھی آیا ہوا ہے۔ اس لئے قرآن کے طریق روایت سے محض خبر متواتر ہی کا ثبوت نہیں ہوتا۔ جو قسم کا مرتبہ ہے بلکہ مطلق خبر کے معتبر ہونے کا بھی ثبوت ہو جاتا ہے جو مقسم کا مرتبہ ہے۔ جس کے معنی یہ نکلے کہ اصولاً نفسِ روایت اپنی اقسام کے ذیل میں حسبِ مراتب خود بلا شبہ معتبر اور واجب التسلیم ہے خواہ وہ قرآن کی روایت ہو یا غیر قرآن کی۔

اس لئے حدیث کی روایت کا معتبر ماننا قرآن کو معتبر ماننے کے بعد ضروری ہو جاتا ہے۔ البتہ دونوں کی روایت کے درجات و مراتب کی قدر ان کے احکام کے مراتب و درجات کے فرق سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر اصل کے انکار کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

منکرینِ حدیث کے لئے دو۲ راستے

اس لئے منکرین کے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا وہ سرے سے نقل و روایت کا انکار کر دیں اور کھل کر حدیث کے ساتھ قرآن کے بھی منکر ہو جائیں۔ لیکن اگر وہ قرآن کی روایت کو مانیں تو اس ضمن میں نفس روایت کو مان کر روایت حدیث کا ماننا بھی اُن کے سر عائد ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن کو مان کر حدیث کا انکار کر دیں ورنہ وہ نفس روایت کے ہی منکر کہلائیں گے۔

ثبوتِ قرآن سے خبر متواتر کا ثبوت:

مزید غور کیا جائے تو روایتِ متواترہ کا ثبوت قرآن کی روایت ہی کو سامنے رکھنے پر موقوف نہیں بلکہ مطلقاً قرآن کے ثبوت سے بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قرآن کی روایت ہی سے اس کا ثبوت پیش کیا جائے کیونکہ قرآن کو حجت مان کر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قرآن کا قرآن ہونا آخر ہمیں کیسے معلوم ہوا؟ اگر خود قرآن ہی سے معلوم ہوا تو درحالیکہ ابھی تک خود قرآن کا قرآن ہونا ہی ثابت شدہ نہ ہو قرآن سے کسی چیز کا ثبوت کیسے ہو سکتا ہے؟ جسے تقدمِ شئی علی نفسہ کہتے ہیں۔ لا محالہ غیر قرآن ہی سے قرآن کا ہونا معلوم ہو سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ غیر قرآن بجز پیغمبر علیہ السلام کی خبر کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ جو منقول ہو کر بلا کم و کاست ہم تک پہنچے اور اسی کا نام حدیث ہے۔ اس لئے قرآن کا قرآن ہونا خود حدیث پر موقوف نکلا۔

اندریں صورت یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن تو واجب التسلیم ہو اور حدیث نہ ہو ورنہ خود قرآن کا

ثبوت اور وجود بھی ممکن نہ رہے گا۔

خبر متواتر کی قطعیت کا ثبوت:

ساتھ ہی یہ کہ جس خبر سے ہم کو قرآن جیسی قطعی یقینی اور اہم ترین کتاب کا علم ہو وہ خبر بھی قطعیت میں قرآن سے کم نہ ہونی چاہئے ورنہ اگر وہی ظنی ہو تو قرآن کا ثبوت قطعی نہ رہے گا بلکہ ظنی ہو جائے گا جس کے انکار سے نہ کفر عائد ہوگا نہ اس پر ایمان لانا فرض قطعی رہے گا جس سے ایمان کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اس لئے اس خبر کا قطعی اور انتہائی طور پر موجبِ یقین ہونا ضروری ہے اور ایسی خبر بجز متواتر کے دوسری نہیں ہو سکتی۔

اس لئے قرآن کے ثبوت سے پہلے مگر قرآن کی نسبت کے ساتھ نہ صرف جنسِ حدیث ہی کا ثبوت ہاتھ لگا جو جنس اور مقسم کا مرتبہ ہے بلکہ اس کی ایک قسم خاص خبر متواتر کا ثبوت بھی نکل آیا۔ اس لئے قرآن کو قرآن کہنے والا تو کم سے کم نفسِ حدیث اور اس کی ایک قسم کو متواتر کا کبھی انکار نہیں کر سکتا ورنہ وہ تسلیم قرآن کے دعوے میں بھی جھوٹا اور منافق شمار کیا جائے گا۔ ہاں! قرآن ہی کا کوئی کھلے بندوں انکار کرنے لگے تو ہمیں اس تحریر میں اس سے تعرض کرنا نہیں۔ کیونکہ منکر قرآن کا جواب دوسرا ہے جس سے یہاں بحث نہیں۔

بہر حال قرآن کو کسی بھی جہت سے مانا جائے کم از کم حدیث کا متواتر ماننا ضروری ہو جائے گا جس کے لئے قرآن کی روایت بھی ایک مستقل ثبوت ہے اور خود عین قرآن کے اقرار کی نسبت بھی ایک مستقل ثبوت ہے جس کے ضمن میں نفسِ حدیث کا ثبوت بھی خود بخود آجاتا ہے۔ اس لئے خبر متواتر کا ثبوت تو قرآن حکیم سے بحمد اللہ تعالیٰ مل گیا۔

خبرِ مشہور، خبرِ عزیز اور خبرِ غریب قرآن کی روشنی میں

اب حدیث کی بقیہ تین قسموں مشہور، عزیز اور غریب پر قرآن کی روشنی میں غور کیجئے۔ سو خبر مشہور جو کم از کم تین ثقہ راویوں کی روایت سے منقول ہو، اس کا اس کی حجیت کا ثبوت بھی ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔ قرآن حکیم نے اصحاب القریہ کے بارے میں فرمایا جو سورہ یٰسین شریف میں ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْجَاءَ هَا الْمُرْسَلُوْنَ اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْا اِنَّا اِلَيْكُمْ مُرْسَلُوْنَ.

"یاد کرو گاؤں والوں کی مثال جبکہ ان کے پاس رسول آئے جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے، تو انہوں نے انہیں جھٹلا دیا تو ہم نے تیسرے سے قوت دی اور (ان تینوں) نے کہا کہ

ہم تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں"۔

اس سے واضح ہے کہ دو کی تکذیب کر دینے پر تیسرے کا اضافہ اصولاً اس وجہ سے تھا کہ عادتاً تین ثقہ اور عادل افراد کو جھٹلانا فطرت انسانی کے خلاف اور اس سے گاؤں والوں پر خدا کی حجت تمام ہو جائے گی۔ کیونکہ تین آدمی کا مجموعہ جماعت کہاتا ہے اور عادتاً نہ تو تین افراد کی جماعت اور وہ بھی نیک اور پارسا لوگوں کی، مل کر جھوٹ بول سکتی ہے اور نہ ہی اسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں نقل اور روایت کے سلسلے میں تین کا عدد پیشِ نظر ہے۔ رسالت کا وصف پیشِ نظر نہیں۔ کیونکہ رسول تو ایک بھی ثقاہت وعدالت اور صدق وامانت میں ساری دنیا سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اگر گاؤں والوں کو رسالت کی عظمت پیشِ نظر ہوتی تو وہ ایک رسول کی بھی تکذیب کی جرأت نہ کرتے اور کرتے تو وہ خود ہی غیر معتبر ٹھہر جاتے۔ رسولوں کے عدد میں بلحاظ وصف رسالت اضافہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن ان پر قانونی حجت تمام کرنی تھی، تو آخر کار تین کا عدد مکمل کر کے رسالت ان تک پہنچوائی گئی کہ دنیا کے عام اصول پر تین سچے انسانوں کی خبر کسی طرح بھی قابلِ رد شمار نہیں کی جاتی۔

اس سے یہ اصول واضح ہو جاتا ہے کہ اگر تین تین کی روایت سے کوئی خبر روایت ہوتی ہوئی ہم تک پہنچے تو قرآن کی رو سے بلحاظ روایت وہ ہرگز رد نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس سے نہ صرف غلبہ ظن بلکہ دیانتاً یقین حاصل ہو جاتا ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی اور جبکہ یہی نوعیت خبر مشہور کی ہے۔ تو قرآن کریم سے خبر مشہور اور اس کی حجیت کا ثبوت مل جاتا ہے۔

اندریں صورت خبر مشہور کے ثبوت اور اس کی حجیت کا منکر درحقیقت قرآن کے اس اصول اور آیت بالا کا منکر ہے جس کو منکرِ قرآن کہا جائے گا۔

اسی طرح خبر عزیز جس کی روایت دو ثقہ راوی کریں، قرآن حکیم سے ثابت اور معاملات میں ازروئے قرآن حجت ہے۔

ارشاد قرآنی ہے:

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ

"اور گواہ بناؤ، دو عدل والوں کو اپنے میں سے اور لوجہ اللہ شہادت قائم کرو"۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ دو شہادت محض معتبر ہی نہیں بلکہ حجت بھی ہے جس پر دین اور دنیا کے ہزارہا جانی، مالی، اخلاقی اور ما بینی معاملات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ حتی کہ قضائے قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے۔ یہ شہادت ظاہر ہے کہ روایت ہے۔ اس روایت کا نام شہادت تعارف کے طور پر اس لئے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ سرکاری طور پر کسی مقدمے یا خصومت میں قاضی یا مجسٹریٹ یا ثالث و سرپنچ کے سامنے دی جاتی ہے جس سے اس میں سرکاری اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ وہی روایت ہے جو عدالت کے کمرے کے باہر روایت کے

نام سے موسوم ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نام یا نسبت کے فرق سے ایک سرکاری خبر ہے اور ایک نجی۔ یا ایک اطلاع قضاء ہے اور ایک دیانتاً خبر کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر یہی شاہد عدالت کے کمرے سے باہر نکل کر یہی روایت پبلک کے سامنے بیان کرے تو تبدیلیٔ نام ونسب کے سوا اور فرق ہی کیا ہوگا۔

بس اب اسے شہادت کے بجائے روایت کہنے لگیں گے۔ لیکن خبر اور مخبر کی حقیقت وہی رہے گی جو عدالت کے کمرہ میں تھی اس لئے شہادت کی تمام شرائط در حقیقت روایت کی شرائط ہیں۔ پس جیسے شہادت بلاواسطہ ہو تو اس کا عینی ہونا ضروری ہے کہ شاہد اپنا مشاہدہ یا سماع بیان کرے۔ ایسے ہی روایت میں بھی راویٔ اول کے لئے بھی یہی شرط ہے کہ روایت کردہ واقعہ اس کا چشم دید یا براہِ راست خود شنید ہو۔

پھر جیسے روایت بالواسطہ بھی ہوتی ہے ایسے ہی شہادت بھی بالواسطہ ہو سکتی ہے جسے شہادت علی الشہادت کہتے ہیں اور جیسے ان وسائط کی شہادت کیلئے ضروری ہے کہ جس پر شہادت کی انتہا ہو وہ اپنا چشم دیدیا خود شنید واقعہ بیان کرے۔ ایسے ہی روایت کی سند کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی انتہا جس پر ہونی چاہئے کہ راویٔ اول اپنا مشاہدہ یا سماع نقل کرے۔ پھر ثقہ اور اعتماد کی جو شرائط شاہد کے لئے ہیں وہی شرائط راوی کے لئے بھی ہیں جن کی تفصیلات فن میں مدوّن ہیں۔

غرض شہادت اور روایت ایک ہی چیز ہے۔ اس لئے اگر شہادت شرعاً حجت ہے تو بلاشبہ روایت بھی حجت ہے۔ فرق ہے تو قضا اور دیانت کا ہے نہ کہ اصل خبر کا۔

پس قرآن کریم نے آیت بالا میں دو آدمی کی شہادت کو معتبر اور حجت مان کر در حقیقت دو کی روایت کے معتبر اور حجت ہونے کا اعلان کیا ہے۔ پس اگر یہ دو کی روایت عدالت جیسی اہم جگہ میں قانوناً معتبر ہے جس میں سیاسی اہمیت بھی موجود ہے تو انہی دو کی روایت عدالت سے باہر دیانات کے حلقوں میں جہاں وہ سیاسی اہمیت بھی نہیں ہے دیانتاً کیوں معتبر اور حجت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی بلکہ اسے درجہ اولیٰ معتبر اور حجت ہونا چاہئے۔ اس لئے دو دو کی روایت کے معتبر اور واجب التسلیم ہونے کا ماخذ بھی قرآن حکیم ثابت ہوا جس کا نام خبر عزیز تھا اور واضح ہوا کہ خبر عزیز اور اسکی حجیت کا منکر در حقیقت آیت بالا کا منکر ہے۔ جسے منکر قرآن کہا جائے گا رہی خبر غریب جسے خبر فرد بھی کہا جاتا ہے اور جسے ایک ایک آدمی روایت کرے۔ سو قرآن حکیم کی ایک نہیں بیسیوں آیتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اس کی حجیت پر روشنی پڑتی ہے۔

روایت اور اس کی حجیت

اول تو سارے انبیا کے پاس تن تنہا سیدنا حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کا وحی لے کر آنا اور خدا کی خبروں کی روایت کرنا ہی خبر فرد کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی کی خبر ہوتی تھی۔ آخر

میں سیدنا حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور ﷺ تک پورا پورا قرآن روایت کیا۔ یہ خبر فرد نہ تھی۔ حق تعالٰی نے اسی کو فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ

"(یہ قرآن) قول ہے ایک رسول کریم (جبریلؑ) کا"۔

جس سے واضح ہے کہ قرآن کے راوی اول سیدنا حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں جنہوں نے تن تنہا سارا قرآن حضور ﷺ تک پہنچایا۔ قرآن نے اس روایت کے بارے میں آیت بالا میں تصریح کی کہ وہ روایت جبریلی تھی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن کی روایت اور خبر فرد ان کے فرشتہ ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم نہیں ہوئی بلکہ اس لئے کہ ان میں راویوں کے تمام محاسن روایت جمع تھے اور تمام مطاعن روایت منفی تھے جو روایت کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ جیسا کہ رسول کریمؑ ذی قوۃ وغیرہ کے اوصاف سے واضح ہے اور آئندہ اس کی شرح آتی ہے۔

بہر حال یہ مقدس راوی کتنے بھی اوصافِ قدسیہ سے متصف ہو لیکن یہ خبر بہر حال فرد ہی کی رہے گی جسے ایک شخصیت نے روایت کیا۔ جس سے خبر فرد کا ثبوت اور اس کی حجیت نص قرآنی سے عیاں ہو جاتی ہے اور جب جبرائیل علیہ السلام کی یہ اخبارِ غیبیہ صرف زمانہ نبویؐ ہی تک محدود نہیں بلکہ زمانۂ آدمؑ سے تا زمانہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ اسی ایک فرد کی خبر پر سارے ادیان اور ساری شرائع کا دارومدار ہے جس سے خبر فرد کا نہ صرف ثبوت بلکہ اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ادیان اور شرائع کا دارومدار ہی خبر فرد پر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آغاز ادیان کے وقت یہ اہمیت نہ خبر عزیز کو حاصل ہوتی ہے نہ مشہور و متواتر کو۔ اس لئے خبر کی کوئی قسم معتبر ہو یا نہ ہو، مگر خبر فرد بالضرور معتبر ماننی پڑے گی۔ ورنہ تمام ادیان و شرائع کی بنیاد ہی معاذ اللہ منہدم ہو جائے گی۔

ممکن ہے کہ اس ثبوت میں یہ خدشہ ظاہر کیا جائے کہ گفتگو ہے انسانوں کی خبر فرد میں اور نظیر لائی جا رہی ہے۔ فرشتوں کی خبر فرد سے۔ حالانکہ کسی جنس کے لئے نظیر ہم جنس ہی کی معتبر ہوتی ہے اور یہاں انسان اور فرشتہ میں کوئی جنسی اشتراک نہیں، تو پھر ایک نوع کی نظیر دوسری نوع پر کیسے حجت ہو سکتی ہے۔

گو یہ شبہ قابلِ التفات نہیں جبکہ خبر کی نوعیت دونوں جگہ ایک ہے خواہ وہ فرد انسان ہو یا فرشتہ۔ یہاں فرق اگر ہے تو راویوں کی جنس کا ہے نہ کہ روایت کی جنس کا روایات اور اوصاف روایت کی نوعیت دونوں جگہ یکساں ہے۔ اسلئے کہ تفاوتِ جنس روایت کے ثبوت میں کیا خلل آ سکتا ہے یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک راوی چین کا ہو اور ایک عرب کا ایک مشرق کا ہو ایک مغرب کا۔ مگر جب کہ وہ اصول روایت کے مطابق روایت کریں تو ان کے وطنوں اور رنگوں کے فرق سے روایت میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ ایسے ہی کسی خبر فرد کے راوی آسمان کے باشندے ہوں یا زمین کے بسنے والے، مگر روایت کے تمام اصول و قوانین کی رعایت سے روایت

کریں تو اس زمین کے باشندوں کے لئے بطورِ نظیر پیش کئے جانے میں آخر اشکال کیا ہو سکتا ہے؟ پھر اچھے اوصاف کا سر چشمہ بہر حال ملائکہ ہی ہیں اور انسانوں کو ان کی ملکیت سے استفادہ کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ کہاں فرشتہ سے اس کی ذات کا استفادہ منظور نہیں کہ آدمی فرشتہ ہو جائے بلکہ فرشتہ کے اوصاف سے یا استفادہ مطلوب ہے جو باوجود اختلافِ جنس کے مطلوب ہے اور نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے۔ چنانچہ مثالوں میں کہا جاتا ہے کہ فلاں انسان پر ملکیت کا غلبہ ہے۔ گویا بشر کے لئے ملائکہ کی اخلاقی نظریں حجت ہو سکتی ہیں اور اوصاف میں یہ اشتراک جنسوں کے اختلاف کے باوجود بھی ہو سکتا ہے اور روایت کے بارے میں ملائکہ کے اوصاف روایت انسانوں کے حق میں کیوں نا قابلِ اعتبار اور نا قابلِ قیاس ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ مذکورہ شبہ اصولاً مہمل ہے۔

ہر امت کے پاس ایک ہی ہادی آیا

تاہم اس بحث سے الگ ہو کر جبکہ مقصود مخاطبوں کو اطمینان دہانی ہے تو ہم روایت فرد کے بارے میں ملکی نظیر سے ہٹ کر بشری نظیر بھی قرآن کریم ہی سے پیش کئے دیتے ہیں۔ ہم نے سابق میں خبر مشہور کے بارے میں تین پیغمبروں کی جماعتی خبر سے استدلال کرتے ہوئے خبر مشہور کا قرآن کریم سے ثبوت پیش کیا تھا۔ اس لئے خبر فرد کے بارے میں تن تنہا ایک پیغمبر کی خبر یقیناً خبر فرد کے ثبوت کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

سو کون نہیں جانتا کہ امت کو پیغمبر سے جو خبر ملتی ہے وہ ایک ہی کی ہوتی ہے۔ یہ تو صرف اصحاب القریہ ہی کی خصوصیت تھی کہ ان کے پاس اکٹھے تین پیغمبر بھیج دئے گئے جنہوں نے جماعتی طور پر پیغامِ الٰہی پہنچایا۔ ورنہ ہر امت کے پاس امت کا ایک ہی ہادی و نذیر آیا اور اس ایک ہی نے خدائے برتر کی طرف سے خبریں دیں۔

سیدنا حضرت نوح، سیدنا حضرت ابراہیم، سیدنا حضرت موسیٰ، سیدنا حضرت عیسیٰ، سیدنا حضرت ہود، سیدنا حضرت صالح وغیر ہم علیہم الصلوٰۃ والسلام تنہا تنہا ہی اپنی امتوں کی طرف مبعوث ہوئے اور ایک ہی ایک نے خدائی دین کی نقل و روایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے سامنے پیش کی۔ یہ خبر فرد نہیں تھی تو اور کیا تھی؟

اس لئے قرآن نے جتنے بھی پیغمبروں کی دعوت کا ذکر کیا ہے وہ در حقیقت خبر فرد ہی کا ذکر ہے۔ جہاں جہاں بھی اذ قال لھم نوح. اذ قال لھم ھود. اذ قال لھم لوط۔ وغیرہ کے کلمات وارد ہوئے اور وہ حجت تھے تو یقیناً یہ خبر فرد ہی کی حجیت اور اس کے واجب التسلیم ہونے کا زبردست ثبوت ہے جو قرآن کی بیسیوں آیتوں میں پھیلا ہوا ہے۔

پس خبر عزیز اور مشہور و متواتر کے لئے تو ایک ہی آدھ آیت بطور دلیل یا ثبوت دستیاب ہو گی لیکن

خبر فرد کے لئے تو سینکڑوں آیتیں موجود ہیں جس سے اس کا ثبوت سارے ثبوتوں سے زیادہ مضبوط اور اٹل ہو جاتا ہے۔ اور جبکہ فرشتہ سے لے کر انبیاء تک خدائی خبریں ایک ہی فرد سے آئیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ تمام آسمانی شریعتوں اور ادیان کا مدار ہی خبر فرد کی روایت پر رہا ہے نہ کہ خبر مشہور و متواتر پر، اس لئے بایں خصوصیت خبر فرد اپنی تمام ہم نوع خبروں سے فائق ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ سارے دینوں کی مدار علیہ ہے۔ اگر اس سے انکار کر دیا جائے تو ساری شریعتوں کا کارخانہ ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ شاید اس لئے خبر فرد کے ثبوت کے لئے قرآن نے خود اپنی آیتوں تک کا تواتر پیش کر دیا ہے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے اور اس لئے خبر فرد کا ماننا دوسری واجب التسلیم خبروں کے ماننے سے کہیں زیادہ ضروری اور قطعی ہے بلکہ غور کیا جائے تو انبیاء کی ان انفرادی روائتوں اور اخبار فرد سے صرف اصولاً ہی خبر فرد کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ کلام رسولؐ کی حیثیت سے بھی خبر فرد کا ایک واقعی حقیقت اور حجت ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انبیائے سابقین کی یہ خبریں جہاں خبر فرد تھیں، وہاں حدیث رسول ہی نہیں۔ کیونکہ کسی نبی کو بجز نبی کریم ﷺ کے کلامی معجزہ نہیں دیا گیا جس کے الفاظ بھی منزل من اللہ نہ ہوں۔

پس وہ مضامین الٰہی جو عامۃً قلوب انبیاء پر الہام کئے جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے الفاظ میں امت کو سنادیتے تھے اور ان کی یہ روایتیں بلحاظ الفاظ درحقیقت حدیث رسول ہوتی تھیں اور ان کا وہی پلہ ہوتا تھا جو اسلامی شریعت میں حدیث رسول کا ہے۔ اس لئے انبیائے علیہم الصلوٰۃ السلام کی انفرادی خبروں سے نہ صرف خبر فرد ہی کا اصولی ثبوت قرآن سے ملا بلکہ عین حدیث رسول کے حجت ہونے کا ثبوت بھی سامنے آگیا جو ایک کی روایت سے امت تک پہنچی ہو۔

پس نبی کریم ﷺ کی وہ تمام خبریں جو قرآن کے علاوہ آپؐ نے بصورتِ حدیث صحابہ کرام علیہم الرضوان کو سنائیں بجز خبر فرد کے اور کیا تھیں؟

بعد میں راویوں کے عدد کی قلت و کثرت کے سبب وہ مشہور و متواتر بنتی گئیں لیکن اپنی ابتداء میں تو یہ سب خبر فرد ہی تھیں اسلئے خبر فرد اپنے نوع بنوع ثبوت کے ساتھ قرآن کی نصوص سے سامنے آجاتی ہے۔

روایتِ رسولؐ اصولِ روایت کی روشنی میں

لیکن خبر فرد کی اس نوع میں جو پیغمبر کی واحد اطلاع سے سامنے آئے ممکن ہے کہ کسی کو وہی شبہ ہو جو سیدنا حضرت جبرائیل علیہ السلام کی خبر میں ہوا تھا اور یہ کہہ دیا جائے کہ رسول کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہے ان کے وصف رسالت کی عظمت کا ایک قدرتی دباؤ قلوب پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ رسول ملکی ہو یا رسول بشری۔ اس لئے ان کی خبر کا ماننا درحقیقت رسالت کے دباؤ کا اثر ہے اصول فن کا تقاضا نہیں اور نہ فنی حیثیت سے وہ قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ گویا رسول ملکی کی طرح رسول بشری کی خبر فرد بھی کوئی فنی یا اصولی خبر فرد نہیں کہ ان نظیروں سے اسے قرآن سے ثابت شدہ مانا جائے۔

مگر میں عرض کروں گا کہ یہ شبہ بھی انکارِ حدیث کی طرح قرآن حکیم سے ناواقفیت اور اس میں غور نہ کرنے کے سبب پیش آیا ہے۔ قرآن نے کہیں بھی کسی پیغمبر کی خبر فرد کو محض پیغمبری یا رسالت کی وجہ سے نہیں بلکہ اصول روایت کی رو سے ہے۔ ارشاد ہے:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰیo مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰیo وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰیo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیo

"قسم ہے (مطلق) ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے۔ یہ تمہارے (ہمہ وقت) ساتھ رہنے والے نہ راہ حق سے بھٹکے نہ غلط رستہ ہولئے اور نہ ہی اپنی خواہشِ نفسانی سے باتیں بناتے ہیں۔ ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے"۔

ظاہر ہے کہ یہ خبر فرد جو تن تنہا رسول اللہ ﷺ سے امت کو پہنچی اور قرآن نے اسے واجب الاعتبار ٹھہرایا تو یہ کہہ کر نہیں کہ آپ نبی اور رسول ہیں، بلکہ یہ کہہ کر کہ اس روایت کے راوی میں کوئی تہمت یا مطاعن روایت میں سے کوئی طعن موجود نہیں جو روایت کو مخدوش بناتا ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے حضورؐ سے مطاعن روایت کی نفی کی اور رسول کہہ کر نہیں بلکہ صاحبکم کہہ کر، جس سے واضح ہے کہ خبر فرد کے منوانے میں رسالت کا دباؤ دلوں پر ڈالنا مقصود نہیں۔

پس اولاً ان مطاعن میں سے سب سے پہلے ضلالت کی نفی کی۔ کیونکہ بے راہرو اور ناواقف کی بات ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ پھر غوایت کی نفی کی کیونکہ کج راہ جو کہ اوندھی سمجھ رکھتا ہو اوندھی ہی سمجھے، اوندھی ہی بات کہے، اس کی روایت ہرگز لائق التفات نہیں ہوتی۔

پھر ہوائے نفسانی کی نفی کی۔ کیونکہ ہوا پرست خود غرض ہوتا ہے اور خود غرض کی بات متہم ہوتی ہے۔ موجبِ سکون اور لائق اعتبار نہیں ہوتی۔ یہ سب وہی مطاعن روایت ہیں جن سے روایت مجروح اور مخدوش ہو جاتی ہے۔ آخر میں ان منفی اوصاف کی نفی کی علت پر مطلع فرمایا کہ وہ راوی کا صاحبِ وحی ہونا ہے جو پیغمبر کے سوا دوسرا نہیں ہوتا اور نبوت و رسالت ایسا اعلیٰ مقام ہے کہ اس کے ساتھ ضلالت، غوایت اور ہوائے نفس کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

پس نبوت کے وصف کو اول تو صراحۃً ذکر ہی نہیں کیا گیا اور وحی کے لفظ سے کنایۃً اگر ذکر بھی فرمایا تو منصب کی حیثیت سے نہیں بلکہ مطاعن روایت کے دفعیہ کے سلسلے میں، بطورِ علت دفع کرنا فرمایا کہ جس ذات میں وحی نبوت موجود ہیں وہاں ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس کا کیا کام؟ جس سے خبر غیر معتبر ہو جائے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ غیر فرد کے اعتبار و حجیت کو وصف رسالت کے دباؤ سے نہیں منوایا جا رہا ہے بلکہ رسول کی روایت کو معیارِ روایت پر پورا پورا اترنے اور اصول روایت کی رو سے مطاعن روایت سے پاک ہونے کی وجہ سے واجب الاعتبار قرار دیا جا رہا ہے تاکہ خوب واضح ہو جائے کہ رسول کی روایت وصف رسالت سے الگ ہو کر اصول روایت کی رو سے بھی واجب الاعتبار اور حجت و سند ہے اور ظاہر ہے کہ

رسول کی یہ خبر جس نے نطق کی اس آیت میں اطلاع دی گئی ہے خبر فرد ہے تو خبر فرد کے وجود اور حجیت کا واضح ثبوت اصول روایت کی رو سے بھی قرآن سے نکل آیا۔

خبرِ فرد کا ثبوت غیر انبیاء سے

لیکن اس پر بھی اگر کوئی یہی کہے جائے کہ رسول کی بہر حال غیر معمولی شخصیت ہے، اس لئے عمومی اور معمولی شخصیتوں کی خبر فرد کا ثبوت تو معمولی ہی قسم کی شخصیتوں کی روایت سے ہو سکتا ہے نہ کہ پیغمبروں کی غیر معمولی شخصیتوں سے۔

تو میں عرض کروں گا کہ قرآن نے اس بارے میں بھی ہمیں روشنی بخشی ہے اور خبر فرد کا ثبوت غیر رسول اشخاص سے بھی نظم قرآنی میں موجود ہے۔

ارشاد ہے:

وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ...... (سورۃ القصص)

"وہ ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑے ہوئے آئے، کہنے لگے اے موسیٰ (علیہ السلام) اہل دربار آپ کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں۔ سو آپ چل دیجئے میں آپ کی خیر خواہی کر رہا ہوں۔ پس موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے نکل گئے خوف اور وحشت کی حالت میں۔"

ظاہر ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خبر دینے والا پبلک کا ایک معمولی آدمی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی خبر مان لی جو بلا شبہ ایک فرد کی روایت تھی، جماعت کی نہ تھی اور اس سے اثر بھی لیا۔ قلب پر تو خوف کا، اور ظاہر پر خروج کا، **فخرج منها خائفا**۔

اس خبر فرد کو موسیٰ علیہ السلام نے مانا اور اسے اثر اس لئے لیا کہ راوی میں کوئی طعن مطاعن روایت میں سے محسوس نہیں کیا۔

چنانچہ اس نے اپنی روایت کی توثیق خود یہ کہہ کر کی کہ **انی لك من الناصحين**۔ (میں آپ کے خیر خواہوں میں سے ہوں) اس کا حاصل یہ ہوا کہ میں یہ خبر ہوائے نفس یا کسی کے بہکائے سکھائے سے غلط نہیں دے رہا ہوں بلکہ آپ کا خیر خواہ ہوں۔ اور مخلصانہ طریق پر مطلع کرنے آیا ہوں۔

ظاہر ہے کہ اوصاف راوی کے سلسلہ میں سب سے بڑا وصف بے لوث ہے جس سے خبر کی پوزیشن صاف ہوتی ہے۔ پس شخص واحد روایت کرے جو پیغمبر نہیں، اور پیغمبر اس کی روایت کو قبول کر کے اس سے اثر لے۔ یعنی غیر نبی کی روایت کو مان لے تو کیا اس سے بھی بڑھ کر خبر فرد کے ثبوت اور اس کی حجیت کے معتبر ہونے کا کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ غیر نبی کی خبر ہو اور نبی کی قبول کردہ ہو۔ حالانکہ نبی کی ثقہ و عدالت کے سامنے غیر نبی کی ثقت و عدالت کوئی چیز ہی نہیں۔ سمندر اور قطرہ کی بھی نسبت نہیں لیکن

پھر بھی فرد واحد کی روایت اس لئے مان لی گئی کہ روایت اصول روایت کے مطابق تھی، راوی متہم نہ تھا، مجروح نہ تھا اور ہوائے نفسانی سے خبر نہیں دے رہا تھا۔

بہر حال خبر فرد کا ثبوت قرآن نے اس طرح نہیں بلکہ مختلف اندازوں سے پیش کیا۔ ملائکہ کی نوع سے لے کر انبیاء تک اور انبیاء کی نوع سے لے کر غیر انبیاء کی نوع تک کی نظیریں اس بارے میں پیش کیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خبر واحد کی اس قسم خاص (خبر فرد) کے اثبات میں قرآن کو بہت زیادہ اہتمام ہے۔ گویا منکرینِ حدیث کے برعکس اور علی الرغم قرآن اس خبر کے اثبات پر زیادہ زور دے رہا ہے جس سے منکرین زیادہ گریزاں ہیں۔ یعنی خبر فرد جسے وہ قابل التفات بھی سمجھنا نہیں چاہتے۔ اگر کسی حد تک کچھ مانتے ہیں تو خبر متواتر کو کچھ مان لیتے ہیں جس کے لئے قرآن نے اپنی کوئی خصوصی نص بھی پیش نہیں کی، صرف اپنے کو پیش کر دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منکرینِ حدیث دراصل منکرینِ قرآن بلکہ دشمنانِ قرآن ہیں اور یہ بھی کہ قرآن ان کا دشمن اور ان سے گریزاں ہے۔ وہ اگر خبر فرد کو بالکل ہی نسیاً منسیاً کر دینا چاہتے تھے تو قرآن نے اس کے اثبات کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا۔ بہر حال خبر فرد کے سلسلۂ روایت میں کچھ خصوصی اہمیت ہے جس کی طرف قرآنِ حکیم نے کئی کئی اندازوں سے توجہ دلائی۔

فاسق کی خبر کی شرطِ قبول

حتیٰ کہ قرآن حکیم نے خبر فرد کے اثبات میں اسی پر بس نہیں کر دی کہ ملائکہ انبیاء اور عوام کی خبروں کے ہی نظائر پیش کر دیئے ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یا یوں کہنا چاہئے کہ اور زیادہ تنزل کر کے فاسق کی خبر فرد کا بھی اعتبار کر لیا اور اسے بھی کلیتہً رد نہیں کیا۔ شرط البتہ تبیین و تحقیق کی لگا دی کہ تحقیق اور چھان بین کے بعد اسے بھی قبول کر سکتے ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ.

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں کسی قوم پر تم مصیبت ڈھاؤ اور پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ"۔

اس سے واضح ہے کہ شخصِ واحد کی خبر اس کے فاسق ہونے کے باوجود بھی معتبر اور حجت ہونے کی شان رکھتی ہے۔ بشرطیکہ تحقیق میں آجائے اور حجت بھی ایسے اہم معاملات میں جن کے بگڑ جانے کی صورت میں ندامت اٹھانی پڑے جو کسی اہم اور بڑے ہی معاملہ کی شان ہوتی ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ شخصِ واحد کی خبر بھی قرآنی اصول پر قابلِ رد یا غیر معتبر نہیں، بلکہ تبیین و تحقیق کے بعد معتبر اور بڑے بڑے معاملات میں حجت ہو جاتی ہے۔ جس پر دیانتاً معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ روکا اگر گیا ہے تو قبل از تحقیق اس پر عمل کرنے سے، نہ کہ مطلقاً۔ ورنہ یوں کہا جاتا کہ فاسق اگر کوئی خبر لائے تو

ہر گز اس کی بات کا اعتبار مت کرو نہ یہ کہ تحقیق کے بعد اسے مان لو اور معتبر سمجھو۔

پس تحقیق کی شرط اس لئے لگائی گئی کہ خبر دہندہ اور روایت کنندہ کے فسق و فجور سے اس کی خبر میں جو بے اعتباری کی گنجائش پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو جائے اور قابلِ اعتبار بن جائے مگر خبر بہر حال ایک ہی کی رہے گی۔ اس لئے صاف ثابت ہوا کہ ایک کی روایت معتبر اور معاملات میں حجت ہے۔ اب اگر خبر دینے والا فرد فاسق بھی نہ ہو بلکہ غیر متہم، غیر مجروح ہو جیسے رجل یسعیٰ کی خبر تو وہ بلا تبیین بھی اس اصول سے قابل قبول بن سکتی ہے۔ اور اگر راوی غیر مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ عادل و متقی، متدین اور امین بھی ہو جیسے ملائکہ وانبیاء اور صلحاء، تو اس اصول پر اس کی بلاواسطہ خبر کو معتبر ماننے کے لئے قطعاً تبیین و تحقیق کی ضرورت نہیں رہنی چاہئے۔

لیکن اگر وسائط کی وجہ سے اس پر بھی تحقیق و تبیین کر لی جائے تو پھر یہ خبر بطریق اولیٰ واجب الاعتبار بن جائے گی۔ مگر بہر صورت رہے گی خبر فرد ہی۔ اسلئے خبر فرد جسے خبر غریب بھی کہتے ہیں قرآن کی رو سے معتبر اور حجت ثابت ہو گی۔ گو اس کی حجیت درجہ ظن ہی کی حد تک ہو کہ ظنیات بھی شرعاً حجت اور معاملات میں قانوناً مؤثر ہوتے ہیں کیونکہ ظنیات کے معنی وہمیات کے نہیں بلکہ صرف اس کے ہیں کہ خبر پر وثوق واعتماد کے ساتھ جانب مخالف کا احتمال بھی باقی رہے۔ نہ یہ اصل خبر بے اعتبار اور قابل رد ہو جائے۔

البتہ اس کے ساتھ اگر اس راوی واحد کی روایت کی جو ثقہ اور عادل ہے تحقیق بھی کر لی جائے۔ یعنی اس کے متابعات و مؤیدات اور شواہد و قرائن بھی فراہم ہو جائیں تو پھر اسی خبر فرد سے ظن اس حد تک بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یقین کی سرحد سے جا ملے۔ اور ایسی خبر اگر قطعیت کے ساتھ درجہ یقین تک نہ پہنچے گی، تو شبہ یقین تک ضرور پہنچ جائے گی۔ جس کا نام اصطلاح میں غلبہ ظن ہے سو ایسی خبر اصول و آئین کی رو سے نہ رد کی جا سکتی ہے نہ غیر معتبر ٹھہرائی جا سکتی ہے جبکہ قرآن کریم خبر فرد کے سلسلہ میں ایک فاسق کی خبر کو بھی کلیۃً غیر معتبر نہیں ٹھہراتا۔ بلکہ بعد تبیین اسے معتبر قرار دیتا ہے تو ایک ثقہ اور عادل کی خبر کو اس قرآنی اصول کی روشنی میں کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟

اس لئے خبر فرد اور اس کی حجت کا ثبوت آیاتِ بالا سے بہت کافی وضاحت کے ساتھ ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خبر فرد کی حجیت کا منکر ان ساری آیتوں کا منکر ہے جسے بلاشبہ منکرِ قرآن کہا جائے گا اور نہ صرف منکر قرآن بلکہ تمام کتبِ سماویہ اور تمام اخبار، ملائکہ وانبیاء کا منکر ثابت ہو گا۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ۔

تمام اقسام حدیث کا مآخذ قرآنِ کریم ہی ہے

بہر حال عدد کے لحاظ سے جبکہ یہ چار قسمیں حصر کے ساتھ اساسی اور معیاری ثابت ہوئیں تو اس کا قدرتی مقتضا یہ ہے کہ اس نوع کی بقیہ اقسام ان چار قسموں کی فروع ہوں اور ان کے ثبوت کے ضمن میں خود بھی ثابت شدہ سمجھی جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ سلسلۂ سند میں راویوں کی قلت و کثرت کا وہ عدد جس سے حدیث

کی بنیادی قسمیں بنتی ہیں ایک سے شروع ہو کر چار ہی پر ختم ہو جاتا ہے اور چار ہی اساسی قسمیں بن جاتی ہیں جیسا کہ ابھی گزرا کہ ایک ایک راوی کی روایت ہو تو خبر غریب عدد دو کی ہو تو خبر عزیز، تین تین کی ہو تو خبر مشہور، اور تین و چار کی قید سے بالاتر ہو کر اتنے ثقہ اور عادل راویوں سے منقول ہو کہ ان کا جھوٹ پر جمع ہو جانا عادتاً محال ہو تو خبر متواتر ہے۔ حدیث کی یہی چار قسمیں بلحاظ عدد روات تمام اقسام کی جڑ بنیاد ہیں۔

چار سے زیادہ والی روایت ہو تب بھی انہی چار کی فرع ہو گی اور ایک سے کم والی روایت ہو تب بھی ان ہی چار کی شاخ کہی جائے گی۔ کیونکہ یا وہ چار پر اضافہ ہو گیا چار کا نقصان۔ دونوں صورتوں میں نسبت ان چار ہی سے باقی رہے گی جس سے یہ کمی بیشی پہچانی جائے گی مثلاً اگر راویوں کا عدد چار سے بڑھ جائے اور اوپر سے نیچے تک جماعتیں روایت کریں تو وہ تواتر طبقہ ہو جائے گا جو قرآن کریم کی روایت کی شان ہے۔ مگر یہ خبر متواتر ہی کی ایک نوع اور قسم کہلائے گی خبر متواتر سے الگ کوئی مستقل قسم نہ ہو گی۔ کیونکہ کسی شئے پر اضافہ اس شئے ہی کا تمتہ کہلاتا ہے جو اس کے تابع ہوتا ہے نہ کہ اس سے الگ مستقل نوع۔

اسی طرح ان روایتوں میں سے ایک ایک راوی روایت میں سے اگر کہیں ایک سے بھی عدد گھٹ جائے، جس ایک سے خبر غریب بنتی تھی تو وہ روایت رتبہ میں خبر غریب سے کم سہی مگر خبر غریب ہی کی شاخ کہلائے گی۔ مثلاً اگر ابتداء سند میں (جو ہماری جانب ہے) ایک راوی گھٹ جائے تو وہ مرسل کہلائے گی اور درمیان میں سے گھٹ جائے تو معضل کہلائے گی مگر یہ تینوں قسمیں خبر غریب ہی کی شاخ شمار ہوں گی۔ کیونکہ یہ سب وہی ایک ایک راوی والی روائتیں ہیں جن میں کہیں کہیں ایک سے بھی عدد گھٹتا گیا ہے۔

پس مذکورہ بالا چار کے عدد پر اضافہ سے پیدا شدہ قسم متواتر کی قسم ہو گی اور ایک کی کمی سے پیدا شدہ قسم غریب کی قسم ہو گی۔ اس لئے جو ماخذ خبر غریب اور خبر متواتر کا ہو گا وہی ان فروعی اقسام کا بھی ہو گا۔ کیونکہ یہ نئی اقسام نہیں بلکہ وہی خبر غریب اور خبر متواتر ہیں جن میں فرق اگر ہوا ہے تو عدد کی قلت و کثرت کی وجہ سے صفات اور احکام کا ہوا ہے خبر کی ذات کا نہیں ہوا۔ ذات خبر کی وہی کی وہی ہے جسے غریب یا متواتر کہا گیا تھا۔ اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ خبر غریب اور متواتر، اور عزیز و مشہور کا ماخذ قرآن ہے تو ان کی فروعات کا ماخذ بھی قرآن ہی ہو گا جبکہ یہ فروعات ذرا سے صفاتی فرق سے بعینہٖ وہی اصل ہیں۔ اسلئے بے تکلف دعوٰے کیا جا سکتا ہے کہ عدد روات کی قلت و کثرت سے پیدا ہونے والی تمام اقسام حدیث قرآن سے ثابت ہیں۔ کیونکہ جب ان کے اصول قرآن سے ثابت ہیں تو یہ فروع بھی یقیناً قرآن سے ثابت ہیں۔ بالخصوص جبکہ یہ قسمیں بجنسہٖ وہی اصل قسمیں ہیں فرق ذات کا نہیں صرف شئون و صفات کا ہوا ہے۔

اوصافِ روات کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں

پھر قرآن کریم نے اسی پر بس نہیں کی کہ عدد روات کے لحاظ ہی سے حدیث کی اساسی قسموں پر روشنی ڈالی ہو بلکہ حدیث کی ان بنیادی قسموں کی طرف بھی اصولاً رہنمائی کی ہے جو راویوں کے لحاظ سے

نہیں بلکہ ان کے اوصاف کے لحاظ سے پیدا ہوتی ہیں اور اپنی نوع کی بقیہ اقسام کے لئے معیار و منشاء کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چنانچہ حدیث کی دوسری تقسیم اوصاف رواۃ کے لحاظ سے کی جاتی ہے اور انہی اوصاف کے معیار سے راوی کے ثقہ، غیر ثقہ، معتبر، غیر معتبر اور پھر اعتبار کے متفاوت درجات اعلیٰ وادنیٰ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ سوان اوصاف کی بنیادیں بھی قرآن کریم ہی نے قائم کی ہیں۔ جیسا کہ عددی روایتوں میں راویوں کی معیاری تعدادیں بھی قرآن ہی نے متعین کی تھیں۔

دو اصولی صفات عدالت اور ضبط:

چنانچہ پہلے اس پر غور کیجئے کہ راوی کے وہ تمام اوصاف جو بلحاظ روایت اس کی قبولیت کا معیار بن سکتے ہوں دو اصولی صفات کی طرف راجع ہوتے ہیں، عدالت اور ضبط۔ اگر روایت کے راوی عادل ہوں جن میں عدالت کا فقدان یا نقصان نہ ہو اور ادھر وہ ضابطہ ہوں جن میں حفظ وضبط اور تقیظ و بیداری کا نقصان و فقدان نہ ہو اور قلت عدالت و ضبط سے جو کمزوریاں راوی کو لاحق ہوتی ہیں، جن کی تفصیل آگے آتی ہے، ان سے راوی پاک ہوں اور ساتھ ہی سند مسلسل اور متصل ہو تو وہ روایت صحیح لذاتہ کہلائے گی۔ جو اوصاف راوی کے لحاظ سے روایت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ کیونکہ اس میں عدالت و ضبط مکمل طریق پر موجود ہے جو راویون کو ثقہ اور معتبر ثابت کرتا ہے۔ اس لئے اس دائرہ میں حدیث کی یہ قسم بنیادی اور اساسی کہلائے گی۔ اس کے بعد جو قسم بھی پیدا ہوگی وہ ان اوصاف کی کمی بیشی اور نقصان یا فقدان سے پیدا ہوگی۔ اس لئے وہ اسی خبر کی فرع کہلائے گی۔

نقصان و فقدان عدالت

مثلاً اگر راوی ساقط العدالت ہو تو اس نقصان عدالت یا فقدانِ عدالت سے پانچ اصولی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جنہیں مطاعن حدیث کہا جاتا ہے۔ کذب تہمت، کذب فسق، جہالت بدعت یعنی راوی کاذب ہو، یا کذب کی تہمت لئے ہوئے ہو، یا فاسق ہو، یا جاہل، یا نادان ہو یا بدعتی ہو تو کہا جائے گا کہ وہ عادل نہیں اسلئے اس کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔

نقصان و فقدانِ ضبط

اسی طرح اگر راوی ضابط نہ ہو تو اس نقصان حفظ یا فقدانِ حافظہ سے بھی پانچ ہی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جو روایت کو بے اعتبار بنادیتی ہیں۔ فرط غفلت، کثرت غلط، مخالفت ثقاۃ، وہم، سوءِ حفظ۔ یعنی غفلت شعار اور لاابالی ہو۔ جس میں تیقظ اور احتیاط اور بیدار مغزی نہ ہو، یا کثیر الاغلاط ہو۔ یا ثقہ لوگوں سے الگ نئی اور مخالف بات کہتا ہو یا وہمی ہو۔ اسے خود ہی اپنی روایت میں شبہ پڑجاتا ہو یا حافظہ خراب ہو۔ یا بات بھول جاتا ہو، تو کہا جائے گا کہ یہ روای ضبط و حفظ کا مضبوط نہیں۔ اس لئے اس کی روایت کا کچھ اعتبار نہیں۔ لیکن اس

نقصانِ عدالت و ضبط میں کوئی معمولی سی کمی ہو مگر روایت کے اور طریقوں اور سندوں کی کثرت سے ان کمزوریوں کی تلافی ہو جائے تو اس حدیث کو صحیح لغیرہٖ کہیں گے۔ اگر یہ تلافی اور جبر نقصان نہ ہو اور وہ معمولی کمزوریاں بدستور قائم رہ جائیں تو حدیث حسن لغیرہٖ کہلائے گی اور اسی نسبت سے ان کے اعتبار اور حجیت کا درجہ قائم ہو گا۔

صحیح لذاتہٖ بلحاظ اوصافِ رواۃ

بس اوصاف رواۃ کے لحاظ سے حدیث کی چار اساسی قسمیں نکل آئیں۔ صحیح لذاتہٖ، صحیح لغیرہٖ، حسن لذاتہٖ، حسن لغیرہٖ۔ اور ان میں بھی بنیادی قسم صحیح لذاتہٖ ہے جو اپنے دائرہ میں سب سے اونچی قسم ہے۔ بقیہ تین قسمیں اسی میں کمی آجانے سے بن جاتی ہیں۔ جیسے عددی روایتوں میں بنیادی قسم متواتر تھی اس میں کمی اور کمزوری آجانے سے بقیہ تین قسمیں بن جاتی ہیں۔

پھر ان تین قسموں میں مطاعن کی کمزوریوں میں سے کوئی کمزوری اگر اور زیادہ بڑھ جائے تو پھر حدیث ضعیف کی اور قسمیں پیدا ہو جائیں گی۔

مثلاً اگر عدالت کی کمی کذب راوی سے ہو تو وہ حدیث موضوع کہلائے گی۔ تہمت کذب سے ہو تو متروک۔ جہالتِ راوی سے ہو تو مبہم۔ یا مثلاً ضبطِ راوی میں کمی کی وجہ سے فرطِ غفلت، یا کثرت غلط، یا مخالفت ثقاۃ کے مطاعن پیدا ہو جائیں تو حدیث شاذ کہلائے گی یا وہم و نسیانِ راوی ہو تو معلل یا سوء حفظ ہو تو مختلط کہی جائے گی۔ مگر یہ ساری قسمیں اگر غور کیا جائے تو انہیں تین مذکورہ قسموں بلکہ ایک ہی بنیادی قسم صحیح لذاتہٖ میں کمی اور کمزوری آجانے اور اس کمزوری کے متفاوت مراتب نمایاں ہو جانے سے پیدا ہوئی ہیں اس لئے ان سب کو اسی ایک اونچی قسم کی شاخیں کہا جائے گا۔ اس لئے جو ماخذ اس ایک قسم کا ہو گا وہی ان سب کا بھی ہو گا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ خبر صحیح لذاتہٖ ہے۔ اس لئے بھی صحیح لذاتہٖ کا ماخذ قرآن ہی ثابت ہو گا۔ پھر قرآن ہی نے صحیح لذاتہٖ کی شرائط و صفات کا قانون وضع کیا ہے۔ اس لئے بھی وہی ماخذ ہے۔

چنانچہ روایت کے راویوں کے ان دونوں بنیادی اوصاف عدالت و ضبط کو خبر کے ردو قبول کا معیار قرآن ہی نے قرار دیا ہے جو صحیح لذاتہٖ کی جوہری حقیقت ہے۔ کیونکہ قرآن نے اوصاف رواۃ کی یہ دو بنیادی شانیں عدالت و ضبط شہادت میں قائم کی ہیں، اور ہم سابق میں عرض کر چکے ہیں کہ شہادت درحقیقت روایت ہے اس لئے خبر شہادت کے لئے مشاہد میں عدل و ضبط کی قید درحقیقت جنس خبر کے راوی میں قید لگائے جانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ خبر ہونا دونوں جگہ قدر مشترک ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شہادت قانونی خبر ہے تو اس کے راوی میں عدالت و ضبط بدرجہ کمال ہونا چاہئے اور روایت محض دیاناتی خبر ہے تو اس میں ان اوصاف کی کمی بیشی بھی حسبِ تفاوت مراتب قابلِ قبول ہے۔ لیکن نفسِ خبر کے لئے بہر حال راوی کا عادل و ضابط ہونا ضروری ہے۔ سو قرآن حکیم نے شہادت کے لئے عدالت کی شرط تو اس آیت میں لگائی ہے۔

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ

"اور دو عادل لوگوں کو اپنے میں سے گواہ بنایا کرو۔ اور شہادت قائم کرو۔"

اس سے شاہد کی شہادت کے قبولیت کا معیارِ عدالت نکلا جو درحقیقت خبر کے قبول کا معیار ہے۔ شہادت کے لئے دوسری شرط قرآن نے حفظ و ضبط ذکر کی ہے کہ شاہد کا حافظہ بھی متہم نہ ہو جس کا اصطلاحی لقب ضبط ہے۔ فرمایا گیا:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى.

"اور گواہ بنالیا کرو مردوں میں سے دو کو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد دو عورتیں جن کو تم پسندیدہ سمجھو، گواہوں میں سے کہ ایک ان میں بھول جائے تو دوسری یاد دلادے"۔

حاصل یہ ہوا کہ گواہوں میں اگر عورت ہو تو عورت کے لئے ایک مرد کی جگہ دو کی قید اس لئے رکھی گئی ہے کہ اگر ایک سے بھول چوک ہو جائے تو جو عورت میں بوجہ معاملات میں زیادہ دخیل اور بارسوخ نہ ہونے اور عدالتی کاموں سے سابقہ کم پڑنے کے زیادہ متحمل ہے۔ تو دوسری یاد دہانی کا فرض انجام دے تاکہ شہادت اور روایت واقعہ میں نسیان سے غلطی نہ ہونے پائے جس سے معاملہ بگڑ جائے۔ اس سے واضح ہے کہ راوی شاہد میں بھول چوک کا غالب احتمال ہوتے ہوئے اس کی شہادت و روایت معتبر نہیں رہتی۔ جب تک کہ اس احتمالِ نسیان کی تلافی کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب احتمالِ نسیان بھی روایت کو مخدوش کر دیتا ہے تو خود نسیان کی صورت میں تو شہادت روایت کا اعتبار ہی کیا باقی رہ سکتا ہے۔

اس سے یہ اصول نکل آیا کہ راوی یا شاہد ناقص الحفظ اور قلیل الضبط ہو تو اس کی روایت و شہادت معتبر نہیں ہو سکتی جس سے مطاعن حدیث کے دو بنیادی وصفوں پر روشنی پڑ گئی کہ وہ ضد عدالت یعنی ظلم ہے جسے فسق و فجور کہتے ہیں اور ضد حفظ یعنی نسیان ہے۔

پس یہ دونوں وصف جس درجہ میں بھی راوی میں ہوں گے اس کی روایت مخدوش ہو جائے گی۔ باقی آیت کریمہ میں دفع نسیان کی حد تک عورت کی تخصیص اس لئے نہیں کی گئی کہ مرد کے لئے روایت میں نسیان اور بھول چوک قابلِ اعتراض یا مطاعن روایت میں سے نہیں بلکہ اس لئے کہ عورت میں اس قسم کے نسیان کا مظنہ غالب ہے جبکہ عادۃً اسے ایسے عدالتی کاموں میں پڑنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے اور ساتھ ہی اس کا معاملاتی فہم بھی اتنا اونچا نہیں کہ بلا امداد غیرے قابلِ اعتماد ہو۔ سو یہ تخصیص واقعہ کی خصوصیت ہوئی۔ اصول میں تخصیص نہیں ہوئی۔ نیز جب مرد کے لئے ممن ترضون کی قید لگا دی گئی جس سے شاہد کے ساتھ طالب شہادت کی رضا ضروری ٹھہری۔ اور ظاہر ہے کہ شاہد مرضی و پسندیدہ وہی ہو سکتا ہے جو شرائط شہادت یعنی حفظ و ضبط میں کمزور اور متہم نہ ہو اس لئے عورت کے لئے بوجہ مذکور اگر حفظ و ضبط صراحتاً ذکر کیا گیا تو مرد کے لئے بعنوانِ رضا اس کا تذکرہ فرمایا گیا۔

اس لئے اس اصول سے جو آیت کریمہ سے نکلا شہادت کے لئے اور جب کہ شہادت ہی خبر ہے تو خبر وروایت کے لئے خواہ اس کا راوی مرد ہو یا عورت ضبط و حفظ کا وجود ضروری ہے اور یہ کہ نسیان یا قلب حفظ روایت کے حق میں طعن اور سقوط اعتبار کا سبب ہے۔ ادھر راوی کے لئے عدالت پہلی آیت پر نا قابل رد شہادت اور واجب التسلیم روایت وہی ہو سکتی ہے جس کے راوی عادل وضابط ہوں اور ان میں نہ ضعف حفظ ہو نہ ضعفِ عدالت بس ایسی ہی روایت کا نام محدثین کی اصطلاح میں صحیح لذاتہ ہے۔ خواہ اسے ایک راوی روایت کرے یا دو یا تین یا اس سے زیادہ۔

اس لئے حدیث صحیح لذاتہ اوصاف رواۃ کے لحاظ سے اساسی اور بنیادی قسم ثابت ہوئی جس کی بنیاد قرآن عزیز نے رکھی اور اس کے راوی اوصاف عدالت و مضبوط مشخص کئے۔

قرآن نے عدالت وضبط کے ساتھ انکے نقصان وفقدان سے پیدا ہونیوالی دس کمزوریوں کی وضاحت کر دی ہے

اس سے بڑھ کر مزید تدبر کیا جائے تو واضح ہوگا کہ قرآن نے اوصافِ رواۃ کے سلسلے کے صرف یہ دو بنیادی وصف ہی بیان کر دیئے جن کا نام عدالت وضبط ہے بلکہ ان کے نقصان و فقدان سے جو دس مطاعن روایت پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی طرف واضح اشارے فرما دیئے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم کی سند بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے اس کے ابتدائی رجال پر روشنی ڈالی کہ خود حق تعالیٰ سے قرآن کی روایت کرنے والے تو جبرائیل امین علیہ السلام ہیں اور ان سے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم روایت فرمارہے ہیں۔ اس سلسلۃ الذہب کی کڑیوں اور ان کے اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍo ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍo مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍo وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍo وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِo وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍo وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍo

"یہ قول ہے رسول کریم (جبرئیل) کا جو قوت والا عرش والے کے نزدیک ذی مرتبہ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے وہ امانت والا ہے اور تمہارا ساتھی (محمدؐ) مجنون نہیں ہے، اس نے جبرائیل علیہ السلام کو افق میں دیکھا اور وہ غیب کے بارہ میں بخیل نہیں ہے اور نہ وہ قول ہے شیطان رجیم کا"۔

رسول کریم سے جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں جنہوں نے قرآن کے ساتھ قول کیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سنایا۔

پس جبرئیل راوی اول ہیں۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ جبرئیل فرشتہ ہیں تو ان کی ملکیت کی وجہ سے اس روایت کو واجب التسلیم سمجھو۔ گویا ان کی بزرگی کا دباؤ مان کر روایت کو مانو۔ نہیں بلکہ ان کی روایت کو

بھی اصول روایت پر پرکھ کر ہی واجب القبول ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ جبرئیل سے متعلق بیان فرمودہ اوصاف میں خصوصیت سے اوصاف قبولِ روایت سے متعلق ہیں وہ تین ہیں۔

رسول کریم، امین یعنی رسالت، کرامت، امانت اور ان ہی تین وصفوں سے چونکہ رسول مطاعن حدیث منفی ہو جاتے ہیں اس لئے جبرائیلؑ کی روایت واجب القبول ہوئی نہ کہ محض فرشتہ ہونے کی وجہ سے۔ چنانچہ غور کیا جائے تو رسالت کی حقیقت علم ہے۔ کیونکہ نبوت کی بنیاد ہی علم پر ہے اس لئے رسالت الٰہی در حقیقت علمِ الٰہی ہے۔ اور جبکہ علم کی ضد جہل ہے تو جبرائیل امین کو رسول کہنے سے جہالت ان میں منفی ہو گئی جو دس مطاعن روایت میں سے ایک ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ رسالت ہی شریعت ہے جس کے لئے اتباع و انقیاد ضروری ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا.

"پھر ہم نے کر دیا ہے تمہیں (اے پیغمبرؐ!) امر کی شریعت پر سو آپ اس کا اتباع کیجئے۔

اور متبع کبھی متبدع نہیں ہو سکتا۔ اس لئے رسالت ہی کے لفظ سے بدعت بھی منفی ہو جاتی ہے۔ پھر جہالت ہی کا ایک شعبہ مخالفت ثقاۃ بھی ہے۔ کیونکہ جس روایت کو بہت سے ثقہ لوگ روایت کر رہے ہوں ایک شخص ان سب کے خلاف بالکل نئی بات کہے تو اسے حقیقت نہیں مخالفتِ حقیقت کا نام دیا جائے گا اور راوی کا وہم کہا جائے گا جو علم کی قسم نہیں جہل کی اقسام میں سے ہے۔ اس لئے رسالت کے لفظ سے جب جہالت منفی ہوئی تو مخالفت ثقات بھی منفی ہوئی اور اسی طرح وصف رسالت سے **تین** مطاعن روایت منفی ہوئے۔ جہالت، بدعت، مخالفت ثقات۔ جبرائیلؑ کی دوسری صفت کریم بیان کی گئی ہے۔ کرامت کے لئے حسبِ نص قرآنی تقویٰ لازم ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ.

"تم میں سے سب سے زیادہ کرامت والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ متقی ہو"۔

اور تقویٰ کے معنی حسبِ ارشاد قرآنی دین کے معاملہ میں تذکر ملکہ یادداشت ذکر اور تنقیظ کے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ○

"جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں جب انہیں کوئی جماعت شیطانوں کی چھو دیتی ہے تو وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور اچانک دیکھنے لگتے ہیں"۔

اس سے واضح ہے کہ کرم و متقی یعنی ذاکر و متذکر کبھی غافل وہمی سئی الحفظ اور کثیر الاغلاط نہیں ہو سکتا ورنہ وہ ذاکر ہی کیا؟ اس لئے صفت کرامت سے فرط غفلت، وہم اور سوء حفظ اور کثرت غلط منفی ہو گئے۔ پھر تقویٰ کی ضد فسق و فجور ہے۔ چنانچہ عرف شرع اور لغت میں متقی کا مقابل فاسق آتا ہے۔ اس لئے جو کریم ہو کر متقی ہو گا وہ کبھی فاسق نہیں ہو سکتا۔ تو کریم ہی کے لفظ سے فسق کی صفت بھی منفی ہوئی اسلئے صفت کرامت سے فرطِ غفلت، کثرۃ غلط، وہم، سوءِ حفظ اور کثرت فسق چاروں مطاعن حدیث منفی ہوئے۔

تیسری صفت امین بتائی گئی جو روایت کے بارے میں اصل اصول ہے۔ امانت ضد خیانت ہے اور خیانت فی الروایت کے افراد میں سے کذب اور تہمتِ کذب کا ہونا واضح ہے، اس لئے امانت سے کذب اور تہمتِ کذب کی صفت منفی ہو گئی۔

پس تین مطاعن جہالت، بدعت، مخالفت ثقات صفت رسالت سے منفی ہوئے۔ پانچ مطاعن فرطِ غفلت، کثرتِ غلط، وہم، سوءِ حفظ اور فسق، صفت کرامت سے منفی ہوئے اور دو مطاعن کذب اور تہمت کذب، صفتِ امانت سے منفی ہوئے۔ اس طرح حدیث کے مطاعنِ عشرہ کی جبرائیل امین علیہ السلام سے نفی ہو گئی۔

ادھر مثبت انداز میں انہیں ذی قوت کہا گیا کہ وہ کسی سے دبنے والے نہیں کہ دب کر کچھ کا کچھ کہہ دیں اور جان بوجھ کر دباؤ سے روایت کو غلط کر دیں۔ پھر عند ذی العرش مکین کہا گیا۔ اگر مکین کے معنی مقیم کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ عرش والے خدا کے پاس رہتے ہیں انہیں اس سے غایت درجہ قرب ہے بعد کا نشان نہیں اس لئے ان کا قول بلحاظ روایت بھی محفوظ ہے۔ اور بلحاظ سماع بھی محفوظ ہے نہ سننے میں غلطی، نہ کہنے اور روایت کرنے میں کوئی ادنیٰ قصور، جس کو محدثین کی اصطلاح میں تحمل اور ادا کہتے ہیں۔ یعنی تحمل روایت بھی مضبوط اور اداءِ روایت بھی مضبوط اس سے محدثین کے ان دو اصولوں (تحمل اور ادا) کا ماخذ بھی قرآن ہی ثابت ہوا۔ اور اگر مکین کے معنیٰ ذی عزت کے لئے جائیں تو حاصل یہ ہو گا کہ وہ عند اللہ باعزت اور بارتبہ ہیں۔ بارگاہ حق میں انکا احترام ہے۔ سوایسا مقبولِ خداوندی، روایت میں کزبیونت کیسے کر سکتا ہے؟

پھر انہیں مطاع کہا گیا جس سے ان کی مقبولیت عامہ واضح کی گئی جس سے انکی روایت کا کمال احترام نمایاں ہو تا ہے۔ گویا وہ انکی بات اس درجہ مقبول ہے کہ ملائکہ کا عالم انکی بات سننے کے اشتیاق میں رہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عند اللہ و عند الخلق ان کی محبوبیت و مقبولیت واضح کر دی گئی جس سے راویٔ قرآن کی ذاتی پوزیشن بھی نمایاں ہو گئی اور روایت کے سلسلے کے اوصاف بھی واضح ہو گئے اور ساتھ ہی ان اوصاف کی اضداد بھی منفی ہوئیں تو ثابت ہو گیا کہ قرآن کی روایت جو جبرائیل امین کے ذریعہ پیغمبر تک پہنچی محض اس لئے واجب التسلیم نہیں کہ وہ فرشتہ کی روایت ہے بلکہ اس لئے بھی واجب القبول ہے کہ وہ اصول روایت پر پوری اتر رہی ہے۔ ادھر قرآن کے دوسرے راوی حضرت خاتم الانبیاء ﷺ ہیں، سو ان کی روایت کے بارہ میں بھی محض یہ کہہ دینے پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ پیغمبر اور سرورِ انبیاء و رُسل ہیں۔ لہٰذا ان کی روایت کو مانو۔ بے شک قبولِ روایت کے لئے یہ سب سے بڑا سبب اور محرک ہے۔ مگر ایسا کہہ دیئے جانے سے فنی طور پر اصول روایت کی روشنی میں روایت میں ثبوت نہ ہوتا جو منکر پر بھی حجت بن سکتا۔ س لئے مقدس راویٔ ثانی کی توثیق بھی اصول روایت ہی کے لحاظ سے فرمائی گئی اور چار اوصاف بیان فرمائے گئے۔ تین منفی قسم کے اور ایک مثبت قسم کا۔

منفی اوصاف یہ ہیں کہ آپ مجنون نہیں۔ ظاہر ہے کہ مجنون کی روایت قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتی جب تک راوی عاقل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ غیب کے علم کی اطلاع میں بخیل نہیں بلکہ افادۂ عامہ کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ علم میں بخل ہو تو آدمی اس کے اظہار میں کتر بیونت اور قطع و بُرید کرتا ہے جس سے روایت کبھی پوری ادا نہیں ہوتی اور ناقص روایت سے مفہوم پورا نہیں ہو سکتا جو روایت کا سب سے بڑا عیب اور از قسم خیانت ہے۔ مگر جو شخصیت افادی جذبہ رکھتی ہے اور اس میں علمی بخل کا نشان نہ ہو جو اکثر اربابِ کمال میں ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی شخصیت روایت کی ادا میں ہمہ وقت کوشاں اور منہمک رہے گی اور اس سے نقص روایت کی غلطی کا ہو جانا ممکن نہ ہوگا۔

تیسرے یہ کہ یہ قرآن کسی شیطان رجیم کا قول نہیں بلکہ مقدس پیغمبر کا قول ہے۔ شیطان سرچشمہ ہوتا ہے تمام معائب و خبائث کا۔ اور اس کے بالمقابل پیغمبر سرچشمہ ہوتا ہے تمام محاسن و کمالات کا جس سے پیغمبر کی جامعیت کمالات واضح کی گئی ہے جو روایت کی توثیق کے لئے کافی دلیل ہے۔

چوتھا وصف فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے جبرائیل کو افق مبین میں دیکھا ہے یعنی آپؐ جس راوی سے قرآن کی روایت لے رہے ہیں اس کا مشاہدہ آپ کو حاصل ہے جو روایت میں ایک بنیادی اور اہم مقام ہے۔ پس پیغمبرؐ میں جامعیت کمالات ثابت کر کے تو تمام ان مطاعن کی نفی کر دی گئی جو جبرائیل سے کی گئی تھی اور رویت جبرائیل کا ذکر کر کے روایت کی بناء مشاہدہ پر ثابت کی گئی جو اصول روایت کے لحاظ سے بنیادی چیز ہے۔

روایت صحیح لذاتہ اور آیاتِ قرآنی:

اس سے واضح ہو گیا کہ قرآن حکیم نے نہ صرف اوصاف روایت کے دو بنیادی اصولوں عدالت اور ضبط ہی کو سامنے کر دیا بلکہ ان دو کی ضد سے جو اوصاف ذمیمہ اور روایت کے حق میں دس مطاعن پیدا ہوتے تھے ان کی بھی تفصیل فرما دی۔ بالفاظ دیگر فن روایت کی فنی بنیادیں کھول دیں جن سے صحیح روائتوں کا آئینی وجود عمل میں آیا اور فن روایت دنیا میں ظاہر ہوا جو اب تک نہ تھا۔ ساتھ ہی محدثین کی جلالتِ قدر بھی واضح ہو گئی کہ انہوں نے فن روایت کے وہ تمام اصول نکھار کر سامنے رکھ دئے جن کی بنیادیں قرآن نے قائم کی تھیں۔ یعنی اتباع قرآن کی برکت سے ان کا ذہن ان تمام اصول روایت تک پہنچ گیا جو قرآن کے نظم میں لپٹے ہوئے بطور مخفی خزانہ کے محفوظ تھے۔

ظاہر ہے کہ جب اوصافِ رواۃ کے لحاظ سے حدیث کی بنیادی قسم صحیح لذاتہ ہے جس کے بنیادی اوصاف دو ہیں عدالت و ضبط اور ان دو کے فقدان سے اس کے منفی اوصاف دس ہیں۔ فقدان عدالت سے پانچ۔ کذب، تہمتِ کذب، فسق، جہالت، بدعت اور فقدان ضبط سے پانچ۔ فرط غفلت، کثرت غلط، مخالفت ثقات، وہم، سوءِ حفظ اور ان سب مثبت و منفی اوصاف کو صاف صاف قرآن حکیم نے بیان ہی نہیں کیا، بلکہ ان کی بنیادیں رکھیں۔ کسی کی عبارت النص میں اور کسی کی دلالت و اقتضاء میں اور پھر ان بنیادوں پر آئی ہوئی

روایتوں پر دین و دنیا کے سارے معاملات فیصل کرنے کی بنیاد رکھی۔ اس لئے حدیث صحیح لذاتہ کا انکار در حقیقت قرآن کی سینکڑوں آیتوں کا انکار ہے اس لئے کسی منکر حدیث کے لئے جو اتباع قرآن کا نام نہاد مدعی ہے۔ کم از کم اس روایت سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی جس کا نام صحیح لذاتہ ہے۔

اب رہیں اس دائرہ کی دوسری انواعِ حدیث جن کی تفصیل ابھی گزری۔ سو وہ اسی صحیح لذاتہ سے پیدا شدہ ہیں کیونکہ صحیح لذاتہ کے راویوں کے اوصاف عدالت و ضبط میں نقصان یا فقدان سے یہ قسمیں حسب مراتب نقصان و فقدان بنتی ہیں۔ اس لئے یہ ساری قسمیں اسی صحیح لذاتہ کی شاخیں اور فروع مانی جائیں گی۔ کیونکہ ان کا وجود ہی لذاتہ کی طرف نسبت ہو جانے سے بنتا ہے۔

چنانچہ ان کی تعریف میں اولاً اسی کا ذکر آئے گا اور کہا جائے گا کہ صحیح کے خلاف وصف کی کمی سے فلاں قسم بنی اور فلاں وصف کے نقصان سے فلاں قسم۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان اقسام کا وجود بھی بلا صحیح لذاتہ کے ذکر کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ تو یہ اسی کی کھلی علامت ہے کہ ان اقسام کا کوئی اپنا مستقل وجود نہیں بلکہ صحیح لذاتہ اور اس کے رواۃ کے احوال و اوصاف کا ماٰخذ قرآن حکیم ہے تو ان توابع اور فروع کا ماٰخذ بھی قرآن ہی مانا جائے گا۔ ورنہ ان کی ثابت شدہ تبعیت اور فرعیت باقی نہ رہے گی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اقسام ہی باقی نہ رہیں گی۔ اس لئے لامحالہ جیسے یہ وجود میں صحیح لذاتہ کے تابع ہیں ایسے ہی ثبوت میں بھی اسی کے تابع رہیں گی اور اس صحیح لذاتہ کا ثبوت قرآن سے واضح ہے۔ جیسا کہ ابھی تفصیل سے عرض کیا گیا تو ان کا ثبوت قرآن سے ثابت ہو گیا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تخم کا معدن تو زمین ہو اور شاخوں کا معدن زمین نہ ہو۔

حدیث میں جرح و تعدیل کا معیار بھی قرآن ہے:

بہر حال ہم نے جنسِ حدیث کا ثبوت آیت ان علینا بیانہ سے پیش کیا۔ تعداد رواۃ کے لحاظ سے حدیث کی چار بنیادی قسموں میں سے ایک قسم متواتر کا ثبوت مجموعہ قرآن کی روایت اور پھر قرآن کے قرآن ہونے کی خبر سے پیش کیا جس کے ضمن میں جنس حدیث اور نفس روایت کا بھی مکرر ثبوت ہو گیا اور پھر ان چار میں سے بقیہ تینوں قسموں خبر مشہور، خبر عزیز، خبر غریب کا ثبوت الگ الگ صریح آیات سے پیش کیا۔ جس سے اندازہ ہونا چاہئے کہ راویوں کی عددی قلت و کثرت اور وحدت و تعدد کے میعار سے روایت کی جو بنیادی قسمیں بنتی ہیں اور محدثین نے فن مصطلحات الحدیث میں ذکر کی ہیں۔ ان سب کی بنیادیں قرآن حکیم ہی کی قائم کردہ ہیں۔ پھر اسی طرح راویوں کے وہ اوصاف و اخلاق جن سے ان کی روایت قابلِ قبول بنتی ہیں اور پھر ان میں بھی وہ مرکزی صفات جن کی طرف تمام اوصاف رواۃ رجوع کرتے ہیں، قرآن حکیم ہی نے متعین فرمائے اور وہ عدالت و ضبط ہیں جن کے لئے دو واضح آیات پیش کی گئیں۔ پھر ان کے نقصان و فقدان سے جو دس مطاعن پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیں بھی قرآن ہی نے قائم کیں۔

غرض حدیث کی روایت کے اصول و فروع کی تاسیس قرآن نے کی۔ جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ

حدیث کی جنس ہی نہیں بلکہ اس کی بنیادی قسموں اور اساسی اوصاف تک کی بنیاد بھی قرآن حکیم ہی نے رکھی ہے اور کیوں رکھی؟ جواب یہ ہے کہ خود اپنی ہی ضرورت سے اسے اپنی شرح و تفسیر منظور تھی تو اس نے روایت و خبر اور حدیث کے موضوع سے دنیا کو آشنا کیا جس سے اقوامِ عالم بے خبر تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ روایت و سند کیا چیز ہے؟ اس کے صحت و سقم کا میعار کیا ہے؟ عدداً کیا ہے؟ اور صفتہً کیا ہے؟ اور اس کے معیار سے طبعی طور پر کتنی قسمیں بن سکتی ہیں؟ جس میں سے بعض سے پیدا شدہ ہو سکتی ہیں۔ ان کے اعتبار و حجت کے مراتب و درجات کیا ہونے چاہئیں۔ ان کے احکام و شرائط کیا ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تاکہ اس فنی طریق روایت سے پیغمبر کے اقوال و افعال امت کے سامنے آئیں اور کلامِ الٰہی کی قولی و عملی تفسیر سنیں اور دنیا اسوۂ حسنہ سے روشناس ہو اس لئے اسناد و روایت اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے جو دوسرے مذاہب کو میسر نہیں۔ کیونکہ قرآن نے ہی اس طرق استناد و تحقیق اور تمیین روایت کی اساس قائم کی ہے جس پر وہ خود بھی قائم ہے اور اس کا بیان (حدیث) بھی قائم ہے۔

دین کو بے اعتبار بنانے کے لئے قرآن کا غلط استعمال

اس لئے اسلام کے دشمنوں بالخصوص یہود و نصاریٰ اور ان کی نفسانی اولاد پر جو ان ہی کے رنگ پر پلی اور ان ہی کی قے چاٹ کر پروان چڑھی۔ اسلام کا یہ امتیازی نشان شاق ہوا تو انہوں نے **حسدا من عند انفسھم** اسے میٹ دینے کی کوشش کی۔

حدیث اور اس کے ساتھ قرآن کے طریق روایت پر شکوک و شبہات وارد کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے دین سے بیزار کرنا چاہا لیکن اس کے اصلی محافظ نے جو اس کا نازل کنندہ ہے اس کی حفاظت کی اور ان کی تمام مساعی رائیگاں گئیں۔ تب انہوں نے کمالِ نفاق سے آخری حربہ قرآن کے نام پر قرآنی دین کی روایات کو بے اعتبار بنانے اور بیان قرآن یعنی حدیث کو دنیا سے محو کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن قرآن نے انہیں پھٹکار دیا اور انکی دسیسہ کاریوں کو انہی کے منہ پر مار کر ان کے علی الرغم حدیث و روایت کے سلسلے میں حدیث، سندِ حدیث، مطاعنِ حدیث، اوصافِ رواۃ، عددِ رواۃ، اس عدد کی قلت و کثرت سے پیدا شدہ اقسام حدیث، اوصاف رواۃ، اور انکے قوت و ضعف کے معیار سے حاصل شدہ انواع روایت وغیرہ کا مآخذ قرآن نے خود اپنے کو بتایا تا کہ کسی بوالہوس کو قرآن کی آڑ لے کر خود اسی کے بیان کو بے اعتبار بنانے کی جرأت نہ ہو۔

پس روایات حدیث عددی قسم کی ہوں یا وصفی قسم کی قرآن سے باہر نہیں جا سکتیں۔ جبکہ قرآن ہی ان کے حق میں مؤسس ہے اور وہ کسی انسان کی اختراع و ایجاد سے پیدا نہیں ہو گئیں۔ البتہ ان کے اسماء والقاب اور ان کے احوال کی معبر اصطلاحات علماء نے ان کے مناسب حال خود تجویز کر لئے، سو اصطلاح کی تجویز کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ حقائق بھی ان کی اختراع کردہ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب حدیث کی قسموں

کے یہ معیاری اصول اور ان کی بنیادی انواع واقسام قرآن کی تاسیس سے قائم شدہ ہیں اور وہی ان کی فروعی اقسام کا بھی بواسطہ اصول مآخذ ہے تو انکارِ حدیث درحقیقت انکارِ قرآن ہے۔ اور حدیث کی حجیت کا انکار فی الحقیقت قرآن کی حجیت کا انکار ہے۔

قرآن و مراداتِ خداوندی کی رسول اللہ تک منتقلی

پھر یہی نہیں کہ حدیث کی یہ بنیادیں ہی قرآن نے قائم کی ہیں۔ اور وہ ان کے حق میں صرف مآخذ ہی ہے بلکہ غور کیا جائے تو قرآن ہی نے حدیث کو محفوظ من اللہ ہونے کا بھی دعوے کیا ہے جس کے بعد انکار حدیث کی نہ صرف یہ کہ گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ یہ انکار پہاڑ سے سر پھوڑنے کے مترادف ثابت ہوتا ہے جس سے منکر کے ایمان میں تو یقیناً خلل پڑ سکتا ہے لیکن روایت وحدیث کے نظم میں کوئی ادنیٰ خلل نہیں آسکتا۔

وجہ یہ ہے کہ قرآن کے ارشاد کے مطابق قرآن فہمی بلا بیان کے نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ بیان ہی سے مراداتِ خداوندی کھل سکتی ہیں، اس لئے قرآن کی حفاظت کے معنی صرف اس کے لحاظ کی حفاظت کے نہیں ہو سکتے بلکہ قرآن مع بیان کی حفاظت کے ہوں گے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں ایک درجہ الفاظ و تعبیرات کا ہے جس کا تعلق قرأۃ خداوندی اور پیغمبر کی لسانی حرکت سے ہے اور ایک درجہ معانی و مطالب اور مراداتِ خداوندی کا ہے جس کا تعلق بیانِ خداوندی یا بیانِ نبوی ؐ سے ہے۔

پس قرآن کے تحفظ وبقاء کے معنی یہ ہیں کہ اس کے الفاظ و تعبیریات بھی محفوظ ہوں اور معانی و مرادات یعنی بیان بھی محفوظ ہو۔ ورنہ اگر الفاظ کی حفاظت ہو جائے اور معانی کی رہ جائے تو گویا نصف قرآن کی حفاظت ہوئی اور نصف غیر محفوظ رہ گیا۔ یا معانی کی حفاظت تو کی جائے اور الفاظ و تعبیرات کی چھوڑ دی جائے تو پھر بھی وہی نصف قرآن کی حفاظت ہوئی اور نصف کی رہ گئی۔

اس لئے مکمل حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب لفظ و معنی اور قرآن و بیان دونوں محفوظ کر دیئے جائیں ورنہ ناقص حفاظت ہوگی جسے حفاظت نہیں کہا جا سکتا۔ حالانکہ دعویٰ حفاظت کاملہ کا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ لفظ "**حافظون**" کے مطلق لانے سے واضح ہے۔ اس بناء پر حق تعالیٰ نے دونوں ہی کی حفاظت کا ذمہ لیا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا محفوظ رہنا دشوار تھا۔ چنانچہ جہاں تک حضور ﷺ کی ذات کا تعلق ہے، حق تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری "**علینا**" کے کلمہ سے فرمائی جو اپنے اوپر لازم کر لینے کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی "**علینا**" ہی کے کلمہ سے تو قرآن کی جمع و حفاظت کا سینۂ نبوی میں ذمہ ظاہر فرمایا اور ظاہر ہے کہ قرآن کے معنی "**ما یقراء**" کے ہیں۔ یعنی پڑھے جانے کی چیز، اور پڑھے جانے کی چیز ظاہر ہے کہ الفاظ ہی ہیں معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے **ان علینا جمعه و قرانه** سے تحفظ الفاظ کا وعدہ ہوا، پھر **علینا** ہی کے کلمہ سے حضور ﷺ کے لئے ان الفاظ کے مطالب و مرادات کھول دینے کا ذمہ لیا جسے بیان کہتے ہیں کیونکہ بیان کے معنی کھول دینے اور واضح کر دینے کے ہیں اور واضح معانی ہی کیے جاتے ہیں جو لفظوں میں مخفی اور لپٹے

ہوئے ہوتے ہیں نہ کہ خود الفاظ کہ وہ ہر ایک حرف شناس کے لئے واضح ہوتے ہیں اسلئے ثم ان علینا بیانه سے اس بیان کی حفاظت کی ذمہ داری واضح ہو گئی۔ پھر ثم کا لفظ بھی اس کی کھلی دلیل ہے کہ اس کے بعد علینا سے جو ذمہ داری لی جارہی ہے اس کا پہلی ذمہ داری سے تعلق نہیں ورنہ ثم کالانا عبث ہو جائے گا۔

پس علینا کا تکرار اور ثم سے ان دونوں میں فصل ان دو ذمہ داریوں کو کھلے طور پر واضح کر دیتا ہے۔ ایک الفاظِ قرآن کی حفاظت کی اور ایک بیانِ قرآن کی حفاظت کی۔ ظاہر ہے کہ اس بیان کو جو قرآن کے بارہ میں سینۂ نبوی میں ڈالا گیا۔ جس تعبیر سے بھی ڈالا گیا ہو۔ جب وہ حضور ﷺ کے سینہ مبارک میں کسی ملفوظ کی شکل میں خطور کرے تو وہی حدیث نبویؐ ہے جس کا مضمون تو من اللہ ہے اور الفاظ من الرسول اور ثم علینا سے اسی بیان کو سینۂ نبویؐ میں محفوظ کر دینے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے فرمائی تو دوسرے لفظوں میں حدیث کے تحفظ کی ذمہ داری رسول کی ذات کی حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گئی۔ پس اگر قرآن (مایقراء) ضائع نہیں ہو سکتا تو بیان (مایبین) بھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ نے پہلی چیز یعنی الفاظ تو رسول تک بذریعہ قرأۃ پہنچائے۔ چنانچہ کہیں فاذا قرأناه (جب ہم قرأۃ کرنے لگیں) فرما کر اپنے کو قاری ظاہر فرمایااور کہیں نتلوا علیك (ہم تم پر اے نبی تلاوت کرتے ہیں) فرما کر اپنے کو تلاوت کنندہ فرمایا۔

ادھر دوسری چیز یعنی مراد و مطالب کا بیان رسول تک بذریعہ تعلم پہنچایا۔ کیونکہ علم کا موضوع الفاظ کو پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کی معانی و مطالب کا سمجھانا ہوتا ہے اور اسی کو تعلیم کہتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے ہی کو معلم رسول فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا

"اور ہم نے تعلیم دیں تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے اور تھا تم پر اللہ کا بڑا فضل"۔

کہیں اس تعلیم کو ہدایت کے لفظ سے تعبیر فرمایا جس کا تعلق الفاظ سے نہیں معانی ہی سے ہے۔ چنانچہ کتابِ الٰہی اور ایمان باللہ کے بارہ میں اپنا احسان جتاتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہی اے نبی تمہیں ایمانی مقاصد کی ہدایت کی ورنہ تم اس سے پہلے ان باتوں سے واقف نہ تھے۔

مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا.

بہر حال قرآن کے الفاظ اور معانی تلاوت اور ہدایت و تعلیم کے ذریعہ پیغمبر ﷺ تک بحفاظت تمام پہنچ گئے اور سینۂ نبوت میں جمع اور محفوظ ہو گئے۔

قرآن و مراداتِ خداوندی کی ہر دور میں منتقلی:

مگر سب جانتے ہیں کہ قرآن اتارنے کا مقصد قیامت تک کے انسانوں کی تکمیل ہے جیسا کہ انی رسول اللہ الیکم جمیعاً سے واضح ہے۔ اسلئے محض رسول کی تعلیم اور ان پر تلاوت کر دینے سے یہ مقصدِ عظیم پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ یہ قرآن و بیان ساری امت تک اسی حفاظت سے نہ پہنچ جائے اور تاقیامِ قیامت اسی طرح محفوظ نہ ہو جائے جس طرح رسولؐ تک پہنچا اور محفوظ ہو گیا۔ تو حق تعالیٰ نے اسی

تلاوت اور تعلیم وہدایت کا ذمہ جو رسول کے لئے خود لیا تھا امت رسول کے لئے وہی ذمہ رسول کے سر عائد فرمایا کہ وہ امت کے لئے تلاوتِ آیات بھی کریں تا کہ الفاظِ قرآنی امت تک پہنچ جائیں اور تعلیم وہدایت کا سلسلہ بھی قائم کریں تا کہ مطالب ومراداتِ الٰہی بھی امت تک پہنچ جائیں اور اس طرح قرآن وبیان کے کمال امانت ودیانت آگے تک پہنچتے رہنے کا سلسلہ قائم فرمادیں۔ چنانچہ رسول ﷺ کی ذمہ داریاں ظاہر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍo وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ.

"تحقیق احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنین پر جبکہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کو پاکیزہ بناتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے، اور دوسرے ان لوگوں میں جو اب تک ان سے ملے ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے"۔

اس میں وہی تلاوت اور تعلیم کی ذمہ داری رسول پر ڈالی گئی ہے جس کی ذمہ داری رسول تک پہنچانے کی خود حق تعالیٰ نے لی تھی۔ یہاں تک تو رسول پر منصبی ذمہ داری عائد کردیے جانے کی اطلاع تھی۔

لیکن یہ کہ رسولؐ نے ذمہ داری کو عملی جامہ پہنایا یا نہیں؟ اور قرآن کے ساتھ بیانِ قرآن امت تک پہنچ گیا یا نہیں؟ تو تعلیم کے بارے میں فرمایا کہ:

وَيُعَلِّمُكُمْ مَالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

"اور تمہیں وہ تعلیم دیتا ہے اس کی جو تم نہیں جانتے تھے"

اور ہدایت کے بارے میں فرمایا کہ:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

"اور آپؐ اے پیغمبر! البتہ ہدایت کرتے ہیں سیدھے راستے کی"۔

ادھر بیان کے بارے میں فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

"اور ہم نے اے پیغمبر! ان کی طرف یہ ذکر (قرآن) اتارا، تا کہ آپ لوگوں کے لئے اس چیز کو کھول کھول کر بیان کردیں جو ان کی طرف اتارا گیا ہے"۔

غرض جو تلاوت تعلیم بیان اور ہدایت اللہ سے رسول کی طرف آئی تھی، بعینہٖ اسی کا رسول سے امت کی طرف آنا بھی ثابت ہوگیا اور خوب خوب نمایاں ہوگیا کہ قرآن کے ساتھ ابتدائے نزولِ قرآن سے بیان لازم رہا ہے، کیونکہ بلا بیان کے قرآن لفظِ محض ہوگا۔ جس کی مرادات اور مطالب کی تعین و تشخیص

لوگوں کی اپنی ہوگی جو محض ظنی اور قیاسی رہ جائے گی۔

اس لئے تلاوت و قرأت کے ساتھ تعلیم و ہدایت اور بیان کی ذمہ داری خود صاحبِ قرآن نے لی۔ جس سے صاف واضح ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی منزل من اللہ ہیں اور معانی و مرادات بھی منزل من اللہ ہیں جن کے اظہار کا نام بیان ہے۔ اس لئے قرآن کے بارہ میں اولین قاری حق تعالیٰ نے اپنے کو فرمایا۔ جیسا کہ **فاذا قرأناه** سے ظاہر ہے۔ ورنہ **فاذا قرأه** فرمایا جاتا۔

اسی طرح بیان کے بارے میں اولین مبین اور مفسر قرآن بھی خود اپنے ہی کو فرمایا جیسا کہ **ثم ان علينا بيانه** سے ظاہر ہے ورنہ **ثم ان اليك بيانه** فرمایا جاتا۔

پس اپنے ہی کو قاری اول اور اپنے ہی کو مبین اول فرما کر گویا اس کا دعویٰ فرمایا کہ الفاظ قرآن ہوں یا مطالب قرآن یعنی بیان، دونوں ہمارے ہی نازل کردہ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی رسول کی انشاء یا ایجاد کو دخل نہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ لفظ بلا معنی مراد کے کار آمد ہیں اور نہ مراد بلا مقررہ الفاظ کے تعبیر میں آسکتی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر جہاں بھی نزولِ قرآن کا ذکر ہوگا۔ وہاں نزولِ بیان بھی ساتھ ساتھ مراد لینا ضروری ہوگا کہ بغیر نزولِ معنی کے نزولِ الفاظ بے معنی ہیں۔

ایسے ہی جہاں بھی حفاظتِ قرآن کا ذکر ہوگا وہاں یہ بیان قرآن بھی اسی حفاظت میں شامل رکھا جانا ضروری ہوگا کہ بغیر حفاظت بیان کے قرآن کے الفاظ کی حفاظت بے معنی ہوگی۔ پس جبکہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ

"ہم ہی نے ذکر (قرآن) اُتارا۔"

تو اس کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ ہم نے صرف الفاظِ قرآن بلا معنی مراد کے اتار دیئے۔ یا معانی بلا الفاظ کے نازل کر دیئے۔ بلکہ یہی اور صرف یہی مطلب لیا جائے گا کہ پورا قرآن یعنی الفاظ و معانی کا قرآن اتارا جس کے الفاظ بھی ہمارے ہی تھے اور معانی بھی ہمارے۔ کیونکہ ہم نے ہی سے پڑھ کر رسول کو سنایا اور قرأت الفاظ کی ہوتی ہے اور ہم نے ہی بیان دے کر رسول کو سمجھایا اور سمجھانا معانی مراد کا ہوتا ہے۔

غرض یہاں ذکر سے قرآن مع بیان مراد ہوا۔ پس کہ وہ دونوں نازل کردہ ہیں۔ اسی طرح جبکہ اسی آیت کے اگلے ٹکڑے میں قرآن کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ

"اور ہم ہی اس قرآن کے محافظ ہیں"۔

جس میں لہٗ کی ضمیر اسی ضمیر کی طرف راجع ہے جس کے معنی قرآن مع بیان کے تھے، تو یہاں حفاظت کے دائرہ میں بھی وہی قرآن مع بیان ہی مراد لیا جانا ضروری ہوگا اور محافظت کا تعلق دونوں ہی سے ماننا پڑے گا کہ قرآن اور اس کے بیان کے ہم ہی محافظ ہیں۔ ورنہ یہ حفاظت مکمل نہ رہے گی۔ بلکہ ادھوری اور ناقص رہ جائے گی حالانکہ آیت میں **لحافظون** مطلق لایا گیا ہے جس سے اصول عربیت کے مطابق

حفاظت کا فردِ کامل مراد لیا جانا ضروری ہے اور حفاظتِ کاملہ وہی ہے جو لفظ و معنی اور قرآن و بیان دونوں کو شامل ہو۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے۔

اس لئے آیت کے دعوے کا حاصل یہ نکلا کہ ہم ہی قرآن کے لفظوں کے بھی محافظ ہیں اور ہم اس کے معنی اور بیان کے بھی محافظ ہیں، ورنہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے کہ وہ اس کے الفاظ کے تو محافظ ہوں اور معانی کے نہ ہوں۔ درحالیکہ الفاظ کا مقصد معنی ہوتے ہیں۔ جب مقصد ہی محفوظ نہ رہا تو وسائل محضہ کے محفوظ رہنے سے فائدہ ہی کیا ہوا؟ ایسے ہی یہ بھی مطلب نہیں ہو سکتا کہ ہم اس کے معنی کے تو محافظ ہیں لفظوں کے نہیں درحالیکہ تعبیرات گم ہو جائیں تو معانی کی طرف رہنمائی ممکن نہیں۔ کیونکہ بغیر الفاظ کے معانی موجود ہی نہیں رہ سکتے چہ جائیکہ محفوظ رہیں۔

ہاں یہ صورت اس وقت بن سکتی تھی کہ **لحافظون** کو لفظ یا معنی کے ساتھ مقید کر کے لایا جاتا۔ تو جس کی قید لگی ہوتی صرف اسی کی حفاظت مراد ہوتی۔ لیکن مطلق لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ لفظ و معانی دونوں ہی اس حفاظت کے نیچے آئے ہوئے ہیں۔

بہر حال لفظ و معنی اور قراءۃ و بیان میں سے ایک بھی گم ہو جائے تو ذکر کی حفاظت باقی نہیں رہ سکتی، جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے بلکہ ذکر ہی سرے سے باقی نہیں رہے گا۔ چہ جائیکہ وہ محفوظ رہے۔

تا قیامِ قیامت حفاظتِ قرآن

پھر جیسا کہ **لحافظون** کا کلمہ اپنے مشمولات کی رو سے مطلق ہے جس میں لفظ محض یا معنی محض مراد نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اپنے اطلاق کی وجہ سے دونوں ہی کو شامل ہوگا۔ ایسے ہی یہ کلمہ (**لحافظون**) زمانوں کے لحاظ سے بھی مطلق ہے جس میں کسی زمانہ کی قید لگی ہوئی نہیں ہے کہ یہ حفاظتِ لفظ و معنی صرف ماضی کی حد تک تھی یا صرف مستقبل اور حال کے لئے ہے بلکہ ہر زمانہ اس کے اطلاق کے نیچے داخل ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ ہم ماضی و حال اور مستقبل ہر زمانہ میں اس کے محافظ ہیں۔

اندریں صورت کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس کی حفاظت کو زمانۂ نبویؐ یا زمانہ صحابہؓ کے ساتھ مقید کر دے ورنہ کلامِ خداوندی کے اطلاق کی تقید لازم آئے گی جو تبدیل و تحریف کے ہم معنی ہے۔ اس لئے اس حفاظتِ الٰہی کا دوام بھی اسی آیت سے ثابت ہو رہا ہے۔

بہر حال قرآن کے لفظ و معنی کی جو حفاظت خداوندی قراءۃ و بیان کے ذریعہ حسب دلالت **علینا جمعه** اور **علینا بیانه** رسول کی ذات کی حد تک ثابت ہوئی تھی وہی حفاظت الٰہی اس قرآن و بیان کی امت کی حد تک اور وہ بھی تا قیامِ قیامت اس آیت کریمہ سے ثابت ہو گئی۔ خواہ اس کا طریقہ محض نقل و روایت ہو یا خط و کتابت۔ سو رسول کی حد تک تو یہ قرآن و بیان بصورت الہامِ خداوندی روایتِ باطنی کے طور پر محفوظ رہا اور امت کی حد تک بصورتِ نقل و روایت ظاہری یا تحریر و کتابت کے طور پر محفوظ رکھا گیا۔ اس لئے اس

بیانِ قرآن یعنی حدیث کا تحفظ من جانب اللہ، اللہ سے رسول تک اور رسولؐ سے امت تک اور وہ بھی تاقیامت قرآن سے ثابت ہو گیا۔ **فللہ الحمد**

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اسلام آخری اور دائمی دین ہے اور قرآن آخری ودائمی کتاب ہے تو یہ آیت حفاظت اور اس کا دعوائے حفاظت بھی دوامی اور قیامت تک ہونا چاہئے ورنہ قرآن کے ایک جزء کے بھی دوامی نہ رہنے سے قرآن دائمی نہ رہے گا اور جب کہ اللہ کا یہ دعوائے حفاظت قرآن و بیان دائمی مانا جائے تو فعل حفاظت بھی دوامی ہی ماننا پڑے گا۔ ورنہ اللہ کے دعوائے حفاظت کا غیر واقعی ہونا لازم آئے گا۔ اس لئے حفاظتِ قرآن و بیان کا قیام قیامت تک وقوع میں آتا رہنا ضروری ہوگا جس سے پوری امت کی حد تک قرآن اور اس کے بیان یعنی حدیث کا قیامت تک محفوظ من اللہ ہونا خود اس آیت کی دلالت سے ہی ثابت ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے الفاظ و مرادات کو اپنی حفاظت کے ساتھ سینۂ نبوت میں اتار کر جمع اور محفوظ کر دیا تھا۔ ایسے ہی اس کے رسول نے بھی اسی حفاظت خداوندی کی مدد سے قرآن و بیان کو سینۂ امت میں منتقل فرمادیا اور اس طرح قرآن و حدیث بحفاظت الٰہی قیامت تک کی امت کتب بتمام و کمال پہنچ گئے۔ فرق اتنا ہے کہ خدا سے نبی تک قرآن و بیان بلا توسط اسباب محض باطنی رشتوں سے منتقل ہوا اور رسولؐ سے امت تک کھلے طور پر بتوسط اسباب منتقل ہوتے رہنے کا راستہ ہموار ہوا۔

چنانچہ جس طرح حفظ قرآن کے ذریعہ قرآن کے الفاظ کی حفاظت کرائی گئی کہ تواتر طبقہ کے ساتھ قرآن کی روایت کی جاتی رہے گی اور وہ ہر قرن میں لاکھوں سینوں کی امانت بنا رہا اور بنا رہے گا۔ ایسے ہی حفاظ حدیث کے ذریعہ حدث یعنی اس بیان قرآن کی حفاظت کرائی گئی کہ حفاظتِ خداوندی نے انہیں محیر العقول حافظے عنایت کئے۔ انہوں نے اعجازی طور پر حدیث کے متنوں اور اسانید کو سلف سے خلف تک فنی طور پر پہنچایا جو دیا تا ہی نہیں قانوناً بھی قابل ردیا نا قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں اور حدیث لاکھوں سینوں کی امانت بن گئی۔

پھر جس طرح مفسرین نے قرآنی علم کی حفاظت کے لئے سینکڑوں مستقل علوم و فنون وضع کئے جن کا نام تک بتلانے کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئیں جیسے **الاتقان فی علوم القران**، علامہ سیوطیؒ کی یا جواھر القرآن غزالی کی وغیرہ وغیرہ، جس سے قرآنی علم کی انواع کھلیں اور قرآن اپنی ایک ایک لفظی اور معنوی حیثیت سے محفوظ ہو گیا جس کی بدولت حفاظت کنندہ، ایک طبقہ نے اس کے الفاظ کی حفاظت کی جو حفاظ کہلائے جو ہر قرن میں ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں رہے اور اب بھی ہیں۔

ایک طبقہ نے اس کے اعراب کی حفاظت کی اور زیر و زبر لگائے تاکہ حفاظ کی حفاظت الفاظ باضابطہ رہے۔ اسکے حروف، کلمات، رکوع اور سورتیں سب گن گن کر رکھ دیں اور بکمال ضبط و حفظ گن کر محفوظ کر دیں۔

ایک طبقہ نے اس کے طرز اداء کی حفاظت کی جو قراء و مجودین کہلائے۔ ایک طبقہ نے اس کے طرز کتابت کی حفاظت کی جو علمائے رسم الخط کہلائے۔ ایک طبقہ نے اس کے لغات و محاورات کا تحفظ یا جو علمائے

مفردات کہلائے۔ پھر اس کے بیان کی روشنی میں جس کا نام سنت اور اسوہ حسنہ ہے خواہ قولی ہو یا فعلی، معانی کی مختلف جہات کا تحفظ مختلف طبقات نے اپنے ذمہ لیا اور ان حفاظتوں کو مختلف علوم وفنون کی حیثیت دی۔

ایک طبقہ نے تفسیر باللغۃ کی اور اس کی وجہ فصاحت وبلاغت کو واضح کیا جو علمائے عربیت کہلائے۔

ایک طبقہ نے تفسیر بالروایت کی جو اہل الاثر کے نام سے موسوم ہوئے۔ ایک طبقہ نے اس کی جزئیات مستنبطہ کی حفاظت کی جو فقہاء کہلائے۔

ایک طبقہ نے درایت سے اس کے عقلی پہلوؤں کو واضح کیا جو حکماء اسلام اور اہل کلام کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس کی کلیات وجزیات میں سے علل احکام کا استخراج کر کے اس لاء اور قانون کی صورت میں پیش کیا جو آئمہ ہدایت اور مجتہدین کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس کے مواعظ وحکم اور امثال وعبر کی نگہداشت کی جو خطباء کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس کے وقائع اور قصص کی تبیین اور تفصیل کی جو مؤرخین کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس کے جزئی معانی سے اصل وکلیات کا استنباط کیا جن سے اس کے علم کا انضباط ہوا اور وہ مفکرین امت کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس سے مسائل استخراج کرنے کے لئے وجوہ استخراج منضبط کئے اور ان کی جامع اصطلاحات ناسخ ومنسوخ محکم ومتشابہ خاص وعام، مطلق ومقید، عبارت ودلالت، اقتضاء واشارۃ مجمل ومفسر وغیرہ وضع کیں جو علماء اصول کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس سے اقوامِ عالم کی ذہنیتوں، فطرتوں اور ان کے عروج وزوال کے سیاسی اصول منضبط کئے جو علمائے ادارۃ کہلائے۔

ایک طبقہ نے اس سے باطنی علوم وحقائق نفسیات کے انقلابی طرق اور شہود وانکشاف قواعد نکال کر ان کی حفاظت کی جو عرفاء کہلائے۔

غرض قرآن حکیم کی لفظی اور معنوی جہت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی حیرت انگیز حفاظت نہ کی گئی ہو اور وہ بھی اس شان سے کہ کوئی طریق حفاظت اختراعی نہیں، بلکہ استنباطی ہے جو قرآن اور بیانِ قرآن سے ماخوذ اور ہر علم وفن کے اصول کے لئے احادیث وآیات سے شواہد موجود۔

چنانچہ ان علوم میں سے جس علم کو بھی اُٹھا کر دیکھا جائے وہ کسی نہ کسی آیت یا روایت کی تفسیر نظر آتا ہے جس کے مسائل کے لئے کسی نہ کسی آیت اور حدیث سے شاہدِ عدل پیش کر دیا گیا ہے۔

گویا قرآن کے ان علوم کی طرف سنت نے رہنمائی کی نہ کہ ان علماء کی طبائع یا عقول محض نے، اور اگر کہیں عقل صافی سے بھی کام لیا گیا ہے تو اسے نورِ سنت سے مستنیر بنا کر ہی قابلِ التفات سمجھا گیا ہے۔ جس سے دنیا آج تک انگشت بدنداں ہے۔ ولو کرہ الکافرون۔

حدیث کی حفاظت کے مختلف ادوار:

پھر جس طرح امت کے ہاتھوں کلام خداوندی کی حفاظت من جانب اللہ کرائی گئی بعینہٖ اسی طرح بیانِ قرآن یعنی حدیث کی حفاظت کے لئے بھی حق تعالیٰ نے امت مرحومہ کو موفق فرمایا اور اس امت نے جس طرح تحفظ کتاب میں حیرت انگیز سعی کر کے دکھلائی اس سے کہیں زیادہ سنت کے تحفظ میں سرگرمی کا حق ادا کیا اور وہ کچھ کر دکھایا جو دنیا کی کوئی قوم اپنی کسی سماوی کتاب کے ساتھ بھی نہیں کر سکی۔

فرق صرف یہ تھا کہ کلامِ الٰہی کی وحی چونکہ بلفظہٖ نازل ہوئی تھی اس لئے وہاں الفاظ کا تحفظ بھی لازمی تھا کہ وحی ہی کلامی اور معجزہ ہی کلام کا تھا مگر اس وحی غیر متلو (سنت) میں معانی و مضامین تو من جانب اللہ تھے۔ مگر الفاظ من اللہ نہ تھے۔ اس لئے یہاں تحفظ الفاظ بجنسہٖ ضروری نہ تھا بلکہ روایت بالمعنیٰ کی بھی اجازت تھی۔ اس لئے امت نے نفسِ مضمون وحی کی حفاظت پر پورا زور صرف کر دیا۔ گو اس کے ساتھ الفاظ کو محفوظ رکھنے کی بھی انتہائی جدوجہد کی۔ چنانچہ ہر حدیث کے الفاظ یا بعینہٖ محفوظ ہیں یا ایسے متقارب ہیں کہ قریب بعینہٖ کے ہیں۔

بہر حال حدیث کی غیر معمولی حفاظت من اللہ ہوئی جس کے انداز مختلف ہوئے ابتداءً حفظ حدیث کا دور آیا جو دورِ صحابہؓ ہے۔ اس وقت زیادہ تر حدیث، سینوں کی امانت رہی۔ گو اسی زمانہ میں کتابت حدیث بھی جاری ہو چکی تھی۔ جیسا کہ متعدد روایات میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ تاہم غلبہ حفظ ہی کا تھا اور صحابہ کرامؓ نے کمال تدین واحتیاط سے اس وعدہ خداوندی کو حافظہ کی مدد سے پورا فرمایا کہ ہمارے ہی ذمہ قرآن کے بیان کی بھی حفاظت ہے۔ گویا یہ وعدہ ان ہی سے کیا جا رہا تھا۔

پھر تدوین حدیث کا دور آیا جو تابعین سے شروع ہوتا ہے اور ممالکِ اسلامیہ کے مختلف اطراف و جوانب سے حفاظ حدیث نے کتابتِ حدیث کر کے حدیث کی تدوین کی۔

پھر تغریہ حدیث کا دور آیا جس میں تنقیح کے ساتھ آثارِ صحابہ اور اقوال تابعین سے حدیث کو الگ کر کے جمع کیا گیا۔

پھر تنقید حدیث کا دور آیا جب کہ وضاعین حدیث یعنی منکرینِ حدیث بصورتِ مقرین حدیث بھی کھڑے ہو گئے اور اصحابِ صحاح کا وقت شروع ہو گیا جنھوں نے حدیث کو نکھار نکھار کر صحیح کو ضعیف سے، اصل کو موضوع سے الگ کیا۔ اس لئے اسناد پر زور دیا جانے لگا۔ تاکہ اس کی رو سے حدیث و خبر کے اعتبار و عدمِ اعتبار کا فیصلہ کیا جائے اور سند صفاتِ سند اور عدد رواۃ کے معیار سے حدیثوں کی قسمیں کی گئیں جیسا کہ قرآن ہی نے اس کی بنیاد رکھ کر اصول قائم کر دئے تھے جن کی تفصیل گزر چکی۔ پھر ان کے اصطلاحی نام تجویز ہوئے۔ اور امت نے اپنی ذکاوت اور علمی فراست کا ثبوت دیتے ہوئے حدیث کو فنی طور پر محفوظ کیا۔

حدیث کی حفاظت فنی طور پر:

بہر حال حدیث اپنے عہد طفولیت سے چل کر قرونِ اول میں محفوظ ہوئی۔ قرن ثانی میں مدون ہوئی۔ قرن ثالث میں منقح ہو کر آثار صحابہؓ سے الگ ہوئی۔ پھر قرن رابع میں تنقید کے ساتھ نکھر کر منضبط ہوئی اور پھر قرونِ مابعد میں مختلف ابواب پر منقسم ہو کر مرتب ہوئی اور بالآخر اسے فنی طور پر محفوظ کر دینے کے لئے امت نے علم حدیث کے سلسلہ میں تقریباً بیاسی علوم وفنون وضع کئے۔ اور فن روایت کو ہر سمت اور ہر جہت سے ایسے محیر العقول طریقے سے محفوظ کیا۔ کہ اس کا ایک ایک گوشہ ایک ایک علم بن گیا، جس پر ہزاروں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ جس سے علوم حدیث مثلاً متن حدیث، سند حدیث، اقسام حدیث، غریب الحدیث مصطلحات الحدیث، علل حدیث، مطاعن حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ نے مستقل علوم وفنون کی صورت اختیار کرلی اور حدیث کے طفیل میں کتنے ہی اہم ترین فنون روایت منظر عام پر آگئے جس سے حدیث کی حفاظت محض لوگوں کے حافظے یا شخصی مناسبت وسعی پر معلق نہ رہی بلکہ اصول وقوعد فن قوانین وآئین، اور وجوہ ودلائل کی قوت سے باضابطہ بھی اس کا تحفظ وجود میں آگیا جس کے حیرت ناک کارنامے تاریخ کی زینت اور ملت کے عظمت بنے ہوئے ہیں۔ ولو کرہ المنکرون۔

قرآن وحدیث کی ہر دور میں حفاظت

پھر جس طرح قرآن وبیان کے بارے میں حفاظت خداوندی نے یہ عظیم کرشمہ دکھلایا کہ امت میں حفاظ قرآن اور حفاظ حدیث نیز علماء قرآن اور علماء حدیث کو کھڑے کیا جو اس کے لفظ ومعنی اور قرأت وبیان کی حفاظت کریں اسی طرح ایسے محافظ افراد کے قیامت تک کھڑے ہوتے رہنے کا اپنے سچے وعدوں سے اطمینان بھی دلایا کہ امت میں ایک "طائفہ حقہ" برابر قائم رہے گا، جو منصور من اللہ ہوگا، مخالفت کرنے والے اسے ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور رسوا کرنے والے اسے رسوانہ کر سکیں گے۔

پھر یہ بھی وعدہ دے دیا کہ ہر دور میں سلف کے بعد خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے جو غالیوں کی تحریفوں، دروغ باف منکروں کی دروغ بافیوں اور جہلاء کی رکیک تاویلوں کی قلعی کھولتے رہیں گے۔

نیز یہ بھی اطمینان دلایا کہ اس سب کچھ کے باوجود پھر بھی اگر فریبی مکار لوگ قرآن یا بیان قرآن کے بارے میں اپنی چرب زبانیوں اور جعل سازیوں سے عام قلوب کے لئے کچھ تلبیس یا التباس کا سامان پیدا کر بھی دیں گے تو ہر صدی پر مجدد آکر دین کو پھر از سر نو نکھارتے رہیں گے۔

منکرینِ قرآن کی انواع قرآن کریم کی روشنی میں:

اور اس سے بڑھ کر حفاظت الٰہی کا ایک دوسرا عظیم کرشمہ یہ بھی نمایاں ہوا کہ اس حفاظت الٰہی میں خلل ڈالنے والے رخنہ اندازوں کی انواع، ان کے دجل وفریب کی صورتوں اور ان کے ناپاک ارادوں کی من وعن خبریں بھی دے دی گئیں تاکہ امت کے اہلِ حق ہوشیار رہیں۔ اور ان مکاروں کی چالاکیاں ایک طرفہ

کاروائی کر کے امت کو گمراہی کا شکار نہ بنا سکیں۔

وضاعین:

چنانچہ حدیث نبویؐ میں مختلف قسم کے منکرین حدیث کی خبر دی گئی کہ وہ مختلف صورتوں اور مختلف اندازوں سے حدیث رسول کا اعتبار ختم کرنے کی ناپاک سعی کریں گے۔ ایک طبقہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ وضاعین حدیث کی صورت میں نمایاں ہوگا جو وضع حدیث کے پیرایہ میں حدیث کو بے اعتبار ثابت کر کے گویا اس سے انکار کی دعوت دے گا۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یکون فی اخر الزمان دجالون کذابون یا تونکم من الاحادیث مالم تسمعوا انتم ولا آباء کم فایاکم و آیا هم لا یضلونکم ولا یفتنونکم. (رواہ مسلم)

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، آخر زمانہ میں ایسے دجال وکذاب، جھوٹے اور جعل ساز پیدا ہوں گے جو تمہارے سامنے ایسی حدیثیں (گھڑ گھڑ کر) بیان کریں گے جو نہ کبھی تم نے سنی ہوں گی اور نہ تمہارے آباء واجداد نے۔ دیکھو ان سے بچتے رہنا، کہیں تمہیں گمراہ نہ کر دیں۔ اور مبتلائے فتنہ وفساد نہ بنا دیں"۔

پس یہ تو ان لوگوں کی اطلاع تھی جنہوں نے حدیث اور بیانِ قرآن کو معتبر کہہ کر بلکہ اس سے عقیدت کا اظہار کر کے عیاری سے جعلی حدیثیں گھڑیں اور اصلی حدیثوں میں رلا، ملا کر شائع کیں تاکہ اصلی حدیث کا اعتبار اُٹھ جائے گویا اقرار کے پیرایہ میں انکارِ حدیث کیا۔

منکرین:

پھر ایسے لوگوں کے وجود کی بھی حضور اقدس ﷺ نے خبر دی جو کھلے بندوں حدیث کا انکار کر کے اسے بے اعتبار بنانا اور مٹا دینا چاہیں گے اور اس عیاری کے ساتھ کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کی رو سے اس بیانِ قرآن کو ختم کر دینا چاہیں گے۔

عن المقدام بن معدی کرب قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الایوشك رجل شعبان علی أریکته یقول علیکم بهٰذا القران فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله کما حرم الله لا یحل لکم الحمار الاهلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطة معاهد الاان یستغنی عنها صاحبها. الخ (رواہ ابوداؤد)

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار ہو کہ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کا مثل اور بھی دیا گیا ہے (حدیث) آگاہ رہو کہ ایک پیٹ بھرا تونگر قسم کا آدمی

مسند و تکیہ پر بیٹھ کر کہے گا کہ لوگو! بس قرآن کو مضبوط تھامو، جو اس میں حلال ہے اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے اسے حرام سمجھو۔ (حدیث کا کوئی اعتبار نہیں) حالانکہ (حدیث میں) رسول اللہ ﷺ نے بھی بہت سی چیزوں کو حرام کیا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے۔ دیکھو پالتو گدھے کا گوشت تمہارے لئے حلال نہیں، کھلے دانت والے درندے تمہارے لئے حلال نہیں، کسی معاہد کی گری پڑی چیز تمہارے لئے حلال نہیں۔ الا یہ کہ تمہاری اطلاع کے بعد وہ خود ہی اس سے دستبردار ہو جائے۔"

اس حدیث نے فتنہ انکارِ حدیث کا منشاء بھی بتلادیا کہ وہ منکروں کی شکم سیری اور پیٹ بھرے ہونے کا کرشمہ ہوگا۔ دنیا کی طرف سے بے فکری ہوگی تو دین پر ہاتھ صاف کرنے کی سوجھے گی۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى

"ہرگز نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ انسان سرکش ہو جاتا ہے اور دین کو حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ جب اپنے آپ کو مال و دولت کی وجہ سے مستغنی دیکھتا ہے (جیسا کہ امم سابقہ اور خود اس امت کا اس بارے میں یہی وطیرہ رہا ہے)"۔

پس غور کیا جائے تو وضاعین حدیث روافض کے نقش قدم پر ہیں جنہوں نے قرآن کو محرف بتلانے کے لئے ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور منکرین حدیث خوارج کے نقش قدم پر ہیں جنہوں نے قرآن کا نام لے کر احادیث کو بے اعتبار ٹھہرایا۔

محرفین:

یہ تو وہ طبقات تھے جنہوں نے برملا انکارِ حدیث یا تحریف الفاظ حدیث کا فتنہ امت میں پھیلایا۔ ایسے طبقوں کی خبر بھی دی گئی ہے کہ جو الفاظِ حدیث کو مان کر اس کی معنویت میں تحریف کے مرتکب ہونے والے تھے۔ چنانچہ احادیث میں ان تحریف معنوی کرنے والوں کی اطلاع بھی موجود ہے جو قرآن و حدیث کو ثابت مان کر پھر اس سے آزاد بلکہ اس پر اپنی عقل کو حکمران سمجھیں گے اور معانی قرآن و حدیث میں عقل محض اور رائے مجرد سے معنوی تحریف کر کے ان کا نقشہ بدل دینے کی کوشش کریں گے جس سے امت میں مستقل گروہ بندی کی خو پیدا ہو جائے گی۔ فرمایا گیا:

تفرقت اليهود على احد و سبعين فرقة و تفرقت النصارىٰ على ثنتين و سبعين فرقة و ستفترق امتى على ثلث و سبعين فرقه كلها فى النار الا واحدة.

"بٹ گئے یہود اکہتر فرقوں پر اور بٹ گئے نصاریٰ بہتر فرقوں پر اور بٹ جائے گی میری امت تہتر فرقوں پر، سوائے ایک فرقہ کے سب جہنمی ہوں گے"۔

یہ گروہ بندی قرآن و حدیث کے انکار کے نام پر نہیں بلکہ اقرار کے نام پر ہوئی اور امت میں اصولاً ۷۲

فرقے بن گئے۔ یہ وہی معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کا وطیرہ تھا جس سے ان میں بہتر فرقے پیدا ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ توراۃ اور انجیل کا اصل علم گم ہو گیا تھا۔

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِهٖ.

"کلمات (دین) کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور نصیحتوں سے جو یاد کرایا گیا تھا اُسے بھلا بیٹھے ہیں"۔

بہر حال جس طرح قرآن و حدیث کی حفاظت کی خبر دیتے ہوئے محافظین کی انواع پر مطلع کیا گیا کہ کوئی مجدد ہو گا، کوئی خلف عادل، کوئی منصور علی الحق، وغیرہ ایسے ہی اس حفاظت الٰہی میں خلل ڈالنے والے خائنوں، چوروں اور ڈکیتوں کی انواع پر بھی مطلع کر دیا گیا کہ ان میں سے کوئی دجال ہو گا۔ کوئی کذاب ہو گا اور کوئی پیٹ کا گدھا اور شبعان ہو گا۔

غرض کوئی بیان قرآن کے الفاظ کا منکر ہو گا۔ اس کے معنی کا انکار کرے گا۔ کوئی اس کی حجیت سے دستکش ہو گا۔ کوئی اس کی تاریخی حیثیت پر طعنہ زن ہو گا اور کوئی سرے سے قرآن ہی کو جعلی دستاویز بتلا کر اس دین سے لوگوں کو بے زار بنانے کی مہم سر انجام دے گا۔

غرض کچھ قرآن کے منکر ہوں گے اور کچھ بیان قرآن کے۔ چنانچہ لفظ و معنی اور اصول و قواعد کے ایک ایک گوشے سے ان دجالین و کذابین نے حدیث و قرآن کے راستے میں رہزنی کی اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن کے ساتھ اس کا بیان لازم ہے۔ ورنہ خود قرآن ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

ان طبقات نے اپنی منحوس اغراض کے ماتحت قرآن کو مٹانے کے لئے اس کے بیان کا مختلف روپوں سے انکار کیا۔ لیکن علمائے امت اور محدثین شکر اللہ مساعیہم نے فنی طور پر جن اصول سے حفاظت حدیث کا فریضہ انجام دے کر حفاظت قرآن کا کام کیا ہے۔ انہی اصول سے منکروں کی ان ناپاک مساعی کے پرخچے اڑا دئے جو انکار حدیث کے سلسلہ میں کی گئیں اور انکی دسیسہ کاریوں کو حجت و برہان سے پامال کر کے رکھ دیا۔

بہر حال اس سلسلہ میں اس حفاظت خداوندی پر قربان ہو جئے کہ جہاں قرآن و حدیث کے تحفظ کے وسائل اور جوارح الٰہی (حفاظ و محدثین) پیدا کئے جنہوں نے حدیث و قرآن کو محفوظ کیا۔ وہیں دشمنان حدیث و قرآن اور ان کی چالاکیوں اور انکار حدیث کے مختلف روپوں کی بھی پہلے ہی سے خبریں دے دیں۔ تاکہ خدام قرآن و حدیث ان کے مکر و فریب پر مطلع رہیں اور ان کے دجل و فریب اور کذب و افتراء کے جال میں پھنسنے نہ پائیں۔ یعنی قرآن و بیان کی حفاظتِ خداوندی کا یہ بھی ایک مستقل شعبہ تھا کہ ان دینی بنیادوں کے چالاک دشمنوں کی اطلاع دے کر دوستوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا جائے۔

منکرین قرآن و حدیث اور حکمتِ خداوندی

تاہم جس طرح حکومت ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ پولیس متعین کرتی ہے۔ کروڑوں روپے کا بجٹ منظور کرتی ہے اور تعزیرات کے ذریعہ سے چوروں، ڈکیتوں اور ملک میں بدامنی پھیلانے

والوں کی سزاؤں کا اعلان کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود چور، ڈکیت اور رہزن پھر بھی باز نہیں آتے اور اپنی شقاوت سے قانون کی خلاف ورزیوں کی راہ چل کر رہتے ہیں۔ جیل بھی بھگتتے ہیں، سزائیں بھی پاتے ہیں، پٹتے بھی جاتے ہیں۔ لیکن رات دن کے جرائم کی عادت کی وجہ سے ان کی عبرت کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں اور اپنے جرائم کے کام میں مستعد رہتے ہیں۔ پس قوم اپنے کام (حفاظت ملک) میں لگی رہتی ہے اور یہ جرائم پیشہ طبقہ اپنے کام (چوری، ڈکیتی، اور امن سوزی) میں لگا رہتا ہے۔

اسی طرح سرکارِ خداوندی نے قرآن وحدیث کی حفاظت کی گارنٹی بھی لی۔ اس کے لئے محافظین کی پولیس یعنی حفاظ و محدثین بھی مقرر کئے۔ غیب سے ان کے روزینے بھی مقرر کئے۔ ان کی مدد کا وعدہ بھی کیا اور حسب وعدہ مدد برابر آ بھی رہی ہے۔ رخنہ اندازوں کے لئے اعلانِ عام بھی ہو رہا ہے کہ جو بھی اس قرآن وبیان میں رخنہ اندازی کرے گا۔ اس کی سزا یہ ہوگی اور یہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود جن کے قلوب میں شقاوت ازل ہی سے ودیعت کی گئی ہے۔ اور جو انہی جرائم کے لئے پیدا کئے گئے وہ قرآن وحدیث کی تحریف سے نہ کبھی باز آئے نہ آئیں گے کیونکہ کتاب وسنت میں ان ناجائز تصرفات و تحریفات کی عادت سے ان کی دیدہ عبرت پٹ چکی ہے انہیں حق نظر آسکتا ہے نہ وہ اس کی آواز سن سکتے ہیں۔

پس جس طرح سرکارِ خداوندی بتوسط علمائے امت اپنے حفاظت کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ باوجود یہ کہ ان پر دلائل کہ مار بھی پڑ رہی ہے وہ بارہا دلائل حق کے گھیروں میں گھر کر بند بھی ہو جاتے ہیں۔ عقل سلیم اور فنونِ روایت کی نقل صحیح کی طرف سے ان پر جوتیاں بھی پڑ رہی ہیں۔ مگر انہیں روزی ہی انکارِ حدیث، وضع حدیث، تحریف حدیث اور تمسخر حدیث کی دی گئی ہے، جو انہیں بہر حال لینی ہے اور گمراہیوں کے ساتھ مخلوق کی رہزنی کا کام کرنا ہے۔

پس جس حکمت الٰہی نے شیطان اور اس کی رخنہ اندازیوں کو پیدا کر کے دین کی قوتوں کے کھولنے اور مضبوط بنانے کی راہ ڈالی۔ اسی حکمت نے منکرین قرآن وحدیث اور ان کی سیاہ کاریوں کو پیدا کر کے قرآن و حدیث کی قوتوں کے واشگاف کرنے کی راہ پیدا کی ہے۔

خلق الله للحروب رجالا ورجالا لقصعة و ثريدا

مگر انجام کار نتیجہ یہ ہے کہ ان اشرار و فجار میں سے جس نے بھی دین حق کی ان دو بنیادوں، قرآن و حدیث کی قوتوں کے درشگاف چاہا وہ ہی اوندھے منہ گرا اور اس نے منہ کی کھائی۔ یہ منکر طبقے اپنے اپنے محدود وقتوں میں ابھرے مگر ابھر کر گرے، تو ایسے گرے کہ آج کوئی ان کے نقشِ قدم کا پتہ دینے والا بھی نہیں۔ مگر قرآن وحدیث اپنی اسی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے سامنے چمک رہے ہیں۔ یہی صورت حال منکرین اور اربابِ تمسخر و استہزاء کے سامنے بھی آنے والی ہے۔ **فانا نسخر منكم كما تسخرون فسوف تعلمون**o

قرآن اور پیغمبرؐ کی باہمی نسبت

بہر حال اس امت کو دو عظیم اور بے مثال نعمتیں بطور ہدیۂ خداوندی دی گئی ہیں ایک زندہ کتاب اور ایک زندہ نبیؐ۔ اس لئے کوئی بھی بد نیت یا بد فہم ان کے آڑے نہیں آسکتا۔ مردہ چیز کو جس طرح جس کا جی چاہے ادل بدل کر دے۔ لیکن زندہ اور وہ بھی قوی اور متین اور ذمہ بردارِ حفاظت کی چیز کو ادل بدل کر دینا تو بجائے خود ہے اس پر دھول اڑا کر کوئی اسے نگاہوں سے او جھل بھی نہیں کر سکتا۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ م بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ

"باطل اس کے پاس بھی نہیں آسکتا نہ آگے سے نہ پیچھے سے، وہ حکیم حمید کی طرف سے اترا ہوا (کلام) ہے۔

قرآن حکیم اور اس کے بیان کی حفاظت کا یہ بھی ایک عظیم شعبہ ہے کہ بیانِ قرآن (سنت) کی روشنی میں دانایانِ سنت نے قرآن کے تراجم کر کے دوسرے اہل قرآن کو بھی اس پر مطلع کیا تاکہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پھیل جائے اور بسہولت دنیا کی ہر قوم اس سے استفادہ کر سکے تاکہ وہ عالمگیر ہو کر، عالم کی ہر قوم کے دل میں اتر جائے اور اس طرح اس کی عالمگیر حفاظت کا وعدہ خداوندی پورا ہو جائے۔

چنانچہ علمائے اسلام قرآن کے متراجم کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور کمال دیانت و امانت اور کمال صدق و فراست سے مستند علمائے ملت نے اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کئے۔ الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے اخلافِ رشید میں سے شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے دوسرا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے خلفِ صالح حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے اردو میں ترجمہ کیا۔ جو پورا پورا تحت اللفظ ترجمہ اور بے مثل ترجمہ ہے۔ گویا قرآن کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر کلمہ کو اردو میں اس کی پوری کیفیت واصلیت کے ساتھ منتقل فرمادینے کی سعی فرمائی۔

حضرت شیخ الہند سیدنا و مرشدنا مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ' محدث دیوبندی نے اس ترجمہ کے بارے میں اپنے استاد حضرت قاسم العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند کا مقولہ نقل فرمایا کہ:

"اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اس کی عبارت یہی یا اس کے قریب قریب ہوتی جو حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کی ہے"۔

محمد طیّب غفرلہ،
مہتمم دار العلوم دیوبند

آغاز بخاری

خود مصنفؒ فرماتے ہیں جعلته بینی وبین اللّٰہ حجة "میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے"۔ حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ انشاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں وہ بھی انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے ___ یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ اللّٰهِ جَلَّ ذِكْرُهٗ اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِهٖ. حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ .....

قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ الْاَنْصَارِيُّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ اَنَّهٗ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

کلمات تمہید

بزرگان محترم!

یہ ہم لوگوں کی سعادت ہے کہ بخاری شریف کے افتتاح میں شرکت کا موقع ملا ___ عموماً اصحاب درس کا طریق یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن کی اہم کتاب شروع کرنے کے وقت چار چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

* مسجد مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفاً و کرامتاً ۱۳۹۸ھ میں ۱۹ر نومبر ۱۹۷۸ء بروز اتوار یہ درس مبارک ارشاد فرمایا۔

سب سے پہلے مصنفؒ کا اجمالی تعارف کراتے ہیں۔ دوسرے خود تصنیف کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ خود کتاب کی عظمت وجلالت کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے جس سے کتاب میں بحث کی گئی ہے اور چوتھے یہ کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیوں اس کتاب کو پڑھتے ہیں۔؟

اس کو اگر علمی اصطلاح میں لایا جائے تو وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ سب سے پہلے "علت فاعلی" کہ اس کا فاعل کون ہے جس کی طرف ہم توجہ کر رہے ہیں۔ دوسرے "علت مادی" کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن پر مصنف نے بحث کی ہے اور تیسرے "علت صوری" کہ اس کتاب کی اور موضوع کی تشکیل کس طرح سے ہوئی ہے؟ اور چوتھے "علت غائی" کہ اس کے پڑھنے سے کیا غرض وغایت ہے؟ ___ تو عام طور پر اصحاب درس علت فاعلی، علت مادی، علت صوری اور علت غائی انہیں چار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

جلالت امامؒ

جہاں تک مصنفؒ کی ذات کا تعلق ہے وہ مسلمانوں کے قلوب میں آفتاب سے زیادہ مرکوز اور روشن ہے۔ کوئی زیادہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوائل میں سے ہیں، متقدمین میں سے ہیں، امام ہیں، حافظ ہیں اور مصنف ہیں۔ تمام اوصاف کمال جو اہل علم میں ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان میں جمع فرمائی ہیں۔

تقریباً ۱۹۲ھ یا ۱۹۴ھ میں پیدائش ہوئی ہے۔ باسٹھ (۶۲) سال کی عمر ہوئی ہے اور قریب قریب ۲۵۳ھ یا ۲۵۶ھ میں وفات ہوئی ہے ___ نے یہ تین چیزیں جمع کی ہیں اور تاریخ بتلائی کہ کونسا سن ولادت کا ہے اور کون سا سن وفات کا ہے اور عمر کتنی ہے؟ تو ان تینوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا ہے ۔

کان	البخاری	حافظا	ومحدثا
جمع	الصحیح	مکمل	التحریر
میلاده	صدق	ومدة	عمره
فیها	حمید	وانقضی	فی نور

گویا سن ولادت تو صدق کے لفظ سے نکلتا ہے اور مدت عمر حمید کے لفظ سے ہے اور سن وفات نور کے لفظ میں ہے۔

جہاں تک امام کی عظمت اور جلالت کا تعلق ہے۔ حافظہ، عدل وانقان، زہد وتقویٰ اور دیانت وہ اس سے زیادہ مشہور ہے جتنا کہ آفتاب کو ہم دیکھتے ہیں۔ پوری امت نے امام کی تلقی بالقبول کی ہے۔

حافظہ حق تعالیٰ نے محیر العقول عطا فرمایا۔ اس زمانے میں حفظ ہی پر مدار تھا اور بڑے بڑے محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوئے کہ جن کے حفظ کو بس کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ عام طبعی طور پر یہ حافظے نہیں ہوتے۔ حق تعالیٰ شانہ کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو زیادہ پھیلانا تھا تو حیرت ناک حافظے عطا فرمائے جس کو ہم کرامت ہی کہہ سکتے ہیں۔

کرامت حفظ

امام ترمذیؒ مکہ مکرمہ کا سفر کر رہے تھے اور شیخ بھی ساتھ ہیں، جن کے امام ترمذیؒ شاگرد ہیں۔ متعدد تلامیذ ساتھ ہیں ___ تمام تلامیذ نے درخواست کی کہ جہاز میں ایک لمبا وقت گزرے گا تو حدیث کا املاء کرا

دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ شرط یہ ہے کہ کاغذ دوات ہو اور قلم لے کر بیٹھو۔ جو حدیث میں لکھواؤں لکھتے جاؤ ___ یہ شرط مان لی گئی۔

امام ترمذیؒ کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم اور شوق یہ تھا کہ میں بھی درس میں حاضر ہوں۔ مگر شیخؒ نے شرط لگا دی تھی۔

تو یہ کیا کہ پیچھے بیٹھتے تھے اور ایک گھٹنا کھڑا کر کے بایاں ہاتھ اس پر رکھتے تھے اور دائیں ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتے تھے گویا لکھ رہے ہیں۔ تاکہ شیخؒ یہ سمجھیں کہ کاغذ بھی ہے اور لکھائی بھی ہو رہی ہے ___ متعدد ایام گزر گئے ایک دن شیخؒ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نہ کاغذ ہے نہ قلم ہے۔ فرمایا ___ میں نے شرط لگائی تھی، تم بلا کاغذ اور قلم کے کیسے آئے؟

انہوں نے کہا کہ حضرت! مقصد تو یہ تھا کہ چیز محفوظ ہو جائے۔ تو اس ایک ہفتے میں حضرت نے جتنی حدیثیں ارشاد کیں وہ سب محفوظ ہیں اور پہلے دن اتنی حدیثیں ان اسانید کے ساتھ سنائیں۔ دوسرے دن یہ حدیثیں فلاں فلاں سند کے ساتھ سنائیں ہفتے کی کل حدیثیں مع اسانید کے حافظے سے بتلائیں ___ شیخ بڑے خوش ہوئے۔ گلے لگایا۔ فرمایا، تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہے۔

اب یہ حافظہ کہ دس دن بعد فرمائیں کہ فلاں دن یہ حدیثیں تھیں اور یہ یہ سند تھی، فلاں دن یہ حدیثیں تھیں یہ یہ سند تھی۔ اس کو سوائے کرامت کے اور کیا کہا جائے۔ عام حافظے میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

امتحان حفظ

یہ امام بخاریؒ جب بغداد تشریف لائے۔ تو محدثین میں چرچا تھا کہ ایک نوجوان ہے جو حافظ حدیث ہے اور حفظ کا جو شہرہ تھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا غیر معمولی حفظ ہو تو ارادہ کیا گیا کہ امام بخاریؒ کے حافظے کا امتحان لیا جائے۔ دس محدث جمع ہوئے اور دس دس حدیثیں چھانٹ لیں۔ سو احادیث میں امتحان کرنا تھا۔ بہت عظیم مجمع ہوا۔

پہلے محدث نے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ کسی متن کی سند کسی کے ساتھ تھوپ دی کسی کی سند کسی کے ساتھ۔ تو دس حدیثیں الٹ پلٹ کر کے بیان کیں۔

امام بخاریؒ فرماتے :

لا اعرفہ، لا اعرفہ

اس کے بعد دوسرے محدث نے اسی طرح الٹ پلٹ کر کے کسی کی سند اور کسی کا متن خلط ملط کر کے بیان کیا ___ ہر حدیث پر فرماتے رہے :

لا اعرفہ، لا اعرفہ

میں نہیں پہچانتا۔ سو کی سو حدیثیں اس طرح سے روایت کی گئیں۔ ہر حدیث پر امام نے کہا **لا اعرفہ** میں نہیں پہچانتا ___ لوگوں نے کہا کہ خواہ مخواہ شہرت ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان نہ حفظ رکھتا ہے، نہ اتقان رکھتا ہے۔ ہر چیز میں "**لا اعرفہ لا اعرفہ**" میں نہیں پہچانتا کہتا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو امام بخاریؒ بولے۔ سب سے پہلے محدثؒ نے اس ترتیب سے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ پہلی حدیث کی یہ سند ہے، دوسری کی یہ سند ہے، تیسری کی یہ ہے۔ دس کی صحیح سندیں بیان کیں۔ اس کے بعد کہا کہ دوسرے محدثؒ نے یہ دس حدیثیں بیان کیں ان میں یہ خرابی

تھی............ یہ خرابی تھی۔ اس کی اصل سند یہ ہے' یہ ہے۔ سو کی سو روایتوں کی صحیح سندیں بیان کر دیں۔ تمام محدثین کی گردنیں جھک گئیں اور کہا جو سنا تھا وہ حقیقۃً سچ تھا اور یہ شخص امامت کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ وہاں سے پھر امام بخاریؒ کا شہرہ ہوا۔

بہرحال امام بخاریؒ کا حافظہ' ان کا اتقان اور ان ، زہد و تقویٰ یہ گویا اشہر من الشمس ہے۔ ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔

جلالت کتاب

ظاہر بات ہے **قدر الشهادة قدر الشهود** جیسا شہود ہوتا ہے ویسی ہی شہادت ہوتی ہے۔ جب امام اس درجہ کا ہے تو اس کی تصنیف بھی اس درجہ کی ہو گی ___ تو بخاری کی جلالت شان یہ ہے کہ پوری امت نے اجماعی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا گیا ہے۔

بعض حضرات محدثین کی رائے ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ 'امام مالکؒ کی مؤطا ہے اور وہ حدیث میں اولین تصنیف بھی ہے ___ لیکن مؤطا کے اندر احادیث بھی ہیں' آثار صحابہ بھی ہیں اور فتاویٰ بھی ہیں۔ تو مخلوط ہے۔

امام بخاریؒ نے تنقیح کی بلکہ ہر چیز کو الگ الگ کر دیا ہے۔ ابواب اور فصول مرتب کئے اور ایسی کڑی شرائط لگائیں کہ دوسری عبارات اور اسانید میں وہ شرائط نہیں پائی جاتیں۔ بالآخر امت کا اجماع ہو گیا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری ہے۔ اولین درجہ سند میں قرآن کریم کا ہے۔ تو وہاں تواتر طبقہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تواتر روایت ہو یا تواتر سند ہو۔ بلکہ طبقاتی تواتر ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں حفاظ قرآن مجید موجود ہیں۔ اس واسطے وہ تواتر طبقہ ہے کہ جس میں کذب کا شائبہ یا خلط ملط کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا ___ اس کے بعد پھر حدیث کا درجہ ہے۔

اسماء الرجال

احادیث میں محدثینؒ نے "حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے" اور بڑے بڑے مقامات دے' امت کے لئے سامان کر دیا۔ روایات حدیث کے سلسلے میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ جمع کر دی جو راویان حدیث ہیں۔ ان کے خاندان کیا ہیں' ان کا کیریکٹر کیا ہے' ان کا کردار کیا ہے' حافظے کیسے تھے' عدالت کیسی تھی یہ سب جمع کر دیا ہے۔ تو پچاس ہزار انسانوں کی تاریخ ان کے خاندانوں اور احوال سمیت مرتب کر دی کہ یہ راویان حدیث ہیں۔

میزان حدیث

پھر مصطلحات الحدیث مستقل فن ایجاد کر دیا۔ حدیث کے درجات قائم کر دیئے کہ اگر حدیث مرفوع متصل ہے اور طبقہ میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے آ رہے ہیں اس کو متواتر کہا۔ جو مورث یقین ہوتی ہے اس کے منکر کو جاحد کہا کہ وہ کفر میں مبتلا ہے اس سے دوسرا درجہ خبر متواتر کا ہے کہ کم سے کم دو دو آدمی صحابی سے لے کر اب تک روایت کرتے آ رہے ہوں۔ کہیں زیادہ ہو جائیں تو مضائقہ نہیں مگر دو سے کم

نہ ہوں وہ حدیث مشہور کہلاتی ہے۔ یہ مورث ظن غالب ہے جو قریب قریب یقین کے ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ خبر واحد کا رکھا کہ ایک ایک آدمی روایت کرتا آرہا ہو۔ درمیان میں بڑھ جائے تو مضائقہ نہیں مگر ایک سے کم نہ ہو یہ خبر واحد یا خبر وحید کہلاتی ہے یہ مورث مطلق ظن ہوتی ہے۔ اس کا منکر کافر تو نہیں ہوتا مگر فسق میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے' تو خبر مرفوع متصل' متواتر' مشہور' خبر واحد ___ پھر اس کے بعد اگر بیچ میں انقطاع آئے تو منقطع۔ اگر صحابیؓ کی جگہ پر انقطاع آئے تو مرسل۔ بیچ میں انقطاع مسلسل دو راویوں کا آئے تو معضل۔ غرض اقسام حدیث بیان کی گئی ہیں کہ حدیث مشہور ہے' متواتر ہے' معضل ہے' مشکل ہے' مجمل ہے' مجہول ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ درجہ بتلایا کہ کس درجے میں اس کی حجیت ہے۔ بہر حال محدثین نے ایسے کانٹے اور میزانیں بنا کر دیں کہ کوئی بوالہوس خلط ملط نہیں کر سکتا اس کانٹے پر ناپ کر پانی الگ اور دودھ الگ کر دیا جاتا ہے نکھار دیا جاتا ہے۔

انتخاب احادیث

امام بخاری اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور کتاب میں سات لاکھ احادیث میں سے سات ہزار حدیثیں منتخب کیں ہیں۔ اگر مکررات کو ملا دیا جائے تو سات ہزار بیٹھتی ہیں' مکررات کو حذف کر دیا جائے تو چار ہزار سے اوپر بیٹھتی ہیں جو روایتیں اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں ___ بہر حال مصنف بھی جلیل القدر اور کتاب بھی جلیل القدر۔

شان قبولیت

خود مصنف فرماتے ہیں جعلته بینی وبین اللہ حجة میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے۔

حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ ان شاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں وہ بھی انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے۔ یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

موضوع کتاب

اس کا موضوع اقوال' افعال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے جو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یا عمل کر کے دکھلایا یا کسی کے عمل پر سکوت فرمایا۔ یہ سکوت رضا ہے یہ سب احادیث میں داخل ہیں۔

عصمت انبیاء علیہم السلام

اس لئے کہ نبی کا قول اور فعل ہی شریعت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دین کے بارے میں معصوم پیدا فرمائے گئے ہیں اور اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ قبل از نبوت بھی معصوم ہیں معصومیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ گناہ نہ کریں۔ قوتیں ساری موجود ہیں۔ مگر مخالفت نفس کی اتنی قوت ہے کہ کوئی ایک درجہ بھی رضائے حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ قوت نفس اور مقاومت نفس اتنی ہے کہ

شوائب نفس باقی نہیں رہے مغلوب ہوگئے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا مطمئن ہوتا ہے کہ جو خواہش آتی ہے وہ بھی پاک ہی آتی ہے۔ غیر پاک یا ناپاک آتی ہی نہیں۔ اتنے پاک اور صاف انبیاء علیہم السلام کے قلوب پیدا کئے گئے ہیں جس کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ :

یا رسول اللہ! آپ کی عجیب شان ہے

ان ربک يسارعک فی هوانک

آپ کی ہر خواہش کے پورا کرنے میں حق تعالیٰ اتنی جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر دل میں خواہش آئی اور ادھر پوری ہوئی ___ وہ یہ ہے کہ نبی کے قلب میں خواہش ہی پاک آتی ہے۔ جب نبیؐ مخلی بالطبع چھوڑ دیں گے تو خیر ہی کی طرف طبیعت جائے گی' شر کی طرف نہیں جائے گی۔ تو خیر غالب ہوتی ہے اور ہوائے نفس اس کے تحت ہوتی ہے ہر خواہش نفس میں انبیاء علیہم السلام کو رضائے حق کا دھیان ہر وقت رہتا ہے۔ کسی وقت بری خواہش ان کے قلب میں آتی ہی نہیں۔

ان ربک يسارعک فی هوانک

حفاظت اولیاء

اور انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے اور ان کی جوتیوں کی برکت سے انبیاء علیہم السلام کے خدام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے نفوس بھی مطمئن ہیں اور ان کی ہر خواہش پاک ہوتی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ :

الحق ينطق على لسان عمر

''عمر کی زبان پر حق بولتا ہے''۔

دار الحق معه حيث دار

''جدھر عمر جاتے ہیں' حق بھی ادھر جاتا ہے''۔

تو بظاہر تو یہ ہوتا کہ جدھر حق جاتا ہے ادھر عمر جاتے ہیں اور فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمر جاتے ہیں' حق ادھر جاتا ہے ___ یہ انتہائی ہے ___ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر ہی مبتدی بھی چلے۔ لیکن جب اس مشق کے بعد منتہی ہوتا ہے پھر وہ جدھر جاتا ہے حق ادھر ہی جاتا ہے اس لئے قلب پاک اور مطمئن بن جاتا اس میں وہ چیز ہی آتی ہے جو حق ہوتی ہے ناحق چیز نہیں آتی۔

انبیاء علیہم السلام کے خدام میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جدھر جھک جائیں حق بھی ادھر جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت بلند وبالا ہے۔

بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل اور سکوت سب شریعت ہے س لئے کہ وہ پاک ہی پاک ہے' خیر ہی خیر ہے ___ تو اس فن کا موضوع اقوال نبیؐ' افعال نبیؐ اور رضائے نبویؐ ہے۔

غرض کتاب

اس کے پڑھنے کی غرض وغایت کیا ہے؟

رضائے خداوندی حاصل کرنا' آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح ہے۔ دارین کی فلاح اگر حاصل کرنی ہو تو فن حدیث کی طرف آدمی متوجہ ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے ہم اور آپ اور دنیا کا کوئی بھی انسان

بغیر نبی کے توسل کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

وساطت حدیث

اگر انبیاء علیہم اسلام کا واسطہ بیچ میں نہ ہو تو کوئی بھی خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام ہی کا صدقہ ہے کہ بیچ میں آکر بندے کو خدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام ادھر بھی واسطہ' ادھر بھی واسطہ۔ ادھر مخلوق میں شامل' ادھر اللہ سے واصل۔ تو بیچ میں جو بھی آجائے گا اسے اللہ سے واصل کردیں گے۔ بغیر نبی کے واسطے کے کوئی بھی انسان خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح سے لوگوں کا علمی کلام قرآن سے نہیں جڑ سکتا۔ جب تک بیچ میں کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ نہ ہو۔ تو حدیث نبوی قرآن سے لیتی ہے' فقہاء کو دیتی ہے۔ اگر فقیہ کے کلام اور قرآن کریم کے بیچ میں حدیث نہ ہو تو فقہاء کا کلام قرآن کریم سے نہیں جڑ سکتا جیسے افراد اللہ سے بغیر نبی کے واسطے نہیں جڑ سکتے ایسے ہی کلام الناس بھی بغیر کلام رسول کے واسطے کے کلام خدوندی سے نہیں جڑ سکتا ___ تو حدیث بیچ میں واسطہ ہے۔ قرآن سے لیتی ہے اور فقہا کو دیتی ہے۔

بیان القرآن

اسی واسطے حدیث کو بیان قرآن کہا گیا ہے ___ ایک قرآن ہے اور ایک بیان قرآن ہے۔ قرآن کریم تو وہ کلمات اور الفاظ ہیں جو منزل من اللہ ہیں ان کے معنی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر خود ہی اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ تو قرآن لفظوں اور معنی کا مجموعہ ہے۔ لفظ بھی منزل من اللہ ہیں اور معنی بھی منزل من اللہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فکر اور سوچ سے قرآن کے معانی متعین کئے ہوں کہ یہ مطلب ہو سکتا ہے ___ اس مطلب کو بھی اللہ ہی نے واضح کیا ہے۔ تو لفظ بھی اللہ کے ہیں' معنی بھی اللہ کے ہیں۔

چنانچہ ابتدا میں یہ تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو جلدی جلدی رٹنا شروع کردیتے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ

"آپ جلدی نہ کریں۔ آپ کو یہی تو ڈر ہے کہ آپ بھول نہ جائیں"۔

فرمایا :

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

ہمارے ذمہ ہے کہ ہم آپ کے سینے میں جمع بھی کردیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ اس کی فکر نہ کریں :

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ

جب ہم قرأت کریں ___ از خود یا بواسطہ ملک کے ___ آپ سنتے رہیں۔ ہمہ تن گوش ہو کر اسے جذب کرلیں ___ دھیان نہ کریں' نہ عقل لڑائیں نہ حواس کو دخل دیں۔ صرف جذب کریں۔ آگے اس کا جمع کرنا' پڑھوانا اور جمع کردینا یہ ہمارے ذمہ ہے ___ تو الفاظ سے جمع کرنے کی اور زبان سے پڑھوا دینے کی گارنٹی حق تعالیٰ نے دی :

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

اس کے بعد پھر فرماتے ہیں :

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا بھی کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی مراد کیا ہے ___ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معنی میں بھی امین ہیں۔ پوری امانت کے ساتھ آپ نے اللہ کے کلمات بھی پہنچادیئے اور حق تعالیٰ کے کلام سے جو مرادات ہیں' وہ بھی بندوں تک پہنچا دیں۔ تو آپ امین ہی امین ہیں۔

اہمیت فن حدیث

بہر حال قرآن کریم اور کلام فقہاء کے درمیان اگر اتصال کا واسطہ ہے تو وہ حدیث ہے۔ اگر حدیث بیچ میں نہ ہو تو کلام فقہاء کا حدیث سے کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا۔ جیسا کہ بندوں اور خدا کے درمیان اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ نہ ہو تو کوئی بندہ اپنے خدا سے مربوط نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے اسلام میں فن حدیث کی اہمیت ہے۔ اور یہ دنیا میں اعلیٰ ترین اور اشرف ترین فن شمار کیا گیا ہے ___ تو اس فن میں اعلیٰ ترین کتاب یہ ہے' جس کا نام بخاری ہے۔ جسے اللہ اور بندے کے درمیان امام بخاریؒ نے حجت قرار دیا ہے ___ وہ آج شروع ہو رہی ہے۔

شروع میں اس میں چند مباحث ہیں۔ جو اکثر حضرات اساتذہ بیان کرتے ہیں۔

حمد و نعت سے ابتدا نہ کرنے کی وجہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ عام کتابوں کا طریقہ یہ ہے کہ کتابیں حمد و نعت سے شروع کی جاتی ہیں۔ خطبۂ ماثورہ ہوتا ہے۔ **الحمد لله نحمده ونستعينه الخ** اسی میں حمد بھی ہوتی ہے' نعت بھی ہوتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام ہوتی ہے۔ امام بخاریؒ نے یہ نہیں کیا بس بسم اللہ سے کتاب شروع کر دی ___ تو ایک عام شبہ اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے عام مروجہ طریق کے خلاف کیوں کیا ___ ؟

لیکن حقیقت میں یہ کوئی اعتراض نہیں ___ اس لئے کہ سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس اعتراض کا منشاء کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے کسی حدیث یا نص کی خلاف ورزی کی ہے؟ بظاہر ایک رواج کی خلاف ورزی کر دی' تو رواج کوئی حجت قاطعہ تو نہیں تھا کہ امام خواہ مخواہ اس کی پابندی کرتے؟ تو اصل منشاء کیا ہے؟

تو منشاء یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ :

كل امر ذی بال لم يبدأ بسم الله تعالىٰ فهو اقطع

جو مہتمم بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع البرکہ ہوتا ہے۔ یہ حجت تھی ___

لیکن چھ طریقوں سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے اس کے کلمات مختلف ہیں ایک صیغہ **كل امر ذی بال لم يبدأ بسم الله تعالىٰ فهو اقطع**۔ دوسرا صیغہ یہ ہے **كل امر ذی بال لم يبدأ بسم الله الرحمن الرحيم فهو اقطع** ___ تیسرا صیغہ یہ ہے **كل امر ذی بال لم يبدا بذكر الله تعالىٰ فهو اقطع** اسی طرح سے اور بھی ہیں جو تقریباً چھ صیغے ہیں۔ تو سب میں قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ "ذکر

اللہ" سے آغاز کیا جائے۔ اس میں بسم اللہ بھی آ گئی، اسم اللہ بھی آ گیا، ذکر اللہ بھی آ گیا۔ ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے آغاز ہو ___ تو مصنف نے بسم اللہ سے آغاز کر دیا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بسم اللہ بھی تو ذکر ہے اور اعلیٰ ترین ذکر ہے۔ پھر انہوں نے شبہ کیا کہ اگر لکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟ ___ تو سوال یہ ہے کہ نہ لکھتے تو کیا حرج تھا ___؟

حدیث میں یہ ہے کہ **کل امر ذی بال لم یبدا الخ** کوئی مہتم بالشان کام جس کو ذکر اللہ سے شروع نہ کیا جائے مقطوع البرکت ہے۔ تو اس حدیث میں **لم یبدا** کا لفظ ہے **لم یکتب** کا لفظ تو نہیں ہے کہ کوئی امر ذی بال کے شروع میں اگر بسم اللہ نہ لکھی جائے وہ مقطوع البرکت ہوتا ہے **لم یبدا** شروع نہ کیا جائے ___ اب خواہ زبان سے شروع کر دے، لکھ کر شروع کر دے، دل سے شروع کر دے ___ حدیث پر عمل ہو جائے گا۔ تو مصنفؒ نے اگر نہیں لکھا تو حمد ثنا زبان سے کہہ دی ہوگی۔

ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ

اور میں تو یہ کہتا ہوں ___ کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا مگر ___ بہرحال قواعد فن کے بھی خلاف نہیں ___ کہ امام بخاریؒ کا طریق یہ ہے جو راویوں نے نقل کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے مکہ مکرمہ (زادہا اللہ شرفاً وکرامتاً) میں سولہ برس گزارے ہیں اور وہیں بخاریؒ کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس دوران میں اور بھی سفر ہوئے مگر مستقر مکہ مکرمہ رہا یہاں بیٹھ کر بخاری کی تکمیل کی ہے اور تکمیل بھی اس طرح سے کی ہے ___ کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے۔ پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ جب انشراح تام ہو جاتا تب حدیث نقل کرتے۔ تو ہر حدیث کو نماز اور غسل سے شروع کیا ہے۔ اور نماز اذکار عشرہ کا مجموعہ ہے۔ نماز کے اندر بسم اللہ بھی ہے، اعوذ باللہ بھی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھی ہے، تکبیر بھی ہے، تحمید بھی ہے، تسبیح بھی ہے، تہلیل بھی ہے جو اذکار عشرہ کہلاتے ہیں اور دین میں معروف ہیں۔ وہ سارے اذکار جمع کئے، طاعت وعبادت کی ساری ہیئتیں جمع کیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ آپ ___ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے ابتداء نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری نے ایک ایک حدیث میں نماز اور اذکار عشرہ سے ابتداء کی ہے۔ اس سے زیادہ اور آپ امام بخاریؒ سے کیا چاہتے ہیں؟ ___ اگر کتاب میں اذکار عشرہ نہیں لکھے۔ تو ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ کئے ہیں۔ اس کے بغیر حدیث نہیں لکھی۔ **لم یکتب** کا لفظ تو ہے نہیں **لم یبدا** کا لفظ ہے اور بدایت اس طرح سے کی کہ ایک ایک حدیث کے لکھنے سے پہلے نماز پڑھ لی۔ ہر نماز میں سارے اذکار ادا کئے تو آپ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے شروع نہیں کیا میں کہتا ہوں کہ ہر ہر حدیث کو اذکار عشرہ سے شروع کیا ہے۔ اس کی کوئی نظیر بتلائے۔ یہ کیا اعتراض کی بات ہوئی ___؟ غرض اس میں مصنفؒ پر کوئی شبہ نہیں پڑتا۔

ابتداء کتاب میں اتباع سنت کا اہتمام

اب آگے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اذکار میں بسم اللہ بھی داخل ہے، الحمد للہ بھی داخل ہے تو بسم اللہ ہی کی کیوں تخصیص کی؟ **الحمد للہ نحمدہ** کیوں نہ لکھ دیا ___؟ اس قسم کے سوالات طالبعلمانہ ہوتے ہیں کہ لکھا کیوں نہیں؟ فقط بسم اللہ ہی کیوں لکھی؟

تو میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی امام بخاریؒ نے اتباع سنت کیا ہے ___ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ منبر پر وعظ اور خطاب فرماتے تو پورا خطبہ ماثورہ پڑھتے۔ **الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ الخ** اور جب سلاطین کو دعوت اسلام کا فرمان بھیجتے تو اس میں فقط بسم اللہ ہوتی تھی اس کے بعد **من محمد بن عبد اللّٰہ ورسولہ الی فلانٌ الی فلان** ___ تو عادت کریمہ یہ تھی کہ خطبات اور مواعظ کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورا خطبۂ ماثورہ پڑھتے اور فرامین لکھتے تو فقط بسم اللہ پر اکتفاء فرماتے ___ تو امامؒ نے دیکھا کہ حدیثیں فی الحقیقت فرامین ہیں جو امت کے نام بھیجے گئے ہیں۔ تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ابتداء کی۔

ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے ___ وہ یہ کہ باب رکھا **کیف کان بدأ الوحی** وحی کا آغاز کیسے ہوا ___؟ اور حدیث لائے **انما الاعمال بالنیات** ___ دوسری حدیث میں جس میں وحی کی کیفیت ذکر کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وحی اس طرح سے میرے اوپر آتی ہے **یاتینی مثل صلصلۃ الجرس** جیسے گھنٹہ بجانے کے بعد جو گونج پیدا ہوتی ہے بس اس قسم کی آواز سنتا ہوں اس میں سے پھر حروف متمیز ہوتے ہیں۔ اور الگ الگ ہوتے ہیں۔ تو اگر **بدأ الوحی** کا باب رکھا تھا تو اگلی حدیث لانی چاہئے تھی یہ بیچ میں **انما الاعمال بالنیات** کا کیا ذکر ___؟ تو ترجمۃ الباب میں اور حدیث میں کوئی مناسبت قائم نہیں ہوتی یہ ایک سوال کیا جاتا ہے ___ حالانکہ مصنفؒ کا طریق یہ ہے کہ ترجمۃ الباب وہ رکھتے ہیں جو بعد میں حدیث لاتے ہیں۔ تو حدیث میں اور ترجمۃ الباب میں کامل مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ کہاں **بدأ الوحی** اور کہاں **انما الاعمال بالنیات** کہ عمل نیت سے ہوتا ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو کامل مناسبت ہے۔ اس واسطے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر جب وحی آتی ہے۔ تو نبی کے قلب میں پہلا جذبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اسے امت تک پہنچاؤں یہی تو نیت تھی ___ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس وحی کا تحمل بھی کروں اور امت کے لئے اس وحی کی ادائیگی بھی کروں۔ نزول وحی کے وقت انبیاء علیہم السلام کی یہی دو نیتیں ہوتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت سب سے پہلی چیز جو قلب نبوت میں آتی ہے وہ نیت ہے یا وحی کا انجذاب ہے۔ تو **بدأ الوحی** کو **انما الاعمال بالنیات** سے کامل مناسبت ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں وحی کے اترنے کے وقت یہ نیت تھی کہ میں اسے جذب کروں ___ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رٹنے لگتے تھے جس سے حق تعالیٰ نے روک دیا کہ :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی نہ کریں۔ ہم آپ کے قلب مبارک میں جمع کر دیں گے۔“۔

تو قلب مبارک میں پہلی نیت تو یہ آئی کہ میں اس وحی کو اپنے اندر جذب کر لوں اور ایسا یاد رکھوں کہ بھول نہ سکوں ___ تو سب سے پہلی نیت نبی کے قلب میں یہ آتی ہے کہ اس کا تحمل کر لوں اور اسے جذب کر لوں، اسے جزء نفس کر لوں ___ اس کے بعد دوسری نیت یہ ہوتی ہے کہ اسے مخلوق کی طرف پہنچاؤں اور اس امانت کو ادا کر دوں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کامل مناسبت ہے۔ اس واسطے اگر **بدأ الوحی** کے نیچے **انما الاعمال بالنیات** لائے تو کامل مناسبت پیدا ہو گئی کہ یہی حدیث لانی چاہئے۔ تو پوری مناسبت ہے۔ یہ کوئی شبہ واعتراض کی بات نہیں۔

كيف كان بدأ الوحي۔

''وحی کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟''

کس طرح سے وحی آئی؟ یہ تو اللہ کا فعل ہے کہ کس طرح سے وحی بھیجی؟ نبی کا فعل یہ ہے کہ جب وحی آئی تو نبی نے کیا نیت کی ___ ؟ یہ کہ اس کا تحمل بھی کروں اور ادائیگی بھی کر دوں۔ تو نیت اور وحی میں کامل مناسبت ہے۔

مثلاً آپ کے سامنے اگر وحی قرآنی پیش کی جائے یا وحی حدیث ہی پیش کی جائے تو سب سے پہلے آپ کے دل میں نیت ہی تو آتی ہے کہ اسے مان لوں۔ ماننے کے بعد یہ نیت آتی ہے کہ اس پر عمل بھی کروں، اس کے برکات اور فوائد بھی حاصل کروں۔ تو وحی کو نیت سے اتنی مناسبت ہے کہ درجہ اول میں وحی ہے اور درجہ دوم میں نیت ہے۔ بالکل مطابقت ہے۔

امامؒ کا تفقہ

تو امام بخاری نے **كيف كان بدأ الوحي** کا باب رکھ کر پھر حدیث **انما الاعمال بالنيات** کا ذکر کیا اس سے کمال مناسبت ظاہر ہوتی ہے کہ وحی نمبر اول ہے اور نیت نمبر دوم ہے۔ تو ان میں کامل تطبیق ہے۔ اس واسطے بدأ الوحی کے تحت میں حدیث مذکور کا آنا برمحل اور بہت موزوں ثابت ہوا۔

اس سے گویا امام بخاریؒ کے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو امام بخاریؒ فقط محدث ہی نہیں تھے بلکہ فقیہ بھی تھے۔ فقط روایت ہی سامنے نہیں آتی تھی بلکہ درایت بھی سامنے تھی۔ حدیث کے الفاظ ہی سامنے نہیں تھے بلکہ حدیث کے معانی اور حدیث کے حقائق اور معارف بھی ان کے قلب میں موجود تھے۔ تو امام بخاریؒ روایت اور درایت دونوں کے جامع ہیں ___ اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ **فقه البخاري في تراجمه** ___ امام بخاریؒ کا فقہ اگر دیکھنا ہو تو ان تراجم کو دیکھو جو باب رکھتے ہیں، مثلاً یہی باب **كيف كان بدأ الوحي**، **باب الايمان**، **باب الصلوٰة** وغیرہ ___ اور ان کے نیچے روایتیں لاتے ہیں ___ تو امام بخاریؒ کا اگر فقہ دیکھنا ہو تو ابواب و تراجم کو دیکھ لو۔ اس سے تفقہ معلوم ہوگا۔

درجۂ اجتہاد

یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ویسے معروف تو یہ ہے کہ وہ شافعی ہیں اور اکثر اعمال میں ہیں بھی شافعی ___ لیکن احادیث میں جب غور کیا جاتا ہے اور ان کی رائے معلوم ہوتی ہے تو بعض راؤں میں فقہ حنفی کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض میں امام شافعیؒ کی فقہ کو اور بعض میں امام مالکؒ کی فقہ کو ___ مختلف مذاہب کی ترجیحات ذکر کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب اجتہاد ہیں۔ خود مستقل ان کی ایک رائے ہے۔ تو محض مقلد ہی نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں۔ جس درجہ کا بھی اجتہاد ہو مگر اجتہاد ہے ___ تو ان کا تفقہ تراجم و ابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ **باب كيف كان بدأ الوحي** یہ ترجمہ ہے اور اس کے نیچے **انما الاعمال بالنيات** کی حدیث لائے اس سے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وحی اور نیت کی کیسی تطبیق ان کے قلب مبارک میں آئی کہ وہی حدیث ذکر کی جو بدأ الوحی کے ساتھ زیادہ مناسب تھی۔ بہرحال امام بخاریؒ نے اگر بسم اللہ سے آغاز کیا تو اتباع سنت کیا۔ ابتداء میں بدأ الوحی کا ذکر لائے تو مادۂ شریعت کا ذکر کیا جس کا مقام اولیت کا ہے پھر بدأ الوحی کے ساتھ **انما الاعمال بالنيات** کو لائے اس سے

تفقہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کتنی کامل مناسبت ہے۔

تشریح حدیث

اس کے بعد حدیث نقل کی :

انما العمال بالنیات وانما لامرء مانوی فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت هجرته الی دنیا یصیبها اوامرأة یتزوجها فهجرته الی ماهاجر الیه۔

اصل کلی

اس حدیث کے تین جز ہیں۔ سب سے پہلا جز **انما الاعمال بالنیات** ہے۔ یہ **ایک اصلی کلی** ہے جس میں کسی عمل کی طرف اشارہ نہیں۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ عمل نیت سے ہے۔ نیت اچھی عمل اچھا۔ نیت بری عمل برا۔ عمل نیت کے تابع ہے ___ بعض نے کہا ہے کہ :

انما ثواب الاعمال بالنیات

عمل پر جو ثواب ملتا ہے وہ نیت ہی سے ملتا ہے اور بعض نے کہا :

انما صحة الاعمال بالنیات

جب تک نیت نہ ہو عمل صحیح نہیں ہوتا۔

ہر ایک چیز پر اعتراض پڑتا ہے اس واسطے کہ شریعت کے بعضے اعمال ایسے ہیں کہ نیت نہ ہو تب بھی شریعت معتبر مان لیتی ہے ایک شخص جنبی ہے بلا نیت کے دریا میں کود گیا۔ شریعت نے اس عمل کو معقول سمجھا۔ وہ پاک ہو گیا۔ نماز ادا کر سکے گا یا ایک شخص نے وضو کیا' نیت کچھ نہیں کی۔ لیکن اس کا وضو مفتاح صلوٰۃ بن جائے گا۔ شریعت اس کو معتبر مانے گی۔ تو یہ کہنا کہ **انما صحة الاعمال بالنیات** عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا' یہ چلنے والا اصول نہیں ہے بہت سے اعمال ایسے ہیں جو صحیح ہو جاتے ہیں اور شریعت میں معتبر ہو جاتے ہیں حالانکہ نیت نہیں ہوتی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عمل کا ثواب اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نیت نہ ہو۔ اگر بلا نیت کے وضو ہوا تو مفتاح صلوٰۃ بن جائے گا۔ مگر اجر نہیں ملے گا جب تک تقرب نہ ہو۔ نماز اس درجہ میں صحیح ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عام یہ ہے کہ جیسی نیت ویسا عمل' نیت اچھی تو عمل اچھا' نیت بری تو عمل برا ___ تو **وجود الاعمال یا صحة الاعمال** تو صحیح نہیں ہوگا ___ **البتہ ثواب الاعمال** اس درجہ میں صحیح ہو گا یا پھر اعتبار کا لفظ (مقدر مانا جائے) کہ **انما تعتبر الاعمال بالنیات** ___ عمل کا اعتبار نیت سے ہے جیسی نیت ویسا عمل ___ بہرحال سب معنی محدثین نے ذکر کئے ہیں۔ تو پہلا جملہ **انما الاعمال بالنیات** یہ ایک اصل کلی ہے۔ اس میں کسی عمل کا ذکر نہیں۔ جو بھی عمل ہو وہ **انما الاعمال بالنیات** کے نیچے آجائے گا' تو ایک اصل کلی ذکر فرمایا۔

انتفاع نیت

اس کے بعد دوسرا جملہ **وانما لامرء مانوی** ہے جیسی نیت کرے گا' وہی صلہ ملے گا۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ کیونکہ جب آپ نے نیت کی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نیت پر کوئی فائدہ بھی مرتب ہو گا یا خالی نیت ہی کرائی ہے۔ کوئی ثمرہ مرتب ہو گا یا نہیں؟ یا قلب کا ایک تخیل ہے کہ ہم نے نیت کرلی۔

تو دوسرے جملے میں اس کا جواب دیا کہ نہیں' اس کا انتفاع بھی ہو گا۔ اگر نیت اچھی ہے تو عند اللہ عمل معتبر ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب ہو گا اور جیسی نیت کی وہی اس کو ملے گا۔ اگر اللہ و رسول کی قربت کی نیت کی ہے تو تقرب مل جائے گا۔ اگر دنیوی مصالح کی نیت کی ہے تو وہ مصلحت مرتب ہو جائے گی۔ مگر نیت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ضرور اس پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

ابتداء و ظہور عمل

اسی واسطے شرعی طور پر فرمایا گیا کہ :

نیتہ المرء خیر من عملہ

"آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے"۔

یعنی عمل کا آغاز نیت سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل عمل کرتا ہے جو نیت ہے۔ اس کے بعد ہاتھ' پیر عمل کرتے ہیں۔ وہ ہیئت عمل ہے۔ تو سب سے اول عمل کی ابتداء قلب سے ہوتی ہے اور وہ نیت کی صورت میں ہے۔ تو جس نے عمل کی نیت کرلی گویا اس نے اپنے دل سے عمل کرلیا۔ عمل کا ظہور نہیں ہوا وہ ہاتھ پیر سے ہو گا۔ مگر اس پر بھی نفع مرتب ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ایک شخص نے نیت کی کہ فلاں نیک کام کروں۔ ابھی کیا نہیں۔ تو فرشتہ لکھ دیتا ہے کہ ایک نیکی کرلی۔ اس پر آخرت میں ثواب مرتب ہو گا۔ تو مطلق نیت پر بھی ثواب مرتب ہوتا ہے۔ اگر بدی کی نیت کی تو قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک بدی لکھ دیتے مگر نہیں لکھی جاتی۔ اگر نیت بدل گئی کہ اس بدی کو نہیں کروں گا تو اس رک جانے پر ایک نیکی لکھ دیتے ہیں کہ یہ بھی ایک حسنہ اور نیکی ہے۔ یہ قلب ہی قلب سے معاملہ چل رہا ہے۔ اور نیت پر ثمرات مرتب ہو رہے ہیں۔ تو پہلا جملہ ثواب و عذاب سے قطع نظر محض ایک اصول تھا کہ جیسی نیت ویسا عمل دوسرے جملے میں انتفاع کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رائیگاں نہیں بلکہ جیسی نیت ہو گی ویسے ثمرات مرتب ہوں گے **وانما لامرء مانوی** جیسی نیت کرے گا وہ آگے آجائے گی۔ دنیا کی نیت کرے گا دنیا آجائے گی۔ آخرت کی نیت کرے گا آخرت آجائے گی۔

ثمرات نیت

جن کے واقعہ میں یہ حدیث ارشاد فرمائی گئی ___ یعنی حدیث کا شان نزول وہ صحابی ہیں جنہوں نے اس نیت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ فلاں عورت مالدار ہے' ام قیس اس کا نام ہے' اس سے نکاح بھی ہو جائے گا' دولت مند ہے کوئی مال بھی حاصل ہو گا ___ یہ نیت کی اور ہجرت کی ___ اس پر ارشاد فرمایا گیا :

انما الاعمال بالنیات وانما لامرء مانوی

"جو نیت کی ہے وہ ملے گا۔ اگر عورت کی نیت کی ہے وہ مل جائے گی"۔

مگر خدا نہیں ملے گا۔ اگر خدا کی نیت کی ہے تو خدا ملے گا۔ جیسی نیت ویسا ثمرہ ___ تو دوسرے جملہ میں

ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ یہ نیت رائیگاں نہیں جاتی بلکہ اس سے انتفاع ہوتا ہے۔ دنیا اور آخرت کا اس سے آدمی نفع اٹھاتا ہے۔

واقعہ جزئی

چنانچہ اس صحابی کا لقب ہی "مہاجر ام قیس" مشہور ہو گیا کہ یہ ام قیس کے مہاجر تھے جو مدینے گئے اور عورت کی نیت کی۔ بعد میں نیت درست کی ہو گی' توبہ کی ہو گی۔

غرض پہلا جملہ اصل کلی ہے دوسرا جملہ اس اصل سے انتفاع کا بیان ہے کہ آدمی نیت سے منتفع ہو گا۔ جیسی نیت کی ہو گی ویسے ثمرات سامنے آئیں گے۔

اور تیسرا جملہ ایک جزوی مثال کا ہے۔

فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا اوالی امراۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ۔

تو پہلے جملے میں اصول بیان کیا گیا دوسرے جملہ میں انتفاع بیان کیا گیا اور تیسرے جملے میں جزوی مثال بیان کی گئی۔

جامعیت حدیث

اور ظاہریات ہے کہ یہی تین درجے ہیں کہ جن سے ایک دعویٰ منضبط اور مرتب ہوتا ہے کہ پہلے دعویٰ کرو' پھر اس کی غرض وغایت بیان کرو۔ پھر اس کی ایک حسی مثال بیان کرو۔ تو دعویٰ منقح اور ثابت ہو جاتا ہے

تو یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھ چیزیں مجھے عطا کی ہیں جو پچھلے انبیاء کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے اوتیت جوامع الکلم مجھے جامع جملے دیئے گئے ہیں کہ چھوٹا جملہ بولتا ہوں اور علوم کے دریا اس کے اندر کھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہزار ہا ہزار مسائل اس سے نکل آتے ہیں۔

تو یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کہ تین جملے ہیں اور تینوں میں تین علوم ہیں اور الگ الگ تین فوائد ہیں۔ ایک اصل کلی' ایک انتفاعی کلیہ اور ایک مثال جزوی ___ غرض یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا۔

غور کیا جائے تو اس ایک حدیث پر عمل ہو تو آدمی کامیاب ہے۔ ہر چیز میں نیت کر لیا کریں۔ تو دنیا بھی دین بنتی چلی جائے گی۔ لباس پہنتے ہوئے اگر یہ نیت کر لیں کہ حکم خداوندی کی تعمیل کر رہا ہوں' بدن چھپانا واجب ہے' اب یہ عبادت بن گیا۔ اس پر اجر و ثواب مرتب ہو گا ___ کھانا کھاتے ہوئے نیت کرے کہ تقوی علی العبادت کے لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو اللہ کو یاد کروں' پھر یہ سارا کھانا عبادت میں داخل ہو جائے گا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ نیت کرے کہ اتباع سنت یہ ہے کہ گھر میں سلام اور اللہ کے نام سے داخل ہو تو میں اتباع سنت کر رہا ہوں یہ گھر میں داخل ہونا عبادت بن جائے گا۔ تو پوری دنیا کو دین بنا لینا یہ نیت سے ممکن ہے ___ بری نیت ہو تو عبادت بھی بری کی اور اعلیٰ نیت ہو تو عادت بھی عبادت بن جاتی ہے۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے بھی ہے۔ اور دین کا نچوڑ' اس میں گویا بیان کر دیا ہے کہ دین کا آغاز نیت ہی سے ہوتا ہے۔

آدمی جب اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی نیت یہی تو ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں داخل ہو جاؤں۔ تو نیت

سے دین کا آغاز ہوا۔ آگے عمل کا درجہ اب باقی ہے ___ یہ جوامع الکلم میں سے بھی ہے اور یہ حدیث دین کا اصل الاصول بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کو امام بخاریؒ ابتداءً لائے۔

ضروری تنبیہ

دوسرے یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ امامؒ طلباء کے لئے گویا اشارہ کر رہے ہیں کہ جو بخاری پڑھنے کے لئے بیٹھے ہیں، وہ سب ابھی سے اپنی نیت درست کرلیں کہ بخاری کیوں پڑھ رہے ہو ___ ؟ اگر نیت صحیح ہے تو اخیر تک یہ دین بنتا چلا جائے گا۔ اگر نیت غلط کی ہے مثلاً کوئی اس لئے بخاری پڑھ رہا ہے کہ میں محدث کہلاؤں تو شہرت طلبی مقصود ہوئی، خدا طلبی مقصود نہ ہوئی۔ اگر کوئی اس لئے پڑھ رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے دنیا کماؤں تو دنیا حاصل ہوگی آخرت نہیں ملے گی ___ اس واسطے امامؒ نے گویا ابتداءً اس کو روایت کرکے طالبان علم کے لئے تنبیہ کی ہے کہ سب سے پہلے اپنی نیت درست کرلو کہ کیوں بخاری پڑھ رہے ہو؟ تمہاری غرض و غایت کیا ہے؟ جیسی اخیر تک نیت کروگے، وہی ثمرات مرتب ہوتے چلے جائیں گے ___ تو جوامع الکلم میں سے بھی ہے، دین کی اساس بھی ہے اور ایک مختصر نصیحت جو پورے انسانوں کے دین کے لئے ہے اور جامع بھی ہے ___ اس واسطے امام بخاریؒ کا تقویٰ اور زہد اور اس کے ساتھ ذکاوت اور فطانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ کیسے عجیب طریق پر مصنفؒ نے اپنی کتاب کا آغاز کیا۔ تو یہ چند جملے میں نے عرض کردیئے۔ طالب علموں کے سامنے تو یہ جملے دس منٹ میں ادا ہو سکتے تھے۔ مگر چونکہ دوسرا مجمع بھی تھا اس واسطے قدرے تفصیل بھی کی۔ ورنہ درس کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ درس میں تو مختصر اور مجمل الفاظ ادا کردئے جاتے ہیں۔ وہ دس منٹ کے بات تھی ___ مگر جیسے مخاطب ہوں گے تو تھوڑی سی تفصیل کرنی پڑی۔

بہر حال اس تفصیل میں بھی کچھ فنی چیزیں آگئیں، کچھ احادیث آگئیں۔ کچھ امامؒ کی عظمت و جلالت شان آگئی، کچھ کتاب کی عظمت و جلالت شان آگئی اور کچھ آغاز کتاب کی برکت کا بھی ذکر آگیا۔ تو یہ سب چیزیں جمع ہوگئیں۔

دعا

اب آیئے سب حضرات مل کر کے دعا کریں اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو تادیر قائم رکھے۔ جس کے ذریعے سے دین پھیل رہا ہے۔ اور حجاز مقدس میں علم کا چرچا ہے اور جو بھی طلباء داخل ہوں وہ اپنے علوم سے منتفع ہوں۔ حق تعالیٰ انہیں باکمال بنا کر وہاں تک پہنچائے۔ جیسا کہ اب تک اس دار العلوم "مدرسہ صولتیہ" سے بہت سے علماء اور فضلاء نکل چکے ہیں اور انہوں نے دین کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔

اللهم ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

اللهم انا نسئلک علما نافعا وعملا صالحا ورزقا واسعا وشفاء من کل داء

اللهم ربنا اتنا من لدنک رحمة وهيئ لنا من امرنا رشدا۔

ربنا اتنا فی الدنيا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار وادخلنا الجنة

مع الا برار ياعزيز ياغفار۔

برحمتک ياارحم الراحمين۔

✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿

افاداتِ بخاری نمبر۱

"دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا۔ پھر اسلام کا' پھر اعمال کا' پھر معاملات کا' ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی مقبولیت پیدا ہوگی؟ تو اس حدیث پر لا کر ختم کیا کہ تسبیح و تہلیل پر کیا ثمرات مرتّب ہوتے ہیں۔ اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ تو دنیا سے ابتدا کی اور آخرت پر لا کر ختم کیا ــــــ یہ ایک عجیب و غریب صنعت ہوگئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہا میں قیامت اور یوم حشر اس کے ثمرات' اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

ربط بین الابواب

یہ بخاری کی آخری حدیث ہے۔ جس پر امام ہمام نے اپنی کتاب کو ختم کیا۔ پہلے تو امام کی اس صنعت پر غور کیا جائے۔ کہ ابتداء بھی عجیب انداز سے فرمائی اور انتہا بھی عجیب انداز سے کی۔ محدّثین کرام کا طریق یہ ہے کہ اگر کسی نے جامع لکھی تو "کتاب الایمان" سے ابتدا کرتے ہیں اور اس کے بعد دوسرے ابواب لاتے ہیں۔ اور اگر سنن کی کتاب ہے تو عموماً ابتدا "کتاب الطہارت" سے کی جاتی ہے اور پھر نماز' زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے ابواب لاتے ہیں۔ تو سنن کا بھی ایک طریقہ ہے۔ اور جوامع کا بھی ایک طریقہ ہے۔

وحی سے ابتدا کی وجہ

لیکن مصنف نے "کتاب الایمان" سے ابتدا کرنے کے بجائے' باب بدء الوحی سے کی ہے کہ وحی

کی ابتدا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے دین کے ابواب ہیں' ان کا مادہ درحقیقت وحی ہے۔ وحی مادہ شریعت ہے۔ اور اس مادہ کی بھی شاخیں ہیں۔ کوئی شاخ کتاب الایمان ہے کوئی شاخ کتاب الصلوٰۃ ہے۔ اور کوئی شاخ کتاب الزکوٰۃ ہے۔ تو ان سب میں وحی جلوہ گر ہے۔ قدر مشترک وحی ہے اور اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ وہی وحی کبھی نماز کی صورت میں نمایاں ہوئی اور وہی وحی کبھی حج کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ اور وہی وحی کبھی دوسرے ابواب کی صورت میں "ظہور پذیر ہوئی" تو مادہ شریعت کا وحیِ خداوندی ہے۔ اس لئے مصنف نے ابتدا مادہ شریعت کو ذکر کیا' اس کے بعد پھر اس کی شکلوں کو ذکر کیا" اور ظاہر بات ہے کہ مادہ کا وجود شکل پر مقدم ہوتا ہے"۔

بنیاد عمل ایمان ہے

تو سب سے پہلے کتاب الایمان کو لاتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام اعمال کی مقبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے۔ ایمان نہ ہو تو کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا۔ گویا ایمان تمام علوم کا مدار علیہ اور موقوف علیہ تھا۔ اس لئے پہلے کتاب الایمان لائے اب آدمی کو ایمان حاصل ہو گیا اعتقاد حاصل ہو گیا۔ حق تعالیٰ کی یکتائی پر' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر' تو سب چیزوں پر یقین ہو گیا۔

ضرورت علم

لیکن یقین کے بعد علم کی ضرورت پڑتی ہے کہ اس یقینی چیز کو ہم کس طرح سے انجام دیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ جہالت سے کوئی چیز انجام نہیں دی جاسکتی۔ تو کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم لائے ہیں تاکہ علم کی عظمت اور علم کی نوعیت واضح ہو جائے۔ گویا اب آدمی میں ایمان بھی ہے اور علم بھی حاصل ہو گیا۔

مقصدِ تخلیق

اس کے بعد میں پھر عبادات شروع کئے ہیں جو انسان کی پیدائش کا اصل مقصود ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ تو مقصد اصلی یہ ہے کہ انسان عبادت کرے۔ عبادت کے معنی ہیں کہ بندے کا ربط اللہ سے اور عبد کا معبود سے رابطہ کیا ہے؟ اس رابطے اور جوڑ کو عبادت کہتے ہیں۔ کہ جس سے قربت حق حاصل کر سکے' اور حق تعالیٰ سے تقرب پیدا کر سکے۔

عبادت کے بعد معاملات

جب بندے اور خدا کا رشتہ جڑ گیا۔ اس کے بعد بندوں سے بندوں کا کیا واسطہ ہے۔ تو معاملات "کے ابواب" لائے جس میں نکاح بھی ہے' جس میں بیع و شراء بھی ہے' ہبہ اور میراث بھی ہے' اوقاف بھی ہیں یہ تمام معاملات لائے ان تمام کو جب بیان کر لیا۔ اس کے بعد میں ان تمام چیزوں کو فتنوں سے بچانے کی کیا صورت ہے؟ ساری معلومات حاصل ہیں۔ سارے ابواب سامنے ہیں مگر فتنہ اتنا ہے ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ضرورتِ جہاد

تو پھر کتاب المغازی لائے اس کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ ہے تاکہ دین کو فتنوں سے محفوظ رکھا جائے اور فتنہ مرتفع ہو۔ پھر اس کے بعد جب جہاد بھی آ گیا تو ان مجاہدین کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال' انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں ذکر کیں کہ اصل مجاہد یہ حضرات تھے' ان کی پیروی میں دوسرے جہاد کریں گے۔

طریقِ عمل

لیکن طریق عمل کیا ہو گا؟ جس سے علم پر عمل کرے' ظاہر ہے کہ وہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اس لئے اس کے بعد باب اتباع السنۃ لاتے ہیں کہ سنت کی پیروی ہو گی تب اس پر عمل ہو گا۔ اور عمل پر عمل نصیب ہو جانا جب مؤثر ہو گا۔ جب پہلے ایمان ہو گا تو پہلے کتاب الایمان لائے' پھر کتاب العلم لائے اور پھر کتاب اتباع السنۃ لائے۔

فضیلتِ امتِ محمدیہ

ان تمام ابواب کو اس امت کی فضیلت پر لا کر ختم کیا اور آخر میں یہ حدیث لائے جس کی آپ نے تلاوت کی ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ مصنف نے دنیا سے ابتدا کی اور آخرت پر لا کر کتاب کو ختم کیا۔

ندرتِ سند

دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا' پھر اسلام کا' پھر اعمال کا' پھر معاملات کا ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی مقبولیت پیدا ہو گی؟ تو اس حدیث پر لا کر ختم کیا کہ تسبیح و تہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے تو دنیا سے ابتدا کی اور آخرت پر لا کر ختم کیا یہ ایک عجیب و غریب صنعت ہو گئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہا میں قیامت اور یوم حشر' اس کے ثمرات اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے۔

عظمتِ سند

تو جیسے کتاب جلیل القدر ہے، اور جیسے مصنف جلالت والے ہیں۔ اسی طرح سے ان کی صنعت بھی جلالت قدر رکھتی ہے کہ مصنف علام نے عجیب و غریب صنعت اختیار کی ہے ___ تو یہ تو میں نے ابتداء بخاری کے بارے میں عرض کر دیا۔

اوصافِ حدیثِ متعلقہ

اب اس کے بعد یہ حدیث آئی جو تلاوت کی گئی ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمٰن سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اس میں تسبیح سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم کا ذکر ہے۔ حدیث میں اس کے تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک تو حسی صورت ہے جو کانوں سے محفوظ ہو جاتی ہے اور آدمی دیکھ سکتا ہے۔ ایک معنوی چیز ہے ایک اخروی چیز ہے تو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

حسّی وصف اول

پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ خفیفتان علی اللسان یہ کلمے زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ ان کے پڑھنے میں کوئی دشواری اور پیچیدگی نہیں کہ زبان کو اینٹھنا پڑے بلسان عربی مبین عربی زبان جیسی خفیف اور اخف زبان کے یہ کلمات ہیں۔ زبان بھی ہلکی پھلکی ہے اور یہ کلمات "خاص طور پر" اس میں اور بھی ہلکے پھلکے ہیں۔ جن کے ادا کرنے میں نہ کوئی دشواری پیش آئے اور نہ اینٹھنا پڑے، بہت ہی ہلکے پھلکے ہیں۔

سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم

فضیلتِ عربی

اور بنا اس کی یہ ہے کہ خود عربی زبان بہت ہی خفیف اور ہلکی بھی ہے، اس کے کلمات جن معانی کو ادا کرتے ہیں وہ کلمات ایسے لطیف ہیں ان کے بغیر وہ حقیقت ادا نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہی کلمہ نہ پڑھا جائے۔ ان کلمات کو دوسری زبان میں ادا کرنا ہو تو دوسری زبانوں میں کلمات نہیں ملتے جو اس پوری حقیقت کو ادا کردیں۔ تو زبان پاکیزہ اور نہایت خفیف ہے۔ لسان اللہ بھی ہے۔ حق تعالیٰ اسی میں کلام فرماتے ہیں۔ اللہ نے اسی زبان کو اپنے معجزے کے اظہار کے لئے منتخب فرمایا۔ قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا یہ کلام نہیں کر سکتا۔ تو اس شانِ اعجاز کا کوئی دوسری زبان تحمل نہیں کر سکتی۔ نہ انگریزی نہ ترکی نہ پنجابی۔ اعجاز اور معجزے کا تحمل اگر کسی زبان نے کیا ہے تو وہ عربی زبان ہے کہ کلمات بہت تھوڑے اور حقائق اس میں بہت زیادہ بھرے ہوئے ہیں۔ زبان کے لحاظ سے خفیف بھی اور لطیف بھی ہے اور معجزے کا تحمل کرنے والی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ :

لسان اھل الجنۃ عربی

"کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی"۔

اہلِ برزخ کی زبان

برزخ کی زبان تو سریانی ہے۔ جس میں میّت کلام کرے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس سے خطاب کریں گے، زبان تو سریانی ہے۔ لیکن میدان محشر سے زبان شروع ہوگی تو وہ عربی زبان ہوگی۔ پھر جنّت کی وہی زبان رہے گی۔ اور ابد الآباد تک وہی زبان رہے گی۔ تو قرآن کی زبان عربی حق تعالیٰ شانہ کا کلام عربی، اہل جنّت کی زبان عربی تو یہ عربی زبان کی فضیلت وخفت اور اس کا ہلکا پھلکا ہونا دلیل سے واضح ہو گیا۔

سابقہ کتب کی زبان

ابتداءً حق تعالیٰ کی کتابیں عبرانی اور سریانی میں نازل ہوئی ہیں۔ تو عبرانی ثقیل ہے۔ جب اس کو ہلکا پھلکا کیا گیا تو اس کی شکل عربی ہو گئی۔ ورنہ ابتداءً وہ ثقیل تھی۔ مثلاً توراۃ عبرانی زبان میں اتری ہے۔ ایک آیت ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ اس میں زبان کو کتنا اینچنا پڑتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاں پیشین گوئی کی تو فرمایا کہ:

نابی بخر بخاما خوخا یا خیم نی بخو خاد جسمهم

اس میں سوائے خا "خ" کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا جب اس کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ معنیً نہیں بلکہ لفظاً تو یوں ہو گیا نابیؔ سے نبی ہو گیا۔

یعنی خربخنا یعنی من قربک بخربخا کی جگہ آگیا: **من تربک ماخوخا یعنی من اخیک یاخیم لخا یعنی یقیم لک یخوخا الهک فتسمون۔**

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیشین گوئی فرمائی گئی کہ نبی آئیں گے تمہارے قریب کے ہوں گے۔ تم بنی اسرائیل ہو وہ بنی اسماعیل ہوں گے۔ چچا تائے کے بھائی ہوں گے **نابی بخر بخا** یعنی **نبی من قربک ما خوخا** یعنی **من اخیک** تمہارے بھائی ہوں گے **یا خیم لخا** یعنی **یقیم لک** وہ اللہ کی الوہیت کو قائم کریں گے۔ اور اللہ کی عظمت و بزرگی اور اس کی عبادات کو قائم کریں گے' تو اب کہاں **نابی بخوخاما خیم لخا یا خوخا** ہے۔ اور کہاں **نبی من قربک من اخیک یقیم لک الهک** تو لطافت کا فرق نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں تو زبان کو ذرا اینچنا پڑتا ہے اور ایک میں زبان ہلکی پھلکی چلتی ہے۔ چونکہ زبان خود خفیف تھی اور اس میں یہ کلمات اور بھی زیادہ خفیف اور اخف ہیں تو فرمایا **خفیفتان علی اللسان** ان دو کلموں کو ادا کرو تو زبان پر بھاری نہیں ہیں۔ بہت ہلکے پھلکے ہیں نہ کچھ وقت لگتا ہے نہ کوئی پیچیدگی بلکہ پل بھر میں کلمات ادا ہو جاتے ہیں ___ تو ایک صفت تو یہ بیان کی گئی کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں۔ یہ صفت حسّی ہے یعنی جب آپ سنیں گے تو کان محسوس کریں گے کہ بڑی ہلکی پھلکی چیز ہے۔

وصفِ ثانی وزنِ اعمال اور ان کی کیفیت

دوسری صفت **ثقیلتان فی المیزان** زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں وزنی اور بھاری اجر اتنا بڑا ہوگا کہ آدمی بظاہر کتنا ہی پڑھے اتنا اجر نہیں ملے گا جتنا ان دو کلموں کے پڑھنے سے ملے گا تو میزان عمل میں وزنی اور ثقیل ہوں گے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت

وزن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی وزن اور ایک معنوی ہے۔ جسمانی وزن تو اجسام کا یہ ہے کہ سیر بھر کا وزن کم ہے دو سیر کا زیادہ اور تین سیر کا اس سے زیادہ اور دھڑی بھر کا اس سے زیادہ اور من کا اس سے زیادہ۔ تو ایک تو مادی وزن ہے جو مادیات سے متعلق ہے جتنی مادی چیز ضخیم ہوگی اور بڑی ہوتی جائے گی وزن بڑھتا جائے گا۔ اور ایک معنوی وزن ہے تو ان دو کلمات میں معنوی وزن ہے۔ ترازو میں تولنے لگو تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے معنی پر غور کرو تو نہایت باعظمت معنی ہیں جس کا بوجھ پڑتا ہے۔ بوجھ فقط مادی نہیں ہوتا بلکہ روحانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں عالم آئے تو میرے دل پر بوجھ پڑا۔ ان کے آنے سے کیا بوجھ؟

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ سیر کا وزن رکھا گیا؟ نہیں بلکہ ان کی عظمت کا بوجھ پڑا۔ ان کے اندر جو روحانی قوت تھی اس کی ہیبت پڑی اور میرا دل بیٹھنے لگا اور ان کی عظمت کو مان لیا ___ تو حق تعالیٰ کی عظمت جو دلوں میں ہے وہ معنوی عظمت ہے کہ بوجھ ہے اور وہ بوجھ معنوی ہے' حق تعالیٰ مادیات سے بری ہیں۔ اسی طرح ان کا کلام بھی مادیات سے بری ہے۔ روحانی اور لطیف ہے اس کا بوجھ قلوب کے اوپر پڑتا ہے ___ اگر کوئی جاہل کلام کہے تو آپ کے دل میں قطعی احساس نہیں ہوگا کہ بھائی یہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے اگر کوئی عالم کلام کرے تو آپ غور کریں گے اور کہیں گے کہ بڑا وزنی کلام ہے دل میں بیٹھتا نہیں ایک دفعہ اور سنادو ایک دفعہ اور سنادو تاکہ دل میں پوری طرح بیٹھ جائے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت مولانا تھانویؒ کے پاس تشریف لائے۔ تو فرمایا کہ ان کے آنے سے میرے دل پر ان کی عظمت کا بوجھ پڑا۔ یہ بوجھ مادی وزن نہیں تھا روحانی وزن تھا۔ جو باعظمت ہوتا ہے اس کے اثر کو روح قبول کرتی ہے' دل قبول کرتے ہیں۔ کاغذ کے اوپر اگر آپ یہ کلمہ لکھ دیں تو کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ لیکن جب پڑھنے لگیں۔ اور عظمت خداوندی سامنے آئے تو جی لرزنے لگے گا جیسے کسی چیز کو اٹھایا نہیں جاسکتا تو یہ معنوی بوجھ ہوتا ہے۔ تو یہاں مراد معنوی بوجھ ہے۔ کہ میزان عمل میں جب اس کلمے کو تولا جائے گا تو میزان عمل اس کی عظمت کے بوجھ سے جھک جائے گی۔

وزنِ روحانی

جیسا ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایک بندہ حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ اس کی بدکاریوں کے انبار ہوں گے۔ ایک دفتر کو پھیلاؤ تو زمین و آسمان جھک جائیں۔ وہ حاضر ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔ کہ اے بندے اپنے اعمال کو تلواؤ ___ وہ عرض کرے گا۔ کہ اللہ میں کاہے کو تلواؤں میرے پاس تو بدیاں ہیں۔ تولنے کی ضرورت تو تب ہو جب ایک طرف نیکی ہو اور دوسری طرف بدیاں ہوں۔ یہ تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ فرمایا کہ نہیں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ننانوے دفتروں میں ایک پرچی نکلے گی کہ پوری عمر میں ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ کلمہ طیبہ پڑھا ہوگا تو وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ ان ننانوے دفتروں کے مقابلہ میں اس پرچی کی کیا حیثیت ہوگی؟ میں تو جہنم کا مستحق ہوں۔ مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ مقام کریم تک پہنچ سکوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے' ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا' تو تلواؤ اور اپنی نگرانی میں تلواؤ کبھی تو یوں کہے کہ ملائکہ علیہم السلام نے کوئی زیادتی کردی ہے کم تول دیا یا زیادہ تول دیا۔ وہ ننانوے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ اللہ کے نام سے زیادہ وزنی نام کون سا ہو سکتا ہے کہ جس کے اندر عظمت کا بوجھ ہو تو اسی کا نام پاک کا یہ کلمہ بھی ہے سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ کہ اس کی عظمت سے میزان کا پلڑا جھک جائے گا اگرچہ لاکھوں بدیاں اور برائیاں ہوں مگر اس کی عظمت غالب آجائے گی اور وہ جھک جائے گا۔ تو مطلب یہ کہ ایک وزن مادی ہوتا ہے اور ایک وزن روحانی اور علمی ہوتا ہے۔ یہاں روحانی اور علمی وزن مراد ہے۔

درود شریف کی برکت

نیز حدیث میں جیسے فرمایا گیا کہ اس امت کے ایک فرد کو جہنم کا حکم دیدیا جائے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس کو جہنم کی طرف لے جا رہے ہونگے اور وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہو گا کہ کوئی مدد گار ہے یا نہیں؟ تو حضرت آدم علیہ السلام کی اس پر نگاہ پڑے گی تو حضرت آدم علیہ السلام پکاریں گے کہ۔ یا احمد یا احمد آپ عرض کریں گے لبیک یا ابا البشر حاضر ہوں۔ تو وہ فرمائیں گے آپ کی امت کا ایک آدمی ہے۔ جسے جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو آپ ملائکہ کا پیچھا کریں گے اور ان سے فرمائیں گے رک جاؤ۔ وہ کہیں گے ہمارا نام زبانیہ ہے ہم جہنم کے ملائکہ ہیں اور ہم امر خداوندی کے مامور ہیں ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے۔ امر خداوندی آچکا ہے، تو آپ بہت ہی تاسف سے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیر لیں گے، اور جا کر عرش کے نیچے سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے کہ میرا امتی ہے، بیشک گنہگار ہے مگر آپ کی رحمت وسیع ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم آپ کو رسوا نہیں کریں گے اور ادھر سے آواز دی جائے گی۔ لَا تَعْجَلُوْا جلدی مت کرو ملائکہ رک جائیں گے۔ آپ تشریف لائیں گے اور اپنی جیب میں سے ایک پرچہ نکالیں گے جیسے اس وقت کی جیب ہوگی، جیسا لباس ہوگا، خدا بہتر ہی جانتا ہے پرچہ نکالیں گے، اور بسم اللہ کہہ کر آپ اس کو میزان عمل میں ڈالیں گے۔ ایک دم نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا اور اس کی نجات ہو جائے گی۔

وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتا نہیں ہو گا تو آکر عرض کرے گا اے نیک نہاد! آپ کون ہیں جو اس آڑے وقت میں میری امداد کی اور مجھے جہنم سے بچایا۔ آپ فرمائیں گے : انا احمد میں تیرا نبی ہوں میرا نام احمد ہے تو جھک جائے گا اور کہے گا، سبحان اللہ یہ آپ نے آکے کیا کیا۔ میرا تو پلڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ تو آپ فرمائیں گے کہ تو نے ایک دفعہ نہایت ہی کمال اخلاص کے ساتھ درود بھیجا تھا وہ درود کی پرچی میرے پاس جیب میں محفوظ تھی۔ وہ اتنے اخلاص سے بھرا ہوا تھا کہ جب میں نے وہ پلڑے میں ڈالی تو اس اخلاص کی برکت سے وہ ساری بدیاں ہلکی پڑ گئیں۔ ظاہر بات ہے کہ درود شریف کو اگر پرچی پر لکھ کر جیب میں ڈال لیں تو کوئی وزن محسوس نہیں ہو گا لیکن روح اس کے وزن کو محسوس کرے گی۔ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ روح محسوس کرے گی تو حق تعالیٰ شانہ قیامت کے دن اعمال کے ڈھانچوں کو نہیں دیکھیں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر اخلاص کتنا ہے سچائی کتنی ہے محنت خداوندی کتنی ہے در حقیقت اس کا وزن ہو گا حدیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں اپنی معنویّت کی وجہ سے بھاری ہیں تو یہ دوسرا وصف ہوا یہ وصف حسّی نہیں ہے بلکہ وصف روحانی ہے اس کو ارواح و قلوب محسوس کریں گے۔

تیسرا وصف

تیسرا وصف ذکر کیا کہ حبیبتان الی الرحمن یہ دونوں کلمے وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں ظاہر بات ہے کہ جب کسی کے پاس اس کی پسندیدہ چیز ہدیے میں لے جائیں گے تو توجہ بہت ہوگی۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ کوئی ایسا ہدیہ لے جائیں جس سے اگلا کراہت محسوس کرے تو پسند نہیں کرے گا، قبول نہیں کرے گا کوئی ایسی چیز لے جائیں جو مرغوب ہے تو شکریہ بھی ادا کرے گا اور خوش بھی ہو گا، تو یہ کلمات حق تعالیٰ شانہ کو محبوب ہیں۔ محبوب چیز کا جب ہدیہ پیش ہو گا تو عنایات متوجہ ہو جائیں گی۔ محبوب کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں الوہیّت کے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقامِ الوہیّت

مقاماتِ الوہیّت چار ہیں جو خصوصیات خداوندی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اس میں شرک کی گنجائش نہیں ہے

پہلا مقام

سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے تنزیہہ کے معنی ہیں۔ اللہ کی پاکی بیان کرنا ہر عیب سے پاک ' ہر برائی سے پاک ہر نقص سے بری وبالا۔ کوئی ادنیٰ درجے کے نقص کا شائبہ یا عیب کا شائبہ ممکن نہیں۔ تصور میں بھی نہیں آسکتا تو سب سے پہلی چیز حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی وہ تمام عیوب سے پاک ہے۔ اللہ ہر عیب سے ہر ذم سے یعنی برائی اور کوتاہی سے پاک ہے تو تسبیح کے معنی درحقیقت تنزیہہ کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزّہ ہے اور سب چیزوں سے بالا ہے جس کو قرآن حکیم میں مختلف عنوانات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا گیا : لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اس لئے کہ یہ تھکن کی علامت ہے اور تھکن ضعف کی علامت ہے اور وہ قوی ہے اس کا ضعف سے کیا کام۔ کہیں فرمایا : لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی تیرا پروردگار نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ بھول اور بھٹک ضعف کے سبب سے ہوتی ہے اور حافظ قوی نہ ہو۔ اور وہ تو قوی ہے وہاں بھول چوک کا کیا کام؟ تو یہ آیتیں تنزیہہ کے لئے ہیں لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی' لَاتَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ نہ وہاں نیند ہے نہ وہاں اونگھ ہے اور نہ وہاں معاذ اللہ بھٹکنا ہے اور نہ وہاں نسیان ہے۔ ہر چیز سے وہ بری وبالا ہے اس کا علم قطعی اور محیط ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تو ساری چیزیں ''سبحان'' کے نیچے آتی ہیں کہ اللہ نوم سے 'اونگھنے سے' بھٹکنے سے اور بے راہ چلنے سے بھی پاک ہے تو سبحان کا کلمہ تنزیہہ کے لئے رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم نے اس طرف دعوت دی ہے۔ کہیں فرمایا فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ اللہ پاک ہے تم صبح کرو یا شام کرو یعنی صبح وشام تغیر کی علامت اور تغیر ضعف کی علامت ہے اور وہ ان سب سے بری ہے سارے تغیرات تمہارے اندر ہیں۔

سُبْحَانَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی اور مسجد اقصیٰ سے سمٰوات کی طرف رجوع فرمایا''۔

کہیں فرمایا :

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی۔

اور کہیں فرمایا :

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ۔

تو جگہ جگہ قرآن کریم نے تسبیح کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جہاں تنزیہہ بیان کرنی مقصود ہے کہ وہ ہر کوتاہی' ہر عیب' ہر شے سے منزہ ہے تو حق تعالیٰ شانہ، کی ذات کا پہلا مقام تنزیہہ ہے کہ وہ ہر عیب سے بری وبالا ہے۔

دوسرا مقام

اس کے بعد دوسرا مقام اس کی عظمت شان کا ہے کہ اس کی شان سب سے بڑی اور نرالی ہے اور لامحدود

عظمتوں کا وہ مالک ہے اس کے لئے شریعت نے حمد کا کلمہ رکھا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

حمد کے معنی یہ ہیں کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور تعریف کبھی برائی پر تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ کمال پر ہی ہوتی ہے تو جب ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سارے کمالات اسی کے لئے ہیں وہ سارے کمالات کا مصدر ہے۔ ہر خیر اور ہر برکت اس کی طرف سے ہے۔ ہر کمال اس کا۔ ہر علم اس کا ہے ہر خوبی اس کی ہے وہ تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔ تو کمالات کا سرچشمہ ہونے سے ظاہر کیا ہے کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں۔ اور جب ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں تو سارے کمالات بھی اس کے لئے ہیں۔ اس لئے کہ حمد کسی جمیل اختیاری پر ہوتی ہے کہ کوئی عمل اور کام ارادی اور اختیاری اتنا اعلیٰ ہو کہ جی چاہتا ہے کہ اس (کے صانع) کی تعریف اور حمد کریں۔ تو اس حمد کے ظاہر کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ نے حمد کا کلمہ رکھا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔

تو جگہ جگہ حمد کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ بعض سورتیں کلمہ حمد سے شروع ہوتی ہیں تو غرض تنزیہہ ہے کہ پاکی بیان کی جائے اس کے لئے سبحان کا کلمہ ہے اور ایک تحمید ہے۔ یہ الوہیت کا دوسرا مقام ہے۔

تیسرا مقام

اور ظاہر بات ہے کہ جو ذات ایسی ہو ___ ہر عیب سے پاک اور ہر کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی اس کے سوا کس کی ہو سکتی ہے؟ ساری برکتیں اس کی ساری عظمتیں اس کی اسی لئے فرمایا گیا:

وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں۔ اس کو ظاہر کرنے کے لئے اسلام میں تکبیر کا حکم ہے وہ اکبر ہے یعنی ہر چیز سے بالا عالم الغيب والشهادة الكبير المتعال : وہی عالی اور بلند ہے اس کے لئے تکبیر کا حکم ہے الله اكبر یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہر بڑائی اس کے سامنے حقیر ہے ہر عظمت اس کی عظمت کے سامنے چھوٹی ہے۔ اب کوئی انڈے کے سامنے چراغ جلادے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ اور سورج کے سامنے انڈا جلادے تو انڈے کی کیا حقیقت ہوگی؟ اس کا سارا نور سورج کے نور میں گم ہو کر رہ جائے گا ___ تو انوار ربّانی کے سامنے کوئی نور نہیں چلتا سب مدہم ہو جاتے ہیں ___ اسی طرح انوار ربّانی کے سامنے کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔

تو کبیر کے معنی یہ ہیں کہ بلندی' برتری اور بالائی سب اسی کے واسطے ہیں جن کو وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے تعبیر کیا کہ آسمانوں اور زمینوں میں اسی کے واسطے بڑائی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الكبرياء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی فيهما قصمته۔

تکبر اور بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا تو میں یقیناً اسکی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچے دکھاؤں گا۔ اس لئے جو بھی کسی مجلس میں بڑا بول بولتا ہے تو یقیناً اسی مجلس میں

اس کی حقارت کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ سمائی (معافی) ہے۔ لیکن کبر اور نخوت جب ہوگی تو ہاتھ کے ہاتھ اس کو جواب ملے گا۔ اس کی مغفرت نہیں یہ قابل برداشت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ گناہ بندے کا اپنا فعل ہے۔ اور اپنی صفت ہے اور کبریائی و بڑائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ جو اس کی بڑائی میں حصّہ دار بننا چاہے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کو نیچا دکھایا جائے گا۔ ذلیل و رسوا کیا جائے گا تو عظمت و کبریائی تیسرا وصف ہے۔

چوتھا مقام

حق تعالیٰ کی تمجید یعنی عظمت اس کی بزرگی بڑائی کے لئے تکبیر کا کلمہ رکھا گیا ہے کہ اللہ اکبر من کل شیء اللہ ہر چیز سے بڑا ہے اب ظاہر بات کہ جو عیب سے پاک ہے اور خوبی کا سرچشمہ ہو۔ بڑائی بھی اسی کے لئے ہو تو اس کے علاوہ یکتائی کے لائق اور کون ہو سکتا ہے۔ اس سے توحید پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے تہلیل کا حکم رکھا گیا لا الہ الا اللہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کے آگے جھکیں گے' اسی کے آگے فریاد کریں گے اسی سے مدد مانگیں گے اور اسی کی طرف رجوع کریں گے وہی دافع امراض ہے ہر عبادت اسی کے لئے ہوگی۔ تو یہ دعویٰ توحید چوتھا مقام ہے۔

دعویٰ توحید کی تکمیل

اس سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ توحید کا دعویٰ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ تین مقام سامنے نہ ہوں تنزیہہ مکمل ہو کہ ہر عیب سے پاک ہو تو یہہ ہو کہ ہر خوبی کا مالک ہو' تکبیر مکمل ہو کہ ہر عظمت اس کی ہو۔ جب یہ تین چیزیں ثابت ہونگی تب توحید کا وجود ہوگا۔ اگر کوئی اللہ کی تنزیہہ نہ کرے اس میں مخلوق کی صفات مان لے یا مخلوق میں خالق کی صفات مان لے تو وہ کبھی بھی توحید کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ ہوگا۔ توحید کا پہلا قدم تنزیہہ کہ ہر عیب سے اس کی پاکی بیان کرو لم یلد ولم یولد۔ نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ اس کی کوئی اصل ہے۔ وہ خود اصل ہے نہ وہ کسی کو جنے گا کہ اس کا کوئی بیٹا ہو یا کوئی اس کی بیوی ہو یا کوئی کفو اور برابر ہو۔ تو ان سب چیزوں سے آدمی پاکی بیان کرے گا۔ تب توحید کے مقام پر پہنچے گا۔ اللہ کے باپ ہونے کا قائل ہو جائے اس کے لئے کسی برابری کا قائل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی شریک ہونے کا قائل ہو جائے۔ وہ کبھی توحید کا مدعی نہیں بن سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا ہوگا۔ اس لئے کہ توحید کا پہلا قدم تنزیہہ ہے ___ تو چاہے نصاریٰ توحید کا دعویٰ کریں۔ چاہے مشرکین کریں مگر وہ زبانی دعویٰ ہے حقیقت اس میں کچھ نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس تنزیہہ نہیں اس طرح سے تو یہہ نہیں یعنی ساری **عظمتیں** بڑائیاں اس کی ذرہ برابر اس میں نقص نہیں۔ اگر حق تعالیٰ کی ذات میں ادنیٰ درجہ نقص مان لے گا تو وہ تو یہہ کے خلاف ہوگا اور توحید کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ جیسے یہود نے بندوں کی ناقص صفات اللہ میں تسلیم کیں اور کہا کہ جب طوفانِ نوح آیا تو حق تعالیٰ بیٹھ کر رونے لگے۔ ہائے میری مخلوق ڈوب رہی ہے تو معاذ اللہ اس کی اتنی قدرت نہیں تھی کہ بچالے تو رونے بیٹھ گئے۔ اتنے روئے کہ آنکھیں دکھنے آگئیں اور فرشتے مزاج پرسی کو پہنچ گئے کہ حضرت اب آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟ تو معاذ اللہ یہود نے خالق کے اندر مخلوق کی ناقص صفات مان لیں اور نصاریٰ نے خالق کی صفات مخلوق میں مان لیں حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تین معبودوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم غیب کلی رکھتے ہیں۔ کہ سب سے پہلا دعویٰ نصاریٰ کا ہے کہ وہ محیط الکل ہیں۔ مقتدر اعلیٰ پیدا کرتے ہیں۔ چاہے موت دیدیں یا زندگی جو الوہیّت کی خصوصیات تھیں وہ بندے میں مان لیں جو بندے میں مانی نہیں جاسکتی تھیں اور یہود نے جو بندوں کی ناقص صفات تھیں وہ خدا میں مان لیں۔ تو انہوں نے جو حدود تھیں توڑ دیں۔ خالق اور مخلوق کا فرق اٹھادیا تو جب اللہ کی تنزیہہ نہ رہے تو بھی توحید کو آدمی نہیں پاسکتا۔

خصوصیّتِ الوہیّت

اس کے بعد تیسری چیز تکبیر ہے کہ ساری **عظمتیں** اس کی ہیں۔ جس میں بھی عظمت ہے تو وہ اس کی عظمت کا کوئی جلوہ اور پرتو ہے۔ فی ذاتہ کسی میں عظمت نہیں ہے بذاتہٖ عظمت صرف ذات حق میں ہے وہ کسی کو عظمت عطا کردیں تو وہ عظمت والا بن جائے گا چھین لیں تو وہ بے عظمت بن جائے گا۔ کسی کو حکومت دیدیں تو وہ حاکم کہلائے گا، حکومت چھین لیں تو حاکم باقی نہیں رہے گا۔ کسی کو ملک دیدیں تو وہ ملک کہلائے گا۔ کسی سے چھین لیں تو وہ مُلک باقی نہیں رہے گا۔ لیکن اللہ کا ملکِ ہونا ازل سے لے کر ابد تک ہے۔ اس کو کسی کی دی ہوئی حکومت نہیں وہ بالذات مُلک ہے۔ اس کی ملکیت بالذّات ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی ملکیّت کو اس سے کوئی چھین لے۔ ہر ایک کی ملکیّت چھن سکتی ہے ہر ایک کا ملک جاسکتا ہے ہر ایک کا اقتدار جاسکتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے آتا بھی ہے جاتا بھی ہے ___ لیکن ازل سے لے کر ابد تک جس کی قدرت محیط، جس کا اقتدار محیط، جس کا ملک محیط، جس کی ملک محیط۔ وہ صرف حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں۔ اس لئے عظمتوں کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی لئے نمازوں میں سبحان ربی العظیم پڑھتے ہیں تاکہ عظمت نمایاں ہو۔ یہ چار مقام ہوئے۔ یہ مقام توحید کا انتہائی درجہ ہے۔ ابتدائی درجہ تنزیہہ کا ہے۔ پھر تنویہ کا پھر تکبیر کا پھر جاکر توحید کا مقام آتا ہے۔ ان تینوں کو پھلانگ کر کوئی توحید تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر دعویٰ کرے گا۔ تو جھوٹا دعویٰ کرے گا

حدیثِ متعلقہ

حدیث مذکورہ میں یہ چاروں مقام بیان فرمائے گئے ہیں سبحان اللہ میں تنزیہہ آگئی کہ ہر کمال کا وہ مالک ہے۔ ہر عظمت کا مالک وہ ہے اس کے لے حمد ہے اور سبحان اللہ العظیم کے اندر عظمت آگئی کہ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں۔ جب ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں تو سارے کمالات اس کے لئے ہیں۔ اس لئے وہ سارے عیبوں سے بری اور بالا ہو تو التزامی طور پر یکتا وہی ہو گا۔ لاالہ الا اللہ بھی اس سے نکل آیا۔

اور ایک حدیث میں تو ان چاروں باتوں کو عبارۃً بیان کیا گیا ہے جیسے فرمایا گیا کہ **احب الکلمات الی اللہ اربع** سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کو چار کلمے ہیں۔ **سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔** ان چاروں کلموں کو محبوب کہا گیا ہے۔ تو یہاں عبارت کے اندر چاروں کلمے موجود ہیں۔ سبحان اللہ بھی الحمدللہ بھی اللہ اکبر بھی لاالہ الا اللہ بھی۔ تو اس کلمہ (یعنی حدیث مذکورہ فی الباب) میں تین عبارۃً موجود ہیں اور ایک اقتضاءً ہے کہ عبارت ازخود اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ سبحان اللہ میں تو تسبیح آگئی اور وبحمدہ میں حمد آگئی۔ العظیم میں عظمت آگئی اور ان تینوں کے مجموعے سے لازم آگیا کہ ایک ذات ایسی ہے جو یکتا ہے تو اس سے لا الہ الا اللہ نکل گیا۔ تو وہاں عبارت میں چاروں مقامات موجود ہیں اور یہاں تین تو عبارت النص میں موجود ہیں اور ایک اقتضاء النص سے نکلتا ہے۔ یہ چاروں کلمے اللہ کو محبوب ہیں۔

محبوب کیوں ہیں؟اس لئے کہ یہ کلمات اس کے مقام کے ترجمان ہیں۔ اور یہ فطرت ہے کہ جس میں کسی کی واقعیّت بیان کی جائے تو وہ اس کو پسند ہوگی۔ آپ کسی کی بیٹھ کر تعریف کریں تو بڑے غور سے سنے گا اور بہت خوش ہوگا اور اگر برائیاں کریں تو رنجیدہ ہوگا۔ بھلائیاں بیان کریں خوش ہوگا۔ کیوں خوش ہوگا؟ اس لئے کہ وہ بھلائیاں اس کے اندر موجود ہیں۔ تو وہ خوش ہوگا کہ اس کے سنانے والے موجود ہیں۔ اسکو بیان کرنے والے موجود ہیں۔ تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی کی خوبی بیان کی جائے تو وہ خوبی والا فطرۃً خوش ہوتا رہے گا۔ اس کے لئے دلیل کی حاجت نہیں۔ حق تعالیٰ کی خصوصیات جب کوئی بیان کرے گا۔ تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں وہ پسند ہونگی۔ وہ چیزیں ان کے سامنے محبوب بنیں گی یہ الوہیّت کی خصوصیات تھیں۔ اس لئے جب بندہ انھیں ادا کرے گا تو یہ کلمے بھی محبوب بنیں گے اور ادا کرنے والا بھی محبوب بنے گا۔

حدیث میں مذکور اوصافِ ثلثہ اور صفتِ علم کی فوقیّت

تو اس سے میں نے عرض کیا کہ تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک حسّی وصف ہے ایک معنوی وصف ہے اور ایک غیبی وصف ہے۔ حسّی وصف تو یہ کہ زبان پر ہلکے پھلکے ہیں ہر ایک محسوس کریگا۔ معنوی وصف یہ ہے کہ میزان عمل میں وزنی اور ان کی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے اور غیبی وصف یہ ہے کہ حبیبتان الی الرحمن اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو امام بخاریؒ کی صنعت قابل داد ہے کہ سب سے پہلے وحی کا ذکر کیا کہ وہ پسندیدہ چیز ہے چونکہ وحی کی حقیقت علم ہے اور علم سب سے بڑی صفت ہے تمام صفات سے۔ اس لئے کہ جتنی بھی صفات ہیں وہ اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہیں لیکن علم اپنے کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ سب سے اوّل ارادہ ہے ارادہ آپ جب کریں گے جب مراد کا علم ہو جائے گا۔ اگر مراد ہی معلوم نہیں تو آپ کس کا ارادہ کریں گے اسی طرح قدرت ہے، قدرت جب آپ استعمال کریں گے جب اس مقدور کا علم تو ہو کہ مجھے قدرت کا ہے میں صرف کرنی ہے اگر اس مقدور کا علم ہی نہ ہو تو آپ قدرت کا بے جا صرف کردیں گے۔ تو قدرت اپنے کام کرنے میں علم کی محتاج ہوتی ہے۔ ارادہ اپنے کام لانے میں علم کا محتاج ہے۔ اسی طرح اقتدار ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ وہ مقتدر چیزیں جن پر آپ کو اقتدار حاصل ہوگا، پہلے سے معلوم ہوں ایک ملک پر آپ اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس ملک کا علم تو ہو کہ وہ کہاں ہے تاکہ میں جاکر اس پر اقتدار کو قائم کرسکوں، تو اقتدار نہیں آسکتا جب تک مقتدر کا علم نہ ہو تو ارادہ بھی علم کا محتاج، قدرت بھی علم کا محتاج اور اقتدار بھی علم کا محتاج ___ اسی طرح آپ کسی چیز کی حفاظت کریں تو پہلے اس شئی کا علم تو ہو جس کی آپ حفاظت کررہے ہیں اور اگر شئی معلوم نہ ہو تو آپ حفاظت کس کی کریں تو حفیظ کی صفت کام نہیں کرے گی جب تک کہ پہلے علیم کی صفت نہ ہو تو ہر صفت اپنے کام میں علم کی محتاج ہے لیکن علم نہ ارادے کا محتاج نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج۔

آپ ریل میں جارہے ہیں تالاب آگیا۔ آپ ارادہ کریں یا نہ کریں آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ تالاب ہے یہ نہیں کہ آپ ارادہ کریں تو یہ معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے اور اگر ارادہ نہ کریں تو کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ تو ارادہ کی احتیاج نہیں جب شئی سامنے آجائے گی تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ آپ نے شہر دیکھ لیا علم ہو گیا کہ یہ شہر ہے۔ علم اس کا محتاج نہیں ہے کہ پہلے آپ شہر پر اقتدار حاصل کرلیں اور پھر معلوم ہو (کہ وہ شہر ہے) تو آپ کو اس پر اقتدار حاصل ہو نہ ہو، جب شہر سامنے آئے گا تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ فلاں شہر ہے۔ تو علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج ورنہ

ساری صفات علم کی محتاج ہیں تو علم اُمّ الصّفات ہے سب سے اونچی صفت ہے اور ظاہر بات ہے۔ کہ جب علم سب سے زیادہ اونچی صفت ہے اور تمام صفات اس کی محتاج ہیں تو وحی بھی حقیقتِ علم ہی تو ہے۔ حق تعالی اپنے پیغمبر پر وحی فرمائیں اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہی ہیں کہ اپنا علم القاء کر دیا۔ تو وحی کے دوسرے معنی علم خداوندی کے ہیں تو وحی بھی محبوب چیز ہوئی کیونکہ علم انسان کو محبوب ہے تو محبوب چیز سے اپنی کتاب کی ابتداء کی۔ یعنی بدء الوحی سے اور محبوب ہی چیز پر کتاب کو ختم کیا **سبحان اللہ وبحمدہ سبحان العظیم۔**

"اب ظاہر بات ہے کہ جو کتاب محبوبات سے شروع ہو اور محبوبات پر ختم ہو تو بیچ کی ساری باتیں محبوبات میں داخل ہو جائیں گی"۔

"اوّل وبآخر نسبت دارد" ہر اوّل کو اپنے آخر سے نسبت ہوتی ہے اور بیچ کی چیزیں اوّل یا آخر کے تابع ہوتی ہیں۔ کتاب کی ابتداء بھی محبوب چیز سے ہوئی وہ علم خداوندی ہے، اور کتاب کی انتہا بھی ایک ایسے عمل سے ہوئی کہ وہ عمل محبوب خداوندی ہے یعنی سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم پڑھنا یہ عمل محبوب ہے' تو امام بخاریؒ کی صنعت بھی واقعی نرالی اور انوکھی ہے جہاں ان کا دل اور قلب پہنچا دوسرے نہیں پہنچ سکے' امام بخاریؒ کی جلالت شان اور ان کا کمال وہ اسی کا مقتضی تھا کہ کتاب بھی اتنے ہی کمالات سے بھری ہوئی ہو۔

صحتِ بخاری

تو امام بخاریؒ روایت کرنے میں یکتا ہیں کہ صحیح بخاری کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ ان کی شرائط پر منطبق ہیں وہ نہایت ہی اونچی حدیثیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحیح کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ مسلم میں بھی صحیح حدیثیں ہیں' ترمذی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں' نسائی میں بھی' تو صحیح حدیثیں اور کتابوں میں بھی ہیں مگر جن شرائط اور محتاط طریقے سے امام بخاریؒ قبول کرتے ہیں ان سب سے نیچے نیچے ہیں۔ ان کی نہایت پکی شرطیں ہوتی ہیں۔ ان میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تو امام بخاریؒ نے ایسی کڑی شرطیں روایت میں لگائی ہیں کہ وہ اور صحیحوں سے بڑھ کر روایت میں صحیح ہیں جن کو امام بخاریؒ نے روایت کر دیا ___ اسی لئے امّت کا اس پر اجماع ہے :

اصح الکتب بعد کتاب اللہ

کہ اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری ہے۔ کتاب اللہ کے بعد اس کا درجہ رکھا گیا۔ اول تو طبعاً بھی بعد میں اس کا مرتبہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کتاب اللہ میں تو اللہ کا علم ہے ___ کتاب اللہ اس کو کہتے ہیں کہ جس میں حق تعالیٰ کا علم ہو' اور یہ صحیح بخاری در حقیقت کتاب الرسول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول کی کتاب کا درجہ تو اللہ کے بعد ہی ہے اس لئے رسول کا درجہ بھی اللہ کی کتاب کے بعد ہوا۔ تو اعلیٰ ترین صحت کتاب اللہ کی ہے کہ اس عالم میں کسی آسمانی کتاب کو وہ صحت نصیب نہیں ہوئی وہ فصیحت اور سندیت نصیب نہیں ہوئی جو کتاب مبین کو ہوئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کلام اللہ در حقیقت صرف یہی ہے۔

سابقہ کتب سماوی کی حیثیت

توراۃ حقیقی معنی میں کلام اللہ نہیں ہے انجیل بھی حقیقی معنی کے لحاظ سے کلام اللہ نہیں اس لئے کہ کلام کہتے ہیں **ما بہ التکلم بہ** جس کو بولنے والا بولے وہ کلام کہلاتا ہے لکھ کر دیدے اس کو مجازاً کلام کہہ دیں گے خط تو کہیں گے لیکن کلام نہیں کہیں گے یوں مجازاً آپ کلام کہہ دیں گے۔

آپ نے کوئی مضمون اپنے دل کی حکمت سے دوسرے کے دل میں ڈال دیا تو اسے کلام نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ آپ نے زبان سے تو وہ کلام نہیں کہا۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دی گئی مگر پڑھ کر حق تعالیٰ نے نہیں سنائی توراۃ کو الواح کے اوپر لکھ کر حوالے کردیا تو توراۃ کتابِ خداوندی ہے کلامِ خداوندی نہیں ہے مجازی طور پر اس کو کلامِ خداوندی کہیں تو کہہ سکتے ہیں حقیقی معنی میں کتاب انجیل ہے۔

وہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القا فرمایا۔ انہوں نے اپنے مبارک الفاظ میں اس کو ادا کیا جیسے حدیث ہے کہ یہ وحی ہے مضمون حق تعالیٰ کا ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں' اس میں وحی متلو وہ ہے جو قرآن ہے اور وحی غیر متلو یہ ہے' وہاں الفاظ بھی اللہ کے ہیں اور مضمون بھی' یہاں مضمون تو حق تعالیٰ کا ہے لیکن اس میں الفاظ عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ اس لئے انجیل کو مضمون خداوندی کہا جائے گا کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے تکلم نہیں کیا۔ مجازاً آپ کہہ دیں کہ یہ بھی کلام خداوندی ہے لیکن قرآن حکیم حقیقی معنی میں کلام خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے پڑھ کر سنایا بھی ہے تو ما یتکلم بھی ہے یعنی کلام بھی اللہ نے کیا اور مضمون تو اس کا ہے ہی اور لوح محفوظ میں لکھا بھی ہے تو یہ کتاب خداوندی بھی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے پڑھا بھی ہے اس لئے یہ کلام خداوندی بھی ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کی عظمت سے تمام ملائکہ بے ہوش ہوجاتے تھے اور جب ہوش میں آتے تو پوچھتے **مَاذَا قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقَّ۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ** ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام فرماتے کہ حق فرمایا ہے۔ اور وہ علی کبیر ہے۔ تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا ہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورا قرآن لاکر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔

صرف قرآن ہی کلام خداوندی ہے'

تو قرآن کریم کتابِ خداوندی بھی ہے کہ سب سے پہلے اس کو لوحِ محفوظ میں لکھا گیا اور اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا کہ وہ حروف ذرا خفی تھے اور لوحِ محفوظ کے حروف جلی تھے بعض احادیث میں ہے کہ ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر تھا جیسا لکھنے والا' ویسا اس کا قلم' ویسے اس کے حروف ویسے ہی اس کی لوح۔ لکھنے والا لامحدود عظمت والا ہے اسکے کلام کی کتابت بھی ایسی ہوگی اور حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر چھوٹے حرفوں میں لکھا گیا۔ یہاں سے حمائل کا ماٰخذ نکل آیا مسلمان بڑی تختی میں بھی قرآن کریم لکھتے اور چھوٹی حمائل شریف بھی گلے میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے حمائل بھی لکھدی اور لوحِ محفوظ پر جلی حروف میں بھی لکھا۔ اس کا ماخذ بھی ہے۔ بہرحال یہ کتابِ خداوندی بھی ہے جس کو قرآن کہتے ہیں اور کلامِ خداوندی ہے جس کا باری تعالیٰ نے اولاً تکلم کیا پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے سامنے تکلم کیا۔ احادیث میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام ہر رمضان میں حضور علیہ الصلوۃ السلام کے ساتھ دَور کرتے تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھتے۔ وفات کا جو سال ہے جو آپ کا آخری رمضان تھا اس میں دو مرتبہ دور فرمایا تو تکلم واقع ہوا۔ نبی کی زبان سے بھی یہ کلام ادا ہوا اور فرشتے کی زبان سے بھی یہ تکلم ہوا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی تکلم ہوا۔ تو کلامِ حقیقی صرف کلامِ خداوندی یہی قرآن ہے۔ دوسری چیزوں کو کلام مجازاً کہہ دیں گے حقیقتاً وہ یا کتابِ خداوندی ہے یا مضمونِ خداوندی ہے لیکن

کلام اسی کو کہیں گے جس کے ساتھ تکلم واقع ہوا۔

قرآن وحدیث میں مابہ الامتیاز

تو یوں کہنا چاہیئے کہ حدیث مضمونِ خداوندی لیکن الفاظ حضور علیہ السلام کے ہیں اور قرآن کلام خداوندی ہے کہ لفظ بھی اللہ کے مفہوم بھی اللہ کا اس لئے اس کو وحی متلو کہتے ہیں کہ وہ تلاوت میں آتی ہے اور اس (حدیث) کو وحی غیر متلو کہتے ہیں کہ یہ ان معنوں میں تلاوت میں نہیں آتی۔ لیکن محبّت اور استفادے کا تقاضا ہے کہ اس کی بھی تلاوت کی جائے۔

چنانچہ بعض علماء کا معمول رہا ہے کہ جہاں وہ دو چار پارے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو وہاں وہ بخاری کا پارہ ــــ یا نصف یا ربع یا ثلث مقرر کر لیتے تھے اور اس کی بھی تلاوت کرتے تھے اب بھی بعض علماء ایسے ہیں کہ وہ بخاری کی تلاوت کرتے ہیں دو تین سال میں ختم کر دیتے ہیں تو تلاوت کرنے میں ایک برکت حاصل ہو گئی دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا ہوتی ہے جتنا کسی کے کلام کو پڑھا جائے اس سے نسبت پیدا ہو جائے گی یعنی دل اٹک جاتا ہے اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر آدمی بامعنی پڑھے تو حقائق تک پہنچتا ہے اور اگر مراقبے کے ساتھ پڑھے تو کیفیات بھی طاری ہونے لگتی ہیں۔

شاہ رفیع الدینؒ لکھتے ہیں کہ جب تلاوت کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ دراصل تلاوت کنندہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، میں تلاوت نہیں کر رہا۔ حق تعالیٰ تلاوت کر رہے ہیں زبان میری ہل رہی ہے زبان میری ہے کلام ان کا ہے تکلم ہو رہا ہے :

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَاِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔

، ہمارا نبی جو کلام کرتا ہے کلام ہمارا ہے زبان انکی ہے زبان مظہر بنی ہوئی ہے ــــ تو شاہ رفیع الدینؒ لکھتے ہیں کہ تلاوت کرنے بیٹھو تو اس لحاظ سے کرو کہ کلام حق تعالیٰ کا ہے۔ وہ پڑھ رہے ہیں زبان میری حرکت کر رہی ہے۔ اس پر عبور ہو رہا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ جب یہ مراقبہ مضبوط ہو جائے گا تو صراحۃً غیب و کشف کے اندر سے آواز آنا بھی شروع ہو جائے گی کہ حقیقتاً تم تلاوت نہیں کر رہے ہو۔ حق تعالیٰ ہی تلاوت کر رہے ہیں اور جب وہ تلاوت کریں گے تو پورے عالم کا ذرّہ ذرّہ ناطق ہوگا۔ اس کلام کے ساتھ ہر درخت کے پتہ سے آواز آئے گی کہ تلاوت ہو رہی ہے۔

بہرحال یہ کلام خداوندی کی خصوصیّت ہے کہ اس کی تلاوت کرو تو بڑھتا چلا جائے گا۔ تلاوت کثرت سے کرو تو حق تعالیٰ سے نسبت پیدا ہو گی اور اس کو مراقبہ سے کرو گے تو وہ کیفیات جو ان آیات میں بھری ہوئی ہیں وہ قلب پر طاری ہو جائیں گی اور قلب و روح محسوس کریں گے اور قیامت میں جاکر آنکھوں کو محسوس ہوگا۔

عظمتِ قرآن اور پیغمبر کی جلالتِ شان

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ لوحِ محفوظ کو (قیامت میں) خطاب کریں گے کہ قرآن لاؤ۔ وہ عرض کرے گی کہ قرآن تو جرائیل امین لے گئے تھے جرائیل علیہ السلام کو بلایا جائے گا تو وہ اس طرح آئیں گے کہ ان کے ہاتھ پیر کانپتے ہوں گے۔ اتنا مشکل ہو گا لرزتے ہوئے ہوں گے کہ معلوم نہیں کیا ہو گا؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ قرآن لوح محفوظ سے تم لے کر آئے ہو؟ عرض کریں گے۔ میں لے کر آیا کہاں لیکر گئے؟ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی ہوگی۔ حق

تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ ہمارا قرآن آپ تک جبرائیل نے پہنچایا۔ آپ فرمائیں گے بلاشک پہنچایا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے آپ نے کیا کیا؟ میں نے اپنی امّت کے سامنے تلاوت کیا اور اس کو پڑھا اور تعلیم بھی دی اس کی کیفیات بھی میں نے بتائیں یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا اب ہمارے سامنے اور ان امّتوں کے سامنے بھی تلاوت کرو۔ حدیث میں ہے کہ آپ کا منبر اس مقام پر بچھا دیا جائے گا۔ جہاں آج آپ کا منبر بچھا ہوا ہے یعنی مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں۔ اس پر بیٹھ کر آپ تلاوت فرمائیں گے پوری ترتیب کے ساتھ اوّل سے لیکر آخر تک پورا قرآن پڑھیں گے اور دنیا کی ساری امّتیں سنیں گی۔ تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے اب تک سنا ہی نہیں جو آج سن رہے ہیں اس لئے کہ وہ کیفیات جن کا ادراک روح کرتی تھی آج آنکھوں سے نظر آئیں گی اور قرآن ایک باغ وبہار کے رنگ میں ہوگا جس میں عجیب وغریب پھول کھلے ہوئے ہوں گے۔ عجیب عجیب خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں تو پورے قرآن کو مجسّم کردیا جائے گا۔ اور وہ کیفیات جو روحیں محسوس کرتی تھیں، قیامت کو آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ سامنے ہوں تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کا مجمع ہو اور سیّد الاوّلین والآخرین پڑھ رہے ہوں تو ان کیفیات کا کیا ٹھکانہ ہوگا جو قلوب پر طاری ہونگی اور وہاں سے بڑھ کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔

تو درحقیقت قرآن کریم میں پہلی چیز لفظ اور دوسری چیز معنی ہیں اور تیسری چیز اس کے حقائق ہیں۔ اور چوتھی حقائق کے نیچے اس کی کیفیات جو ارواح پر طاری ہوتی ہیں کبھی خوف کا غلبہ، کبھی خشیت کا غلبہ کبھی رجاء کا غلبہ، کبھی امید کا غلبہ، کبھی رحمت سامنے، کبھی قہر سامنے، یہاں روح محسوس کرتی ہے وہاں آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

اس لئے میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں تو کیفیات الوہیّت جمع ہیں اور کلام رسول میں کیفیات نبوّت جمع ہیں۔ اگر آیت قرآن کو تلاوت کیا تو کیفیات الٰہیہ آپکے باطن پر طاری ہونگی اور اگر کلام نبوّت کو تلاوت کیا تو کوائف نبوّت آپ کے قلب کے اوپر طاری ہوں گی، اور پھر آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسا عجیب وغریب کلام ہے کہ کتنے سمندر اس میں چھپے ہوئے ہیں۔ تو بہرحال یہ داستان تو بڑی طویل ہے۔ میرا یہ مقصد تھا عرض کرنے کا کہ پہلی بات کتاب کی صنعت تھی اور دوسری چیز حدیث کی خصوصیات تھیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

احوال واقعی

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے دارالعلوم حقانیہ میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر طلباء واساتذہ، دارالعلوم کی خواہش پر بروز اتوار ۲۰ر رجب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۸ء دارالحدیث ہال میں بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پر نہایت حکیمانہ اور عالمانہ درس دیا۔ دارالحدیث اور اس کے باہر برآمدے ___ اہل علم وفضل سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ہال پر ایک عجیب نورانی فضاء چھائی ہوئی تھی، علوم ومعارف قاسمیہ کا یہ فیضان نماز عصر تک جاری رہا۔ یہ تقریب ایک گونہ دارالعلوم کی طرف سے استقبالیہ تقریب بھی تھی، اس لئے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف سے دارالعلوم کے مدرس مولانا شیر علی شاہ نے عربی زبان میں ایک فصیح وبلیغ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام مظہر انوارِ قاسمیہ مدظلہ کی تقریر کے تمہیدی کلمات اپنے اندر اکابرین دیوبند کی تواضع، عجز، انکساری اور بے نفسی کا پہلو لئے ہوئے ہیں ___ حضرت مدظلہ کا درس اس وقت ٹیپ ریکارڈ سے محفوظ کرلیا گیا۔ اور اب اسے مِنْ وعَنْ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ "الحق" دارالعلوم اکوڑہ خٹک

افادات بخاری نمبر۲

"امام بخاریؒ کی صنع بھی حدّ کمال تک ہیں، لیکن یہ اوّل و آخر کی صنعت اس میں بھی حدّ کمال ہے کہ ابتدا میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیّت کے مقامات کی طرف اشارہ کرایا ہے۔ اور بیچ کے اندر تمام ابواب آگئے۔ اس میں عبادات بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، معاشرت بھی ہے، سیاسیات بھی ہیں تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آجاتے ہیں اور اوّل آخر کو نیّت اور میزان عمل سے گھیر دیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادات بھی قبول، معاشرت بھی قبول، سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ (اِلٰى قَوْلِهٖ) سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ. عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رض قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

بجواب سپاس نامہ

بزرگان محترم!

یہ مجلس کسی وعظ و تلقین کی یا کوئی اجتماع عام نہیں ہے۔ بلکہ مجلس درس ہے اس لئے میں نے صحیح

بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں۔ ایک بالکل ابتدائی اور ایک بالکل انتہائی۔ ابتدا اور انتہا کے بیچ میں "وسط" کا حصہ ہوتا ہے۔ تو اس اعتبار سے تقریباً پوری بخاری "معنیً وحکماً" آپ کے سامنے تلاوت کردی۔

سپاسنامہ میرے لئے دنیا و آخرت کی نجات کی دستاویز ہے۔ اس لئے کہ پیش کرنے والے جن کا نام مبارک لیا گیا، حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ ہیں میں انھیں اپنے اساتذہ کے طبقے میں سمجھتا ہوں۔ اس لئے ان کا سپاس نامہ درحقیقت شفقت نامہ ہے، سپاسنامہ تو کسی چھوٹے کی طرف سے ہوتا ہے بڑوں کی طرف سے محض شفقت، حوصلہ افزائی اور اظہار برکت کے لئے ہوتا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ :

انتم شهداء الله في الارض

تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اگر سرکاری گواہ کسی کی نسبت شہادت دے دے کہ وہ اچھا ہے تو وہ عند اللہ اچھا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان حضرات کی شہادت اگرچہ کریم النفسی یا حوصلہ افزائی ہے لیکن میں اسے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اہل اللہ کی زبان ہے اور اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ من اللہ ہے اور میں کتنا بھی نالائق سہی لیکن جب ایسے پاکیزہ لوگ گواہی دیں گے تو اللہ کے ہاں کیا بڑی بات ہے کہ اللہ کسی نالائق کو لائق بنادے، کسی برے کو اچھا بنادے ___ سپاسنامہ درس کے مناسب حال نہیں تھا ___ اس کے علاوہ میں یہاں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوا، تو میں اسے اپنا گھر سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند میں بیٹھا ہوا ہوں میں تو خود آپکے گھر کا ایک جز ہوں۔ تو اپنے گھر میں کسی کو سپاس نامہ تھوڑا ہی دیا جاتا ہے۔ یہ تو غیر کو دیا جاتا ہے۔

برادری مختلف جگہوں پر منتشر ہے لیکن افراد کے انتشار سے خاندان منتشر نہیں ہوتا۔ ہمارا علمی خاندان ایک ہی ہے اس کے اجزاء منتشر ہیں کچھ دیوبند میں، کچھ پاکستان میں، کچھ برما میں، اور کچھ افریقہ میں۔ یہ سارے افلاذِ کبد ہیں جو مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اصل ہم سب کی ایک ہے جس کو دارالعلوم دیوبند کہا جاتا ہے۔ اس واسطے جیسے آپ اس کی شاخیں ہیں، میں بھی ایک شاخ ہوں تو میں اپنی برادری میں آیا، بھائیوں میں آیا۔ تو بھائیوں میں سپاس نامہ عزّت افزائی تو الگ چیز ہے مگر ایک رسمی سی چیز ہے ___ لیکن چونکہ اہل حق پیش کر رہے ہیں میں اس لئے اسے رسم بھی نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ جو کچھ ارشاد فرمایا گیا یہ اعماق قلب سے ارشاد فرمایا گیا یہ زبان اور قلم نے حرکت نہیں کی۔ بلکہ دل کی حرکت ہے اور دل سے جب ایک چھوٹے اور نالائق کو اچھا کہا گیا، تو انشاء اللہ وہ عند اللہ اچھا بن جائے گا۔

تو میں نے اس وقت بجائے کسی تقریر کے جو جلسے کا موضوع ہوتا ہے صحیح بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں اور اسی سلسلے میں چند کلمات طالب علموں کے سامنے گزارش کروں گا۔ میرے مخاطب حضرات اساتذہ نہیں ہیں۔ یہ تو خود میرے استاذوں کے طبقے میں ہیں۔ میری بات چیت طلبہ سے ہے جو برادری کے بھائی ہیں۔

علم میں بے شک آپ مجھ سے افضل ہیں، آپ کا علم تازہ ہے۔ اور مجھے تو پڑھے ہوئے چالیس برس گزر گئے، بھول بھال بھی گیا کہ کیا پڑھا تھا۔ انتظامی سلسلے کے جھگڑوں میں پھنس کر وہ نوعیت بھی نہیں رہی اس واسطے ایک بھائی تو ہوں مگر ایک جاہل قسم کا بھائی ہوں آپ بحمد اللہ علماء ہیں علم تازہ ہے تاہم آپ نے چونکہ اس جگہ بٹھلادیا۔ اس واسطے اسی کے مناسب حال یہ روایتیں میں نے تلاوت کیں۔

امام بخاریؒ اور ان کی کتاب کی عظمت

امام بخاریؒ کی جلالتِ شان اور جلالتِ قدر سے کون مسلمان ناواقف ہے اہل علم میں کون ہے جو ناواقف ہے۔ انکی تصنیف یا تالیف صحیح بخاری کی عظمت وجلالت پوری امّت پر واضح ہے۔ امّت نے اجتماعی طور پر تلقّی بالقبول کی ہے اور اصحّ الکتُب بعد کتاب اللہ ہونے کی شہادت دی ہے اس لئے مولف بھی جلیل القدر، کتاب بھی جلیل القدر اور کتاب کا موضوع ہے وہ حدیث ہے یعنی کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ واقوالہ وتقریراتہ۔

اس لئے موضوع بھی مبارک، مصنف بھی مبارک، تصنیف بھی مبارک، حق تعالیٰ ہم سب کو بھی مبارک بنادے کہ ان کے سلسلے سے ہم سامنے آرہے ہیں۔

امام بخاریؒ کی یہ صفت تمام محدّثین کرام میں امتیازی طور پر معروف ہے نسائیؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاریؒ کا کچھ نقش قدم اختیار کیا ہے مگر بہرحال اصل اصل ہے اور فرع فرع ہے صنع بخاری یہ بہت اونچی چیز ہے اور تراجم بخاری یہ تو فی الحقیقت فقہ کا ایک مستقل باب ہیں ___ فقہ البخاری فی تراجمہ تو امام بخاریؒ محدّث بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں۔ نیز اجتہاد کے رُتبے کو پہنچے ہوئے ہیں اس لئے میں نے تبرکاً پہلی حدیث بھی تلاوت کی اور آخر کی بھی تلاوت کی۔

عملی دنیا کی دو چیزیں

دونوں روایتوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں نہ وقت ہے نہ اب اتنی طاقت ہے لیکن اتنی بات بالاجمال عرض کئے دیتا ہوں کہ آدمی کے لئے عملی دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک مصدر عمل وہ چیز ہے جس سے عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور مظہر عمل، عمل کی وہ ہیئت کذائی ہے جس میں رہ کر ہم اور آپ عمل انجام دیتے ہیں تو مصدر عمل در حقیقت انسان کی نیت ہے جس سے عمل سرزد ہوتا ہے اور عمل کی قبولیت نا قبولیت اسی نیت پر موقوف ہے اچھا سے اچھا عمل ہو لیکن نیت خراب ہو تو وہ برا بن جاتا ہے اور برے سے برا عمل ہو لیکن وہ ___ نیّت کی صحت سے انجام پائے تو آدمی کبھی مورد ملامت نہیں ہوتا۔ وہ عمل بھی مقبول ہو جاتا ہے۔ اس لئے سب سے بڑی چیز نیّت ہے کہ جس سے عمل کا صدور ہو اور ایسے پاک عمل کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو میزان عمل ہے وہ بھاری پڑ جائے۔ نیک اعمال ہی سے میزان میں وزن پیدا ہو گا۔ برے اعمال کا وزن نہیں ہے۔ بلکہ بروں کو تو تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اچھے اور برے جمع ہوں گے جبھی تو تولنے کی ضرورت پڑے گی۔ تا کہ توازن قائم ہو جائے۔

اس عملی دنیا میں دوہی چیزیں ہیں۔ ایک مصدر عمل اور ایک ثمرہ عمل۔ تو امام بخاری نے ابتدا میں انما الاعمال بالنیات حدیث نقل کی ہے کہ گویا نیّت بنیاد ہے عمل کا ظہور در حقیقت اسی نیّت سے ہوتا ہے، قبولیت بھی اسی نیّت پر موقوف ہے یہ الگ چیز ہے کہ بعض اعمال بلا نیّت کے صحیح ہو جائیں اور شریعت ان کو معتبر مان لے لیکن آخرت کا اجر وثواب نیّت کے بغیر مرتّب نہیں ہوگا۔ وضو اگر آپ بلا نیّت بھی کریں تو مفتاح صلوٰۃ تو بن جائے گی۔ لیکن جب تک نیّت نہ ہو اجر مرتّب نہیں ہو گا۔ تو عند اللہ قبولیّت کا معیار در حقیقت نیّت پر ہے۔ صحت کا معیار فتوئ ہے۔ اس لئے کہ بعض بغیر نیّت کے صحیح بھی نہیں ہوتے بعض صحیح تو ہو جاتے ہیں گو ان پر اجر مرتب نہیں ہوتا۔

نیّت عمل کی بنیاد ہے

بہرحال قدر مشترک کے طور پر نیّت بنیادی چیز ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ :

نية المرء خير من عمله

آدمی کی نیّت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ یوم محشر میں بعض لوگ حاضر ہوں گے' حق تعالیٰ شانہ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ لکھ دو انہوں نے عمر بھر تہجد پڑھ لی ہے۔ ملائکہ عرض کریں گے کہ انہوں نے ایک دن بھی تہجد نہیں پڑھی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے' روزانہ سوتے وقت نیّت کرتے تھے کہ آج ہم تہجد پڑھیں گے' مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ لہٰذا لکھ دو کہ انہوں نے ساری عمر تہجد پڑھی تو انسان کی نیّت عمل کی بنیاد ہے۔

ربط بین الابواب

دوسرے لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کرنا چاہئے کہ آدمی پہلے دل سے عمل کرتا ہے پھر ہاتھ پاؤں سے ____ وہی دل کا عمل بنیاد ہے جس سے ہاتھ پیر کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ تو قلب سے عمل کرنے کی صورت نیّت ہے اور قالب سے عمل کرنے کی ہیئتِ کذائیہ ہے جو شریعت نے ارشاد فرمائی ____ تو پہلے ہر عمل قلب سے ہوتا ہے پھر قالب سے انجام پاتا ہے اور وہ قالبی عمل اس باطنی عمل پر منطبق ہوتا ہے۔ تو رخ دو ہیں اور عمل درحقیقت ایک ہے باطنی رخ اس کا نیّت ہے اور ظاہری رخ اس کی وہ ہیئت عمل ہے ____ تو امام ہمامؒ نے سب سے پہلے ایسی بنیادی حدیث نقل کی کہ کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس میں نیّت کا دخل نہ ہو۔ اور اس کے اجر و ثواب کا تعلق نیت سے نہ ہو۔ ترتیب یوں ہو گئی کہ پہلے نیت درست کرادی۔ اس کے بعد ابواب ایمان' ابواب علمؒ' پھر ابواب زکوۃ' اور دیگر ابواب بیان کئے۔ ان سب کا مصدر "نیّت" ہی بتلا دیا۔ تو حکماً وہ سارے اس کے نیچے آ گئے۔

اعمال پر اجر کا ترتب

اخیر میں جو چیز تھی وہ عند اللہ قبولیت اور اجر کا ترتّب ہے۔ تو آخر میں یہ حدیث نقل کی :

كلمتان حبيبتان الى الرحمن خفيفتان على اللسان ثقيلتان فى الميزان

سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم

دو کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے' ان کے ادا کرنے میں نہ وقت لگتا ہے نہ دشواری ہے ایک کلمہ سبحان الله وبحمده اور دوسرا کلمہ سبحان الله العظيم ہے۔ یہ ہلکے ہلکے دو کلمے جو ادائیگی میں نہایت ہلکے زبان پر نہایت لطیف' لیکن بلحاظ اجر کے ثقیل ہیں۔ میزان عمل کے اندر جو ان کا وزن ہوگا۔ وہ دوسرے اعمال کا نہیں ہوگا۔ کیوں ہیں یہ وزنی ____؟

وزنِ کلمات کی وجہ

ان کے ثقیل ہونے کی بنا درحقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں مقامات الوہیّت کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اتنے عظیم ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز اس کے لگ بھگ بھی نہیں ہو سکتی۔ تو انتہائی بات یہ ہے کہ

مقامات الوہیّت کو ان دو کلموں کے ذریعے بیان فرمایا۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اجزاء سے پاک ہیں۔ وہ نہ بسیط ہے نہ مرکب۔ ہر چیز سے وراء الوراء ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی الوہیّت کے مقامات' ظاہر بات ہے کہ وہ لامحدود ہیں حدِ کمال انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مقام تنزیہہ

حق تعالیٰ کے مقامات میں سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے۔ یعنی وہ ہر عیب سے بری۔ ہر نقص سے بالا اور تمام عیوب سے پاک تو حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی بیان کرنا ظاہر بات ہے کہ یہ مقامات الوہیّت میں ایک مقام ہے۔ خدا کہتے ہیں اس ذات کو جو ہر برائی سے پاک ہو الخیر کلہ منک والیک والشر لیس الیک ہر خیر کا سرچشمہ وہ ہے' اسی سے خیر چلتی ہے۔ ہر شر سے بری و بالا ہے ذات بھی شر سے پاک ہے اور باہر کی شر بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ ہر حیثیت سے وراء الوراء ہے۔ تو الوہیّت کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ خدا ذات برتر ہر عیب سے پاک ہے۔ تو پہلی چیز مقامات الوہیّت میں تنزیہہ ہے اور سبحان اللہ کہنا یہ گویا اشارہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی پاکی بیان کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک ذات بابرکات وہ ہو جو ہر عیب سے پاک اور بری ہے (تو الوہیّت اسی کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ تو ایک مقام الوہیّت کا تو یہ ہوا)۔

اب آگے خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ تو جہاں جو خوبی ہے وہ اسی ذات کی ہے اگر آپ علم دیکھیں گے تو اصل علم حق تعالیٰ کا ہے۔ اس کا پرتو پڑتا ہے تو دوسرے عالم کہلانے لگتے ہیں۔ قدرت در حقیقت اس کی ہے اس کا پرتو پڑا' تو ملائکہ قادر کہلانے لگے' کہ پل بھر میں آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان پر۔ ان کا علم حقیقی اور ذاتی ہے اس کا پرتو پڑا تو ہم آپ بھی عالم کہلانے لگے اور انسان کو مظہر علم بنا دیا۔ رفیع الرتبہ اور رفعت و عظمت ان کی شان ہے۔ اس کا پرتو آسمانوں پر پڑا تو وہ رفعت والے ہو گئے۔ وہ بھی اونچے بن گئے اور ان کی برتری ثابت ہو گئی ___ تو سرچشمہ کمالات کا اللہ کی ذاتِ بابرکات ہے اور ظاہر بات ہے کہ حمد و ثناء کمال پر ہی کی جاتی ہے۔ نقص اور عیب پر کوئی کسی کی حمد و ثناء نہیں کرتا تو حمد و ثناء کے معنی یہ ہیں کہ جمیل اختیاری پر حمد کی جائے۔

مقامِ تحمید

ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ تمام کمالات کا سرچشمہ اور ساری برکتوں کا مصدر ہیں اس لئے تمام تعریفیں بھی انہی کے لئے ہونگی۔ حمد و ثناء بھی انہی کے لئے ہوگی۔ جسکی بھی ثناء کی جائے گی وہ در حقیقت انجام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ثناء ہوگی۔ کیونکہ اسی کا کمال تھا جو کسی دوسرے میں ظاہر ہوا۔ تو حمد و ثناء کے اظہار کا طریقہ در حقیقت تحمید ہے اور اس کے لئے الحمدللہ کا کلمہ رکھا گیا تو سبحان اللہ کا کلمہ تنزیہہ بیان کرنے کے لئے ہے۔

دوسرا مقام تنویہ اور عظمت بیان کرنے کا ہے اس لئے تحمید رکھی گئی اور اس کیلئے الحمدللہ کا کلمہ رکھا گیا ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف عنوانوں سے ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۔ وغیر ذالک۔

توتسبیح و تحمید اور حمد و تسبیح کرنا جگہ جگہ ذکر کیا گیا۔ تو سبحان کا کلمہ مقام تنزیہہ کو ظاہر کرتا ہے اور الحمد للہ کا کلمہ مقام تنویہ کو ظاہر کرتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے جو ذات اقدس ہر عیب سے بری اور ہر کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی بھی اسی کے لئے ہوگی ___ یہ کیسے ممکن ہے کہ عظمتوں کا سرچشمہ تو وہ ہو اور بڑائی کسی اور کی ہو جائے۔ عظمت اور کبریائی کسی اور کیلئے ہو جائے۔ جو درحقیقت کمال کا مصدر ہے وہی حمد و عظمت کا مستحق ہے کہ اسی کی کبریائی اور عظمت بیان کی جائے۔ اسی لئے اسلام نے تکبیر کا عنوان رکھا اور اس کے لئے اللہ اکبر کا صیغہ رکھا، تاکہ اللہ کی عظمت بیان کی جائے کہ اکبر من کل شئی ہر چیز سے وہ بڑا ہے۔

اور نہ صرف اضافتہً بڑا ہے بلکہ حقیقتہً بڑا ہے کہ بڑائی ہے ہی اس کیلئے، جس میں کوئی بڑائی آتی ہے اسی کے نام کے ساتھ ملنے سے آتی ہے۔ اس کے نام سے جو کٹ گیا، اس میں بڑائی ختم ہو گئی۔ تو بڑائی، عظمت و کبریائی درحقیقت اسی کے لئے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری فمن نازعنی فیھما قصمتہ۔

تکبر میری چادر ہے، بزرگی میری لنگی ہے۔ جو بھی اس میں کھینچا تانی کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کو نیچا دکھلاؤں گا۔ تو یہ برداشت نہیں کہ کبریاء و عظمت میں کوئی شریک ہو۔ وہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے لئے ہے۔ تو لہ الکبریاء فی السموت والارض اس کے لئے بڑائی و عظمت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ذرا سا ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوگا۔ یا ہوا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں حکم ہے **تخلقوا باخلاق اللہ** اللہ کے اخلاق سے متخلق بنو، وہ کریم ہے تو تم بھی کریم بنو۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی رحیم القلب بنو وہ حافظ وہ حفیظ ہے تو تم بھی اپنوں کی نگہداشت کرو وہ معطیٔ حقیقی ہے تو تم بھی فقیروں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھو اور اعطاء کی صفت اختیار کرو۔ تو اللہ تعالیٰ کے کمالات سے متکمل بھی بنو۔ اور اس کے اخلاق سے متخلق بھی بنو۔ تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر بھی تو اس کی شان ہے، اس میں بھی **تخلق** ہونا چاہئے ہر شخص متکبر بنے ورنہ کریم النفس بننے سے روکا جائے اس میں بھی شرک ہوگا تو پھر اگر ہم تکبر کریں تو ملامت کیوں کی جاتی ہے۔ **تخلقو باخلاق اللہ** (بموجب حدیث) اللہ کے اخلاق سے متخلق بننا تو عین کمال ہے ___؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا معاذ اللہ بری بات نہیں ہے۔ نہ کبر بری چیز ہے۔ وہ تو صفت خداوندی ہے۔ تکبر کرنا برا نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ جو اللہ کے سوا کہے گا کہ میں بڑا ہوں جھوٹا ہوگا۔ جھوٹ بولے گا۔ تو جھوٹ بولنے سے روکا گیا ہے۔ اب ایک ہی ذات کیلئے تکبر سزاوار ہے تو اللہ ہی فرما سکتا ہے : **انا الکبیر، انا المتعال۔ لی الکبریاء** بڑائیاں میرے لئے ہیں اور عظمت میرے لئے ہے۔ اس کے سوا جو دعویٰ کرے گا کہ **لی الکبریاء لی العظمۃ** ___ وہ جھوٹا ہوگا تو جھوٹ بولنا بری عادت ہے تکبر کرنا بری عادت نہیں ہے۔ مگر حق تعالیٰ شانہ کے سوا جو متکبر بنے گا، جھوٹ بولے گا۔ اس واسطے روک دیا گیا۔

(دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حقیقی جواب ہے۔ کیونکہ آدمی تکبر تو نہیں کرتا کیونکہ ہر متکبر حق تعالیٰ شانہ کے علاوہ جھوٹا ہوگا۔ لیکن پھر حدیث **تخلقوا باخلاق اللہ** کے پیش نظر ''صفت کبریائی'' کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے مفہوم کا تعین ضروری ہے تو فرماتے ہیں) پھر یہ کہ کبریا و عظمت درحقیقت صفات ذات میں

سے ہے۔ صفات افعال میں اگر ہم تخلق کریں تو وہ الگ بات ہے (اس کو تو حکم ہے) لیکن صفات ذات مثلاً خالقیّت کی صفت میں کوئی تخلق کرنے لگے یا تکبر میں تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی ذات کی برابری چاہتا ہو۔ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس واسطے روکا گیا کہ تکبر نہ کیا جائے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تکبر کرنے والا ہمیشہ محروم ہوتا ہے کیونکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے، کسی کو تکبر کی اجازت نہیں ہے۔

حقیقتِ توحید

تو جو ذات تمام عیوب سے پاک ہو، تنزیہہ اسی کے لئے ہے۔ جو ذات ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہو، تو یہ اسی کے لئے ہے۔ جو ذات ساری خوبیوں کی مالک ہو، عظمت و کبریائی اس کیلئے ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب ذات وہ مان لی جو ہر عیب سے پاک اور ہر کمال سے متصف و موصوف اور ذاتی طور پر ہر بڑائی اور عظمت اس میں ہے۔ تو پھر یکتا بھی وہی ہو گا۔ جب ایسی ذات کوئی دوسری نہیں ہے تو اس ذات کو یکتا کہا جائے گا۔ جس کا کوئی شریک نہیں، برابر نہیں۔ کوئی ند نہیں، کوئی ضد نہیں۔ کوئی اس کے لگ بھگ نہیں تن تنہا ایک ہی ذات بابرکات ہے جو ایک بھی ہے اور یکتا بھی نہ اس کی ذات جیسی ذات، نہ اس کے افعال جیسے افعال، نہ اس کی شیون جیسی شئون تو ہر چیز کے اندر وہ یکتا ہے اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں توحید ہے۔ توحید کے معنی محض ایک ہونے کے نہیں ایک تو اپنی ذات میں ہم اور آپ بھی ہیں۔ توحید کے معنی یکتا کے ہیں کہ اس کی کوئی مثل اور نظیر نہیں **لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر** ___ تو درحقیقت توحید کی بنائیں تین ہیں۔ ایک تنزیہہ مطلق، ایک تنویہ مطلق، ایک تعظیم مطلق۔ عظمت بھی اس کی، پاکی بھی اس کی اور مصدر کمالات ہونا بھی اسی کی ذات کی شایان شان ہے تو جو ذات پاک بھی ہے، جو ذات خوبیوں کا مصدر بھی ہے، جو عظمت والی بھی ہے تو معبودیّت بھی اسی کی ہوگی یکتا بھی اسی کو کہا جائے گا۔ پھر عبادت بھی اسی کی ہوگی، کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ یہی توحید کے معنی ہیں۔ کہ ذات کے لحاظ سے بھی یکتا ہو، صفات کے لحاظ سے بھی اور افعال کے لحاظ سے بھی کہ اس کا کوئی شریک نہ ہو اور شئون بھی اس کی بے مثل اور بے نظیر ہوں۔

تو مقامات الوہیّت چار نکل آئے، ایک تنزیہہ جو سبحان اللہ سے ادا ہوتی ہے۔ ایک تنویہ جو الحمد للہ سے ادا ہوتی ہے، ایک کبریا و عظمت جو **العلی العظیم** سے ادا ہوتی ہے اور ان تینوں کے مجموعے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو یہ اس کے لئے توحید نکلی۔

تو اس حدیث پاک میں مقامات الوہیّت بیان فرمائے گئے ہیں۔

سبحان اللہ سے تسبیح اور وبحمدہ سے الحمد للہ اور سبحان اللہ العظیم میں عظمت و کبریائی بیان کی گئی ہے اور ان تینوں کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو توحید بطور ثمرہ ان پر مرتّب ہو جاتی ہے ___ جیسا کہ پہلی حدیث جو امام بخاریؒ نے نیّت کے بارے میں روایت فرمائی۔ اس میں مقامات عبدیّت ہیں۔ عبد کا کام یہ ہے کہ نیت سے بھی اسکی طرف رجوع کرے اور عمل سے بھی اس کی طرف رجوع کرے، قلب سے متوجہ ہو گا وہ نیّت ہو جائے گی ___ قالب سے متوجہ ہو گا، وہ عمل ہو جائے گا۔

تصحیحِ نیّت اور حقیقتِ نیّت

تو درحقیقت اس حدیث میں مقامات عبدیّت بیان کئے گئے ہیں۔ بندے کا کام یہ ہے کہ نیّت صحیح ہو۔

نکاح کرے تو نیّت صحیح ہو۔ ہجرت کرے تو بھی اس کی نیّت صحیح ہو' دولت کمائے تو بھی نیّت صحیح ہو۔ اور نیّت صحیح کے معنی "حبّہ" کے ہیں۔ یعنی ہر عمل لرضاء اللہ اور لوجہ اللہ ہو۔ اور یہ کام بندے کا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ معاذ اللہ نیّت کے پابند نہیں' وہاں نیّت کا کیا دخل ___ ؟ وہ تو ہر چیز سے بری ہے۔ کیونکہ نیّت تو در حقیقت عبادت ہے اور وہ عبادت سے بری ہے۔ وہ تو معبود ہے (یہ کیسے ممکن ہے کہ معبود خود ہی اپنی عبادت شروع کردے)۔ اس واسطے **انما الاعمال بالنیات** میں تو "مقامات عبدیّت" بیان کئے اور اخیر حدیث میں مقامات الوہیّت بیان فرمائے اور درمیان میں علم کے ابواب عمل کے ابواب' اور اعتقاد کے ابواب۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال اور ان اعتقادات میں نیّت صحیح کرو تاکہ قرب پیدا ہو۔ اور جب قرب ہو گا تو ثمرات مرتب ہوں گے۔ کہ تمہاری میزان عمل بھر جائے گی۔

امام بخاریؒ کی صنع بھی حدّ کمال تک ہیں لیکن یہ اوّل و آخر کی صنعت اس میں بھی حدّ کمال ہے کہ ابتدا میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیت کے مقامات کی طرف اشارہ کردیا اور بیچ کے اندر تمام ابواب آگئے۔ اس میں عبادات بھی ہیں' معاملات بھی ہیں' معاشرت بھی ہے' سیاسیات بھی ہیں تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آجاتے ہیں۔ اور اول و آخر کو نیت اور میزان عمل سے گھیر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادت بھی قبول' معاشرت بھی قبول' سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس واسطے میں نے اوّل کی حدیث بھی تلاوت کردی اور آخر کی حدیث بھی اور ۔ع۔ اول با آخر نسبتے وارد۔ ان دونوں میں باہم ایک نسبت ہے۔ اور وہ نسبت یہی ہے کہ بندہ ابتدا سے چلے اور انتہا کے مقام تک پہنچ جائے اور امّت میں علم و عمل اور عبادت سب کو لیتا ہوا چلے اور انجام کار میزان عمل تک پہنچ جائے' یہی آپ کے اعمال ہی در حقیقت تولے جائیں گے۔

اعمال میں وزن کیسے ہو گا؟

اور اعمال میں وزن نیّت سے ہو گا۔ اگر نیّت صحیح ہے ، اخلاص صحیح ہے تو وہ عمل وزنی ہو گی۔ اگر العیاذ باللہ نیّت صحیح نہیں تو کتنا ہی بڑا عمل ہو گا' نا قبول ہو گا' تو اللہ کے ہاں صورت نہیں دیکھی جائے گی کہ ڈیل ڈول کتنا ہے؟ بلکہ وہاں وزن دیکھا جائے گا کہ اندر اخلاص کتنا ہے؟ کتنا حسنِ نیّت ہے۔ صدقِ دل کتنا ہے؟

ان اللہ لا ینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم

اللہ تعالیٰ شانہ' نہ تمہاری صورتیں دیکھتا ہے نہ تمہارے اعمال کی صورتیں دیکھتا ہے لیکن وہ تمہارے اندر دیکھتا ہے کہ دلوں میں کیا ہے؟ اور عمل میں بھی دیکھتا ہے (کہ کتنا حسنِ نیّت ہے)؟

بعض دفعہ چھوٹا سا عمل ہوتا ہے اور آدمی کمال اخلاص سے انجام دیتا ہے۔ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ صورت کے لحاظ سے عمل بہت بڑا ہوتا ہے مگر نیّت درست نہیں وہی حبط اعمال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عمل چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ کس کمال خلوص سے ادا کیا گیا کہ وہی مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اخلاص کی قوّت

امام ابوداؤد محدّث جلیل' ان کی کتاب "ابوداؤد شریف" نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے تراجم میں

لکھا ہے کہ وہ کسی دریا کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے اور تقریباً سو پچاس قدم کے فاصلہ پر جہاز کھڑا ہوا تھا۔ اس زمانے میں گودیاں تو تھی نہیں کہ جہاز پلیٹ فارم سے لگ جائے۔ تو جہاز پرے کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤد کنارے پر تھے۔ جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی اس نے بہت زور سے "الحمد للہ" کہا۔ ان کے کان میں اس کی آواز پڑی۔ تو مسئلہ آپ بھی جانتے ہیں کہ چھینک لینے والا الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا اخلاقی فرض ہے۔ مگر اس کے لئے مجلس شرط ہے یہ نہیں ہے کہ کوئی بازار میں چھینک مار کر الحمد للہ کہے تو آپ سفر کر کے یرحمک اللہ کہنے کے لئے جائیں۔ امام ابوداؤد پر واجب نہیں تھا کہ وہ یرحمک اللہ کہتے۔ وہ کنارے پر تھے اور جہاز آدھے فرلانگ کے فاصلے پر دور تھا۔ مگر یہ حضرات عمل کے بارے میں حریص ہوتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے جیسے دنیا دار پیسے پیسے کے لئے حریص ہوتے ہیں کہ ہزار ہو تو کہیں گے کہ دس ہزار ہو جائیں۔ دس ہزار ہو جائیں تو کہیں گے ایک لاکھ کے مالک ہو جائیں۔

اگر جنگل بھر کے بھی ان کو سونے کا دیں تو ضرور حرص کی وجہ سے دوسرا جنگل مانگیں گے ان اہل اللہ کو عمل صالح کی حرص ہوتی ہے کہ جتنا ہو سکے کمالیں۔ گویا ساری جنت کو اپنے لئے سمیٹنا چاہتے ہیں ___ مگر اس کے معنی بخل کے نہیں (کہ کسی اور کو کچھ نہ ملے) بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنت پر قبضہ کر لیں اور اپنے ساتھ جو وابستہ ہیں۔ ان کو بھی ساتھ لے جائیں۔ معاذ اللہ خود غرضی لاحق نہیں کہ تنہا چلے جائیں بلکہ (بفضل خدا) اپنے سب متعلقین کو ساتھ پہنچائیں گے۔ بہر حال چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے ___ تو کان میں الحمد للہ پڑا، تین روپیہ میں کرایہ پر کشتی لی، اس میں بیٹھ گئے کہ جہاز کو پہنچ جائیں۔ وہاں جاکر یرحمک اللہ کہا۔ تو اہل تراجم لکھتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز کان میں پڑی۔ بولنے والا تو نظر نہیں آتا تھا کہ اے ابوداؤد آج تین درہم میں تم نے جنت خرید لی ___ اب امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کتنے تو انہوں نے تہجد پڑھے ہوں گے۔ کتنی حدیثیں روایت کی ہوں گی۔ کتنے جہاد کئے ہوں گے، کتنے اعمال صالحہ کئے ہوں گے اور جنت کی خریداری میں صرف تین درہم لگے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمل کامل اخلاص سے کیا تھا وہ اتنا وزنی بن گیا کہ وہی نجات کا ذریعہ بن گیا۔

تو اصل میں عمل کو مقبول بنا دینے والی چیز وہ اخلاص کی قوت ہے۔ عمل تو بمنزلہ ڈھانچے کے ہے اور روح اس کے اندر حسنِ نیت ہے۔ اگر یہ روح نہ ہو تو عمل کا ڈھانچہ لاش کی مانند ہے۔ اور لاش کا انجام پھٹنا، پھولنا، سڑنا، گلنا ہے۔ اسی طرح عمل ہے۔ اس کے لئے اخلاص روح ہے۔ وہ آخرت تک پہنچے گا، اس پر ثمرات مرتب ہوں گے، تو امام ابوداؤدؒ نے تین درہم میں جنت کمالی۔ اسی طرح جو بھی آپ حدیث پڑھ لیں اس کو کم درجے کا نہ سمجھیں ایک حدیث پڑھنے کی بھی توفیق ہو گئی تو دنیا ومافیہا ہمارے ہاتھ آگئی۔ جنت میں تو ایک تنکے کے برابر ایک جوتے کے تسمے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو سعادت ہے، دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔

حقیقت جنت وعمل

اور وہ جنت یہ قرآن وحدیث ہی تو ہے بلکہ بعض روایات میں تو فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی جتنی آیات ہیں اتنے ہی جنت میں درجات ہیں اور بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ وہاں جاکر نعیم مقیم کی صورت میں متمثل ہونگی۔ یہاں انکی عمل کی شکل ہے۔ وہاں جاکر انکی شکل نعمت کی بن جائیگی تو چیز ایک ہی ہے۔ دار دنیا میں ان کا لباس عمل کا ہے اور دار آخرت میں ان کا لباس ثمرہ اور جزا

کا ہے۔ تو یہ اعمال بعینہٖ وہاں جا کر باغ و بہار کی صورت اختیار کریں گے۔

تمثّلِ اعمال کی مثال

ہمارے بچپن میں یورپ سے ایک کھلونا آیا کرتا تھا۔ ایک پیکٹ ہوتا۔ اس میں بارہ ٹکیاں ہوتیں۔ وہ دو آنے میں ملا کرتا تھا۔ ٹکیہ لے کر بچے بیٹھ جاتے اور کٹورے میں پانی ڈال لیتے تھے۔ پھر ایک ٹکیہ اس میں ڈال لیتے تھے۔ منٹ بھر کے بعد ٹکیہ پھٹتی تو کسی سے پھول نکل آتا۔ کسی میں سے انجن۔ کسی میں ریل کا ڈبہ نکل آتا۔ بچے خوش ہوتے کہ گولی کا انجن بن گیا، گولی کا پھول بن گیا۔ گویا کاریگر نے اس گولی کو ایسی ساخت سے بنایا تھا کہ جب وہ کھلے تو کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہو جائے۔

آیات نعمت کی شکل میں ظاہر ہونے کی مثال

آتش بازی آپ نے دیکھی ہوگی۔ آتش بازی میں ایک بانس کا چکر ہوتا ہے اس کے سر پر مصالحہ اور بارود وغیرہ لگا دیتے ہیں۔ لیکن جب اس کو آگ دیکر کھولتے ہیں تو کسی میں سے آگ کا بنا ہوا گھوڑا اور کسی میں سے سوار نکل آتا ہے۔ وہ فضاء کے اندر دوڑ رہا ہے۔ یہ کاریگر کی صناعی ہوتی ہے کہ وہ ایسے انداز سے مصالحہ لپیٹتا ہے کہ جب وہ کھلے تو گھوڑے کی شکل بن جائے۔ تو ان گولیوں میں بھی صنعت ہے۔ اور یہ بندوں کی صنعت ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو کسی ایسی صورت سے ترتیب دیا ہے کہ جب وہ کھلیں گی تو باغ و بہار بن جائیں گی۔ یہاں ان کی شکل آیت کی ہے۔ وہاں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔ تو چیز ایک ہی ہے۔ دار بدلنے سے، وطن بدلنے سے، اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے کوئی انجنیئر جب کوئی کوٹھی بناتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کے قلب میں وہ کوٹھی بنتی ہے۔ اتنی کھڑکیاں، دروازے، اور رنگ و روغن وہ سب دل میں ذہنی آئینے میں تصوّر میں دیکھتا ہے کہ وہی کوٹھی بعینہٖ بنی بنائی تیار ہے۔ پھر وہ اس کا نقشہ کاغذ پر کھینچتا ہے ___ پنسل سے یا قلم سے، وہی کوٹھی کا نقشہ کاغذ پر آجاتا ہے۔ پھر اس کے مطابق زمین پر وہ اینٹ سے کوٹھی تیار کرتا ہے۔ تو کوٹھی درحقیقت ایک ہی ہے جو کاغذ اور زمین پر آئی ذہن کا ظرف لطیف ہے تو اس کی شکل بھی مادی نہیں تھی۔ کاغذ پر آئی تو اس کی شکل روشنائی اور لکیروں کی بن گئی۔ دنیا کے میدان میں زمین پر آئی تو اس کی شکل اینٹ پتھر کی بن گئی۔ مگر جو اصل نقشہ ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو انجنیئر کے دل میں تھا۔ لباس بدلتے رہے لیکن وطن کے بدلتے رہنے سے شئی ایک ہی رہی۔ اسی طرح یہ آیات الٰہیہ اور اعمال ہیں یہاں ان کی عمل کی شکل ہے۔ جب وطن بدل جائے گا۔ تو آخرت میں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائیگی۔

تمثّلِ اعمال کی حقیقت

تو یہاں یہ جو آپ عمل کر رہے ہیں۔ یہ عمل بھاری بھی ہے شاق بھی، مگر صبر و تحمل سے اطاعت کے طور پر انجام دے رہے ہیں۔ یہاں یہ عمل آپ کے سر پر سوار ہے۔ اور آپ پر بوجھ ہے مگر آخرت میں جائے گا تو آپ کا بوجھ اٹھائے گا۔

آخرت میں حمل و نقل کے قابل بن جائے گا۔ آپ اس پر سوار ہونگے، بالکل اسی طرح جیسے آپ سفر

کرتے ہیں تو ایک چھوٹا سا بستر باندھا اور ایک بکس لیا بکس سر پر رکھا، اور بستر کو بغل میں دابا۔ بکس بھی آپ کے سر پر سوار ہے اور بستر بھی آپ کے سر پر، تھکتے ہوئے، ہانپتے کانپتے ہوئے آپ جا رہے ہیں جب آپ سرائے میں پہنچے تو بستر بچھایا، اب بستر نیچے ہے اور آپ اس کے اوپر اور وہ بکس آپ کے لئے تکیہ بن گیا۔

تو اثنائے سیر میں سامان آپ کے اوپر بار تھا، اور منزل پر پہنچ کر وہ آپ کے لئے تکیہ بن گیا۔ بعینہ یہ وہاں کی مثال ہے۔ یہاں اعمال بھاری ہیں۔ صبر و تحمل کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہاں جا کر یہ عمل ہمارے لئے سواری بن جائے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ :

سمنوا ضحایاکم فانها علی الصراط مطایاکم۔

"تم قربانیوں کو فربہ کیا کرو کہ یہی تمہارے لئے پل صراط پر سواریاں بنیں گی"۔

تو یہاں قربانی گویا ہمارے پر سوار ہے، بوجھ ہے کہ سینکڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد دل کڑھ رہا ہے کہ ایسے محبوب جانور ذبح کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے کانٹ چھانٹ دیا۔ اور وہاں جا کر ہم اس کے اوپر بار ہو جائیں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ :

السخاء شجرة فی الجنة

"یہ سخاوت جنت کے اندر ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی"۔

جیسے آپ نے سخاوت کی اور کسی غریب کی خبر گیری کی، کسی کو چار پیسے دیدیئے تو وہ آپ کی سخاوت کی زیر سایہ پل رہا ہے۔ سایہ اور راحت بھی ملی، یہی عمل وہاں جا کر درخت بنے گا۔ آپ اس کے پھلوں سے فائدہ اٹھائیں گے تو یہی سخاوت وہاں جا کر درخت کی صورت میں متمثل ہو گئی۔

اعمال متشکّل کب ہوں گے؟

تو حق تعالیٰ قیامت کے دن ہر ایک عمل کو کوئی نہ کوئی صورت دیں گے۔ یہ اعمال متجسّد اور متشکل بن جائیں گے اور یہ یوم حشر سے ہی شروع ہو جائے گا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرصات حشر میں قیامت کے میدان میں ہر آدمی کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم جس سے ہیبت ناک آوازیں آتی ہوں گی اور ایک اس کے اعمال جو قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ عمل کے مناسب ان کو شکلیں دیدی جائیں گی۔ گویا پوری دنیا مجسم کر کے سامنے کر دی جائیگی ہر ایک آدمی بیٹھا ہوا اپنے کو دیکھے گا کہ میں فلاں برائی کر رہا ہوں۔ سات کوٹھڑیوں کے اندر، فلاں وقت، بعینہ وہی زمانہ، وہی ہیئت ہے۔ وہ زمانہ وہ مکان سب وہاں منتقل کیا جائے گا۔ اسے نظر آئے گا کہ میں اس زمانہ اور مکان میں بیٹھا ہوا اس حرکت میں مشغول ہوں ____ تو یہاں کا زمانہ، مکان ہر عمل اور اس کی ہر ہیئت کذائی بھی وہاں لوٹا دی جائیگی۔

سائنسی دنیا سے تمثیلِ اجساد کی تصدیق

اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آج کی سائنس نے تو اسے بالکل آسان کر دیا ہے ہندوستان میں دلّی میں ایک نمائش ہوئی، مختلف یورپین ممالک نے اپنے اپنے سٹال لگائے، اور اپنی اپنی ایجادات دکھلائیں۔ روس کی

طرف سے ٹیلی ویژن آیا تھا تو اس نمائش میں ہم دیکھنے کے لئے گئے۔ تو ہم نے ان سے کہا کہ کوئی عجیب چیز اپنے روس کی دکھلاؤ۔ اس نے ایک ٹیلی ویژن دکھلایا۔ اس کے بعد اس نے کچھ مشینوں سے اور کام لیا۔ تو ہمیں یوں نظر آیا کہ چین کا ایک جنگل ہے۔ جس میں عورتیں دھان بو رہی ہیں۔ تو چینی عورتوں کا طریقہ یہ ہے کہ دھان بوتے بوتے کچھ گیت گاتی جاتی ہیں۔ تو ٹیلی ویژن کے اندر وہ کھیتوں میں دھان لگاتی جاتی ہیں۔ اور چینی زبان میں ان کی گانے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ ہم نے واقعی یہ عجیب چیز دیکھی تھی۔ پھر لطف یہ کہ ہم یہ رات کے وقت دیکھ رہے تھے۔ اور وہاں ظہر کا وقت تھا گویا بارہ ایک بجے ہوں گے۔ اس میں وہی وقت نظر آتا تھا۔ ویسی ہی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ وہی وقت ہے۔

تو ٹیلی ویژن والوں کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ ایک وقت کو متمثل کر کے دوسرے وقت میں دکھلادیں۔ عشاء کی وقت میں ظہر کا وقت دکھلادیں چین کا جنگل ہندوستان میں دکھلادیں۔ چینی عورتوں کا حرکت کرنا ہمیں نظر آجائے ان کے گانے کی آواز ہم سن سکیں۔ ایک وقت ایک مکان میں دوسرا وقت اور دوسرا مکان نمایاں کردیں ___ تو اللہ نے انسان کو یہ عقل وقدرت دی ہے تو اللہ کی قدرت کیا ایسا نہیں کرسکتی کہ دنیا کے سارے اعمال اور سارے زمانے اور سارے مکان آخرت میں سب کے سامنے پیش کردے۔ جو اس کو مان سکتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ اسے نہیں مانے گا ___؟

جو یہاں کی ایجاد کو مانتا ہے وہاں کی ایجاد کو بھی مانے گا۔ جبکہ یہاں کی ایجاد بھی انسان کی ذاتی نہیں۔ اللہ نے ہی تو یہ عمل اور عقل دیا۔ جس سے یہ ایسی ایجاد کرتے ہیں تو جس کے دیئے سے ہم اس نہج پر پہنچ گئے، تو جو ان کمالات کا سرچشمہ ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ بنادے تو تعجب کی کونسی بات ہے؟

بہرحال یہ آیتیں، یہ اعمال۔ یہاں عمل کی صورت میں ہیں۔ وہاں جاکر نعیم مقیم اور باغ وبہار کی صورت بن جائیگی۔ ایک آدمی یہاں معاذ اللہ زنا کرتا ہے وہ گویا اپنے بدن سے سانپ اور بچھو لپیٹ رہا ہے۔ مگر یہاں شکل نمایاں نہیں قیامت کے دن شکل نمایاں ہوجائیگی کہ وہ زنا نہیں تھا بلکہ سانپ اور بچھو تھا وہ چوری نہیں تھی بلکہ عذاب تھا۔ جو عذاب الیم وہاں لپیٹا تھا۔ یہاں آکے وہ شکل بن گئی۔ تھوڑے عرصہ میں شکل سامنے آجائیگی۔

سردیوں میں بعض بچوں کو گڑ کھانے کی عادت ہوتی ہے اور اگر زمینداروں کا گھر ہو تو وہاں تو گڑ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور بچے کھاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ روکتے ہیں کہ بھئی گرمی کرے گا۔ مگر چونکہ مٹھاس ہوتا ہے۔ مزہ آتا ہے تو رکتے نہیں تو وہ انہوں نے پانچ مہینے کھایا اور خوب کھاتے رہے مگر جب گرمی کا موسم آیا اب وہ پھوٹ پھوٹ کر نکلنا شروع ہوا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں اور پیپ بہنے لگی۔ اب والد علاج کراتے کراتے تنگ آگیا کہیں مرہم لگا رہا ہے، کہیں مصفیات پلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ بچے! اسی دن کے لئے تو میں روکتا تھا کہ گرمی میں پھوٹ کر نکلے گا ___ تو یہی گڑ وہاں اس کی شکل مٹھاس کی تھی اور یہاں اس کی شکل پھوڑے کی ہوگئی، تھوڑا سا موسم بدل گیا تو آثار ظاہر ہوگئے۔

آج جو بدعملی یہاں کی جارہی ہے۔ وہ یہاں عمل کی شکل ہے، لیکن تھوڑا سا وقفہ گزرنے کے بعد جب موت کو پار کر کے آدمی قیامت میں پہنچے گا۔ وہی عذاب الیم کی صورت میں پھوٹ پھوٹ کر بدن سے نکلے گی۔ جو یہاں لگا تھا۔ وہ وہاں سامنے آجائیگا۔

جتنے بھی اعمال ہیں یہ محض سطحی نہیں ہیں بلکہ انسانی نفس ان کو نگلتا ہے اور جزو بدن بناتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی جب جزو نفس بن گئیں تو جب اس میدان میں پہنچے گا تو وہی چیزیں جو جو ہر بنائی تھیں نفس کی وہ شکل

گئیں۔ تو اللہ تعالیٰ اندر سے نمایاں کردیں گے عملی کو۔ اور باہر سے بھی عمل کو مجسّم بنا کر حجت تمام کردیں گے۔

صحیح بخاری کے اوّل و آخر کی نسبت

بہرحال امام بخاریؒ نے ابتداء میں عمل کا پہلا سرا بتلادیا کہ :

انما الاعمال بالنیات کہ نیّت صحیح کرو تاکہ عمل صحیح ہو گویا انما الاعمال بالنیات۔ تو ایک اصول وکلیہ ہے کہ ہر چیز نیّت سے معتبر ہوگی۔ شرعی وجود اور شرعی ثواب نیّت سے ہوگا۔ اب ہم اس کلیہ سے نفع کس طرح اٹھائیں تو انتفاع کے لئے دوسرا جملہ رکھا :

وانما لامرء مانوی آدمی جو نیت کرے گا اس کو وہی پھل ملے گا۔ محض اصول کے درجے میں بات نہیں رہ جائے گی بلکہ عمل کے میدان میں یا ضرر اٹھائے گا۔ یا نفع' تو یہ دوسرا اصول ہے۔ انتفاع کے لحاظ سے وہ اصول ہے عقلی اور کلی۔ کوئی آدمی کرے یا نہ کرے وہ اصول اپنی جگہ ہے اور جب کرے گا تو **انما لامرء مانوی** اب اس سے منتفع ہونے کا وقت آیا۔ تو یہ اصول درحقیقت عملی ہی ہے اور پہلا اصول نظری۔ اس کے بعد تیسری مثال جزوی دی کہ :

فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت هجرته الی دنیا یصیبها اوالی امراة یتزوجها فهجرته الی ماهاجرالیه۔

تو ایک جزوی مثال ، ایک عملی اصول' ایک نظری اصول' یہ تینوں اس حدیث میں جمع کردیئے گئے اور مجموعہ سے یہ بات نکلی کہ عمل بغیر نیّت کے ہوتا نہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' حتیٰ کہ دنیا میں بھی اگر کوئی مجرم ہو تو بعض تو گورنمنٹ کا قانون بھی کہتا ہے اور وکیل بھی کہتا ہے کہ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس کی نیّت بری نہیں تھی۔ باقی عمل سرزد ہوگیا تو وہاں تو مدار ہی نیّت پر ہے۔ اللہ کی حکومت میں تو اصل باطن ہی کو دیکھا جاتا ہے تو اس حدیث میں تین چیزیں بیان فرمادیں اور عمل کا مبدا بیان کردیا۔ اور دوسری حدیث میں کلمات ارشاد فرمائے۔ اخیر میں کہ وہ ثمرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر نتیجہ کیا نکلے گا تو اسے ظاہر فرمادیا کہ :

ثقیلتان فی المیزان خفیفتان علی اللسان۔

"یہ دو کلمے ایسے ہیں کہ زبان پر ہلکے اور میزان عمل پر بھاری ہیں"۔

میں ہنسی میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں' کبھی آپ نے یہ پاپڑ تو کھائے ہوں گے باریک باریک بنتے ہیں' کبھی موم کے کبھی ویسے' تو میں کہا کرتا ہوں کہ :

خفیفتان علی اللسان۔

زبان پر ہلکے مگر معدے میں گئے بھاری ہوجاتے ہیں۔ گڑبڑ پیدا کرتے ہیں یہ مادی غذاؤں میں اس کا مصداق ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمالِ شریعت میں یہ دو کلمات وہ ہیں کہ زبان پر ہلکے' ادائیگی میں کوئی دشواری نہیں اور نہ ان میں وقت لگے' اور میزان کو دیکھو تو وہ پُر ہوجاتی ہے اجر و ثواب سے۔

تو امام بخاریؒ نے اپنی صنعت سے مبدا' بھی بیان کردیا اور منتہی بھی مصدر بھی اور مظہر بھی ___ اس واسطے میں نے یہ دو روایتیں پڑھیں کیونکہ یہ مجلس وعظ اور تقریر کی نہ تھی' درس کی تھی۔

تو ان دو احادیث کا کچھ ترجمہ پیش کردیا اور اصل جو علوم ہیں اور کمالات ہیں۔ وہ تو ہمارے مولانا (حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ) ہی آپ کے سامنے بیان فرمادیں گے۔ اور علماء ہی کو بیان کا حق ہے۔ میں نے تو چند باتیں طالب علمانہ عرض کردیں کہ تعمیلِ حکم کے بغیر چارہ نہ تھا۔

دعا

اب امید ہے آپ حضرات میرے لئے بھی دعا فرمائیں گے۔ اپنے لئے بھی اور حضرت مولانا (عبدالحق مدظلہ) کے لئے بھی دعا فرمائیں گے کہ جن کی وجہ سے یہ ساری بہار قائم ہے اور یہ باغ وبہار آپ کے سامنے ہے اور دارالعلوم دیوبند کے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مادر علمی بنایا وہاں سے یہ سب گُل کِھل رہے ہیں اور یہ پھل پھول نکل کر سامنے آرہے ہیں اور حق تعالیٰ ہم سب کا انجام بخیر فرماوے۔

وصلّی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمدوالہ واصحابہ اجمعین

برحمتک یا ارحم الراحمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

درس ختم بخاری

آپ کو بخاری پڑھنے کے بعد دو چیزیں حاصل ہوئیں' ایک متن حدیث اور اس کی مرادات ___ اور دوسرا یہ کہ آپ کو سند ملی۔ آپ نے کہا کہ مجھے یہ حدیث میرے استاذ سے پہنچی' اسے اس کے استاذ سے ___ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ مل گیا' گویا آپ کے قلب کا رشتہ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو گیا اور ایک نورانی سلسلے سے کلام کے لفظ اور معانی آپ کے قلب تک آ گئے ___ تو متن حدیث کے ساتھ آپ کو سند بھی حاصل ہو گئی اور آپ مستند عالم ہو گئے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

اما بعد ! ے

ثمرات ختم بخاری

بزرگان محترم و برادران عزیز طلباء!

جہاں تک ختم بخاری کا تعلق تھا' وہ ہو گیا اور اس کا حق بھی ادا ہو گیا آخری حدیث پڑھی گئی اور دعا بھی ہو گئی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی (جامع) بخاری کی نسبت فرمایا کہ :

جعلتہ بینی وبین اللہ حجۃ ۔

میں نے اس کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے۔ اس کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ ختم بخاری کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں تو تجربہ بھی شاہد ہے' امت کا عمل بھی ہے کہ وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں' اس لئے عامہ علماء میں یہ دستور رہا ہے کہ جب بخاری ختم کرنی ہوتی ہے تو مجمع ہو جاتا ہے' اجتماعاً دعاء کر کے ختم کرتے ہیں ___ اب یہ سسٹم اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ باہر سے بھی لوگ بلائے جانے لگے ہیں۔ لیکن ہم لوگ طالب علمی کے زمانے میں دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت اقدس مولانا انور شاہ صاحبؒ جب بخاری ختم کراتے تھے تو باہر سے کسی کو نہیں بلایا جاتا تھا۔ لیکن دار العلوم کے اساتذہ' طلبہ' منتظمین سب جمع ہو کر ختم بخاری میں شریک ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے کہ جب بخاری ختم ہوتی ہے تو دار العلوم کے لوگ اور شہر کے لوگ بھی اطلاع پانے پر آجاتے ہیں ___ اور دعا میں شریک ہوتے ہیں۔

بہر حال ختم بخاری پر دعا کا معمول رہا ہے۔ ایک تو درساً درساً ختم ہوا اس وقت تو ختم بخاری ہوتی ہی ہے۔

دعا بھی کرتے ہیں ___ ویسے بھی اگر کوئی مہم پیش آجاتی ہے' خدانخواستہ مسلمانوں کو کوئی آفت پیش آئی یا کوئی مقصد کسی نے لکھ کے بھیجا اور چند مقاصد جمع ہو گئے' تو اس کے لئے بخاری کا ختم کرائے جانے کا مدارس میں اور دارالعلوم میں بھی معمول ہے ___ متعدد مقاصد و درخواستیں جمع ہو جائیں تو ایک دن اساتذہ اور طلباء جمع ہو کر ختم کرتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں اور اس کے اثرات بھی دیکھے گئے ہیں کہ حق تعالیٰ (دعا) قبول فرماتے ہیں۔

تقدیس بخاری

امام بخاریؒ نے اس کتاب مقدس کو اپنے اور اللہ کے درمیان میں حجت ٹھہرایا' اور حجت ہونی بھی چاہئے۔ اس لئے کہ جس اعتناء اور جس تقدس کے ساتھ امام بخاریؒ نے اس کتاب کو مدون کیا اس کی نظیر بھی دوسرے محدثین میں نہیں' حرم محترم میں جا کے اس کتاب کی کتابت اور تکمیل کی۔

اور فرماتے ہیں کہ ہر حدیث جب میں لکھتا تھا تو لکھنے سے پہلے غسل کرتا تھا' دو رکعت نفل پڑھتا تھا اور دعائیں مانگتا تھا کہ

اے اللہ! مجھ میں انشراح پیدا فرما۔

جب شرح صدر ہو جاتا تھا' تب ایک حدیث میں لکھتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں تقریباً سات ہزار یا کم وبیش حدیثیں ہیں۔ تو چودہ ہزار نفل پڑھ کر امام بخاریؒ نے قلمبند کیا ہے ہر حدیث پر رجوع الی اللہ کیا ہے۔

تو اول تو حدیث خود کلام مقدس' کلام نبوی ہے' پھر مدون کرنے والے امام بخاریؒ جو امیرالمومنین فی الحدیث ہیں اور اس کی تدوین میں حرم محترم میں ہر حدیث پر دو رکعت نفل پڑھنا ___ تقدس ہی تقدس جمع ہو گیا۔ پھر بھی اگر حجت نہ بنتی تو اور کیا ہوتا ___؟ تو وہ حجت بنی۔

اور امت میں یہ تعامل جاری ہے کہ ختم بخاری کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ ختم بخاری کا حق تو ادا ہو گیا۔ حدیث بھی پڑھی گئی۔ دعاء بھی مانگ لی گئی ___ اب آگے زوائد کی بات ہے۔

جہاں تک حدیث کی شرح کا تعلق ہے وہ اساتذہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں کیا عرض کروں؟ ___ میں تو ان سے بہت زیادہ کم علم ہوں۔ تو وہ بھی حق ادا ہو گیا یا ہو جائے گا کہ جو استاذ بخاری پڑھانے کے متعلق ہیں، وہ حدیث کی شرح کردیں گے اور اگر کسی درجہ میں کوئی شرح کر سکتا تھا۔ تو تین سال ہوئے یہاں آ کے شرح بھی کر دی تھی۔ جب بخاری ختم ہوئی تھی۔ میں بھی اس میں شریک ہوا تھا۔ تو حدیث پر تقریر ہو گئی تھی وہ آئندہ کے لئے بھی کافی ہے ___ اس وقت اس مقدس جلسے میں تو صرف اظہار مسرت و مبارک باد مقصود ہے۔

شرفِ اوّلیت

کیونکہ جہاں تک انسانوں کا تعامل ہے۔ دو چیزیں خوشی کی اور مبارک باد کے قابل سمجھی گئی ہیں ___ ایک کسی شئے کا آغاز اور ایک اختتام ___ آغاز پر بھی لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور اختتام پر بھی۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں' مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آج اس کی انسانیت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ابتداء

ہو رہی ہے۔ اس واسطے خوشی کرتے ہیں ___ کوئی شخص باغ لگاتا ہے تو پہلا درخت نصب کر کے احباب کو بلاتا ہے مٹھائی تقسیم کرتا ہے' اس لئے کہ باغ کا آغاز ہو گیا۔

کوئی شخص دکان کھولتا ہے تو اکثر اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے کہ صاحب! آپ ہی افتتاح کر دیں۔ مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے ___ بہرحال آدمی کا آغاز ہویا اس کے افعال کا آغاز ایک خوشی کی چیز ہے اور اسی لئے کسی چیز کی اولیت کو شرف سمجھا گیا اور اس کو فضیلت مانا گیا ہے۔

جو شخص بھی کسی کام میں ابتداء کرے وہ ایک تاریخی چیز بن جاتی ہے کہ فلاں کام کا یا فلاں بات کا فلاں نے آغاز کیا ہے۔ تو اولیت ایک شرف ہے۔

نور علم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں جو احادیث آئی ہیں' ان میں اولیات کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ :

اول ماخلق اللہ نوری ۔

"سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا"۔

ظاہر بات ہے کہ نور سے مراد حسی نور نہیں ہے جیسے سورج یا چاند کا نور ہوتا ہے یہ نور اس کے سامنے معمولی ہے جو آپ کا نور ہے' وہ نور حقیقت محمدیہ کا ہے ___ یعنی سب سے پہلے اللہ نے حقیقت محمدیہ پیدا کی اور وہ ہے نور یعنی میرا نور بنایا۔ حسی نور نہیں معنوی نور اور معنوی نوروں میں سب سے زیادہ علم کا نور اکمل ہے' جس طرح سے حسی نور کے چاندنے میں آپ راستہ پالیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے یا بری ہے۔ ادھر چلنا چاہئے ادھر نہیں۔ نور آفتاب میں راہ طے کرتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر نور علم ہے جس میں کسی شئی کی خوبی اور خرابی کو پہچانا جاتا ہے۔ علم کی روشنی میں جائز اور ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔ یہ چیز مرضی خداوندی اور یہ نامرضی خداوندی ہے۔ یہ اللہ کی پسند اور یہ ناپسند ہے ___ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کی تمیز سورج کے نور سے نہیں ہو سکتی ___ سورج کا نور شکلیں دکھلا دے گا اور علم کا نور حقیقتیں دکھلاتا ہے حقائق کے اندر امتیاز پیدا ہو گا۔ صورت دکھلا دینا یہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ اس لئے آفتاب کا نور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لالٹین' انڈے اور بجلی کا نور ہے۔ اس میں شکلیں' صورتیں' رنگ اور الوان پہچانے جاتے ہیں لیکن علم کا نور وہ ہے جس میں حقائق پہچانے جاتے ہیں جس کے اندر شریعتیں پہچانی جاتی ہیں۔ شریعتوں کے احکام کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ احکام کی علتیں پہچانی جاتی ہیں۔ علتوں سے احکام نکالے جاتے ہیں۔ اسرار و معارف اور حقائق پہچانے جاتے ہیں تو علم کا نور بہ نسبت آفتاب کے نور کے عظیم نور ہے۔

حقیقت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور علم ہے یعنی آپ کی حقیقت میں علم گوندھ دیا گیا ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا :

اوتیت علم الاولین والاخرین۔

اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کر دیئے گئے۔ تو آپ اعلم البشر ہیں۔ کائنات میں وہ علم نہ ملائکہ

کو دیا گیا نہ انسانوں کو، جو علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ تو آپؐ ساری خلائق میں سب سے زیادہ علم والے اور اعلم الخلائق ہیں۔

وہ کیوں ہیں؟

اس لئے کہ آپؐ کی حقیقت ہی علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے ___ اس لئے آپ کی شریعت علم سے لبریز ہے کوئی حکم نہیں جس کے نتیجے میں حکمت نہ ہو۔ کوئی نقل نہیں جس کے اندر عقل چھپی ہوئی نہ ہو۔ کوئی صورتِ حکم نہیں جس کے اندر حقائق کی تہ بہ تہ جمی ہوئی نہ ہو۔

حرف حرفش راست اندر معنی
معنی در معنی درمعنی

ایک ایک حرف کے اندر حقائق کے دریا چھپے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم آپؐ پر معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ علمی معجزہ ہے۔ تو قرآن کریم کی حقیقت علم سے لبریز ہے۔ تو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خود علم سے گوندھی ہوئی ذات ہوئی۔ شریعت وہ دی گئی جو علم سے لبریز ہے۔ شریعت کا کوئی حکم نہیں جس کی حقیقت ولمیت موجود نہ ہو۔

اس لئے آپؐ نے بحکم خداوندی ارشاد فرمایا:

اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف پ ۱۳ آیت ۱۰۸)

"میں اور میرے ماننے والے دین کے بارے میں بصیرت پر ہیں"۔

یعنی اسلام چند بندھی رسوم کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ حقائق سے لبریز دین ہے جو اس دین پر واقفیت حاصل کرے گا' علوم وکمالات سے بھر جائے گا۔

دنیا اور آخرت کے سارے راز اس پر کھلیں گے۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جامع العلوم ہیں۔

کمالاتِ نبوّت کے منتہیٰ

اور اسی لئے آپؐ کو خاتم الانبیاء بنایا گیا ___ ختم نبوّت کے معنی قطع نبوّت کے نہیں کہ نبوّت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ ختم نبوّت کے معنی تکمیل نبوّت کے ہیں کہ نبوّت کے جتنے مراتب اور کمالات ہیں وہ آپؐ کی ذات پر لا کر جمع کر دیئے گئے۔ اب نبوّت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ بعد میں کسی کو نبی بنا کر لایا جائے اور اس کو ظاہر کیا جائے۔ سارے کمالات نبوت علمی ہوں' اخلاقی ہوں' عملی ہوں وہ سب آپؐ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ ان کی انتہا ہو گئی۔ تو آپؐ سارے کمالات نبوّت کے منتہی ہیں ___ اخلاق کو دیکھو تو آپ صابر ہی نہیں بلکہ سید الصابرین ہیں' آپ شاکر ہی نہیں ___ بلکہ سید الشاکرین ہیں' آپؐ فقط حیا والے ہی نہیں بلکہ حیا والوں کے سردار ہیں اور حیاء کے سارے مراتب آپؐ میں جمع ہیں۔ غیرت وحمیت اور شجاعت وسخاوت اور جتنے بھی اعلیٰ ترین اخلاق ہیں آپ ان سب کا منتہی ہیں کہ تمام اخلاقی درجات آپ پر لا کر ختم کر دیئے گئے۔

اسی لئے فرمایا گیا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم پ ۲۹ آیت ۴)

"آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں"۔

مراتبِ اخلاق

اس لئے کہ اخلاق میں اگر غور کیا جائے تو تین مرتبے نکلتے ہیں۔ ایک خلق حسن ' ایک خلق کریم اور ایک خلق عظیم ___ خلق حسن کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امر کیا گیا' حق تعالیٰ نے فرمایا :

خَلِیْلِیْ حَسِّنْ خُلُقَکَ وَلَوْمَعَ الْکُفَّارِ۔

"اے میرے خلیل! حسن اخلاق سے پیش آؤ' چاہے کفار ہی تمہارے سامنے کیوں نہ ہوں؟"

دوسرا درجہ خلق کریم کا ہے۔ آدمی کا کریم الاخلاق ہونا یہ دوسرا مقام ہے اور تیسرا مقام خلق عظیم کا ہے ___ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ۔

"میں مبعوث کیا گیا ہوں اس لئے کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں"۔

تعریف اخلاق

تو آپ پر کریمانہ اخلاق ' اخلاق حسنہ اور اخلاق عظیم بھی مکمل ہو گئے۔ ان تینوں اخلاق میں کیا فرق ہے؟ خلق حسن کے معنی عدل و مساوات کے ہیں کہ جو ادھر سے ہو اس کے برابر ادھر سے ہو ___ اگر آپ کے ساتھ کوئی ایک پیسے کا سلوک کرے تو آپ کا فرض ہے کہ ایک پیسے کے برابر آپ بھی سلوک کریں' کہا جائے گا کہ انہوں نے خلق حسن برتا۔ اخلاق حسنہ کا آدمی ہے کہ بدلہ برابر کر دیا۔

اس کے برخلاف اگر کسی نے آپ کو تھپڑ مار دیا تو آپ کو حق ہے کہ آپ بھی تھپڑ ماریں۔ اگر تھپڑ سے زیادہ مکہ ماریں گے تو کہیں گے بد خلق آدمی ہے۔ اسے برابری کا حق تھا کہ دوسرے نے اس کو تھپڑ مارا' اسے بھی تھپڑ مارنے کا حق تھا۔ تھپڑ کے بجائے مکہ مار دینا بد اخلاقی و زیادتی شمار ہو گی۔ اس نے اتنی زیادتی نہیں کی تھی کہ جتنی آپ نے کی۔ تو آپ مستحق سزا ہوں گے۔ تو خلق حسن کے معنی عدل و مساوات کے ہیں کہ نیکی اور برائی کے اندر برابر آپ بدلہ لیں۔ یہ خلق حسن ہے۔

خلق کریم اس سے اگلا مرتبہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے ساتھ اگر کوئی برائی سے پیش آئے تو آپ بدلہ نہ لیں' بلکہ معاف کر دیں' درگزر کریں۔ یہ خلق کریم ہے۔ اگر بدلہ لے لیا تو خلق حسن ہے بشرطیکہ برابر سرابر بدلہ ہو اور اگر برائی کو معاف کر دیا یا ایک روپے کے بدلہ میں دو روپے دے دیئے ورنہ ایک روپیہ کا بدلہ ایک روپے سے دے سکتا تھا۔ تو کہیں گے خلق کریم کا برتاؤ کیا۔ یہ آدمی کریم النفس ہے بہرحال مساوات سے آگے بڑھ کر کچھ کام کرے وہ خلق کریم کہلائے گا۔

اور تیسرا درجہ خلق عظیم کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ برائی کی تو نہ صرف یہ کہ آپ نے بدلہ نہ لیا نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا بلکہ اوپر سے برائی کرنیوالے کے ساتھ احسان بھی کیا۔ یہ خلق عظیم ہے۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی ___ فرمایا گیا :

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ۔ (اعراف پ۹ آیت ۱۹۹)

اس سے زیادہ فرمایا :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۔ (آل عمران پ۴ آیت ۱۵۹)

وہ جو اللہ نے آپ میں کوٹ کوٹ کر رحمت بھردی ہے اس کی وجہ سے آپ رقیق القلب ہیں، قلب مبارک نہایت نرم ہے۔ ذرا سی مصیبت کسی کی دیکھی اور پگھل جاتا ہے۔ قلب رحمت سے بھرا ہوا ہے۔

وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

اگر آپ سخت دل ہوتے، یہ جو آپ کے ارد گرد پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں۔ یہ اٹھ اٹھ کر ہٹ جاتے۔ سب آپ کے اخلاق نے انہیں جذب کر رکھا ہے۔ آپ کے اخلاق کیا ہیں؟

پہلا درجہ فرمایا گیا : فَاعْفُ عَنْهُمْ ___ یہ نہیں کہا گیا کہ برابر سرابر بدلہ لے لیں۔ اگر کوئی برائی کرے تو معافی اور ایثار سے کام لیں۔ آپ معاف کردیں بدلہ لینے کا تصور نہ کریں۔ بدلہ لینے سے آپ کی ذات بہت بالاتر ہے۔ اگرچہ برابر کا بدلہ لینا وہ بھی خلق حسن ہے مگر آپ کے اخلاق اس سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ کا ابتدائی خلق یہ ہے کہ جب کوئی برائی کرے تو آپ معاف کردیں۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ___ اس برائی کرنیوالے کے لئے دعاء مغفرت بھی کریں یہ ایک درجہ اور بڑھا دیا ___ دوسرا گالیاں دے رہا ہے اور آپ دعائیں مانگ رہے ہیں ___ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ___ آپ ان سے مشورہ لیں یہ اس سے بھی اونچا مقام ہے۔ اس مجموعہ کا نام خلق عظیم ہے۔ تو خلق عظیم میں خلق حسن اور خلق کریم بھی درج ہے۔

درجات تربیت

انبیاء علیہم السلام جامع الاخلاق ہوتے ہیں لیکن تربیت کرنے میں انبیاء علیہم السلام کے درجات ہیں۔ ان درجات میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاں خلق حسن کا درجہ ہے۔ جس پر انہوں نے اپنی امت کو تربیت دی کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے، تمہارا فرض ہے کہ تم برائی کا بدلہ لو۔ موسوی شریعت کے اندر معاف کرنا جائز نہیں تھا۔

فرمایا گیا :

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ الخ۔ (مائدہ پ۶ آیت ۴۵)

ہم نے اہل تورات پر لازم کردیا تھا کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو معاف کرنا جائز نہیں، بدلہ لینا ضروری ہے۔ اگر کوئی دانت توڑے، تمہارا فرض ہے تم بھی دانت توڑ دو۔ کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑ دو۔ کوئی تھپڑ مارے، تم بھی تھپڑ مارو۔ بدلہ لینا واجب ہے، عفو کرنا جائز نہیں۔ یہ موسوی شریعت ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو خلق حسن پر تربیت دی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، انہوں نے خلق کریم پر تربیت دی۔ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی برائی کرے تو بدلہ لینا جائز نہیں۔ معاف کرنا واجب ہے۔ تو وہاں تشدد غالب ہے۔ یہاں تساہل غالب ہے۔ یہاں یہ حکم ہے کہ اگر

کوئی تمہارے بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کردو کہ بھائی ایک اور مار تا جا خدا بھلا کرے۔

یہ نہیں کہ بدلہ لو۔ بدلہ لینا جائز نہیں' معاف کرنا واجب ہے جھک کر تواضع سے رہنا ضروری ہے۔ اسی میں تمہارے نفس کے لئے انکسار ہے۔ اسی میں اولیت و اولویت ہے تو یہاں خلق کریم پر تربیت دی گئی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خلق عظیم پر تربیت دی ہے کہ کوئی برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلا کرو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ۔

"دوسروں کی برائی کا بدلہ اپنی بھلائی سے دو۔ وہ گالیاں دے تم دعائیں دو"۔

حضرت جنیدؒ جہاز میں سوار تھے اور حج کے لئے جا رہے تھے۔ لوگوں نے ان کے مقام کو نہ پہچانا ___ کسی نے برا کہا' کسی نے گالی دی' کسی نے کچھ اور کہا وہ گالیاں دے رہے ہیں اور جنیدؒ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ ان کو ہدایت دے اور انہیں وہی مقام دے جو تو نے مجھے دیا ہے تو وہ برائی کے درپے ہیں یہ ان کی بھلائی کے درپے ہیں۔ اس شان سے امت محمدیہ کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ ان کے اندر خلق عظیم آئے۔

شرف خاتمیت

عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اخلاق کے تین مراتب ہیں۔ اعلیٰ ترین مرتبہ خلق عظیم ہے۔ اس کے بعد کوئی مرتبہ نہیں۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا تو آپؐ جامع الاخلاق اور جامع الکمالات ہیں۔ علم بھی آپ کو اگلوں اور پچھلوں کا دیا گیا۔ تو آپ جامع العلوم بھی ہیں۔ احوال سابقہ سارے آپ کے اوپر طاری ہوتے تو آپؐ جامع الاحوال بھی ہوئے ___ اس لئے آپ کو خاتم بنایا گیا کہ آپ کمالات علم' کمالات عمل اور کمالات اخلاق کے منتہی ہیں۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کمالات سے بھرپور ہے۔ اس کو آپ نے فرمایا :

اول ماخلق اللّٰہ نوری ۔

سب سے پہلے میری حقیقت پیدا کی گئی۔ وہ حقیقت علم اور کمالات سے گوندھی ہوئی ہے ___ مگر عرض یہ کرنا تھا کہ مناقب میں اولیت کا ذکر کیا گیا۔ اگر یہی چیزیں بعد میں پیدا کر دیتے کسی اور کو پہلے لا کر تو کمالات کے جامع جب بھی آپ ہی ہوتے۔ مگر وہ جو اول ہونے کا شرف حاصل ہے' وہ نہ ملتا ___ تو اولیت بھی عطا کی گئی ___ تو ایک طرف تو خاتمیت عطا کی گئی کہ آپؐ سب سے اخیر میں ہیں اور ایک طرف اولیت عطا کی گئی۔ تو آپؐ ان کمالات میں جو اللہ نے عطا کئے ہیں اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔ رجوع آپ ہی کی طرف ہوگا۔ تو اولیت ایک عظیم فضیلت ہے۔

یا جیسے آپؐ نے فرمایا : **انا اول من تنشق منہ القبر۔**

سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا اور بعد میں سب کو اٹھاؤں گا۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اٹھائیں گے' اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو جنت البقیع میں مدفون ہیں انہیں اٹھاؤں گا ___ اس کے بعد مکہ کی طرف جنت المعلیٰ ہے۔ وہاں کے قبرستان سے لوگ اٹھیں گے اور سب میرے ساتھ ہوں گے تو قبر سے اٹھنے میں آپ کی اولیت ثابت ہے

انا اول من یفتح باب الجنۃ ___ سب سے پہلے میں ہوں گا جو جنت کا دروازہ کھولوں گا ___ اس واسطے وہاں بھی آپ ہی کو اولیت حاصل ہے ___ **انا اول قائد وانا اول خطیب ۔**

قیامت کے دن سب سے پہلے میں قائد ہوں گا۔ میری قیادت میں دنیا کی امتیں چلیں گی ' میں ہی شفاعت کبری کروں گا' سب امتیں میرے جھنڈے کے نیچے آئیں گی ___ تو دنیا و آخرت کی جتنی بھی اولیتیں ہیں ' وہ سب آپ ؐ کے لئے ثابت ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اولیت ایک عظیم شرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چیز کی اولیت پر اور ابتدا و آغاز پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔

تکمیل پر مسرت

اسی طرح سے دوسرا مقام اختتام کا ہے کہ اس پر خوشی منائی جاتی ہے۔ جب کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے تو خوشی مناتے ہیں کہ آج پوری ہو گئی۔ بچہ اگر تعلیم سے فارغ ہو کر سند حاصل کرے ' آپ دعوت کرتے ہیں کہ بچہ فارغ ہو گیا۔ یعنی اس کا علم حد اختتام کو پہنچ گیا۔ جو تدریس کا سلسلہ تھا ' اس میں آخر مرتبے پر آ گیا۔ تو انتہا کی بھی خوشی کرتے ہیں۔

آپ کہیں گے ' بچے کی پیدائش پر خوشی کرنا صحیح ہے لیکن اس کا تقاضا یہ ہے جس دن اس کا انتقال ہو ' اس دن بھی خوشیاں منائی جائیں۔ حالانکہ اس دن روتے ہیں خوشیاں کوئی بھی نہیں مناتا۔ اس قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ جب ابتدا میں خوشی کی گئی تو انتہا میں بھی خوشی کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ انتہا میں بھی آپ خوشی کرتے ہیں۔ موت پر بھی کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اچھی موت ہو بعض اوقات کہا کرتے ہیں کہ بھئی بڑا اچھا آدمی تھا ' خدا ایسی موت ہر ایک کو نصیب کرے۔ مرنا تو تھا ہی ' مگر ایسی موت نصیب ہوئی ' بڑی خوشی کی بات ہے ' بڑی فرحت کی بات ہے۔ کوئی جام شہادت پی لے تو آپ کہتے ہیں کہ بھئی! موت تو اپنے وقت پر آتی ہے لیکن شہید ہو کر مرا ہے ___ کتنی خوشی کا مقام ہے۔

موت کی خوشی

اور ویسے بھی مرنے کے معنی اللہ سے مل جانے کے ہیں۔ تو کیا اللہ سے مل جانا کوئی غم کی چیز ہے کہ اس میں آدمی رنج کرے کہ ہائے فلاں آدمی خدا سے کیوں مل گیا؟

حدیث میں فرمایا گیا :

اللھم حبب الموت الی من یعلم انی رسولک -

"یا اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے ' جو میرے رسول ہونے کا قائل ہے"۔

کیوں محبت ڈال دے؟ کیوں موت محبوب بنائی گئی؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ

ان الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب ___ موت ایک پل ہے جس سے آدمی گزر کر محبوب حقیقی سے جاملتا ہے۔ اپنے پروردگار سے جاملتا ہے تو موت درحقیقت بندے کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے۔ یہ نہیں کہ بندہ تو خدا سے مل رہا ہے اور آپ بیٹھ کر رنج کریں؟ اور آہ و فغاں کریں؟

بلکہ حقیقت میں موت بھی خوشی کی چیز ہے پھر بھی جو غم کرتے ہیں ' وہ غم موت کا نہیں ' جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں عزیز جدا ہو گیا۔ اس پر غم نہیں کہ مر کیوں گیا؟ اللہ سے کیوں مل گیا؟ ___ بلکہ ایک نعمت ہم سے چھنی [illegible] میں اس کا غم ہوتا ہے۔ یہ غم اس کی موت پر نہیں ہوتا۔ یہ غم فراق کا ہوتا ہے کہ ہم سے

فلاں آدمی چھن گیا۔

تو غم حقیقت میں جدائی کا کرتے ہیں۔ موت کا غم نہیں ہوتا' نہ اس کا غم ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے کیوں مل گیا؟ ___ لہٰذا موت بھی ایک خوشی کی چیز ہے ___ اور اہل اللہ کے ہاں تو اس سے زیادہ فرحت کی چیز ہی کوئی نہیں۔

ابن الفارض کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں برویم
تادر میکدہ شاداں وغزل خواں برویم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے دیار کو چھوڑیں گے۔ اور اپنے محبوب حقیقی سے جا کے ملیں گے۔

شوق ملاقات محبوب

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جب وفات کا وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے اور چہرے پر ایسی خوشی کہ عمر بھر اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

لوگوں نے عرض کیا :

"موت کی تو تکلیف گزر رہی ہے اور چہرہ آپ کا دمک رہا ہے۔ خوشی ہے نورانیت برس رہی ہے"۔

فرمایا :

غدا نلقى محمدا واصحابه۔

بس اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔ اس لگن میں مطمئن ہوں۔

پاکیزہ عالم میں جارہے ہیں یہاں کے دوستوں کو چھوڑ کر جن کی دوستی مشکوک ہے' ان دوستوں میں جارہے ہیں جن کی دوستی میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

منصورؒ اکثر قبرستان میں رہتے۔ لوگ کہتے شہروں کو چھوڑ کر قبرستانوں میں کیوں جاتے ہو ___ ؟

تو کہتے کہ میں اس قوم کے پاس رہتا ہوں جو نہ غیبت کرتی ہے نہ جھوٹ بولتی ہے نہ چغلی کھاتی ہے نہ بد خواہی کرتی ہے ___ مرنے کے بعد آدمی کی برائیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اس کی جتنی نیکیاں ہیں وہ ابھر جاتی ہیں۔ اس لئے آدمی ان سے مل کر خوش ہوتا ہے ___ اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے ملے تو اس سے بڑھ کر خوشی کا کیا مقام ہے؟ ___ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت بھی خوشی کی چیز ہے اور آپ بھی در حقیقت خوش ہی ہوتے ہیں مگر اس کے اوپر جدائی کا غم چونکہ غالب ہو جاتا ہے تو وہ خوشی دب جاتی ہے۔ اگر جدائی کی غمی نہ ہوا کرتی تو شاید لوگ میت پر شادیانے بجایا کرتے کہ بڑا اچھا ہوا اللہ سے جا ملا۔ مگر اس خوشی کے اوپر جدائی کا غم غالب آجاتا ہے۔ اس سے آدمی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

تو مطلب یہ ہے کہ خوشی کی دو چیزیں ہیں۔ ایک آغاز اور ایک اختتام۔

اصل خوشی

آغاز میں توقع پر خوشی ہوتی ہے۔ ابتداءً آدمی توقع باندھتا ہے کہ آج میں نے بچے کو پڑھنے کے لئے بٹھایا ہے۔ امید ہے کہ آٹھ برس میں عالم بن جائے گا۔ اس توقع پر خوشی مناتے ہیں یہ نہیں کہ آج کوئی خوشی میسر آرہی ہے ___ اگر باغ لگاتے ہیں اس میں ابتدا میں خوشی کریں تو توقع کی خوشی ہوتی کہ اب چند دن کے بعد پھل دے گا اور ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ غرض ابتدا کی خوشی محض توقع پر مبنی ہوتی ہے واقع پر مبنی نہیں ہوتی ___ لیکن انتہا کی خوشی واقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ شئ تکمیل کو پہنچ گئی۔

جس دن آپ نے بخاری شریف شروع کی ہوگی اس دن جو خوشی منائی تھی وہ اس کی تھی کہ اب امید پڑگئی کہ ہم سال بھر میں ختم کریں گے۔ امید کے اوپر آپ خوشی منا رہے تھے اور جب ختم کی تو ایک واقعہ کے اوپر خوشی منائی کہ ایک چیز حد کمال کو پہنچ گئی۔ آج ہمارے لئے بڑی خوشی کا دن ہے کہ بخاری شریف ختم ہوئی۔

ختم ہونے کا یہاں یہ مطلب ہے کہ دلوں کے اندر مکمل ہو گئی۔ ساری احادیث کو عبور کر کے آج اس درجے پر آگئے کہ ہم سات ہزار احادیث کے عالم بن گئے۔ بقدر استعداد ہم نے علم حاصل کر لیا۔ وہ ہمارے اندر مجتمع ہے۔ تو اختتام کے وقت جو خوشی ہوتی ہے۔ وہ تکمیل شئ پر اور ابتدا میں محض توقعات پر خوشی ہوتی ہے۔ کسی شئ کا وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے اصل خوشی اختتام کی ہے۔ تو آج خوشی کا دن ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔

قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ

غور یہ کرنا ہے کہ آخر ختم پر ہم نے کیوں خوشی منائی ___؟

آپ کو بخاری پڑھنے کے بعد دو چیزیں حاصل ہوئیں۔ ایک متن حدیث اور اس کی مرادات جو آپ کے اساتذہ نے آپ کو سمجھائیں۔ کتاب الایمان اور اس کی احادیث کے یہ مطالب و مرادات ہیں۔ کتاب العلم اور اس کی احادیث کے یہ مطالب ہیں۔ یہ مفہوم شرعی ہے۔ کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الحج اور پھر آگے معاملات اور کتاب الاجتہاد اور غزوات، ان تمام چیزوں میں دو ہی باتیں ہیں۔ ایک متن حدیث وہ آپ تک پہنچا اور آپ نے اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھ لیا اور دوسرا یہ کہ آپ کو سند ملی۔ آپ نے کہا مجھے یہ حدیث میرے استاذ سے پہنچی۔ اسے اس کے استاذ سے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ مل گیا۔ گویا آپ کے قلب کا رشتہ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو گیا اور ایک نورانی سلسلے سے کلام کے لفظ اور معانی آپ کے قلب تک آگئے۔ تو متن حدیث کے ساتھ آپ کو سند بھی حاصل ہو گئی اور آپ مستند عالم ہو گئے۔

ضرورتِ سند

اور محض عالم ہونا کافی نہیں، مستند عالم ہونا ضروری ہے۔ جس عالم کا بلا انقطاع سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو جائے، وہی عالم ہے۔ اگر آپ دیکھیں اس سے سلسلہ ہی قطع ہو گیا۔ نہ اس نے کسی استاذ سے تعلیم پائی نہ سند حاصل کی، نہ تربیت حاصل کی اور پھر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے تو وہ قوت مطالعہ سے کہہ رہا ہے۔ اپنے نفس کو امام بنا کے کہہ رہا ہے کہ جو میرے نفس نے سمجھ لیا۔ وہ میں کہہ رہا ہوں۔ ظاہر بات ہے

وہ مراد ربانی نہیں ہو سکتی مراد نبوی نہیں ہو سکتی ___ اس کے نفس کی مراد ہو سکتی ہے۔
اس لئے کہ لفظ اللہ و رسول کے لئے اور معانی اپنے ڈال دیئے۔ لفظ منقول لئے اور معنی غیر منقول لئے وہ معانی ہمیں مطلوب نہیں جو سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو کر ہم تک نہ پہنچیں۔

مسلسلات

محدثین نے سند کا یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ نہ صرف لفظ اور معانی ہی کو نقل کیا بلکہ ان ہیئتوں کو بھی نقل کیا ہے جو حدیث کے پڑھنے اور سننے میں ان کے سامنے آئیں' استاذ کی حالت و کیفیت کو بھی سند کے ساتھ نقل کیا۔

چنانچہ مسلسلات کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے الدر الثمین مستقل رسالہ لکھا۔ اس میں فقط الفاظ و معانی کی ہی نقل و روایت نہیں بلکہ ہیئتوں کی بھی ہے۔ ان افعال کی بھی سند جو افعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلائے جیسے کہ مثلاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

صافحت بکفی ھٰذہ کف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
"میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے مصافحہ کیا اور اپنی ہتھیلی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی"۔

اور کہتے ہیں :

فما مسست خزا ولا حریرا من کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
"میں نے جب اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی تو میں نے کوئی ریشم اور ملائم سے ملائم کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک نرم تھی ___ تو میں نے اس کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا"۔

تابعی کہتے ہیں کہ مجھے اجازت دیجئے میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھوں تاکہ اس سلسلہ سے بالواسطہ میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی جائے' ان تابعی سے تبع تابعی بھی کہتے کہ مجھے آپ اجازت دیں کہ میں آپ سے مصافحہ کروں تاکہ دو واسطوں سے میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک پر رکھی جائے' اس طرح یہ حدیث چلی۔

عالی سند

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ کو فرمایا کہ اس وقت میری سند اپنی جماعت میں سب سے عالی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مجھ میں کم واسطے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی سند دوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سہارن پور آ کر حدیث کی اجازت لو ___ میں نے عرض کیا۔ حضرت! میں حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی بھول بھال گئے۔ ایک برس گزر گیا۔ اتفاق سے میں ایک سفر میں ساتھ ہوا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تو آیا نہیں؟ میں تجھے حدیث کی اجازت دیتا ___ میں نادم ہوا۔ میں نے

کہا حضرت! اب حاضر ہوں گا۔ پھر ایک برس گزر گیا۔ وہ بھی لڑکپن کی بات تھی گزر گئی۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ (زادھا اللّٰہ شرفاً و کرامۃً) تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب فکر ہوئی کہ پھر یہ دولت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تو میں نے سہارن پور کا سفر کیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے کہا' حضرت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ بہت خوش ہوئے۔ مولانا زکریا صاحب سے فرمایا مظاہر العلوم کے کتب خانہ میں جتنی حدیث کی متداول کتابیں ہیں سب لے آؤ۔ تو وہ معاجم مسانید اور صحاح ستہ لے آئے۔ ساری کتابیں جمع ہو گئیں۔ ہر ہر کتاب کا اول پڑھ کر حضرت نے مجھے حدیث کی اجازت دی۔ کچھ مجھ سے پڑھوایا' بعض کتابوں کی نقل کرنے کی اجازت دی۔

اس کے بعد فرمایا بھائی! مسلسلات کی اجازت بھی دے دوں گا۔ تو یہ جو مسلسل بالمصافحہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کی اجازت مصافحہ کر کے اور میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ کر دی۔ مصافحہ کیا اور حدیث نقل کی کہ یہ مصافحہ بھی مسلسل سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ ان واسطوں سے گویا تیری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر رکھی گئی۔

اس کے بعد دوسری حدیث "حدیث مسلسل بالماء والتمر" کی بھی عملاً اجازت دی۔ یہ حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کھجور کی ضیافت کی اور اس کے بعد آپ نے کھجور کھائی اور کھا کر الش حضرت علیؓ کو کھلایا اور پانی پیا اور بچا ہوا پانی حضرت علیؓ کو پلایا ___ گویا کھجور اور پانی کی دعوت کی اور دعوت کر کے پھر وہ حدیث سنائی کہ کھجور اور پانی کی دعوت کرنے میں کیا فضیلت ہے۔

حضرت علیؓ نے اسی طرح اپنے شاگرد کو اجازت دی کہ خود کھجور کھائی۔ الش اسے کھلایا۔ پانی پیا اور بچا ہوا پانی پلایا اور حدیث پڑھی ___ یہ مسلسل عمل چلا آ رہا ہے تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کھجور منگوائی اور پانی بھی منگوایا (زمزم کا پانی) کھجور کھا کر الش مجھے کھلایا اور پانی مجھے پلایا اور حدیث نقل فرمائی، اور اس کی اجازت دی ___ تو عملاً حدیث مسلسل بالماء والتمر اور مسلسل بالمصافحہ کی اجازت دی اور پھر روایۃً ساری مسلسل کی اجازت دی کہ میں حدیث کی اجازت دیتا ہوں تو ان کو روایت کر سکتا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ محدثین نے فقط قول نبی نقل نہیں کیا معانی بھی نقل کئے اور معانی ہی نہیں بلکہ وہ افعال اور ہیئتیں بھی سند کے ساتھ ہم تک پہنچائے جو افعال پہنچتے آئے ہیں۔

محدثین کی احتیاط

معمولی سی بات ہے کہ میں نے مشکوٰۃ اپنے والد ماجد سے پڑھی تھی۔ تو نوحہ کی حدیث آئی ___ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تھا، تو وہ وصیت کر کے جاتا تھا کہ چھ مہینے تک یا سال یا دو برس تک مجھے رویا جائے اب ظاہر بات ہے کہ اتنے دنوں تک آنکھوں میں کوئی آنسو لے کر بیٹھ جائے تو یہ ہو نہیں سکتا اور نہ روئے تو لوگ کہیں گے بھئی! کوئی بڑا آدمی نہیں تھا، معمولی تھا، مر گیا لہٰذا چھ مہینے روؤ تاکہ معلوم ہو کہ کوئی بڑا آدمی گزرا ہے۔ مگر اب چھ مہینے تک روئے کون؟ تو رونے والیاں کرائے پر رکھی جاتی تھیں کہ وہ چھ مہینے تک بیٹھ کر روئیں اور وہ عورتیں ہی رکھی جاتی تھیں ___ اس لئے کہ آنسو بہانا آسانی سے آتا ہے بس ارادہ کیا اور ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے۔ تو رونے اور رلانے کے لئے عورتوں سے بہتر دوسرا کرایہ دار نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے عورتوں کو کرایہ پر رکھتے تھے۔ اجرت بھی دیجاتی اور کھانا کپڑا بھی۔

اور ان کا طریقہ کیا تھا ___ ؟ گھر میں بیٹھی ہوئی ہیں کھاپی رہی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا' بس وہ فوراً گھیرا بنا کر بیٹھ گئیں اور انہوں نے "راں راں" کر کے رونا شروع کیا۔ **واکفا' واجیلاہ' واشمساہ'** تو تو پہاڑ تھا' تو تو آفتاب تھا' چاند تھا' وغیرہ ___ اور پوری لے کے ساتھ اور کچھ "راں راں" کر کے دکھلایا کہ یوں روتی تھیں۔

ہمیں حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ ___ پھر خود ہی فرمایا کہ تمہارے ذہنوں میں سوال پیدا ہوا ہو گا کہ یہ میں نے "راں راں" کر کے کیوں دکھلایا؟

فرمایا اس لئے کہ جب مولانا گنگوہیؒ سے میں نے حدیث پڑھی' تو انہوں نے یوں ہی راں راں کر کے دکھلایا تھا اور مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جب میں نے شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث پڑھی تو اس حدیث پر انہوں نے بھی یوں ہی راں راں کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنیؒ نے کہا کہ جب میں نے شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاقؒ کہتے ہیں کہ جب میں نے شاہ عبدالعزیزؒ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا اور وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے شاہ ولی اللہؒ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے یہی کر کے دکھلایا اور شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ جب میں نے شیخ ابو طاہر مدنیؒ سے حدیث پڑھی۔ انہوں نے یونہی کر کے شاہ ولی اللہؒ کو دکھلایا اور اس راں راں کی صحابیؓ تک سند پہنچا دی۔

تو محدثین نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ نقل کئے بلکہ ہیئتیں بھی نقل کیں۔ بلکہ وہ عوارض اور احوال بھی سند کے ساتھ پہنچائے تاکہ معلوم ہو کہ پورے وثوق کے ساتھ انہیں حدیث آئی اور حدیث سنی ہے۔

غیر مستند عالم

اب جس شخص کے پاس سند نہ ہو' محض ترجمے دیکھ کر وہ حدیث بیان کرے۔ وہ قابل اعتبار نہیں۔ وہ مستند عالم نہیں ہے' اسے عالم نہیں کہیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ناقل کہیں گے۔ اگر نقل صحیح کر دی' کہیں گے نقل صحیح کی۔ غلط کی ، کہیں گے غلط کی۔ لیکن عالم کہہ دیں؟ یہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ عالم کے لئے استناد لازمی ہے بغیر استناد کے علم ،علم نہیں ہوتا۔

عقلی علوم میں استناد ضروری نہیں ہے کہ آپ فلسفہ میں صدرا پڑھ کر یوں کہیں کہ **حدثنا فلان قال حدثنا ارسطو والافلاطون**

وہاں ضرورت نہیں ___ اس واسطے کی عقلی چیزیں ہیں۔ ہمیں بھی عقل ہے۔ انہیں بھی عقل تھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عقلی باتوں میں غلطی کر گئے ہوں۔ ہم کہیں گے غلط کام ہوا۔ ہماری عقل میں یہ چیز آتی ہے ___ تو ہر شخص کو عقل دی گئی ہے' دوسرے کی عقل اس کے لئے حجت نہیں۔ وہ **تخطیہ** کر سکتا ہے۔

لیکن نقل و روایت کی چیز میں پابند ہونا پڑے گا استاد کلام رسولؐ نقل کر کے کہے گا میرے استاد نے یہ نقل کیا۔ پھر وہ کہے گا میرے استاذ نے۔ یہاں تک کہ صاحب شریعت تک سند پہنچ جائے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا'

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں' وہ وحی سے ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھ سے یوں فرمایا۔ تو ہماری سند حق تعالیٰ تک متصل ہو جائے گی۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی ختم ہو گئی علم مستند باقی نہیں رہے گا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں' نہ اسے عالم مستند کہیں گے۔

مثال غیر مستند عالم

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے مادی وراثت میں جب تک باپ سے نسب ثابت نہ ہو آپ وارث کیسے بنیں گے؟ پہلے آپ یہ ثابت کریں گے یہ فلاں کا بیٹا ہے تو اس کا جو ترکہ ہوگا وہ اس کو ملے گا اور اگر آپ یہ ثابت نہ کر سکے اور لوگوں نے کہا کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ اس کے بیٹے نہیں۔ معلوم نہیں اس کا باپ کون ہے۔ یہ فرضی طور پر کھڑے ہو گئے۔ وراثت نہیں مل سکتی۔ تو وراثت کے لئے نسب کا ہونا ضروری ہے۔ باپ سے سلسلہ نسب ہو تو کہا جائے گا کہ وارث ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے انبیاء علیہم السّلام کی وراثت علم ہے۔ اس وراثت کا وارث بھی وہ بنے گا جس کا سلسلۂ نسب روحانی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہوا ہو۔ وہاں مادی نسب ضروری ہے' یہاں روحانی نسب ضروری ہے۔ وہاں بغیر مادی نسب کے وراثت نہیں مل سکتی' یہاں بغیر روحانی نسب کے علمی وراثت نہیں ملے گی۔

تو ہم اس علم کو علم کہتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے پہنچا ہو' جس علم کا ہماری عقل نے اختراع کیا ہو' سنی سنائی باتیں کہہ رہے ہوں یا کسی ترجمہ میں دیکھ کر کہہ دیں۔ وہ مستند نہیں سمجھی جائے گی۔ ایسے آدمی کو عالم نہیں کہا جائے گا۔ عالم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مستند ہو۔ کن اساتذہ سے اس نے علم حاصل کیا ہے؟ اس کا سلسلۂ نسب علم میں کہاں پہنچتا ہے؟ اگر نہیں پہنچتا ہم کہیں گے بھئی! تو بے باپ کا بیٹا ہے۔ اور جو بے باپ کا بیٹا ہے وہ وراثت کا مستحق نہیں ہوتا۔ بہرحال سب سے بڑی چیز سند اور استناد ہے۔

سبب تبریک

اسی واسطے محدثینؒ کہتے ہیں :

لولا الاسناد لبطل الدین۔

اگر دین میں اسناد نہ ہو تو دین ہی باطل ہو جائے۔ **لقال من شاء ماشاء** ___ جس کا جو جی چاہے گا کہہ مارے گا۔

اور کہے گا یہ دین کی بات ہے۔ ہر ایک کو حق ہوگا لیکن جب ہم پوچھیں گے سند کیا ہے؟ کس کے شاگرد ہو؟ وہ کس کے شاگرد ہیں؟ آگے وہ کس کے ___؟ جب تک اسناد پیش نہ کرے گا اس کے علم کو ہم علم نہیں کہیں گے۔ غرض علم میں سب سے بڑی چیز سند ہے۔

تو آپ کے لئے سب سے بڑی قابل مبارکباد چیز یہ ہے کہ بخاری ختم ہوئی ___ یعنی آپ کو سند حاصل ہوئی ___ اللہ کے رسول تک روحانی نسب نامہ مل گیا۔ آپ وہی کہہ رہے ہیں جو اللہ کے رسول نے کہا تھا اور وہی باتیں سمجھا رہے ہیں جو اللہ کے رسولؐ نے اپنے صحابہؓ کو سمجھائی تھیں اور صحابہؓ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو۔ تو ایک متن حاصل ہوا جس سے علم کا دروازہ کھلا۔ ایک سند حاصل ہوئی جس سے آپ کا علم مستند اور دوسروں کے لئے حجت بنا۔ بغیر سند کے وہ حجت نہ ہوتا۔ اس لئے محدثین نے سند ضروری قرار دی۔

وقعت روایت

اور اس میں بھی ایک درجہ رکھا ہے کہ اس شخص اور اس راوی کی روایت زیادہ وقیع ہے جو اپنے شیخ سے کثیر الصحبت ہو۔ ایک راوی تو وہ ہے کہ اس نے استاد کی زیارت کی' ملاقات ہوئی، ایک حدیث نقل کی اور ایک وہ ہے کہ برس دو برس شیخ کی خدمت میں رہ کر اس نے فن حاصل کیا ___ ظاہریات ہے جو برس دو برس اپنے شیخ کی خدمت میں رہے گا' اسے قول اور فعل ہی حاصل نہیں ہوگا' بلکہ اس کے قلب کو وہ رنگ بھی ملے گا جو استاذ کے قلب کا رنگ ہے اس تک وہ کیفیات بھی منتقل ہوں گی جو استاذ کے قلب میں اوپر سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں۔ اس لئے جو راوی کثیر الصحبت ہے اس کی روایت کا جو وقار ہوگا وہ اس راوی کی روایت کا نہیں ہوگا۔ جس کی چند گھنٹے ملاقات ہوئی۔ حدیث سن کر چلا آیا سند ٹھیک ہے۔ مگر سند کے ساتھ وہ کیفیات منتقل نہیں ہوں گی۔ جو استاذ کے قلب میں تھیں اور وہ اصل چیز ہیں۔

صبغة الله ومن احسن من الله صبغة ___ اللہ کا رنگ سب رنگوں پر غالب ہے' اللہ نے وہ رنگ اپنے نبیؐ کے قلب میں ڈالا۔ نبیؐ نے اپنے فیض صحبت سے وہ رنگ صحابہؓ کے قلوب میں ڈالا۔ صحابہؓ نے اپنے فیض صحبت سے وہ رنگ تابعین کے قلوب میں ڈالا۔ انہوں نے تبع تابعین کے' وہ کیفیات' قلب کی صفائی اور ذوق و وجدان کا رنگ بھی درحقیقت منقول ہوتا چلا آرہا ہے' ہم اسی کو صحیح مانیں گے جو اوپر سے منقول ہو ___ یعنی اپنے ذوق کا علاج بھی اپنے استاذ سے کرائیں گے تاکہ ہمارا ذوق صحیح ہو جائے۔ اپنے وجدان کو استاذ کے آگے پیش کریں گے کہ ہمارا وجدان صحیح ہے یا غلط؟ ___ تو ذوق بھی وہی ہونا چاہئے' جو اللہ کے رسول کا ہے۔ وجدان کا رنگ بھی وہی ہونا چاہئے، جو اللہ کے رسول کا ہے۔

ذوق صحیح

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے چار فرائض قرآن حکیم میں ذکر کئے گئے ہیں **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ** پہلا کام یہ ہے کہ آپؐ آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ الفاظ خداوندی پوری امانت کے ساتھ امت کو پہنچادیتے ہیں ___ اس کے بعد ہے **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ** ___ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم معانی کا سمجھانا اور مرادات ربانی کا ذکر کرنا ہے ___ اسکے بعد فرمایا :

وَالْحِكْمَةَ ___ حکمت بھی سکھلاتے ہیں ___ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمت نظری اور حکمت عملی ___ حکمت نظری تعلیم کے اندر آ گئی۔ باقی حکمت عملی رہ جاتی ہے تو بلاغت کے قاعدے سے اگر ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور ایک پہلے لفظ میں آجائیں' تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے دوسرے معنی ہیں۔ تو حکمت نظری تعلیم میں آگئی۔ اس لئے **اَلْحِكْمَةَ** میں حکمتِ عملی مراد ہوگی۔ حکمت عملی سے مراد یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمونۂ عمل بھی دکھلاتے ہیں کہ یہ عمل اس طرح کرو۔ تو لفظوں میں تعبیرات پہنچائیں۔ معنی میں مرادات، سمجھائیں۔ حکمت میں عمل کرکے دکھلایا کہ اس نمونہ کا عمل پیش کرو اور چوتھا فریضہ ذکر کیا'

وَيُزَكِّيْهِمْ ___ آپ دلوں کو مانجھتے بھی ہیں ___ یہ وہی ذوق اور وجدان کا صحیح کرنا ہے کہ قلوب میں سے زیغ نکل جائے۔ ٹیڑھ نکل جائے۔ کجی نکل جائے' استقامت پیدا ہو اور فہم میں اتنی سلامتی آجائے کہ جو چیز اللہ و رسول کی بیان کی جائے وہ قطعاً دل کے اندر اترتی ہوئی چلی جائے۔ ٹیڑھ باقی نہ رہے۔ غرض سلامتیٔ

قلب، ذوق صحیح اور وجدان صحیح یہ تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔ تو صحابہؓ کے ساتھ آپؐ نے محنت کی، تاکہ ان کا ذوق درست کریں، کجی باقی نہ رہے۔

اس لئے کہ اگر دل میں کجی رہ جاتی تو دل کی کجی کے ہوتے ہوئے جو آیت بھی سامنے آئے گی، دل اس کے وہی معنی سمجھے گا جو الٹے معنی ہوں گے۔ اگر معاذ اللہ کسی کے دل میں نصرانیت کا جذبہ گھسا ہوا ہو اور وہ نصرانیت کا ذوق لے کر قرآن پڑھے تو اسے ہر آیت سے نصرانیت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانیت کا ذوق لے کر آئے تو پورے قرآن سے قادیانیت ٹپکتی ہوئی نظر آئے گی۔

اس واسطے کہ قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں ۔۔۔ یہ استاذ اور مربی سمجھائے گا کہ یہ مراد ہے اور یہ مراد نہیں۔ اگر تربیت نہ ہو تو کئی معنوں میں سے آدمی نفس کے مطابق جو معنی سمجھے گا وہ اختیار کرے گا۔ وہ مراد نبوی نہیں ہوگی۔ اس کے نفس کی مراد ہوگی۔ اس لئے ذوق کا درست کرنا ضروری ہے۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف قرآن پیش کیا، ایک طرف دلوں کو مانجھ کر کلام رسول سے اس کی تشریح کی۔ تو علماً و عملاً و ذوقاً صحابہؓ وہی سمجھ گئے جو آپؐ کو سمجھانی تھی۔ اگر ذوق صحیح نہ ہو، عمل کا نمونہ سامنے نہ ہو تو مرادات ربانی سمجھنے کی کوئی صورت نہیں۔

مراد قرآن اور سنّت

یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو جب خوارج سے مناظرہ کرنے بھیجا تو ایک وصیت کی، فرمایا، دیکھو! ۔۔۔ خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے دلیل پیش کرنا۔

ابن عباسؓ نے عرض کیا، حضرت! قرآن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعادی ہے **(اللهم علمه الكتب والحكمة)** (اے اللہ! ابن عباسؓ کو قرآن کا علم و حکمت نصیب فرما) اور اللہ نے مجھے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے اور قرآن ہی میرا موضوع ہے ۔۔۔ اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کروں۔ سنت سے پیش کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا، قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم آیت پڑھ کر ایک معنی سے استدلال کروگے، مخالف اسی آیت کو دوسرے معنی میں ڈھال کر اپنی دلیل پیش کرے گا، عوام کہیں گے یہ بھی تو قرآن پڑھ رہا ہے۔ حق واضح نہیں ہوگا۔

لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پیش کردیا۔ اس میں دو معنی نہیں ہوسکتے۔ اس سے مراد متعین ہو جائے گی ۔۔۔ اس واسطے ضرورت ہے کہ سنت سے استدلال ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن سے من مانی مرادیں نکالنے کے عادی ہوگئے ہیں، وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ بلا کہاں سے نازل ہوگئی۔ اس سے تو ہم وہی معنی لینے پر مجبور ہوگئے، جو اللہ کی طرف سے منقول ہوتے آرہے ہیں اور ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ وہ انکار کرکے حدیث کو بیچ سے ہٹاتے ہیں تاکہ آزادی حاصل کریں اور جو ان کے نفس و عقل میں اختراعی چیزیں آئیں، انہیں قرآن کی طرف ٹھونک دیں ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کی مراد نہیں ہوگی، ان کے نفس کی مراد ہوگی۔

کلام میں لب ولہجہ کا دخل

اس واسطے کہ قرآن کی مراد سمجھانے میں لب ولہجہ کا بھی دخل ہے، کلام کی خصوصیات کا بھی دخل ہے،

ماحول کا بھی دخل ہے جب ساری چیزیں قطع ہو جائیں تو مراد کیسے متعین ہو گی؟ ___ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو کا ایک جملہ ہے "کیا بات ہے" اس کے کئی معانی آتے ہیں اور لب ولہجہ سے معنی بدل جاتے ہیں اگر میں کہوں کیا بات ہے؟ آپ سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں کہ بھئی! کیا معاملہ ہوا ہے؟ کیا واقعہ پیش آیا؟ ___ اور اگر میں لہجہ بدل کے یوں کہوں کیا بات ہے۔ اب کیا سمجھے؟ قطعاً سوال نہیں سمجھے' بلکہ آپ سمجھے کہ میں کسی شئ کی بڑائی بیان کر رہا ہوں کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے۔ وہ تو بہت ہی بڑی ہے ___ اور اگر میں لب ولہجہ بدل دوں اور کہوں کیا بات ہے۔ اب آپ کیا سمجھے؟ اب نہ بڑائی سمجھے نہ سوال بلکہ تحقیر سمجھے کہ میں نے کسی شئ کی حقارت بیان کی اور اگر پھر لب ولہجہ بدل کر اسی جملہ کو یوں ادا کروں کیا بات ہے ___ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ نہ بڑائی بیان کی نہ تحقیر نہ استفہام و سوال ___ تو ایک ہی جملہ ہے "کیا بات ہے" اور اس کے چند معنی ہیں اور سب معانی لب ولہجہ سے متعین ہوتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ اگر یہ جملہ خط میں لکھ کر بھیج دیں تو لب ولہجہ تو خط میں نہیں آئے گا۔ تو وہ اس جملہ سے وہی معنی سمجھے گا جو خیال اس کے نفس پر غالب ہو گا۔ لیکن اگر آپ بالمشافہ سامنے بٹھلا کر لب ولہجہ سے (یا کلام دے کر کسی شخصیت ویا مبر کے ذریعہ) سمجھائیں گے تو مخاطب وہی معنی سمجھے گا جو آپ کی مراد ہے۔ لیکن اگر خط میں لکھ کر بھیجیں گے تو وہی معنی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہو گی۔ گویا وہ اس جملے کے جو معنی سمجھے گا وہ (لفظ آپ کے ہونگے) مراد اس کی اپنی ہو گی لکھنے والے کی مراد نہیں ہو گی۔

ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم اور حدیث نبوی کو سمجھ لیں بہت سے معنی ہوتے ہیں جو لب ولہجہ اور ماحول سے متعین ہوتے ہیں اور بہت سے معنی ہیں جو اسباب نزول سے متعین ہوتے ہیں۔ اگر ان سب امور کو قطع کر کے محض الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو ہر شخص اس سے وہی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہو گی اور ایسا کرنے سے بہت سے نقصانات وجود میں آئیں گے۔ بہت سے بدبخت ایسے بھی ہیں جو تلبیس کر کے دنیا کو دھوکہ دیں گے کہ یہ اللہ اور رسول کی مراد ہے۔ حالانکہ اللہ و رسول کی مراد نہیں' اس کی اپنی مراد ہے۔ لفظ اللہ کے لئے اور معنی اپنے بھر دیئے۔

لیکن اگر سند آگئی' بیان رسول آگیا' وراثتی معنی آگئے جو صحابہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور مع کیفیات کے بیان کئے تو شئ متعین ہو جائے گی اور ایسی صورت میں کسی کو دخل دینے کی مجال نہیں ہو گی ___ غرض جو بھی چاہے گا کہ میں قرآن میں من مانی مرادات کو داخل کروں وہ حدیث اور کلام سلف سے انکار کرے گا۔ وہ ان کے مفہوم کی حجیت کا انکار کرے گا تاکہ دنیا کے اندر اس کی حجیت قائم ہو۔

ہم کہتے ہیں دین وہ ہے جو سلسلے وار مرتب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مسلسل مل جائے۔ لفظ معنی اور کیفیت وحال بھی اور عوارض وواقعات اور احوال کے لحاظ سے بھی۔

ضرورتِ نبوّت

آج وہ طلباء جنہوں نے بخاری شریف ختم کی ہے قابل مبارکباد ہیں۔ پہلی بات قابل مبارکباد یہ ہے کہ سات ہزار احادیث کے قریب متون ان کو حاصل ہوئے۔ جو اللہ کے رسول کا کلام ہیں اور کلام رسول کی عظمت وہی ہے جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جیسے اللہ تک بندہ نہیں پہنچ سکتا جب تک بیچ میں رسول کا واسطہ نہ ہو ___ اس لئے کہ وہ نور مطلق ہیں اور بندہ ظلمت محض ہے۔ نور' ظلمت کے ساتھ نہیں جمع ہو سکتا۔ تو اللہ نے ایک برزخی مخلوق پیدا فرمائی کہ وہ بشر بھی ہیں۔ مگر اتنے کامل بشر کہ

لطافتوں میں اللہ سے واصل ہیں ___ وہ انبیاء علیہم السلام ہیں ___ تو بندوں کے خدا تک پہنچنے کے لئے نبی واسطہ ہیں۔ نبی نہ ہو تو بندہ کا پہنچنا ممکن نہیں ___ اسی طرح اللہ کا کلام اتنی عظمت وجلالت میں ہے کہ بندہ کا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو کلام رسول بیچ میں برزخ ہے کہ اس واسطے سے ہم کلام خداوندی تک پہنچیں گے۔

اگر کوئی کلام رسول کا واسطہ بیچ میں سے نکال دے اور چاہے کہ چھلانگ مار کر اللہ کے کلام تک پہنچ جائے تو وہ نیچے آپڑے گا اور وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے کہ وہ کلام بہت اونچائی پر ہے‘ جیسے ذات خداوندی تک پہنچنا بغیر ذوات رسل کے ممکن نہیں ایسے ہی کلام ربانی کے حقائق تک پہنچنا ممکن نہیں ورنہ پھر نبی کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ ___ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن شریف لکھ کر بیت اللہ شریف کی چھت پر رکھ دیتے اور ایک آواز لگا دیتے ___ اے لوگو! تم سب مریضان نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفا ہے اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج کر لیا کرو‘ پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہ تھی مگر پیغمبر بھیجا گیا ___ جیسے محض طب کی کتابوں کا مطالعہ کر کے نہ اپنا علاج کر سکتا ہے نہ غیر کا ___ کیونکہ کتاب میں اصول بیان ہوں گے۔ لیکن نبض پہچان کر کہ فلاں کو کیا روگ ہے؟ فلاں کا مزاج کیسا ہے؟ اس کے لئے تجربہ وتربیت کی ضرورت ہے اور کتاب کے اوراق تربیت کرتے نہیں۔ تربیت کرنے والی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ اگر شخصیتوں سے قطع نظر کر لیا جائے اور محض کتاب کے اوراق رہ جائیں تو کالے کالے نقوش تو سامنے آئیں گے۔ تربیت اور کیفیات سامنے نہ آئیں گی ___ اسی لئے اللہ کے کلام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کلام رسول کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم نہیں پہنچ سکتے۔ تو آج خوشی کا مقام ہے کہ کلام رسول آپ تک پہنچا اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا۔ محض قوت مطالعہ یا کتب بینی سے یا اختراع نفس سے نہیں پہنچا کہ اس میں نفس کا بھی دخل ہوتا‘ شیطان کا بھی دخل ہوتا۔ خوشی ہے کہ سند متصل کے ساتھ پہنچا اور اللہ کے رسول کے ساتھ سلسلہ جڑ گیا۔

تو وہ طلبہ خوش نصیب ہیں جنہیں آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہو گئی اور ان کا قلب گویا قلب نبوت سے بواسطہ کلام نبوت واصل ہو گیا۔

امتِ محمدیہ کی سب سے بڑی عظمت

اس امت کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس امت میں اللہ کا کلام مستند طریق پر موجود ہے۔ آج قرآن کے بارے میں اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اس کی سند کیا ہے تو امت کے علماء اپنی جگہ ہیں میں یہ کہوں گا کہ میری سند حق تعالیٰ سے متصل ہے۔ مجھے یہ قرآن میرے استاذ قاری عبدالوحید خاں صاحب نے حفظ کرایا‘ ان کو قاری عبدالرحمٰن نے حفظ کرایا اور قرأت سکھلائی‘ انہیں قاری عبداللہ صاحب مکی نے حفظ کرایا اور قرأت سکھلائی اور انہیں ابراہیم نے سکھلائی اور سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریل علیہ السلام نے پڑھا اور جبریلؑ کے سامنے حق تعالیٰ شانہ نے تکلم فرمایا‘ تو حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ تک پہنچ جاتی ہے۔

دنیا میں آج کون سی کتاب ہے جو سند متصل کے ساتھ اللہ تک پہنچے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہو کہ یہ الہامی کتاب ہے تورات‘ انجیل یا زبور ہے کسی کی سند نہیں ہے۔ بس ایک ہی سند ہے کہ

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ باپ دادا کو یوں ہی کہتے سنتے چلے آتے ہیں ممکن ہے باپ دادا نے غلطی کی ہو۔ جب تک سند سامنے نہ ہو غلطی کا امکان ہے لیکن اگر سند سامنے

ہے، تو غلطی کا امکان نہیں ہے۔

فن اسماء الرّجال

اور مسلمانوں نے یہی نہیں کیا کہ سند لے لی ___ نہیں، بلکہ راویان حدیث کے لئے ایک مستقل فن ایجاد کیا۔ اور پچاس ہزار ایسے آدمیوں کی سوانح عمریاں مرتب کیں جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں۔ ان کے نسب نامے کیا تھے؟ ان کا کیریکٹر کیا تھا؟ ان کا کردار کیا تھا؟ ان کا حافظہ کیسا تھا؟ ان کا عدل وانصاف کیسا تھا؟ ان کے قلب کے اخلاق کیسے تھے؟ پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمریاں (فن اسماء الرجال) مرتب کردیں۔ تو وہ کسوٹی ہے کہ دیکھ کر معلوم کرلیں کہ یہ راوی ہیں جن کے واسطے سے کتاب مبین ہم تک پہنچی ہے۔

غرض مسلمان اگر اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کا کلام لئے بیٹھے ہیں تو اس بھروسے نہیں کہ باپ دادا سے یوں ہی سنتے چلے آرہے ہیں۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ٥ (بقرہ پ۲ آیت ۱۷۰)

چاہے باپ دادا نے غلطی کی ہو، چاہے عقل نہ لڑائی ہو، پھر بھی تم یہی کہو گے کہ باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ کوئی سند کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو افواہ ہے۔ افواہاً کوئی چیز معتبر نہیں ہوسکتی۔ سند یہ ہے کہ میں نے فلاں سے پڑھا اور اس نے فلاں سے پڑھا اور اسی طور پر اس کی اللہ کے رسول تک انتہا ہو جائے۔

دین کے ہر ہر جز کی سند

تو مسلمانوں کے پاس ایک ایک حدیث کی سند موجود ہے۔ اگر چھوٹا جملہ بھی پڑھیں گے تو اللہ کے رسول تک سند پہنچائیں گے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں استناد کی عادت پڑگئی، وہ محض قرآن وحدیث نقل نہیں کرتے، بلکہ کوئی دینی فن نہیں کہ جس کی سند نہ ہو۔ آپ ہدایہ پڑھائیں گے، اس کی سند موجود ہے کہ صاحب ہدایہ سے ہمارے استاذوں نے اس اس طرح حاصل کیا، حتیٰ کہ تصوف کے اندر عرفائے حقیقت اور حضرات صوفیہ نے بھی سند کیساتھ۔

شیخ ابواسحاق کا رسالہ قشیریہ ہے۔ اس میں حضرت جنید اور حضرت شبلی کے واقعات بھی نقل کئے ہیں اور سندیں بھی نقل کی ہیں تصوف کے اصول نقل کئے ہیں تو سندیں نقل کی ہیں۔ تصوف کا یہ واقعہ جنید یا شبلی سے یا سید الطائفہ سے فلاں سند کے ساتھ ہمیں پہنچا ہے۔

اور اس میں پھر آگے قرآن وحدیث سے ماخذ پیش کیا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے اخذ کیا ہے۔ تو تصوف کی سندیں الگ موجود ہیں، فقہ کی الگ، حدیث کی الگ ___ اور قرآن کی سند تو تواتر طبقات کے ساتھ ہے تو کوئی دینی فن یا دینی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان یہ کہہ کے نقل کریں کہ ہم باپ دادا سے یونہی سنتے چلے آرہے ہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ میں نے فلاں استاذ سے پڑھا وہ اپنے استاذ کا حوالہ دے گا، وہ اپنے استاذ کا تو یہ کسوٹی ہے۔ جس کے ہاتھ میں سند نہ ہو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا علم مستند نہیں، ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی بات مانی جائے گی جو سند متصل سے بات کرے۔

تو آج ان طلباء کے لئے مبارکباد دینے کا وقت ہے جنہیں متن حدیث حاصل ہوا اور سند متصل کے ساتھ ہوا۔ اس واسطے میں ان طلبہ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں۔ اور ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں، مدرسہ کے معاونین اور منتظمین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی محنتوں کا پھل ان کے سامنے آگیا

اور سند کے ساتھ چند علماء تیار ہو گئے۔

مراتب علماء

یہ ظاہر ہے کہ علماء سب ایک درجہ کے نہیں ہوتے کوئی اعلیٰ فہم رکھتا ہے کوئی متوسط درجے کا ___ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ___ تو ایک درجے کے سارے نہیں ہوتے۔ بعض دقیق الفہم ہوتے ہیں۔ بعض بلید الفہم ہوتے ہیں' بعض غبی بھی ہوتے ہیں مگر خیر دیندار تو بن جاتے ہیں۔ ان کی عبادت اگر علم تک نہ پہنچا سکے تو کم سے کم ان کا عمل صحیح ہی قائم ہو جاتا ہے ___ بہرحال علماء ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ مگر سب کے ساتھ حسن ظن رکھنا ضروری ہے جب کہ وہ سند کے ساتھ روایت کریں اور انہیں سند کے ساتھ علم حاصل ہوا ہو تو ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے ساتھ حسن ظن رکھیں ان کی عظمت کریں۔ وہ عظمت ان کی ذات کی نہیں ہوتی ___ ذات تو گوشت پوست سے بنی ہوئی ہے وہ ہمارے اندر بھی موجود ہے' اس کی کیا عظمت ہے؟

وہ عظمت علم کی ہوتی ہے اور ان کے اندر اللہ اور اللہ کے پاس سے علم آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس واسطے علم کی اور اس نسبت اور سند کی تعظیم کی جاتی ہے۔ جو انہیں حاصل ہوئی ہوتی ہے ___ تو یہ سب طلباء اور علماء جو تیار ہوئے ہیں' ہم سب کے لئے مستحق اور مستوجب تعظیم و عظمت اور وقار کے ہیں ___ لوجه النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور لوجه اللہ تعالیٰ کہ انہیں حق تعالیٰ سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہو گئی ہے' اس لئے ہم ان کی عظمت کریں گے۔ کسی عالم کی تحقیر کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی تحقیر سے علم کی تحقیر ہوتی ہے اور علم اللہ اور اللہ کے رسول کا ہے اس کی تحقیر ہمارے لئے کب جائز ہے؟ تو مستند عالم واجب التعظیم اور واجب التکریم ہے۔ اس واسطے ان دونوں کو عظمت دی جائے گی اور ان کو مبارکباد دی جائے گی۔ تو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اجازت حدیث

اور چونکہ ختم کے لئے اپنی عنایت اور مہربانی سے انہوں نے مجھے بلایا اور اس سعادت میں شریک کیا کہ میں ختم کراؤں۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ میں اپنی سند پیش کر کے اس سند کی اجازت انہیں دوں۔ جن طلبہ نے میرے سامنے حدیث پڑھی۔

میرا سلسلہ ایک یہ ہے حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ وہ حضرت شیخ الہند کے وہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور وہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی صاحب' شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے اور شاہ محمد اسحاق صاحبؒ' شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ' شاہ ولی اللہؒ اور شاہ ولی اللہؒ' شیخ ابو طاہر مدنیؒ کے شاگرد ہیں (اس سے آگے سلسلہ سند ترمذی شریف میں مرقوم ہے) اور دوسرا سلسلۂ سند یہ ہے۔ بندہ کو مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارن پوری نے اور ان کو مولانا عبدالقیوم صاحبؒ بڈھانوی نے اور ان کو شاہ محمد اسحق صاحب دہلویؒ الیٰ آخرِ سند نے اجازت فرمائی۔

ہر دو سلسلہ سند سے میں ان طلباء کرام کو اجازت حدیث دیتا ہوں۔

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم
واٰخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تفاسیر و علوم قرآنی اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر

دارالاشاعت کی مطبوعہ کتب ایک نظر میں

تفاسیر و علوم قرآنی

تفسیر عثمانی بطرز تفسیر مع عنوانات جدید کتابت ۲ جلد ــــــــ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، اضافہ عنوانات جناب محمد ولی رازی

تفسیر مظہری اردو ــــ ۱۲ جلدیں ــــــــ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ

قصص القرآن ــــ ۴ حصے در ۲ جلد کامل ــــــــ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

تاریخ ارض القرآن ــــــــ علامہ سید سلیمان ندویؒ

قرآن اور ماحولیات ــــــــ انجینیئر شفیع حیدر دانش

قرآن سائنس اور تہذیب و تمدن ــــــــ ڈاکٹر حقانی میاں قادری

لغات القرآن ــــ ۶ جلد کامل ــــــــ مولانا عبدالرشید نعمانی

قاموس القرآن ــــــــ قاضی زین العابدین

قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی انگریزی) ــــــــ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

سلک البیان فی مناقب القرآن (عربی انگریزی) ــــــــ حبان پبلشرز

اعمال قرآنی ــــــــ مولانا اشرف علی تھانویؒ

قرآن کی باتیں ــــــــ مولانا احمد سعید صاحب

حدیث

تفہیم البخاری مع ترجمہ و شرح اردو ۳ جلد ــــــــ مولانا ظہور الباری اعظمی۔ فاضل دیوبند

تفہیم المسلم ۰ ۰ ۰ ۳ جلد ــــــــ مولانا زکریا اقبال۔ فاضل دارالعلوم کراچی

جامع ترمذی ۰ ۰ ۰ ۲ جلد ــــــــ مولانا فضل احمد صاحب

سنن ابوداؤد شریف ۰ ۰ ۳ جلد ــــــــ مولانا سرور احمد صاحب، مولانا خورشید عالم قاسمی صاحب فاضل دیوبند

سنن نسائی ۰ ۰ ۰ ۳ جلد ــــــــ مولانا فضل احمد صاحب

معارف الحدیث ترجمہ و شرح ۴ جلد ــــــــ ۷ حصے کامل۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب

مشکوٰۃ شریف مترجم مع عنوانات ۳ جلد ــــــــ مولانا عابد الرحمن کاندھلویؒ، مولانا عبداللہ جاوید

ریاض الصالحین مترجم ــــ ۲ جلد ــــــــ مولانا خلیل الرحمن نعمانی مظاہریؒ

الادب المفرد کامل مع ترجمہ و شرح ــــــــ از امام بخاری

مظاہر حق جدید شرح مشکوٰۃ شریف ۵ جلد کامل اعلیٰ ــــــــ مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری فاضل دیوبند

تقریر بخاری شریف ــــ ۳ حصے کامل ــــــــ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

تجرید بخاری شریف ــــ ایک جلد ــــــــ علامہ حسین بن مبارک زبیدی

تنظیم الاشتات ــــ شرح مشکوٰۃ اردو ــــــــ مولانا ابو الحسن صاحب

شرح اربعین نووی ــــ ترجمہ و شرح ــــــــ مولانا مفتی عاشق الٰہی البرنی

دارالاشاعت ❁ مستند اسلامی و علمی کتب کا مرکز

دارالاشاعت کی مطبوعہ فقہی کتب ایک نظر میں

بہشتی زیور مدلل مکمل ــــ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح
فتاوی رحیمیہ اردو ۱۰ حصے ــــ مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری
فتاوی رحیمیہ انگریزی ۳ حصے ״ ״ ״ ״ ״
فتاوی عالمگیری اردو ۱۰ جلد مع پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی ــــ اورنگ زیب عالمگیر
فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۲ حصے ۱۰ جلد ــــ مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب
فتاوی دارالعلوم دیوبند ۲ جلد کامل ــــ مولانا مفتی محمد شفیع رح
اسلام کا نظام اراضی ــــ ״ ״ ״
مسائل معارف القرآن (تفسیر معارف القرآن میں مذکور قرآنی احکام) ״ ״ ״
انسانی اعضاء کی پیوندکاری ــــ ״ ״ ״
پراویڈنٹ فنڈ ــــ ״ ״ ״
خواتین کے لیے شرعی احکام ــــ اہلیہ ظریف احمد تھانوی رح
بیمہ زندگی ــــ مولانا مفتی محمد شفیع رح
رفیق سفر سفر کے آداب و احکام ــــ ״ ״ ״
اسلامی قانون نکاح، طلاق، وراثت ــــ فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
علم الفقہ ــــ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رح
نماز کے آداب و احکام ــــ انشاء اللہ خان مرحوم
قانون وراثت ــــ مولانا مفتی رشید احمد صاحب
داڑھی کی شرعی حیثیت ــــ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
الصبح النوری شرح قدوری اعلیٰ ــــ مولانا محمد حنیف گنگوہی
دین کی باتیں یعنی مسائل بہشتی زیور ــــ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح
ہمارے عائلی مسائل ــــ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب
تاریخ فقہ اسلامی ــــ شیخ محمد خضری
معدن الحقائق شرح کنز الدقائق ــــ مولانا محمد حنیف گنگوہی
احکام اسلام عقل کی نظر میں ــــ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح
حیلہ ناجزہ یعنی عورتوں کا حق تنسیخ نکاح ״ ״ ״ ״ ״

دارالاشاعت ۞ اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی ۱، پاکستان ۲۶۳۱۸۶۱، ۰۲۱ مستند اسلامی و علمی کتب کا مرکز